فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○

سلسلۂ دار المصنفین

(٦٦)

حیاتِ شبلیؒ

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

از

سید سلیمان ندوی

فہرست مضامین

حیاتِ شبلیؒ

مقدمہ

۱ - ۵۷

اعظم گڈھ اور اس کے اطراف

۵۰ - ۵۷

ولادت اور تعلیم و تربیت

۵۸ - ۹۱

ندوۃ العلماء،

یعنی علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت

۲۹۸ – ۴۱۱

مضمون	صفحہ

سیاسیات

۵۰۵ - ۶۳۶

فہرست رجال حواشی

"حیات شبلی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیاتِ شبلی

پیشِ نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں جس نے تیس برس (۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُرشور رکھا۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود　　زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است

سوانح کے ذرائعِ علم خاکسار نے اُستادِ مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۲ء) تک مسلسل گذارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، یہ دس برس درحقیقت اُن کی تیس برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے معروف ایام تھے، بلکہ اُن ہی کو اُن کی ستاون برس کی زندگی کا حاصل کہا جا سکتا ہے خود اُن ہی کا شعر[1] ہے

ساغرِ زندگیم حیف کہ جز دُرد نداشت　　جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پیماں زدہ ام

ان کے اس معروف ترین حصۂ زندگی کے اکثر لمحات میری نظر کے سامنے گذرے ہیں، اس لئے اس کے مالہٗ و ماعلیہ سے بقدر بشری مجھے پوری واقفیت ہے، اور اس واقفیت نے اس کتاب کی تالیف میں مدد دی۔

[1] مولانا کا شعر ہے، اصل میں زدہ ام ہے۔

مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات، اُن کے اعزہ و احباب اور ان کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور سُنے، تعلیمی حالات خود مولانا کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنتا رہا، علی گڈھ کے قیام کے واقعات کا بڑا حصہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے اوراق سے بہم پہنچے، اور اُن کی پوری زندگی کا خاکہ اُن کے مکاتیب کے مرقع میں بآسانی مل گیا۔

دانائے راز کی کارسازی کے قربان کہ راقم حروف کو مولانا کی زندگی ہی میں سنہ ۱۹۰۰ء میں اُن کے خطوط و مکاتیب کے جمع کرنے کا خیال آیا، اور اُس وقت اس کا مقصد خطوط کے علمی و ادبی ذخیرہ کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن اُن کی وفات کے بعد اُن کی سوانحعمری کا خیال آیا تو نظر آیا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعہ درحقیقت صاحبِ مکاتیب کے سوانحِ زندگی کے ذخیرہ کو میرے ہاتھوں بلاقصد و ارادہ پہلے ہی سے محفوظ کرا دیا تھا، اسی طرح مولانا کے سوانح کی تالیف، واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی یہ دونوں جلدیں بے حد کارآمد ہوئیں، اور اسی لئے سوانح و واقعات کے ذکر میں مکاتیب کے ہر خط کا حوالہ نمبر اور تاریخ کے تعین کے ساتھ دیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص بآسانی واقعہ کی تحقیق کر سکے، اور اس نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حیاتِ شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خودنوشت سوانحعمری ہے۔

بڑی تسکین اس سے ہوئی کہ بحمداللہ اس وقت ہمارے درمیان مولانا کے ایک حبیب اکرم اور اُن کی زندگی کے اکثر واقعات کے شریک و مشیر و ہمدم، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی موجود ہیں، جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی، اسی طرح مولانا

کے علی گڑھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیامِ علی گڑھ اور تعلقاتِ سر
کے واقعات کی تفتیش کی گئی، اور انھوں نے مہربانی فرما کر کچھ واقعات لکھ کر بھی بھیجے،

مولانا کی زندگی میں ان کی سوانحعمری کا خیال

میری ابھی و سمجھئے کہ مولانا کی زندگی میں کبھی یہ وہم بھی نہیں آیا کہ یہ ہستی
مقدس جلد ہمارے درمیان سے اٹھ جائے گی۔ اس لئے ان کے سوانحِ حیات
کے قلمبند کرنے کا خیال بھی نہیں ہوا۔ البتہ بعض دوسرے لوگوں کو آخر زمانہ میں ادھر توجہ ہوئی
لیکن ان کے جواب میں مولانا نے کسی کو بیشتر ولادت کی مختصر سی فہرست لکھ کر بھیج دی، اور
کسی کو کچھ کہہ کے ٹال دیا۔ چنانچہ رسالہ ادیب الہ آباد کے ایڈیٹر شاکر صاحب میرٹھی نے اپنے
رسالہ میں چھاپنے کے لئے کچھ حالات لکھ کر مانگے تو جواب میں لکھا: "یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنے
حالات خود لکھ سکوں، مسلم ریویو میں ایک صاحب نے کچھ واقعات لکھے تھے، وہ آپ لے سکتے ہیں
اس کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ بتا دیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں" (مکاتیب
اول، مکتوب الیہ نمبر ۳۵)
لیکن نہ مجھے لکھا گیا اور نہ میں نے لکھا۔

مسلم ریویو الہ آباد کے جس مضمون کا حوالہ ہے وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز
فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جو انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے، اور مولانا
سے شخصی طور پر واقف تھے، یہ مضمون اگست سنہ ۱۹۱۲ء کے رسالہ مسلم ریویو الہ آباد میں چھپا تھا،
اس مضمون کے لئے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوا دیئے تھے، جو تعلیم و سفر و قیامِ علی گڑھ کے
چند سرسری واقعات پر مشتمل ہے،

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات دریافت کیے تو ایک ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم، کچھ قیامِ علی گڈھ اور کچھ اپنی تالیفات و آثار کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا، اور آخر میں تمسخراً کر یہ لکھ دیا کہ[۱] "خود اپنا آلھا کیا گاؤں"۔

مولانا کی ترتیبِ سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہشمند منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے، شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح انھوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لائف لکھی ہے، (یعنی وہ اس طرح لکھی ہے کہ طرزِ انشاء کے پہچاننے والوں کو وہ بظاہر خود صاحبِ سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں انھوں نے خود مولانا سے خواہش کی مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا، چنانچہ مولانا ابوالکلام کو لکھنؤ سے ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو وہ لکھتے ہیں:- "ہاں اور سنیے! افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھدیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم الاسرار[۲] خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوائیے، بھئی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی[۳]" (مکاتیب ابوالکلام - ۳)

منشی سید افتخار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہیں آئے

---

[۱] یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپا ہے [۲] عالم اسرار تو خدا کے سوا کوئی اور نہیں، مگر یہاں مقصود بعض مخفی حالات کا علم ہے۔ (س) [۳] اس فقرہ سے استکبار اور ترفع کا مفہوم نہ سمجھا جائے، مقصود یہ ہے کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو فارسی کا علم رکھتے تھے، گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم مولانا پر لکھنے کے لئے علوم عربیہ اور فنون کلامیہ اور ادب و تاریخ پر اطلاع ضروری تھی، اس لئے مولانا کا خیال تھا کہ وہ انکی سوانحعمری کے فرض سے

چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا، انھوں نے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا:- "میری لائف میرے بعد لکھیے گا ورنہ مکمل لائف کیونکر ہو گی" (مکاتیب اوّل مکتوب نمبر ۲۴)

یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے دس ہی مہینوں کے بعد کاتب کی لائف یعنی زندگی واقعۃً پوری ہو جائے گی، بہرحال منشی صاحب موصوف نے مولانا کے اس جواب کے بعد مجھے گھیرا کہ میں مولانا کے قلم سے اُن کی خواہش کی تکمیل کرا دوں اور اس غرض کے لئے انھوں نے فروری ۱۹۱۴ء میں مجھے پٹنہ خط لکھا، میں نے مولانا سے انکی سفارش کی تو مجھے جواباً ارشاد ہوا:
"افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا" (مکاتیب سلیمان ۶۶)

ہائے اُن کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف کیسی پوری ہوئی! سچ مچ میں دنیا کے اور کاموں سے آخر فارغ ہی ہو کر ادھر متوجہ ہوا،

وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے

راقم نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے مختصر حالات پہلے تو الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اُس زمانہ میں اصح المطابع لکھنؤ میں چھپ کر تمام ہوا تھا بطور دیباچہ کے لکھے، پھر اسی کو معارف اگست ۱۹۱۶ء میں چھاپ دیا، اور مولانا کے مرض الموت کے حالات، وفات اور آخری احوال پر مسلسل تین مضمون فروری ۱۹۱۵ء کے زمیندار لاہور میں لکھے، مولانا کے دوسرے قدیم احباب و اعزہ میں سے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء میں، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے دلگداز میں، خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اپنے رسالہ عصر جدید مورخہ ۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء میں، سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اردوئے معلی

میں اور مولنا عبد اللہ العمادی نے زمیندار مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ئ میں، اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات، مرثیے اور نوحے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے اور شائع کئے، مگر ان میں استناد کے قابل یہی تین چار اوّل الذکر مضامین ہیں، اور اُس وقت سے لیکر اس وقت تک مولانا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اُس کی ماخذ زیادہ تر پہلا اور کچھ دوسرا اور تیسرا اور چوتھا مضمون ہے،

اُن کی سوانحعمری مستقلاً لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انھوں نے "بشیر پاشا سیر نیرآبادہ" کے ضمن میں مولانا کے حال میں ۱۹۲۵ئ میں ایک رسالہ "تذکرہ شمس العلما مولانا شبلی" کے نام سے لکھ کر شائع کیا،

حیاتِ شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام

خاکسار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریک کار مولنا عبد السلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہموطنی کا تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے، ال ال بی، ایم ال اے وکیل اعظم گڈھ کے سپرد کیا گیا، کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو

اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڈھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون "سیرت شبلی" کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا، اس کے بعد وہ اسمبلی کی ممبری اور اس کے سیاسی فرائض میں ایسے الجھے کہ اس سیرت شبلی کے مسودہ کو تمام کرنے کے لئے وہ مناسب وقت و فرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

اس لیت ولعل میں سالہا سال گذر گئے، اس اثنا میں مولانا کے بہت سے احباب اور ان کے سوانح کے مطالعہ کے مشتاق اسی اشتیاق میں چل بسے، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آگیا، یعنی مولانا کی وفات اور دار المصنفین کی بنیاد پر پچیس چھبیس برس گذر گئے، احباب کا تقاضا ہوا کہ دار المصنفین کی پچیس برس کی سلور جوبلی منائی جائے، میرا اصول یہ ہے کہ

نی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست

اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوع جوبلی یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دیدیا جائے جو سالہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا، آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۲ء میں یہ انجام کو پہنچا، اور اسی زمانہ میں اس کی چھپائی بھی شروع ہو گئی، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس طرح صاحب سوانح کی وفات ۱۹۱۴ء والی یورپ کی جنگ عظیم میں واقع ہوئی اُن کی یہ سوانح عمری کی تالیف بھی ۱۹۴۰ء والی جنگ عظیم میں واقع ہوئی، جس سے زیادہ تعداد میں کاغذ کے ملنے کی دقت ایسی ضخیم کتاب کی چھپائی میں ہارج ہوتی رہی، اور آخر کسی

نہ کسی شکل سے یہ مشکل حل ہوئی، اور چھپنے کی صورت نکلی،

معاونوں کا شکریہ میں آخر میں اپنے اُن تمام بزرگوں اور دوستوں کا مشکور ہوں جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں مجھے مدد دی، بالخصوص مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا جن کے مجموعۂ اوراق کے سبب سے مکاتیب کی ورق گردانی اور کاغذات اور مسودات کی تلاش کی مصیبت سے بہت کچھ نجات ملی، اور مولوی اقبال احمد سہیل صاحب کا جن کی تحریر سے اعظم گڈہ کے بعض علمی واقعات اور مولٰنا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں بڑی مدد ملی، اس کے بعد محبّی منشی محمد امین صاحب زبیری کا جو علی گڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں نظمیں اور واقعات نقل کر کر کے مجھے بھیجتے رہے،

سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ کے ان آٹھ سو صفحوں کو بڑی محنت سے حرف حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ کچھ بڑھایا، اور اس طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے گویا توثیق کی، فللّٰہ الحمد،

حیات شبلی کے معتقد و منتقد خاکسار کو یہ دعوی نہیں کہ یہ تالیف سوانحمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اُس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے مولانا کے سوانح میں بعض رفقاے کار اور معاصرین سے کچھ اُلجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے، اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے

تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں، اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہیں کیونکہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے اُن ہی پر پڑتی ہیں، اور اُن کے تکرار و اعادہ میں اُن کو ایسی لذّت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں

فعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ ولکنّ عین السخط تبدی المساویا

رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے، بہرحال شبلی شبلی تھے، جنید و شبلی نہ تھے،

عہدِ جدید کا عالمِ اوّل مولانا کا رنگ ان قدیم علماے دین کا نہ تھا جن کا پاک مشغلہ صرف خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور مدرسوں میں درس و تدریس ہے، اگر ایسا ہوتا تو ایسے بزرگوں کے تذکروں کے لکھنے کا جو پرانا دستور چلا آتا ہے تذکرہ نگار کو اس سیدھے رستہ پر چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی، بلکہ یہ عہد جدید کے سب سے پہلے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں جن میں قدیم کے ساتھ ایسے جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں، جو عہد قدیم کی مانوس نگاہوں میں کبھی کبھی کھٹک پیدا کردیتے ہیں، کیونکہ ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی، اس لئے وہ قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے، مرج البحرین یلتقیان، اور اسی لئے اُن کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علماے دین کے کارناموں

سے نسبتہً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید علوم کے بہت سے آراء و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محققِ فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہرِ تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانہ کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے، اور یہ سب گوناگوں رنگ اُن کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں، جن کی تفصیل ان اوراق میں نظر آئے گی،

کتاب کے ضمنی مباحث اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحعمری نہیں، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضرور تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے، جس میں دیارِ مشرق میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے،

تصویر رسمِ زمانہ کے مطابق عام لوگوں کو اس میں صاحبِ سوانح کی عکسی تصویر بھی ضروری معلوم ہوتی ہو گی، مگر لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے اُن کی جو سچی اور اصلی تصویر اس پوری کتاب میں نظر آتی ہے، وہ اس فریبِ نظر والے گناہِ بےلذت رسمی تصویر سے زیادہ پائدار اور زیادہ قیمتی ہے، البتہ اس کی کوشش ہے کہ ان کی جسمانی فانی تصویر کے بجائے ان کے باقیات

صالحات کاموں کی تصویر سے ان اوراق کو مزیّن کیا جائے، یعنی ان عمارتوں کی تصویریں دیدی جائیں جن میں ان کے اعمالِ صالحہ اور صدقاتِ جاریہ مجسم ہیں،

کتاب کا نام کتاب کا نام بھی خود صاحبِ سوانح کا فیضِ انتخاب ہے، مولانا ابوالکلام کے نام والے اوپر کے خط میں "حیاتِ شبلی" خود ان کے قلم سے نکلا ہے، اور پسند کے قابل ہے،

محسن کی شکرگذاری اس حیاتِ شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح استاد مرحوم کے احسانات کے بارے میں سبکدوش ہوگیا تو یہ ناشکری ہوگی، کیونکہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، اور اُن کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہی ہے، سب سے اوّل یہ کہ انھوں نے اس بے مایہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استطاعت کے بموجب دین وملت کی کوئی خدمت بجا لا سکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو طالب علم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دستگیری فرمائی کہ حصولِ علم اور شوقِ مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا، اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سُن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم وفن کے آستانہ پر لاکر کھڑا کردیا، اور سب سے آخر یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سیدِ اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اوّل پہنچایا، یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مطالعہ، جمع وتنقید اور تالیف وتحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی، جو الحمد للہ یہاں اُس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے؛

اور انشاءاللہ وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار لغزشوں کے باوجود حجاز کے بجائے ترکستان جانے کی غلطی اُس سے سرزد نہیں ہوئی، اور ساری علمی وعملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اسی سایۂ رحمتؐ کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا، اور اس طرح سرکارِ مدینہ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہِ قبول کے قابل ٹھہرا، اور تلافیِ مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا، ع

حلِ ایں نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد

ہیچمدان سُلیمانؔ

۲۵ر محرم سنہ ۱۳۶۲ھ

۲ر فروری سنہ ۱۹۴۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے، لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس کے لئے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرکے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے،

دادِ او را قابلیت شرط نیست   بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

ہر مسلمان سپاہی جنید و شبلی نہیں ہوتا، لیکن اُس کا بھی ایک کام کہ خدا کی راہ میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنت کا دروازہ اس کے لئے فوراً کھل جاتا ہے،

پچھلی صدیوں میں جو کچھ پیش آیا اور ہر دور میں اسلام کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت اور وقت کی دینی ضرورت کے مطابق اشخاص جس طرح پیدا ہوتے رہے، اُن کے حالات تاریخ کے صفحوں میں مذکور ہیں، خود ہندوستان میں، دیکھئے کہ گو آلِ تیمور سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے فائدے پہنچے، مگر ان کے بعض فرمانرواؤں کی کوتہ اندیشی سے دو رخنے بھی پیدا ہوگئے، ایک یہ کہ ایرانی امرار کو سلطنت میں اقتدار حاصل ہوگیا، اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اُن کی بہت سی مذہبی رسموں کو علی الاعلان قبول کر لیا گیا، آخران ہی دونوں رخنوں سے وہ سیلاب آیا جس نے ان کو بھی ڈبو دیا اور اسلام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کر دینا چاہا، عین اُس وقت سرہند و دہلی کے دو خانوادوں سے وہ اشخاص پیدا ہوئے، جنھوں نے ان فتنوں کے منہ بند کئے اور اسلام کے قلعہ کو اس سرزمین میں از سرِ نو محفوظ کیا، تیموریوں کا دور جب ختم ہوا، اور سکھوں نے سر اُٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خاندانوں سے وہ اکابر اُٹھے جنھوں نے پورے ہندوستان کو جگا دیا، اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغِ دین کا ولولہ پیدا کر دیا،

انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیئے

دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر اُن پر حملہ کی جرأت پائی، اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدّن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے، جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تردِ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں، اور کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف، اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہرِ کامل، اور عبرانی ویونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود اُن ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابلِ شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا،

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائیدِ غیبی ہی کا نشان تھا، اور پھر جس طرح عقائدِ حقہ کی اشاعت اور ردِ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں،

یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانینِ فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کئے، ان کا اصلی جواب تو وہ علما دے سکتے تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح جو قدیم فلسفہ میں ماہر تھے، اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف ہوتے، مگر بہر حال مالا یدرک کلّہٗ لا یترک کلّہٗ، کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق اُن ہی لوگوں میں سے جو گو نیم عالم تھے، لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے سر سید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا، اور ان سے بہتوں کو ایک معنی کر فائدہ بھی پہنچا، لیکن چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں، اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بمراحل دور تھیں، ان کی غلطیوں کا سبب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے زمانہ کی طبیعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی مان کر مسائلِ شرعیہ کو اُن کے مطابق کرنے لگے اور یہ وہی غلطی تھی جس میں بہ مقابلۂ فلسفۂ یونان تیسری اور چوتھی صدی میں باطنیہ فرقہ کے علما، اور مصنفین مبتلا ہو چکے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ علماؤ فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں وہی انبیا، اور رسل علیہم السلام کہتے ہیں، اس لئے دونوں میں ایسی تطبیق دی جائے کہ انبیاؑ کا کلام کسی نہ کسی تاویل سے حکماؤ فلاسفہ کے خیال کے مطابق ہو جائے، لیکن متکلمین اہلِ سنت نے یہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ

یہ کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا اُس کو قطعی و یقینی مان کر حکماء و فلاسفہ کے ان مسائل کی جو قطعاً مخالف تھے، دلائل سے غلطی ثابت کی، اور جو کسی قدر تصحیح سے صحیح ہو سکتے تھے، اس کی تاویل کر دی، اور جو تمام تر مطابق تھے یا کم از کم مخالف نہ تھے، یا انبیاء علیہم اسلام نے اُن سے نفیاً یا اثباتاً بحث ہی نہیں کی تھی، ان کی توثیق کی،

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے،

مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیت خاص رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لئے اٹھے وہ اَن پڑھ مشنریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و تمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخی و تمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سرِ نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو، اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات

کی بے مایگی کا بھی اندازہ ہو،

مرحوم کا مقصدِ زندگی اگر یہیں تک ختم ہو جاتا تو بھی کام نسبتہً ہلکا ہوتا، مگر اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اور اُن ہی کی تفصیل اس کتاب کی غرض وغایت ہے،

اس دوسری غرض کے لئے اُنھوں نے ایسے پر زور مضامین لکھے اور تقریریں کیں جن سے یہ ثابت ہو کہ ہماری عربی تعلیم کا پرانا نصاب اصلاح کا محتاج ہے، اور ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہیئے، شروع شروع میں ہر نئی تحریک کی طرح اسکی بھی مخالفت کی گئی، اور شدید مخالفت کی گئی، مگر جب لکھنؤ میں دارالعلوم کی بنیاد ڈال دی گئی اور اس کے نتائج سامنے آئے تو رفتہ رفتہ مخالفت کی آواز دھیمی پڑتی گئی، اور مولانا اور مولانا کے تلامذہ کے ہاتھوں حیدرآباد سے بھاولپور تک اور خاص طور سے صوبہ ہائے متحدہ اور بہار کے مدرسوں اور ڈھاکہ اور حیدرآباد کے مشرقی و دینی شعبوں میں عظیم الشان اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، یہاں تک کہ اب صوبۂ متحدہ کی مقدس مذہبی درسگاہوں تک اُس کے اثرات پہنچ رہے ہیں،

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء کے وجود سے پہلے ہی اس کے متعلق سب سے پہلی آواز سفرنامہ روم و مصر و شام میں ۱۸۹۲ء ۱۳۰۹ھ میں اٹھائی تھی، اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے

مذہبی مدرسوں اور خاص طور سے جامع ازہر کے نصاب و طریق تعلیم و تربیت پر بڑی دلسوزی سے افسوس و حسرت کے آنسو گرائے، آنسو کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے، اسی کے چند سال بعد ۱۸۹۹ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی، اس کے متعلق سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر نے مسلسل مضامین لکھے، ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کے المنار میں اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نامور علماء کے نام سنداً پیش کئے وہ یہ تھے شیخ احمد جان روسی، شیخ شنقیطی مغربی (مراکش) اور شیخ شبلی نعمانی ہندی[1]، اس کے بعد اگر ۱۹۱۴ء کی تحریک جامعۂ مدینہ کی کامیاب ہو جاتی تو اصلاحِ مدارس کی یہ تحریک ساری دنیائے اسلام میں پھیل جاتی، مولانا اس ماحول میں جس کو ہندوستان میں تعلیم جدید نے پیدا کیا تھا ۱۶ برس کے قریب رہے تھے، اُن کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ کس رُخ پر ہے، اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم و فنون کا کیا حال ہوگا، اور جو شکوک و شبہات اس تعلیم کی بدولت پیدا ہو رہے ہیں، اُن کے جواب دینے کے لئے کس استعداد کے علما کی ضرورت ہے، ساتھ ہی مصر و شام و ٹرکی کی سیاحت نے علماء کے جدید فرائض کی ضرورتوں کو اُن پر آئینہ کر دیا تھا، اور ان ہی وجوہ سے ان کو اپنی تحریک کی ضرورت کا وہ شدید احساس تھا جو دوسرے علما کو نہ تھا،

اس اصلاحی تحریک کی دو دفعات پر مولانا کو بہ شدت اصرار تھا، ایک یہ کہ قدیم یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں، دوسری یہ کہ علما، تعلیم یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقینِ یورپ کے اعتراضات کے جواب اور

[1] اخبار البشیر اٹاوہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء

غلطیوں کی اصلاح کے لئے انگریزی پڑھیں، اس سلسلہ میں دو واقعے مجھے یاد آئے، ایک دفعہ تنہائی تھی تو خاکسار نے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ ومنطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے، فرمایا: یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم ومعرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علمار کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علمائے اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا، اور اب اُن سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علما، ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں، اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں،

مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دارالعلوم کے تمام طلبہ کے لئے انگریزی لازمی کیجائے اتفاق نہ تھا، چنانچہ ایک دن موقع پاکر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسہ میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انھوں نے ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمایا دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی

اب بھی دیکھو جب مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے، تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علمار کا نہیں ہی،

یہ خیالات ان کے بیسیوں مضامین اور متعدد تقریروں میں بار بار دہرائے گئے ہیں، اور عباسیہ کے زمانہ میں علوم یونانی کی اشاعت اور علم کلام کی ایجاد سے اس کی اصلاح کی مثال برابر اُن کے سامنے رہی، ایک تقریر میں وہ پوری تفصیل کے بعد فرماتے ہیں: علمار کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہئیے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں، اور اُن کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیونکہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے، تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے، جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علما، جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذاتِ خود حاصل نہ کریں، ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں، جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں، اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتون پر پڑتا ہے" (خطبات شبلی صفہ ۹)

اسی خیال کے بموجب انھوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کئے، اور الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام

اور الکلام میں اُن کو ترتیب دیا، مگران کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جدید علوم و مسائل سے اُن کی واقفیت بھی محض سُنی سُنائی ہی تھی، یا ثانوی درجہ کی تھی، اس لئے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کر سکے جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی، دوسری کمی یہ ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین و حکماے اسلام کی کتابوں سے چن کر یکجا کیا، حالانکہ ان کا اصلی سرچشمہ کتابِ الٰہی اور سنّتِ نبوی تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہِ راست سامنے رکھی جاتیں، تو منزلِ مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ نے یہ نقطۂ نظر ان کے سامنے کر دیا تھا مگر تصنیفی عمل کا وقت گذر چکا تھا، البتہ سیرتِ نبویؐ کی تکمیل کا موقع اُن کو ملتا تو ضرور وہ اسکی تلافی کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے کہ امام غزالی وغیرہ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی تراجم کو براہِ راست درس میں داخل نہیں کیا، بلکہ ان علوم کو پڑھ کر انھوں نے خود یا دوسرے مسلمانوں نے ان علوم پر اپنی اسلامی طرز پر جو کتابیں لکھیں اُن کو علماء کے درس میں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان علوم کو خود مسلمان بنایا، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا، مولانا کے سامنے بھی جیسا کہ اوپر کی تقریر میں ہے، یہی چیز تھی، مگر افسوس کہ اس پر عمل اب تک اس لئے نہ ہو سکا کہ ان علوم کو علماء اب تک حاصل نہ کر سکے، اور ان پر ان کی تصنیفات کا زمانہ تو بہ مراحل دور ہے، تاہم جو اصل نکتہ ہے، وہ یہی ہے کہ پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہئے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہئے، ورنہ بغیر اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی جو امام غزالی سے پہلے پھیلی تھی، بلکہ میں

کہتا ہوں کہ مختلف تحریکوں اور تصنیفوں کے ضمن میں وہ پھیل بھی رہی ہے،

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہوگیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جزء اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درسگاہوں میں اُن ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا، اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقابلہ میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے، اور اہلِ یورپ کے کارناموں کے سامنے اُن کو اپنے مذہبی و تمدنی و سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں، اور اس طرح اُن کا مذہب جو اُن کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لئے مردہ ہو جائے۔

اس کام کے لئے سب سے پہلے انھوں نے خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی ذاتِ پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا، اس کے بعد خلفاے راشدینؓ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلاطینِ اسلام رحمہم اللہ کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لئے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی، اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور

کالجوں میں زیرِ درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے، تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے، اس طرح مسلمانوں کو طرح طرح کے علمی وسیاسی فریبوں سے خود اسلام سے برگشتہ کردیا

چونکہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر، تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اس لئے اُن کے تاریک پہلوؤں کو دکھائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بنا پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو برا کہنا اور برا دکھانا ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہوگیا تھا،

ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے، جو اُس زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے، ان کے بعد صوبہ یوپی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے، اور لوگ اسی طرح آتے رہے، انگلستان میں بھی یہ کام عمدگی سے انجام پا رہا تھا، اور انگلستان کے سوا فرانس اور جرمنی میں جن کو مشرق کی شہنشاہی کا دعویٰ تھا، یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا، ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر برتھالمی سینٹ ہلیر، نولڈیکی، ولہاوسن، گولڈزیہر، رینان وغیرہ یورپ کے فضلا باری باری سے اس کام کو انجام دیتے رہے، اور سب سے آخر میں انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ صاحب اُٹھے، یہاں تک مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی انکی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جن میں سب سے زیادہ بدنام الہلال مصر کا اڈیٹر جرجی زیدان ہے، یہ لوگ مشنری نہ تھے، اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے، بلکہ اُن کا شمار یورپ کے

فضلا میں تھا، یہ اپنے اغراضِ فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھایا کرتے تھے اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے، اور اس کے لئے سچ یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش اور جستجو کرتے تھے، محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد ڈالتے تھے، اور اب بھی وہ اپنے ان کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں،

ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لئے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلیؒ ہی تھے، جنھوں نے ان ہی کے طریقے سے ان ہی کے اسلوب پر اُن کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدّن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی،

اس سلسلہ کا آغاز مولانا نے اپنی "گذشتہ تعلیم" سے کیا، جس میں دکھایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی دے کر دوسری قوموں کی زبانوں سے کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ اور دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع درسگاہوں کو قائم کرکے دنیا کی ترقی میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے، پھر آگے چل کر معلومات کے اضافہ کے بعد اس مضمون کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کردیا۔

مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز پروپگنڈا جزیہ کے نام سے جاری کیا جاتا تھا، یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت

یں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس مذہبی ٹیکس کے ادا کئے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہا نے یہی لکھا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کئے جانے کا معاوضہ ہے، جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک اُن مسلمان قوموں کا نہ تھا جن کو ہندوستان کی فرمانروائی نصیب ہوئی، مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نُصرت کا معاوضہ ہے، یعنی اسلامی ملکوں میں اُن غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، کہ وہ انکی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا، تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کریں، اسی لئے جب خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں نے اُن کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ کردئے گئے ہیں، مولانا کا یہ مضمون شائع ہوا تو لوگوں کو اُن کی اس اچھوتی تحقیق پر حیرت ہوگئی، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ مولانا کی یہ تنہا تحقیق ہی ان کے نزدیک اُن کے کارنامۂ فضیلت کے لئے کافی تھی، مولانا کا تمامتر استدلال کتب فتوح و تاریخ سے تھا اس لئے ممکن ہو کہ بعض لوگوں کو اس کے ماننے میں اب بھی تامل ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاے اسلام رحمہم اللہ گو اس بارہ میں مختلف ہیں کہ جزیہ بقاء علی الکفر یعنی غیر مسلم ہونے کا معاوضہ ہو (ہدایہ) قتل کا بدل ہے یا قتال کا (فتاوی سراجی و فتح القدیر) یا

اس بات کا کہ ان کو اسلامی ملک میں سکونت کی اجازت دی گئی ہی، (مبسوط ص ج ۱۰)

تاہم وہ ائمہ جن کی نظر جزیہ کے ساتھ اہلِ ذمہ کے شرائطِ مصالحت اور اس کے مصارف پر ہے انھوں نے صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ فوجی خدمت سے استثنا کا معاوضہ ہی،

پانچویں صدی کے فقہ حنفی کے مشہور امام سرخسی المتوفی ۴۹۰ھ مبسوط میں معترض کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر جزیہ کفر کا معاوضہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دنیا کے چند خزف ریزوں کو لے کر کفر کی بقا کو انگیز کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

ثم یاخذ المسلمون الجزیۃ منہ	پھر مسلمان ان ذمیوں سے اون کی اوس ذاتی جسمانی امداد
خلفاً عن النصرۃ التی فاتت باصرارہ	کے معاوضہ میں جس کے یہ ذمی اپنے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے
علی الکفر لان من ھو من اھل	اہل نہیں ہیں جزیہ لیتے ہیں، اسلئے کہ دار الاسلام کی مدافعت و
دار الاسلام فعلیہ القیام بنصرۃ	مدد اس کے سب رہنے والوں پر یکساں واجب تھی اور چونکہ
الدار، وابد انھم لا تصلح لھذہ	ذمی جسمانی امداد کے قابل نہیں کیونکہ وہ دل میں دشمنوں کی
النصرۃ، لانھم یمیلون الی اھل	طرف طبعاً مائل ہیں تو اگر انکو اسلامی فوج میں داخل کر لیا جائے
الدار المعادیۃ فیشوشون علینا	تو وہ دشمنوں کو مدد پہنچائینگے اسلئے ان سے جسمانی مدد کے بدلہ مالی مدد
اھل الحرب. فیوخذ منھم المال	لیجاتی ہے تاکہ وہ انکی امدادی رقم مسلمان غازیوں پر صرف کیجائے
لیصرف الی الغزاۃ الذین یقومون	جو دار الاسلام کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور اسی لئے ان ذمیون
بنصرۃ الدار، ولھذا یختلف	سے انکی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کے سبب سے ان کے جزیون
باختلاف حالہ فی الغنی والفقر،	کی رقم بھی کم و بیش رکھی گئی ہی، کیونکہ امداد کرنے والون

فانه معتبر باصل النصرة، والفقير
لوكان مسلماً كان ينصر الدار راجلاً و
وسط الحال كان ينصر الدار راكباً
والفائق فى الغنى يركب ويركب غلاماً
فما كان خلفاً عن النصرة يتفاوت
بتفاوت الحال ايضاً، (مبسوط
سرخسى جلد ١٠ ص ٨٠ مصر)

بھی اس حیثیت کی کمی بیشی کا اعتبار رکھا گیا ہے کیونکہ اگر
مسلمان نادار ہو تو وہ صرف اپنی ذات سے پیادہ لڑائی
کو تیار ہوگا اور متوسط الحال مسلمان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلیگا
اور دولتمند مسلمان خود بھی سواری پر جائیگا اور اپنے غلام کو بھی اپنے ساتھ
سوار کرکے لیجائیگا، انہی حالات کے مساوی ذمیوں سے بھی جزیہ کی قم
تبفاوت حال وصول کیجائیگی یعنی جس طبقہ کا مسلمان سپاہی غازی بنے
اور خرچ کریگا اُس طبقہ کے ذمی سے اسکے مطابق جزیہ لیا جائیگا۔

اسی اعتراض وجواب کو سید محمود آلوسی مفتی بغداد اپنی مشہور ومقبول تفسیر روح المعانی میں نقل کرکے کہتے ہیں:

وقد يجاب بانها بدل عن النصرة
للمقاتلة منا ولهذا تفاوتت لان
كل من كان من اهل دار الاسلام
يجب عليه النصرة للدار اما بالنفس
والمال وحيث ان الكافر لا يصلح
لها لميله الى دار الحرب اعتقاداً
اقيمت الجزية الماخوذة المصروفة
الى الغزاة مقامها. (جلد عاشر ص٢٠)

اور اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ یہ جزیہ ہمارے (مسلمان)
سپاہیوں کی جسمانی وذاتی امداد کا مالی معاوضہ ہے، اور
اسی سے اس کی مقدار حیثیت مالی کے مطابق گھٹتی بڑھتی
رہتی ہے کیونکہ دارالاسلام میں سب رہنے والوں پر دارالاسلام
کی امداد جان ومال سے ضروری ہے، اور اسکے بجائے غیر مسلم سے اس لئے
کہ وہ طبعاً دارالحرب والوں کی طرف اعتقاداً میلان رکھتا ہے
جزیہ (مالی معاوضہ) لیا جاتا ہے جو ان مسلمان سپاہیوں
پر خرچ کیا جاتا ہے

علماے احناف کا یہی مسلک ہے، چنانچہ ہدایہ کتاب الجزیہ اور اس کی شرح فتح القدیر میں یہ مسائل مذکور ہیں، اس باب میں مولانا کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے امام سرخسی کے نظریہ کی تائید میں مغازی و فتوح کی کتابوں سے تائیدی واقعات یکجا کر دیئے جس نے نظریہ کو فقہ کا ناقابلِ تردید مسئلہ بنا دیا، مخالفینِ اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوقِ زندگی بھی حاصل نہیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں آرمینیا کا واقعہ پیش آیا، یعنی ٹرکی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو جب بزور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحابِ قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے، اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا، اس موقع پر مولانا نے آرمینیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور "حقوق الذمیین" لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں، بلکہ اُسکی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پر پرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے،

اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں، اور اس وقت سے برابر عیسائی اہلِ قلم اس کے جواب میں مصروف ہیں اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے ایس ٹرٹین (سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی) کی کتاب "غیر مسلم رعایا مسلمان خلفا کے زیر حکومت" (The Caliphs and their non-moslem Subjects) (لندن ۱۹۳۰ء) ہے،

عیسائی یورپ نے خلفاے راشدین اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے خلاف ایک بہت بڑا الزام یہ قائم کیا تھا کہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جو دنیا

کی صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، جلا کر خاک کر دیا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام علم کا دشمن ہے، گو اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ ہر خرافات کا مجموعہ علمی خزانہ ہونے کا مستحق کہاں تک ہو سکتا ہے، تاہم مولانا شبلی آگے بڑھے اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزام مسلمانوں پر سراسر غلط ہے، بلکہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اسکو برباد کر دیا تھا، یہ تحقیق بھی بہت مقبول ہوئی، اور اس کے بعد خود یورپین محقق مصنفوں نے اس الزام کی تردید کی ہے، شام کے جرجی زیدان نے مولانا کے مضمون کا جواب لکھا تو اللہ تعالیٰ نے راقم آثم کو توفیق بخشی کہ اس کا جواب لکھے، چنانچہ وہ الندوہ میں شائع ہوا،

اسی جرجی زیدان نے قبۂ اسلام میں بیٹھ کر تمدنِ اسلامی کے نام سے متعدد جلدوں میں اسلامی عربی تمدن کی تاریخ لکھی اور اس میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بظاہر عرب خلفاء کے محاسن اور درحقیقت اُن کے معائب کا دفتر تیار کیا کہ نادان مسلمان اس کے شکرگذار ہوں، لیکن دانا دشمنوں نے اس کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس کی یہ قدردانی کی کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسلمان طالبعلموں کے سامنے اس زہر آلود خوانِ کرم کو رکھنا طے ہوا، اُس وقت ساری دنیاے اسلام اور علماے اعلام میں سے مولانا ہی کا قلم نیام سے نکلا اور مصنف کے سارے اعتراضات کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھدیا، ان کی یہ خدمت ایسی قیمتی ثابت ہوئی کہ مصر کے علماء نے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالتِ مرتبت کا اعتراف کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوں

پر عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آ گیا، اور پھر ہندوؤں میں جدوناتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے، جنھوں نے عالمگیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا ہی کا قلم تھا جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیئے، یہ اب تک اس باب میں بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو پوری آب و تاب سے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے جمع کیا، اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتبخانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہانگیری وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے اور ایک حد تک سچ بھی ہے کہ یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام تر نمایندے نہ تھے، اس لئے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام نے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو گی،

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کا انتخاب کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تلاش و محنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انھوں نے دنیا

کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہو تو پیش کرے،

آجکل کی سیاسی واقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی واقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ اُن کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے ؛ الفاروق سے ! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ اُن کی دوربین نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کر لیا تھا

الفاروق کی نسبت یہ کہنا صحیح ہے، کہ اس میں حضرتِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمداللہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے صرف اُس گوشہ کو اُجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اور جس کی ضرورت اُن کے عہد میں بہت شدید تھی، چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا، اسی طرح اُس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جزوی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے، والعصمۃ للہ وحدہٗ،

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرداز یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس وسعتِ نظر، جستجو، اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں، مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، جن کی مدح وستایش کا اعتراف خود یورپ کے

مستشرقین نے علی الاعلان کیا، اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست و بازو نے اس کو علی حالہٖ بلند رکھا اور اس کے لئے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں،

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کرسکیں، اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انھوں نے وفات پائی ہے، اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے، جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی چنانچہ ۲۵ر اپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹکل لکھا اور بڑے دعوی سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لئے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا، اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا،

اُس زمانہ میں علما جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی میں یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڈھ سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے صرف ایک رسالہ "قرأت فاتحہ خلف الامام" کے رد میں اُردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علمائے کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کردیں اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولنا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی و حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی و حضرت مولنا

اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اُردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی، اور اُس زبان کو جس کی نسبت بطور معذرت سیّدالنعمان میں یوں فرماتے ہیں، ع حرف بہ اُردو زدن آئین نہ بود"، اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علماے زمانہ کے لئے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا، اور بیشمار کتابیں اُن کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھکر یہ کہ ہیں میں بعض علماے اعلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت وافادت اور مضامین کی بلندی وندرت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، مگر بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت، علمی وفنّی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرزِ بیان کے تتبع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لئے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ واستعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ اُن کی کتابیں ادب وانشا کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں، اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا، اور اب تو وہ علمی ومذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے،

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجئے، اُس وقت تک حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے، وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے تصوف وفقہ کے اختلافی مسائل کی تحقیق یا فرقِ باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع تر کردیا، تاریخی، فقہی، تمدّنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوعِ سخن میں وہ گلباری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پُر بہار ہوگئی، اور

اب اس کی تقلید میں علماء کی تحریریں اور تالیفیں بحمداللہ کہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں،

اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا اور اُس وقت کا علم کلام گویا یہی طرزِ سخنوری تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لئے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی ساری ہی عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گذر گئی، اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے حنفی اور اہلِ حدیث، سنّی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائی، مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی تالیفات پر نظر ڈالئے، بقول اُنھی کے

گرچہ سرو برگ سخن دیگر است   شمع ہمان است ولکن دیگر است

انھوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل کے لئے زمانہ کے مطابق ایک اور دلنشین شکل پیدا کر دی، اُن کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہلِ حدیث کا مناظرہ نہیں؟ اُن کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ و سنّی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی و تاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل و قال کا طریق حریفانہ تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن و طنز، سوء تعبیر اور ناسزا سب و شتم سے اتنا بدنما ہوگیا تھا کہ اس نے تاثیر و تاثر اور قبولِ حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر سے کھو دی تھی حالانکہ احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل ہمیشہ سے اہلِ حق کا شیوہ رہا ہے، اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لئے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں بلکہ

جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رد الزام اور رد جواب کے بجائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دلنشین، دلچسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت، طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں اور اُن سے بڑا فیض پہنچا۔ اور علما نے بھی اس پرواز پر کتابیں لکھنی شروع کر دیں، جو مفید حال ہیں،

مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھاگئی تھی کہ اُن کی نظر درسی کتابوں اور اُن کے شروح وحواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا کسی اور علم وفن کی کتاب سے استفادہ قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا انھوں نے ہر علم وفن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتبخانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا، اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیئے، نصاب تعلیم میں اُن میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علما کو اُنکے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، ندوہ کے ایک اجلاس میں علما کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ تو مسلمانوں

کے علوم و فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جانفشانیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علما جو ان علوم کے اصل وارث تھے ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائیکہ ان کی تلاش و تصحیح و مطالعہ و اشاعت کی زحمت اٹھائیں، مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علما میں ناکام نہیں رہی۔

ان ہی دو غرضوں کے لئے دار المصنفین کا خاکہ اُن کے دماغ میں آیا تھا، جو اُن کی زندگی کا اخیر کارنامہ تھا، ان کو جب کوئی نئی قلمی کتاب ہاتھ آتی یا کوئی نادر کتاب چھپکر آتی تو ان کی سرخوشی کا عجیب عالم ہوتا تھا، قلمی کتابوں کو ہر قیمت پر خریدنے کو تیار ہوجاتے تھے، اگر ہاتھ خالی ہوتا تو حیدر آباد وغیرہ سرکاری کتب خانوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیتے، جن میں سب سے پہلا نمبر ان کے حبیب مکرم مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا تھا اور اس کی خبر دوستوں کو اور عزیز شاگردوں کو دیتے تھے، چنانچہ مکاتیب کے اوراق ان بشارتوں اور خوشخبریوں سے معمور ہیں،

مولانا خود بھی اس علمی تبلیغ کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھتے تھے، چنانچہ وفات سے ڈیڑھ سال پہلے اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبد الباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:-

بھائی میں تو اب چراغِ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، المرء اعرف بنفسہ، لیکن صحیح علمی مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا

اگر اسمیں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معائب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں " (۵)

مولانا کو اپنی اس علمی دعوت و تبلیغ اور ادبی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے، اُن کی یہ کامیابی صرف ان کے حلقۂ تلمذ تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے حلقوں کے علما اور تعلیم یافتہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور برابر متاثر ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کے طریقۂ تحریر، اسلوبِ تحقیق اور طرز تنقید کی تقلید سے اب کوئی حلقہ خالی نہیں رہا،۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علما میں باہم ایسا رشتۂ اتحاد ہو، اور بحیثیت ایک جماعت کے اُن کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان ان کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو، اور حکومتِ وقت اُس وقت ان کے سامنے سر جھکا دے گی چنانچہ وہ اپنی اس تقریر میں جو علما کے فرائض پر ندوہ کے ایک اجلاس میں کی تھی، فرماتے ہیں:۔

" غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما، کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما، کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیونکہ علما جب تک قوم کے اخلاق قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصّوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہوسکتی..... اسوقت ندوہ دعوی کر سکتا ہے کہ اوقاف کے

لاکھوں روپیے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں،
ندوہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں، اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے،
ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اس
وقت ابتری کی حالت میں ہے، اس کی اصلاح کر دی جائے، اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ
پر بہت کچھ لحاظ ہوگا،

ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں عدالت صدر میں فقہی مسائل کے
لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ سرنو سے قائم کیا جائے،

ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعت اسلام اس کی ہدایتوں
کی پابند ہو، اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے، اس کے فیصلوں سے سرتابی
نہ کر سکے، اس صورت میں ندوہ تمام قوم کو بیہودہ مراسم سے خلاف شرع باتوں سے
ناجائز امور سے بزور روک سکتا، اور جماعت اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ
کا بزور پابند کر سکتا ہے، یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اتباع سنت کا اور اتفاق
باہمی کا ہوگا" (خطبات شبلی ص ۳۳ و ۳۴)

مولانا کی نگاہ میں علمار کے فرائض کتنے وسیع تھے، وہ خود اس وسعت پر عامل اور
دوسروں کو بھی اسی وسعت خدمت کی طرف دعوت دے رہے تھے، علمار میں وہ پہلے
شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم
سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے، مسلم لیگ کے زاویۂ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین

اور بیسیوں نظمیں لکھیں، احرار اسلام کی رہنمائی کی اور اُن کی بے راہ روی پر اُن کو ٹوکتے بھی رہے، ہندوستان میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعیِ اوّل تھے، اوقافِ اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیلِ جمعہ، اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومتِ وقت کے سامنے پیش کرکے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر اُن کا یہ بڑا احسان ہے، اس روشنی میں دیکھئے کہ اب آجکل جو حضرات علماء میں سیاسی گرمی ہے، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے، اور ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کے لئے جو دوربینی ہے اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہرحال سیاسی مسائل سے جو وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے،

مولانا نے علماء کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور حالات کی پرورش کی، اور اُن کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی اس کا یہ مختصر خاکہ ہے، ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لئے تدریج کی ضرورت تھی، اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک دوست کو لکھتے ہیں

"سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے.....غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علماء برسوں بلکہ قرنوں کے لئے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو اُن سے کٹ کر الگ ہوجانا منظور نہیں، بلکہ ع

میں تو ڈوبا ہوں ولے یار کو بھی لے ڈوبوں گا" (مہدی - ۱۳۰)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی ان احتیاطوں کے باوجود علماء اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور عجب نہیں کہ

انھوں نے اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس کی ہوگی، ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علما، اور ائمہ گذرے ہیں جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علما سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے اور لوگ اُن کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات اُن کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لئے وہ مقبول تھے اور یہاں یہ کیفیت نہیں، اس کے بعد وہ دور آیا جب ان کا خیال ادھر رجوع ہوا کہ اختلافِ خیال کے باوجود وہ علما میں کھپ سکتے ہیں، اور ان کی تصنیفات کے اختلافی حصّہ سے قطع نظر کرکے ان کے کارآمد حصّوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے،

چنانچہ دس برس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں ایک صاحب نے اُس زمانہ میں جب بعض علما نے سرکار بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ سیرت کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو ازراہِ ہمدردی لکھا تھا کہ سیرت کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو، مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"آجکل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں، لیکن ان ہی دینداروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دینداری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا،

یقین فرمائیے زمانہ کی خر بازاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہوگیا ہے، مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں، کیا سچائی پر مبنی ہے، صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا،

قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسا نہیں، بلکہ وہی منقط قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، موجودہ عمارتِ کعبہ بھی حجاج کی ہے،

بلاغت کا بڑا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، جاحظ عبد القاہر جرجانی سکاکی کا بنایا ہوا ہے، یہ سب معتزلی تھے، کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین پڑھتے تھے، حالانکہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے،

قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسا ہوتا ہے کہ وہ خذ ما صفا کرے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں،

ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں، اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں، تاہم چونکہ مخلص ہیں، اس لئے شور و شر نہیں مچاتے، کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں، (عبد الحکیم - ۲)

لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۹ رمئی ۱۹۱۴ء کو جب منازعاتِ ندوہ کے سلسلہ میں دہلی کے بعض علماء نے علم الکلام اور الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر جب ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا:-

"میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائلِ فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں" (دیکھئے زیرِ عنوان عقائد و خیالات ص ۴۲۳)

اس اعلان کے ۶ ماہ بعد مولانا نے وفات پائی،

یہاں پر ایک بات نوکِ زبان پر آئی جاتی ہے، مسلمانوں کو شکوک و شبہات اور الحاد و بیدینی سے بچانے کے لئے جو تدبیر ہمارے حکمائے متکلمین نے اختیار کی، وہ بھی گو اپنی جگہ پر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علومِ زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین و اذعان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہو سکتا ہے کہ بیماری کے کچھ عوارض زائل ہو جائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور جس زمانہ میں ہوا، روم و مصر و شام و ایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الٰہیات کے یہ شکوک و شبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوتِ ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک و شبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، تعلیم یافتگانِ نبوت جہاں پہنچے، سیدھی، سادی اور بے کج و پیچ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی اور اُسوۂ رسول جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ہاتھ میں تھے

جن کو لے کر وہ آگے بڑھتے گئے، اور تاریکی کا پردہ چاک ہوتا گیا، صحابہ کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا، ان کے زمانہ میں ہذیل، اعلاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین و اخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی، یہی صورتِ حال اس دور کے بعد بھی رہی شیخ الرئیس بو علی سینا اور حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابوسعید کا حکیم مشرق بو علی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے "آنچہ تو می گوئی من می دانم وآنچہ تو می دانی من می بینم" دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے صرف اپنے ملک کو دیکھئے، یہاں خیالی اور شرحِ مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا، اور چشت و سہرورد کے خانوادوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا، بات یہ ہے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے، لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں،

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بیکار و ہیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہے، ملتِ اسلامیہ ایک عالمگیر سلطنت ہے، اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امراء اور وزراء تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف عہدوں اور درجوں کے کام کے لائق بنائے گئے ہیں، وزراء ہیں جو سلطنت اور فرمانروائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امراء ہیں جو

رموز سلطنت کے شیر اور کارپرداز ہیں، سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں معروف ہیں، اور اُن میں سے ہر ایک کی خدمت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت وبقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزراء اور امراء یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام و حفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لئے وہی سب کچھ ہیں، وزراء اور امراء کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیرخواہ نہیں، کہ وہ نہوں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی سلطنت کے مصالح و حکم کے واقف کار اور سلطنت کی پالیسی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع و ضرر کے نگراں وزراء اور امراء ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض اور اسی کے مصالح و حکم کی رعایت ان پر واجب ہے جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے، متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں کی ہے[1]، جو دین کو معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے علم و فن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں، اور حضرات محدثین و فقہا و صوفیۂ صافی کی مثال سلطنت کے وزراء و امراء کی ہے جن کے ہاتھ میں حکومت کی پالیسی، سلطنت کے مصالح و حکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام کی طاقت ہوتی ہے، فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے

---

[1] امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہے اور ان کو حارس دین من تخیلات المبتدعہ کا خطاب دیا ہے، اور حج کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہ دی ہے، (باب العلم الذی ہو فرض کفایہ)

مفوضہ حصہ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے، مگر سلطنت کی پالیسی اور رموزِ مملکت اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ یہ کہیں کہ ملت کے کلی مصالح وحِکَم کے وہ نگراں ہیں تو وہ غلطی کریں گے، اور اگر اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء یہ سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بیکار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں،

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے اس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنی مفروضات تھے جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کو خاموش کرنے کے لئے انھوں نے کھڑے کر لیے تھے، اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء کو چاہئے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر اس وقت تک اُن کو ملت کا باغی وطاغی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگیں کہ ان مدافعی مناظروں میں ان کی زبان وقلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عین اسلام ہے، اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ سرحدی حفاظت کے بجائے جو اُن کا فریضہ ہے مرکزی سلطنت کے اساس وانتظام مملکت کے رموز واسرار وقواعد واحکام میں مداخلت ہے، جس کا دوسرا نام طوائف الملوکی یا بغاوت ہے، اسی لئے یہ بات بطور اصول کے مان لی گئی ہے کہ "لازم مذہب نہیں" یعنی متکلمین کے آراء ونظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں، وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا،

گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمینِ حق اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہو کہ وہ اخیر عمر میں جب جنگجویانہ قوی میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت سے اُن کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہینِ عقلی کے بجائے وحی الٰہی اور تعلیم نبویؐ کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں۔ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۞ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابو الحسن اشعری نے چالیس برس کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولِ حق کا اعلان کیا، کہتے ہیں کہ جب امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر دھری تھی، اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ان کی اخیر زندگی کا مشغلۂ حیات تھی، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ملا علی قاری[1] نے متعدد حکما اور متکلموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہی کے اعتراف اور وحی نبویؐ کے عقیدہ کے اقرار پر ہوا، مرتے وقت امام جوینی کی زبان پر یہ تھا "میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" یا یہ کہا کہ "اب میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی شہرستانی اور خسروشاہی وغیرہ متکلمین سے منقول ہیں،

---

[1] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ہند ص۶، عقیدۂ حمویہ کبریٰ رسائل ابن تیمیہ مصر ص۱۷۷، اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند و صواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص۹،

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اپنے ذاتی تحقیق و تجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی الغزالی میں اس کو نقل کیا ہے[1]، جو بلفظہٖ یہاں درج ہے،

اکثر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس (علم کلام) سے حقائق کھل جاتے ہیں اور ان کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشف حقیقت کے بجائے خبط اور گمراہی زیادہ بڑھتی ہے اور یہ بات اگر کوئی محدث (محض) یا ظاہر پرست کہتا تو تم کو خیال ہوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہو جاتا ہے لیکن یہ بات وہ شخص (یعنی خود امام صاحب) کہتا ہے جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ متکلمین اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ہی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے، واقفیت پیدا کی، یہ سب کرکے وہ **علم کلام سے بیزار ہو گیا**،

امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے:

میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور و خوض کر لیا تو میں نے دیکھ لیا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب، اور میں نے پایا کہ منزلِ مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا

---

[1] الغزالی ص۱۴۳ مولانا نے اس کے لئے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ بیان درحقیقت احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں ہے،

راستہ ہے اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہو گیا، اس کو بھی معلوم ہو گا۔[۱]

حافظ ابن قیم نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کئے ہیں،

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا ہے،

نهاية اقدام العقول عقال — وغاية سعي العالمين ضلال

عقلوں کے قدم کی انتہا ناکشودگرہ ہے — اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد گمراہی ہے

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا — سوى ان جمعنا فيه قيل وقال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کر لیا،

واعلم ان بعد التوغل في هذه المضائق والتعمق في الاستكشاف عن اسرار هذه الحقائق رأيت الاصوب الاصلح في هذا الباب طريقة القرآن العظيم والفرقان الكريم وهو ترك التعمق والاستدلال باقسام اجسام السموات والارضين على وجود رب العالمين ثم المبالغة في التعظيم من غير خوض في التفاصيل،

اور جان لو کہ ان تنگ راہوں میں گھسنے اور ان حقائق کے اسرار دریافت کرنے کے لئے غور و فکر کے بعد مجھے اس باب میں صحیح و مناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا، اور وہ عقلی کرید کو چھوڑ دینا اور آسمان و زمین کے عجائبات سے اللہ کو وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر،

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ ممتد رہا، ۲ محرم ۶۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہ نقل کیا ہے، اس

---

[۱] شرح حدیث النزول ابن تیمیہ ص ۱۰۵ امرتسر [۲] اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۱۲۰ امرتسر،

ہیں موصوف نے اپنی عمر بھر کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہے،

ولقد اختبرتُ الطرق الکلامیۃ	مین نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقون کو آزما لیا
والمناھج الفلسفیۃ فما رأیت	تو مین نے اُن کا فائدہ اوس فائدہ کے برابر
فائدۃ تساوی الفائدۃ التی	نہین پایا، جس کو مین نے قرآن عظیم مین پایا'
وجدتھا فی القرآن العظیم،	

(طبقات الاطبا' ابن ابی اصیبعہ ج۲ ص۲۷)

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ" میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا امیدوار ہوکر مر رہا ہوں "

اس وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انھون نے وفات پائی

غرض یہ احوال جس طرح دوسروں کو پیش آئے، اس حیات نامہ کے ہیرو کو بھی پیش آئے اور آخر اس کو یہ کہنا پڑا،

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

سنہ ۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ پر حاضری کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہوگئی تھی ان کے پاس نہ اب ابن رشد وغزالی ورازی وبوعلی سینا کا گذر ہے' نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب وروز ہیں اور کتبِ احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیماتِ نبوی کی ترتیب، اخلاقِ نبویؐ کی تحریر، سوانحِ نبویؐ کی تلاش اور سیرتِ نبویؐ کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے کھری چارپائی ہو یا

چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا، اور ان ہی درباریوں کی ہم نشینی میں اُن کا سارا وقت گذر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور "دربار رسالت کا آستانہ" (مکاتیب اوّل عبدالحکیم ۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھا رہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط و کتابت تھی، اس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط و مکاتیب کو پڑھ ڈالئے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت و حفاظت اور سیرتِ نبویؐ یہاں تک کہ دم نزع بھی اخیر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ **سیرت** ہے،

سیرت کی حیثیت اُن کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے"۔ (مقدمۂ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا اور اسی کو وہ سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ (مکاتیب اوّل حصۂ اضافہ ۲)

کیا ان کے اس کام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے نہیں کیا جا سکتا کہ ادھر اُن کے قلم نے سیرت کی تصنیف کا اعلان کیا اور اُدھر مسلمانوں کی زبانوں سے بیک دفعہ لبیک کی صدا بلند ہوئی اور امداد کی نذر دے کر خود ایک والیۂ ملک آگے بڑھی اور اب جدھر سنو سیرت سیرت کا لفظ ہر مسلمان کی زبان پر تھا، پھر اس کی دوہری مقبولیت کا نشان دیکھئے وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیبِ الٰہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرتِ پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی، اس کوشش میں مقدس علما بھی شریک ہو گئے، نئے تعلیم یافتہ اہلِ قلم بھی، گم کردہ راہ مدعیِ اسلام فرقے بھی، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی"

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابرِ کرم سے محروم نہ رہی، ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کے چھینٹوں نے اُس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، بحرِ ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اس کی فوج ظفر موج سے معمور ہوگئی، تیسری صدی کا خاتمہ تھا، کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی، اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا، اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نامور ہوا جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لیکر بحرِ ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا،

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پُرشور کر دیا، اور غزنی سے لیکر پنجاب تک یک تخت اسلام کی حکومت قائم کر دی، چھٹی صدی میں غوری آئے تو انھوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرنگیں کر دیا، وہ دن ہوا اور

آج کا دن ہی کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہی جس میں نو کرور توحید کے حلقہ بگوش اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں،

خلجی اور تغلق عہد کے علماے خراسان

جس طرح ہندوستان کو خراسان و ماوراء النہر و عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا اُسی طرح اس کے دل و دماغ کو انہی ملکوں کے اربابِ کمال نے اپنا جگذار بنایا، قطار در قطار علما بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے، اُس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا، ملتان اور سندھ کے بعد اُن کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوتی، سلطان شمسُ الدین التمش نے جب سنہ ۶۰۷ھ میں دلی کو اسلام کا دار السلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علما سمٹ سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے،

غیاث الدین بلبن (سنہ ۶۶۴ تا سنہ ۶۸۵ھ) کے زمانہ میں شمسُ الدین خوارزمی، شمس الدین توشجی، برہانُ الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمالُ الدین زاہد وغیرہ بیسیوں اربابِ کمال تھے، جن کے علم و فضل کی رونق سے دلی بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی،

علاء الدین خلجی (سنہ ۶۹۶ تا سنہ ۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین یحیٰی، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیالیس علما دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیا برنی جیسے مورخ کا بیان ہی کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے،

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبد المقتدر شریحی کندی دہلوی، مولنا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال تھے، جن کے دامن تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جون پوری پرورش پاکر ملک العلما بن کے نکلے[1]،

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم

اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علماء کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ، بخارا، کاشان، و(ترکستان) رے اور دمشق کے علماء کے نام تھے تو اب ملتان، بھکر، ہانسی، دلی، تھانیسر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے جاتے ہیں، ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے، بھکر سندھ میں ہے، ہانسی پنجاب کے جنوب ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے،

مورخ ضیاء برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ-۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علماء کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں، وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں: "و در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علماے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشد، و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لفظ و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے می شگافتند و ہر سالے چندیں طالبان علم از آں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند، و مستحق جواب دادن فتوی می شدند، و بعضے از آں استاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند، چنانچہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرباہی و مولنا نصیر الدین غنی، و مولنا تاج الدین مقدم

---

[1] مضمون "اسلامی نصاب درس" مولنا سید عبد الحئی مرحوم الندوہ فروری ۱۹۰۹ء۔

و مولانا ظہیرالدین لنگ و قاضی مغیث الدین بیانہ و مولانا رکن الدین سنامی و مولانا تاج الدین کلاہی
و مولانا ظہیرالدین بھکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کولی و مولانا وجیہ الدین پائلی و
مولانا منہاج الدین قاینی و مولانا نظام الدین کلاہی و مولانا نصیرالدین کڑہ و مولانا نصیرالدین صابونی
و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا کریم الدین جوہری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمیدالدین مخلص و مولانا
برہان الدین بھکری و مولانا افتخار الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ و مولانا وحیدالدین ملهو و مولانا علاء الدین
کرک و مولانا حسام الدین ابن شادی و مولانا حمیدالدین بنیانی و مولانا شہاب الدین ملتانی و مولانا
فخرالدین ہانسوی و مولانا فخرالدین سناقلی و مولانا صلاح الدین سترکی و قاضی زین الدین ناقلہ و مولانا
وجیہ الدین رازی و مولانا علاء الدین صدرالشریعۃ و مولانا میران ماریکلہ و مولانا نجیب الدین ساری و
مولانا شمس الدین تم و مولانا صدرالدین گندبک و مولانا علاء الدین لوہوری و مولانا شمس الدین یحیی
و قاضی شمس الدین گازرونی و مولانا صدرالدین تادی و مولانا معین الدین لونی و مولانا افتخار الدین
رازی و مولانا معز الدین اندہیی و مولانا نجم الدین انتشار و چہل و شش استاذ مذکور کہ من القاب اسامی
ایشاں نوشتہ ام آنانند کہ من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ ، و بیشترے را در مسند افادت
و در محافل و مجالس دیدہ ، و بسیاراں از شاگردان مولائی شرف الدین بوشنجی و استادان یکدگر کہ من
القاب ایشاں نیاوردہ ام در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند و دوایم سبق می گفتند ، در آخر عہد علائی
مولانا علم الدین نبیرۂ شیخ بہاء الدین زکریا[1] کہ جہانِ علم و عالمِ دانش بود در دہلی رسیدہ ، و اگر من خواہم کہ در این
تاریخ جملہ استادان و متعلمانے کہ در محلِ استاذی رسیدہ بودند ذکر کنم بہ تطویل انجامد و از غرض باز مانم و فسوس
ہزار افسوس کہ قدر و قیمتِ بزرگی و فضل آں استادان سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد

[1] ملتانی ،

حقوقِ ایشان نہ گذاردہ، ونہ معاصرانِ عہد دانستند کہ خاکِ قدم آنچناں استادان را درچشمِ جہاں بیں خود کشند، ونہ من کہ مؤلف ام دراں ایام خبرے از جلال وکمالِ ایشاں ادراک کردم، وامروز کہ قرنی بیشتر گذشتہ کہ آں عدیم المثالاں بہ جوارِ رحمتِ رب العالمین پیوستہ اند وبہ درگاہِ قربِ حضرتِ بے نیازی ترقی کردہ وبعد از ایشاں نہ ہمچو ایشاں ونہ ہزاروم بجزذاتِ ایشاں مرا نہ دیگرے را نظر آمدہ، بعضے کہ قدرِ قیمتِ ایشاں دریافتہ ام کہ اگر در کمالاتِ علوم وتفنن ہر یکے مجلدے بہ نویسم مقتصر باشم۔ ودراں ایام کہ استاداں کہ ہر یکے ابو یوسف قاضی ومحمد شیبانی عہد وعصرِ خویش بودند بر صدرِ حیات افادت می کردند اگر مفتیٔ طمطراقِ استاذی بر سر کردہ از خراسان وماوراء النہر وخوارزم ویا از شہرے دیگر در دہلی برسیدی و کمالاتِ علومِ بزرگانِ مذکور را مشاہدہ کردی سبق در بستہ گرفتے و بہ تلمذِ پیشِ ایشاں بہ زانوے ادب در آمدی، واگر در حیاتِ آں استاداں تصنیفی جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا وسمرقند وخوارزم وعراق بہ شہر آوردندی کہ اگر استادانِ شہرِ ما آں تصنیف را استحسان واعتبار نہ کردندی ... ماندے، ومقصود از ذکرِ ایشاں در تاریخِ علائی آں است کہ چہ عصرے وعہدے بود کہ دراں عہد وعصر چندیں متفننانِ نفائسِ علوم بر صدرِ حیات در افادتِ علوم مشغول باشد وچگونہ آں عصر مستثنائے عصرے وآں شہر مستثنائے شہرہائے ربعِ مسکون نہ باشد۔" (فیروز شاہی برنی ص ... کلکتہ)

علم کا قافلہ پورب کو ان بزرگوں کی نسبتِ وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان، قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نامور تھے، تو ان کے پہلو بہ پہلو ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام (پٹیالہ) بیانہ (ریاست بھرت پور) ہانسی (پنجاب) دلی، اندرپت (دہلی کے پاس) کڑہ (الٰہ آباد کے پاس) کول (علی گڈھ) پائل، سترکھ (بارہ بنکی اودھ)

کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں، یعنی علم کا قدم اب پچھم سے بڑھ کر پورب کی طرف اُٹھ رہا ہے، ان بزرگوں کی عظمت و جلالت یہ تھی کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی و رازی کا ہمسر بتاتا ہے، جن کی توثیق و سند سے بخارا و سمرقند و خوارزم اور عراق کے اماموں کی تصنیفیں عتبار اور مرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں | غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا، علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی، اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل **بدایوں** معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاحِ معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملا دیا، اس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (اُستادِ نظام الاولیا) قاضی جمال بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں، خواجہ نخشبی بدایونی وہ ہیں جنھوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطے اُڑائے ہیں، تصوف میں اُن کی دو کتابیں "سلک السلوک" اور "کلیات و جزئیات" ہمارے کتبخانہ میں ہیں،

کڑہ | بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑہ اب بھی ایک قصبہ ہے، مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا، سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بدندان ہے، اسی شہر میں دریا کنارے گذرا تھا، عہد علائی میں مولانا نصیر الدین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور ان کے بعد مولانا مطہر کڑہ کا نام آتا ہے، جن کے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڑہ کو ہاتھ آئے ہیں، یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے مرید تھے[1]

اودھ | بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ ہے جس کو اودھ کہتے ہیں، یہ اصل میں اُس شہر کا نام تھا

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۰۰

جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے اور اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا، اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا،

دلی جس زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے نور سے جگمگا رہی تھی، اس کی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں، اس مطلع خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا اس کا نام شمس الدین یحیٰی الاودی ہے یہ اودھ کے تھے، اسی لئے اودھی کہلاتے ہیں، اسی زمانہ میں اس تیرہ و تاردیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی، اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے،

ان سے پہلے مولنا فریدالدین کا نام آتا ہے جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولنا فریدالدین اودھی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحیٰی اودھی ہیں، اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ہیں، اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا،

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے، لکھتے ہیں: "مولنا علاء الدین نیلی کہ خلیفہ سلطان المشائخ بود...... در کشف غوامض کشاف و مفتاح مثل نہ داشت و در مجلس مولنا فریدالدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود، قاری کشاف خدمت مولنا علاء الدین (نیلی اودھی) بود، و خدمت مولانا شمس الدین یحیٰی و علمائے اودھ سامع بودند" (ص ۲۴۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درسگاہ میں اودھ کے علماء کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا، جنہیں سے تین نے خاص امتیاز پایا،

۱- شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی، المتوفی ۷۴۷ھ

۲- نصیر الدین محمود چراغ دہلی اودھی المتوفی ۷۵۷ھ

۳- شیخ علاء الدین نیلی اودھی، المتوفی ۷۶۲ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کی پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے خلفاء میں اودھ کے قصبہ گوپامئو (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے، اودھ کے علماء جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگتے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوتا کہ راستہ میں اُن سے ملتے جائیں سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے "یارانِ اودھ چنانکہ مولانا شمس الدین یحییٰ و شیخ نصیر الدین محمود و مولانا علاء الدین نیلی و عزیزان دیگر چوں از خدمتِ سلطان المشائخ بازمی گشتند فرمان می شد چوں در گوپامئو برسید خواجہ مبارک را بہ بینید" (ص ۳۱) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار گوپامئو (ہردوئی) کے ادھر کے کسی مقام کے رہنے والے تھے اودھ سے اصل مقصود تو اجودھیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا، ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (ص ۱۹) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں، جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۵۰ھ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے، جس کو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر اشرف سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ کی خوابگاہ بننے کی عزت حاصل ہے،

قنوج اور کڑا دلی اور ممالکِ پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا، اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کڑہ (الہ آباد) تھی، ممالکِ پورب کے دونوں بازوؤں پر یہ دو شہر آباد تھے، ان

دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی، قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہت اور پورنیہ ہو کر بنگال، اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کڑہ سے پار ہو کر جونپور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھکر بنگال، یہی دونوں راستے آج بھی ہیں، ایک پر ای، آئی ریلوے ہے، اور دوسری پر بی، این، ڈبلو، ریلوے۔[1]

ظفرآباد اور جونپور | سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور مشرقی حصوں میں اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا، اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خاں، اور دوسرے کا فخر الدین جونا تھا، پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفرآباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ) نے جونپور آباد کیا،[2] یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی، کیونکہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جونپور میں قیام کیا تھا۔[3]

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جونپور و ظفرآباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی، ۷۹۶ھ میں[4] خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پا کر جونپور کو اپنا مرکز بنایا، اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملیگا، "درعرصۂ جون پور رفت، و آہستگی اقطاع قنوج وکڑہ (الٰہ آباد) اودھ وسندیہ (سندیلہ؟) و دل مئو و بہرائچ و بہار و ترہت را در قبض و تصرف خود آورد"[5] (کلکتہ ص۱۵۷)

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج، بہرائچ اور الٰہ آباد سے لیکر بہار اور ترہت (مظفرپور، دربھنگہ وغیرہ) تک ملک پورب کی وسعت تھی، آٹھویں صدی کے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں: بدر الدین اودھی، تاج الدین کڑہ، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال سترکھ (بارہ بنکی)

---

[1] خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنوتی) کی منزلیں تاریخوں میں پڑھو۔ [2] آئین اکبری جلد ۲ ص ۱۶۸ نولکشور [3] مبارک شاہی ص ۱۲۹ کلکتہ [4] فرشتہ میں ۷۹۶ھ ہے۔

آباد ہوا، اسی طرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلّی کو غارت کیا تو ارباب فضل و کمال نے پورب کا رُخ کیا، اس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار شرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی، اور جونپور آکر رختِ اقامت ڈالا، بادشاہِ وقت نے بیش از بیش قدردانی کی،

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا، ان کے تین لڑکے ہوئے صفی الدین، فخر الدین، اور رضی الدین، تینوں نے اپنے نانا کے درس و کمال سے فیض پایا، شیخ صفی الدین نے درس و افادہ کا بازار گرم کیا، عربی صرف و نحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی ان ہی کی تصنیف ہے، شیخ صفی الدین اسی زمانہ میں ردولی جا کر سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی سے جو ان دنوں وہاں مقیم تھے مرید ہوئے، شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہوئے، ان بھائیوں کی اولادوں نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی، جن کے سلسلہ میں اب تک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے، شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی، شیخ صفی کے ایک بیٹے ابو المکارم اسمٰعیل المتوفی ۸۶۰ھ تھے یہی ہیں جن کے لئے صفی نے دستور المبتدی لکھی، اور انہی کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں،

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا، اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پا کر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد کے پاس جسکا نام مسجد اٹالہ ہے دفن ہوئے، یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلّی سے لائے تھے، دلّی میں انھوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی

قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہی تحصیل علم کی، جونپور کی مسند پر جب آکر وہ بیٹھے تو ان کے فیض کمال سے مشرق کی ساری سرزمین لہلہا اٹھی، کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں یہ فیض جاری ہوا،

اودھ — صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا، اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا، جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا، حضرت شاہ ابو العباس المتوفی ۸۳۰ھ اور شیخ بہاء الدین اکبر المتوفی ۸۸۷ھ اور شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۹۹۵ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دار السلطنت بنایا، ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا، مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی،

لکھنؤ — لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا، چونکہ قنوج اور جونپور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی، اس لئے رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھنے لگی، تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملہ کے بعد ۸۰۲ھ میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا، اور ظفر خاں نے گجرات میں، خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج و اودھ و کڑہ اور جونپور میں، اور خضر خاں نے لاہور و دیپالپور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں، تو ملو اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیئے، اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے "ملو اقبال خاں بہ قنوج رفتہ خواست کہ بہ جونپور و لکھنؤ در آید" (صفحہ ۱۵۹ نولکشور) اس سے معلوم ہوا کہ جونپور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی،

اسلام کی بہت سی آبادیاں اُن نفوسِ قدسیہ کی یادگار ہیں، جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان

میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے، لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے،

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانہ میں تھے، اور جنھوں نے ۷۸۵ھ میں وفات پائی ہی، اُن کے مرید و خلیفہ شیخ قوام الدین تھے، محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "مقبرۂ او در لکھنؤ است بیزار و تبرک[1] ہے"، ۸۴۰ھ میں وفات پائی، ان کے مرید و خلیفہ شیخ سارنگ تھے، جنھوں نے ۸۵۵ھ میں رحلت کی، ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ مینا ہیں جن کا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پاس) ہی، مخدوم شیخ مینا نے ۸۸۴ھ میں انتقال فرمایا،

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہی، کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی کے کنارے لکھنؤ آکر بسے تھے، تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے، اور شیخ موصوف سے ملنے کے لئے وہ لکھنؤ وارد ہوئے، اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں جو بڑے عالم ہوئے ہیں، ان کی اولاد اب تک لکھنؤ دیوہ اور انا ؟ میں آبادی[2]، شیخ اعظم پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم و فضل کا مرکز بنایا، وہ اس تحفہ کو جونپور سے لائے،

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جونپور گئے تھے، ان میں سے قاضی عبد المقتدر دہلوی کے پوتے شیخ ابو الفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر و مدرس تھے، اور قاضی شہاب الدین کے معاصر و ہم استاد تھے، ۸۵۴ھ میں وفات[3] پائی، ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان ہوئے، اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی[4]، شیخ اعظم کے تلامذہ شیخ ضیا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیرآبادی

---

[1] صفحہ ۱۶۴ [2] تاریخ علمائے ہند ص۲۳ [3] اخبار الاخیار ص۱۶۲ [4] تاریخ علمائے ہند ص۲۳،

۱۵

المتوفی سنہ ۸۸۲ھ ہیں، شیخ کا مزار خیرآباد میں اب بھی مرجع خلائق ہی،

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ سماء الدین لکھنوی کا ہی، ان کے صاحبزادہ شیخ الاسلام سعد اللہ فراز کندوری ہیں، سنہ ۸۲۹ھ میں وفات پائی، ان کے جانشین اور صاحبزادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں، اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں، ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اور ان کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں، ان کے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنھوں نے ۸۸۱ھ میں وفات پائی، تاریخ علماے ہند کا بیان ہے "مدام بہ درس و افادۂ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسۂ وے طلبۂ مستعد رجوع می کردند"[1]، شیخ امین الدین کے صاحبزادہ شیخ حامد تھے جن کے نام مکتوبات میں متعدد خط ہیں، اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کی ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہی، "شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین ابن شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ بن زائر الحرمین الشریفین شیخ سماء الدین بن بندگی حضرت مخدوم قاضی فخر الدین بہلولی"

لکھنؤ کے پاس کسمنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہی، یہاں ایک بزرگ شیخ عبد القادر بن شیخ سلطان جو مولنا قطب الدین محدث بن مولنا خضر محدث کی اولاد سے تھے، پیدا ہوئے، انھوں نے لاہور جاکر علم کا فیض حاصل کیا، اور لکھنؤ آکر درس و افادہ کی نہر بہائی، جو چالیس برس تک جاری رہی، لکھنؤ کے اطراف میں ان کے ذریعہ بڑا علم پھیلا، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا وسط ہی، ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب کا ہے جن کی نسبت سے لکھنؤ میں اب تک گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہی، سنہ ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی، ان کا اصل وطن جونپور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیا ہو ہے، مگر عمر لکھنؤ میں گذاری اور یہیں دفن ہوے، شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ

[1] تاریخ علماے ہند ص ۱۷۵،

شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں، شیخ محمد آفاق لکھنوی دراصل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تقدیر لکھنؤ لے آئی، اور اپنے پیر کے پائینتی آسودہ ہیں،

موجودہ اعظم گڈھ اور غازیپور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڈھ کے ضلع میں ہے یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے، اُن کے صاحبزادہ شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے، میر محمد شفیع بھی شیخ عطاء اللہ کے شاگرد تھے، شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر محمد شفیع سے اور آخر میں سندِ فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کی، اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے، اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کی شاگردی پر نازاں ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا، ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کیلئے آرام کیا[1]

فرنگی محل — اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے، جو لکھنؤ کے اُفق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے، اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر ان کے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا، یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا، یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا تھا جس میں مولٰنا حالی اور دیگر نامور پیدا ہوئے، دوسرا حصہ اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا، ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں، اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے،

میر فتح اللہ شیرازی — میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لیکر ہندوستان وارد ہوئے اور ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہنچے، اکبر نے بڑی قدر کی، ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا، اور وہیں خاک میں مل گیا، ہندوستان میں متاخرین علماء ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر مذکور ہی کے ذریعہ پھیلا، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں، " تصانیف علماء متاخرین ولایت

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۱۸۷ و ۱۸۸ تا مآثر الکرام آزاد ص ۲۱۶ ۱۲

نثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان میرم ہندوستان آورد، و در حلقۂ درس اندا وجم غفیر از حاشیۂ محفلِ میر استفادہ کردند، و ازاں عہد معقولات را رواج دیگر پیدا شد۔ (صفحہ ۲۳۴)

ملا عبدالسلام لاہوری | میر فتح اللہ شیرازی کے دامنِ تربیت میں جن باکمالوں نے پرورش پائی، ان میں ایک ملا عبدالسلام لاہوری ہیں، ساٹھ برس تک درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، ۱۰۳۷ھ میں نوے سال کی عمر میں[1] وفات پائی،

ملا عبدالسلام دیوہ | اودھ میں (موجودہ بارہ بنکی کے ضلع میں) دیوہ ایک مشہور قصبہ ہے، اس سرزمین نے ملا عبدالسلام لاہوری کے ہمنام ملا عبدالسلام دیوہ کو پیدا کیا، ملا صاحب پورب میں ایک حد تک پڑھ پڑھا کر لاہور گئے اور ملا عبدالسلام لاہوری کے درس میں بیٹھے، اور نامور بن کر اٹھے، گو شاہجہاں نے فوج میں محکمۂ افتا کا منصب اُن کو دیا تھا، مگر لاہور کی آب و ہوا ان کو آخر پھر وہیں کھینچ لے گئی، اور وہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں شروع ہوا،

ملا دانیال چوراسی | ملا دیوہ کے کئی شاگرد مشہور ہوئے، پچھم میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی (الہ آباد) شیخ محب اللہ آبادی اور شیخ افضل الہ آبادی، ملا دانیال چوراسی کے شاگرد، ملا قطب الدین سہالوی تھے،

شیخ محب اللہ الہ آبادی | خیرآباد کے مشہور قصبہ کے پاس صدرپور ایک مقام ہے، وہاں ایک فاروقی خاندان آباد تھا، اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ محب اللہ پیدا ہوئے، جنھوں نے لاہور جا کر ملا عبدالسلام دیوی سے کسبِ کمال کیا اور واپس آکر الہ آباد کو اپنے فیضِ تربیت کا مرکز بنایا، ان کو ہندوستان کا

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۶

محی الدین ابن عربی کہا جائے تو بجا ہے اسی لئے ابن عربی اگر شیخ اکبر کہا جاتا ہے تو ان کو شیخ کبیر اسی خاندان کے آخری یادگار مولنا محمد حسین صاحب الہ آبادی تھے،

| قاضی گھاسی | شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگردوں میں کئی اصحاب باکمال ہوئے جنمیں سے قاضی گھاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی اور میر سید محمدی فیاض امروہوی کے نام معلوم ہیں شیخ نے ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی[1]

قاضی گھاسی الہ آبادی کے زمرۂ تلامذہ میں ملا قطب الدین سہالوی بھی داخل ہیں، ملا صاحب نے قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، اس سلسلہ سے ملا قطب الدین فرنگی محل لکھنؤ اور دائرہ شاہ محب اللہ الہ آباد کے سنگم یا مجمع البحرین ہیں،

| شیخ آصف الہ آبادی | قاضی محمد آصف الہ آبادی، ملا عبد السلام دیوہ کے ممتاز شاگرد اصل میں خیر آباد کے پاس کے گاؤں صدر پور کے رہنے والے تھے، اور الہ آباد میں قاضی تھے، ان کے شاگرد شیخ محمد افضل الہ آبادی ہوئی

| شیخ محمد افضل الہ آبادی | غازی پور کے ضلع میں سید پور شرفا کا مشہور قصبہ ہے، اس قصبہ میں وہ نامور بزرگ پیدا ہوئے جن کو دنیا شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نام سے جانتی ہے، الہ آباد کے بارہ دائروں میں ایک دائرہ اسی نقطۂ فضیلت کی کشش سے پیدا ہوا ہے، انھوں نے قاضی آصف الہ آبادی اور ملا نور الدین جونپوری سے فیض پایا، شیخ کو اپنے زمانہ میں قبول خاص و عام حاصل ہوا ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی مزار الہ آباد میں ہے،

شیخ افضل کے تلامذہ میں ایک ان کے صاحبزادہ شیخ محمد یحیٰی خوب اللہ المتوفی ۱۱۴۴ھ ہیں اور شاہ خوب اللہ کے جانشین شاہ محمد فاخر الہ آبادی المتوفی ۱۱۶۴ھ اور شیخ محمد ناصر ہیں، اس سلسلہ فیض نے پورب کے اضلاع کو سرسبز و شاداب کیا، اور ظاہر و باطن کے برکات[2] سے بھر دیا،

[1] تاریخ علمائے ہند، ص ۱۰۶
[2] میر آزاد نے مآثر الکرام جلد اول میں ان بزرگ کے حال میں اس خاندان کا تذکرہ کیا ہے ۱۲

ملا قطب الدین سہالوی ملا قطب الدین سہالوی نے جیسا کہ اوپر گذرا شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی الٰہ آبادی سے کسب فیض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر ہمارے قصبات تک دار العلم تھے، ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درسگاہ ترتیب دی، اور جوق جوق طلبہ دیار و اطراف سے آنے لگے، یہاں تک کہ زمینداری کے ایک جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور بینتی پور کے خان زادوں کے ہاتھوں سے شہادت پائی۔ ان کے مشہور تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، حافظ امان اللہ بنارسی، قاضی شہاب الدین گوپاموی، حاجی صبغۃ اللہ⁵ خیرآبادی محدث اور مولوی اسمٰعیل اورنگ آبادی وغیرہ ہیں،

ملا قطب الدین شمس آبادی ملا صاحب کے مطلع درس سے جو پہلا آفتاب چمکا، وہ سید قطب الدین شمس آبادی ہیں، سید موصوف اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے، جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد اس قطب نے امیٹھی کے بجائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا، یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں قنوج کے پاس ہے آزاد لکھتے ہیں:۔ "در شمس آباد مسند افادہ گستر و جم غفیرے را بہ افاضۂ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود" (مآثر الکرام صفحہ) شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہوگیا،

ملا محب اللہ بہاری اس "جم غفیر" میں جو ملا شمس آبادی کی دانش گاہ سے مرتبۂ کمال کو پہنچے ایک نامور بینتھ پور سے آکر شامل ہوئے، یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑا محب علی پور سے، دنیا ان کو قاضی محب اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم کے نام سے پہچانتی ہے، تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے، یہ عالمگیر کا زمانہ تھا، محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی، اور شیخ فرید الدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاندپورہ میں دفن ہوئے، بعض

⁵ میر آزاد نے مآثر الکرام میں انکو قطب الدین شمس آبادی کا شاگرد لکھا ہے، عرب جاکر شیخ طاہر فتنی اور ابراہیم کردی محدثین مکہ معظمہ سے حدیث پڑھی،

صاحبوں نے ملا محب اللہ بہاری کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا ہی[1]

حافظ امان اللہ بنارسی قاضی محب اللہ بہاری کے ایک اور معاصر امام وقت تھے، ان کا نام حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین ہی، بنارس وطن تھا، ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لیکر فارغ ہوے تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا، حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جونپوری نے ملا باقر داماد استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہی، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جن پر خود پیر کو فخر تھا، ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی، ان کی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے، اور میں نے اس کی زیارت کی ہی،

ملا نظام الدین فرنگی محلی ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا، جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا، اور اسی مناسبت سے وہ فرنگی محل کہلاتا تھا، یہی وہ فرنگی محل ہی جو آگے چل کر یورپ کا سب سے بڑا دار العلوم بنا،

ملا قطب الدین کے کئی صاحبزادے تھے، مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوے جن کی نسبت سے عربی کا درس نظامی مشہور ہی، موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود ان کے والد ماجد کا آغوش تربیت ہی، باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علماء کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا، اپنے والد کے شاگردوں ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا، اور آخری تکمیل شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے کی، ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ

[1] حاشیہ شرح ملا حسن از مولوی عبد الحلیم لکھنوی، معلوم ہوتا ہی کہ تذکرہ نگاروں کو قطبین یعنی ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین شمس آبادی میں جو دونوں استاد و شاگرد ہیں التباس ہو گیا ہی،

ملا نظام الدین کی ذاتِ گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے، یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا، میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہمعصر ہیں اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں: "و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بہ مولوی دارند، و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ باوی رساند، بین الفضلا علم امتیازی افرازد، و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردہ اند، و برای اعتبار خاتمۂ فراغ از مولوی گرفتند" سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی، ابدی آرام گاہ لکھنؤ ہے،

مدرسینِ فرنگی محل

ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلما مولنا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی سنہ ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا، اور اب بھی اسکی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ قائم ہے،

ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادہ ملا عبد العلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض بڑھکر دریائے فیض بن گیا اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا، اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا، مدراس میں سنہ ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی،

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے، جن کے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں، ان میں سے ملا کمال الدین، ملا حسن، ملا مبین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں، اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے،

ملا کمال الدین اور ملا حمد اللہ

ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور باکمال شاگرد ہیں، ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی سنہ ۱۱۷۵ھ، اور دوسرے ملا حمد اللہ سندیلہ المتوفی سنہ ۱۱۶۰ھ، یہ ملا حمد اللہ وہی ہیں جن کی کتاب حمد اللہ مشہور ہے، انھوں نے سندیلہ میں اپنی درسگاہ جمائی، جس سے بہت سے نامور پیدا ہوئے،

ملا حمد اللہ کے ایک نامور شاگرد، ملا باب اللہ جون پوری ہیں، اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں، جن کا حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد درسِ نظامی میں	ملا باب اللہ جون پوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری

لیاقت کی آخری منزل ہے، اکبر نامہ[2] ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اور بہار میں مخدوم شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے سنہ ١١٢٨ھ[1] سالِ وفات ہے،

ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلہ ہیں فضل و کمال کا یہی وہ نخل بارور ہے	سلسلۂ خیرآباد

جس سے خیرآباد کی وہ شاخ نکلی ہے، جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے، اور جو "سلسلۂ خیرآباد" کے نام سے مشہور ہے، ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا حمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسبِ فیض کیا، اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالامال کیا، اور بارہویں صدی کے آخر میں ٢٢ محرم ١١٩٠ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا، ملا محمد اعلم کے شاگردوں میں ان کے بھانجے مولوی سید عبد الواجد خیرآبادی کامل ہوئے، اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعلم کے شاگرد ملا ارشد تھے، اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبد الواجد خیرآبادی، ملا عبد الواجد سے ملا نظام العلام اور ملا نظام العلام سے مولانا فضل امام خیرآبادی نے پڑھا، مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے، بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمدنامہ ان ہی کی آمدِ طبع کا نتیجہ ہے، ١٢٤٣ھ میں وفات پائی،

مرحوم کے جانشین، صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے، جن کے دمِ عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے، دیار و اطراف سے طلبہ نے ان کی

---

[1] تاریخ علمائے ہند صفحہ ١٥٥ میں ١١٢٨ھ لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ وہ حضرت مرزا جانجاناں علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور مرزا صاحب ١١١١ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کے ایک رسالہ پر تقریظ لکھی ہے، بظاہر وہ ستر برس کی عمر میں مرشد نہیں بن سکتے تھے، اور نہ تقریظ لکھ سکتے تھے، مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں ان کا واقعۂ ارتحال نقل فرمایا ہے اور تاریخ ١١٨٦ھ لکھی ہے، (کلماتِ طیبات خطوط مرزا صاحب صفحہ ٤)

[2] یہ گاؤں اکبر نامہ ضلع پٹنہ کے قریب ہے،

طرف رجوع کیا، اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا، شروح و حواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں، داخل درس ہوئیں، فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ اور شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ کتابیں عربی طلبہ کی تعلیم کے لئے لکھیں اور مقبول عام ہوئیں، غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی،

مولنا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی، اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے، ان بزرگوں میں سے تین ارباب کمال کی درسگاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی، مولنا عبد الحق خیرآبادی خلف الصدق مولنا فضل حق خیرآبادی، مولنا برکات احمد بہاری ٹونکی، مولنا ہدایت اللہ خاں رامپوری جون پوری، مولنا عبد الحق خیرآبادی نے رؤسائے رامپور کی قدردانی سے رامپور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا، مولنا برکات احمد صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، ان کے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے، مولنا برکات احمد صاحب نے رئیس ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا، مولنا ہدایت اللہ خاں رامپور سے جونپور آئے، اور مدرسۂ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی، ان میں سے ہر ایک کی درسگاہ سے سینکڑوں علما تعلیم پا کر نکلے،

فرنگی محل کا اخیر دور | اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دار العلم میں فضل و کمال کی بیسیوں بساطیں بچھی رہیں ان ہی میں سے مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے، مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابو الرحم صاحب فرنگی محلی کے صاحبزادہ اور جانشین تھے، ان کے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحبزادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے، والد کے بعد ان کی جگہ یہ مفتی ہوئے، روز و شب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت

انجام دیتے، جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی بساط الٹی تو علم کا یہ مرکز جونپور کے مدرسۂ امام بخش میں منتقل ہوگیا، یہاں سے وہ حج وزیارت کو حجاز تشریف لے گئے، اور وہیں ۱۲۵۶ھ میں ابدی نیند سو گئے،

مفتی احمد ابو الرحم کے دوسرے صاحبزادہ کا نام مولوی اکبر تھا، ان کے بیٹے مولوی امین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبد الحلیم فرنگی محلی تھے، مولوی عبد الحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علماء مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا، اور یہ شہرت حاصل کی کہ علماء نے ان کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، ۱۲۶۰ھ میں نواب ذو الفقار بہادر نواب باندا کی طلب پر باندا گئے، اور کئی برس رہے، وہاں سے واپس آکر جون پور کے مدرسۂ امام بخش میں مدرس ہوئے، اور نو سال تک جون پوران کی شمع وجود سے پُر نور رہا، ۱۲۸۴ھ میں ایک عالم کو شمامِ علم سے معطر فرما کر حیدر آباد میں وفات پائی،

انہی کے صاحبزادہ مولنا عبد الحئی صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں، زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد ماجد سے وراثت پائی، باندہ میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جون پور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، اور درس و تدریس شروع کیا، کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی معرکۃ الآراء کتابیں چھپوائیں، علماء سے مناظرے کئے، ان کی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی، اور سینکڑوں علماے اعلام ان کی درس سے کامل ہو کر اٹھے، اور ملک ملک میں پھیلے ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالم جاودانی کا سفر کیا، علماء کو مولانا کی ناگہانی وفات کا وہ صدمہ ہوا، کہ شمس العلماء مولنا سید عظیم آبادی نے یہ تاریخ وفات کہی،

رشد فرنگی محل زعلم تہی

مولنا عبدالحئی صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولنا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی، یہ ملا بحرالعلوم کے پوتے اور اپنے والد مولنا عبدالحلیم فرنگی محلی کے شاگرد تھے،

اخیر زمانہ میں مولنا عبدالباری فرنگی محلی اسی محفل کے چراغ سحر تھے،

علماے جونپور پورب کے دوسرے علمی مرکز جون پور کا نام بار بار آیا ہے، مگر ابھی تک وہاں کے ارباب کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے، تیموری حملہ کے بعد ۸۰۹ھ میں جب جون پور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم و فضل کی مسند بھی بچھی، اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں، لیکن اس سے چند سال پہلے جونپور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفرآباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا،

علماے ظفرآباد یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ظفرآباد شہزادہ ظفرخاں کے نام پر بسا تھا، مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے، اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی، کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۹۰ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کیساتھ ملا مرتضیٰ کوفی ایک مرد مجاہد بھی شریک تھا، اسوقت ظفرآباد کے مقام پر راجہ اودی پال نام ایک راجہ تھا، اس مجاہد نے راجہ سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا اور یہیں دفن ہوا بعد کو مسجد گنگی تھن شہیداں کے نام سے مشہور ہوئی اور اسوقت یہ مزار موضع شمس خاں پور کے رقبہ میں داخل ہے،[۱]

مخدوم شیخ صدرالدین چراغ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں ۶۹۰ھ میں پیدا ہوے تھے، یہ شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے، شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر اشارہ کی تعمیل کو عزت سمجھتے تھے،[۲] شیخ صدرالدین پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفرآباد میں

---

۱ تجلی نور تاریخ جون پور ص ۳۹
۲ نزہۃ ذکر حضرت رکن الدین
۱۲

قیام پذیر ہوئے، مشہور ہی کہ غیاث الدین تغلق نے اُن سے اپنی ایک بیٹی کا نکاح کردیا تھا، اوران کے لئے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا، جو "چراغ ہند کے محل" کے نام سے ابتک مشہور ہی، اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہی[1]

به عهد ملک ذوالقرنین ثانی ۔ بنائے شرع را از عدل بانی

غیاث الدین و دنیا بوالمظفر ۔ سلیمان خاتم و جمشید افسر

شه آفاق تغلق شاهِ اعظم ۔ که بروی شد جهانداری مسلّم

برآمد این حصارِ چرخ ایوان ۔ که در رفعت گذشت از فرق کیوان

دوشنبه بیست (و) هشتم روز بوده ۔ ربیع الاوّلِ ماهِ ستوده

همایون ساعت و در وقتِ مسعود ۔ ز هجرت سال هفصد بست و یک بود

مظفر شد چو شد معمور این شهر ۔ ظفرآباد نامش بوده در دهر
۷۲۱ھ

اس کتبہ سی یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۸ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو بسایا تھا،[2]

چنانچہ اسی کے بعد سے ظفرآباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے، تاتاریوں کے حملہ کے زمانہ میں ایک بزرگ مع اپنی صاحبزادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے، بعد کو ان کے ایک

---

[1] شاہانِ مشرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم کلکٹر جون پور ص ۱۲۵ [2] اس مقام پر فرشتہ ص ۱۲۹ و مبارک شاہی ص ۹۲ کی اس غلطی کو دور کرتا ہی کہ انھوں نے غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۱ھ لکھی ہی، مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہی، اور صحیح وہ ہی جو فیروز شاہی ص ۴۲۵ میں ضیاء برنی نے اور تاریخ بدایونی ص ۲۲۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے، یعنی ۷۲۰ھ،

صاحبزادہ سید تاج الدین کرّہ کے ناظم مقرر ہوئے، اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفرآباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا، اور مخدوم آفتاب ہند ظفرآبادی" کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۷۹۳ھ میں وفات پائی، ان کا مزار اور انکی اولاد ابتک ظفرآباد میں ہی،

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا، اور دلّی جاکر تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میر منشی مقرر ہوئے، اور آخر میں ترکِ منصب کرکے حضرت نظام الاولیاء کے حلقہ میں آئے، دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی یادگار چھوڑا[1]،

پورب میں علمی ترقی کے چار دور

پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں، ایک سلطنت شرقی کا عہد[2] دوسرا اودیوں کا، تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ، اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر،

شرقی سلطنت کا دور

پہلا دور ۷۹۶ھ سے شروع ہوکر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہی، اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہی،

یہ عہدِ حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا، قنوج سے لیکر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفاء کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں، قصبوں میں قاضیوں، مفتیوں

---

[1] تجلی نور نور الدین ظفرآبادی جلد دوم ص۹ [2] سلاطینِ شرق کے نام اور زمانے یہ ہیں:-

۱۔ سلطان الشرق خواجہ جہاں، ۷۹۶ھ - ۸۰۲ھ	۴۔ سلطان محمود شرقی، ۸۴۴ھ - ۸۶۲ھ
۲۔ مبارک شاہ شرقی، ۸۰۲ھ - ۸۰۴ھ	۵۔ سلطان محمد شاہ شرقی، ۸۶۲ھ - ۸۶۳ھ
۳۔ سلطان ابراہیم شرقی، ۸۰۴ھ - ۸۴۴ھ	۶۔ سلطان حسین شاہ شرقی، ۸۶۲ھ - ۸۸۱ھ

اور شیوخِ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جا رہی تھیں، اور ہر جگہ علم و فضل کی مسندیں بچھی تھیں، اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اُس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے، آج بھی ان اطراف میں شرفار کے جو خاندان آباد ہیں، ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں، اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انہی شرقی بادشاہوں کا فیض ہے، یا پھر آخر میں سلطان عالمگیر کے عطیے ہیں، سادات اور صدیقی، فاروقی اور انصاری شیوخ کی نوآبادیاں قنوج سے لیکر جون پور سے گذر کر غازی پور تک پھیلی تھیں، خانقاہیں اللہ والوں سے، اور درسگاہیں علم کے طلبگاروں سے بھری پڑی تھیں، شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفرآباد اور جون پور کے در و دیوار کو پُر نور بنا دیا تھا، علماء اور اہلِ ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

۱- نور الدین ابی محمد بن مخدوم سید اسد الدین المتوفی ۸۲۶ھ،

۲- قطب الدین ابو الغیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی ۸۶۹ھ میں وفات پائی،

۳- ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفرآباد المتوفی ۸۳۹ھ،

۴- قاضی تاج الدین ناصحی ظفرآباد المتوفی ۸۳۱ھ،

۵- قاضی نصیر الدین گنبدی قاضیِ جون پور، شاگرد قاضی عبد المقتدر دہلوی، المتوفی ۸۱۱ھ،

۶- ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، دنیا بادشاہانِ اسلام کی اس علمی قدردانی کو یاد رکھے تو اچھا ہے کہ ملک العلماء جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا، مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لیکر مولانا کے سر پہ پھرا کر یہ دعا مانگی کہ خداوندا

یہ بلا ان سے دور کرکے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما، آخر دونوں آگے پیچھے سنہ ۸۴۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے،

۷- ملا شیخ عبد الملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی، شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی المتوفی سنہ ۹۰۷ھ،

۸- ملا علاء الدین عطا ملک برادر شیخ عبد الملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی، قاضی صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں اپنے اس شاگرد کا ذکر کیا ہے کہ اسی کے پاسِ خاطر سے یہ لکھی گئی،

۹- شاہ ابو الفتح جون پوری نبیرہ قاضی عبد المقتدر دہلوی، المتوفی سنہ ۸۵۵ھ،

۱۰- شیخ محمد عیسیٰ جون پوری شاگرد قاضی دولت آبادی،

۱۱- قاضی سماء الدین قتلغ خاں وزیر سلطان شرقی المتوفی سنہ ۸۰۳ھ؛

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر آباد اور جون پور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علماء اور مشائخ اپنی درسگاہیں اور خانقاہیں اور شرفاء اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے، چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ فراز کندوری المتوفی سنہ ۸۲۹ھ، شیخ قوام الدین المتوفی سنہ ۸۴۰ھ، شیخ سارنگ المتوفی سنہ ۸۴۰ھ، شیخ محمد اعظم لکھنوی، شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی سنہ ۸۱۰ھ، شیخ ضیا لکھنوی شاہ ضیاء المتوفی سنہ ۸۰۴ھ، خیرآباد میں شیخ سعد الدین خیرآبادی المتوفی سنہ ۸۳۰ھ، ردولی میں مخدوم احمد عبد الحق المتوفی سنہ ۸۳۷ھ، شیخ امین الدین المتوفی سنہ ۸۳۷ھ، شیخ صفی الدین، اُن کے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل المتوفی سنہ ۸۶۰ھ، کچھوچھہ (فیض آباد) مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی سنہ ۸۰۸ھ، دریاباد میں شیخ محمد مخدوم آلکش المتوفی سنہ ۸۴۰ھ، اور اجودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی سنہ ۸۹۹ھ تعلیم وارشاد کی

مسندوں پر جلوہ آرا تھے،

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب دولت آبادی کے نام ملتا ہی، جس میں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارشِ خیر کا تذکرہ ہی[1]، شیخ سعد الدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر سماء الدین قتلغ خان کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے، شیخ کے صاحبزادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات[2] میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہی، جس میں شیخ سعد الدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال لکھا ہی، سماء الدین قتلغ خاں گو وزیر تھے، مگر اپنے زمانہ کے مشہور علما میں تھے،

لودیوں کا زمانہ اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور و نخوت سی ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، مگر خوش قسمتی سی اس وقت لودیوں[3] کا جو خاندان دلّی کے تخت پر فرمانروا تھا، وہ علم و فن اور فضل و کمال کا پورا قدرشناس تھا، ان کے زمانہ میں ہندوستان نے علم و تہذیب اور صنعت و زراعت کے کاموں میں بڑی ترقی کی، بلکہ شرقی بادشاہوں نے اس سرزمین میں تہذیب و تمدن کے جو پودے لگائے تھے وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بارآور ہوئے،

غازیپور میں پھول اور پھل لگائے گئے سکندرپور (بلیا) سلطان سکندر لودی کی آبیاری سی چنبیلی (وہاں کے قلعہ کی چنبیلی اب تک مشہور ہی) اور گلابوں کا تختہ بن گیا، جون پور ان پھولوں کے تیلوں اور عطروں سی مشامِ جان کو معطر کرنے لگا، اور اب تک کر رہا ہی، یہی عطر بیزی علمی میدانوں میں بھی ہوئی یعنی

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۲ [2] نسخہ دار المصنفین [3] لودی پٹھانوں کی سلطنت ۸۵۵ھ سی ۹۳۲ھ تک دلی میں قائم رہی، ۹۳۲ھ میں بابر نے آکر لودیوں کا خاتمہ کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی، لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں :-

۱- سلطان بہلول لودی،	۸۵۵ھ	—	۸۹۴ھ
۲- سلطان سکندر لودی،	۸۹۴ھ	—	۹۲۳ھ
۳- سلطان ابراہیم لودی،	۹۲۳ھ	—	۹۳۲ھ

علم و فن کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہار آئی، تیموری بادِ صرصر نے جن پودوں کو مرجھا دیا تھا، ان میں دوبارہ جان پڑی، اور دلی سے لیکر جونپور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے، ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا،

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا، غرض اس نے اطراف و دیار سے علماء کو جمع کیا، اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا[1]، خود شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا، اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں، جنھوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی، اور ملا جامی کی صحبت سے جام فیض پیا تھا، اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آنکلے، شیخ عبداللہ تلنبی[2]، اور شیخ عزیز اللہ تلنبی، پہلے نے دہلی کو، اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا، ملا بدایونی لکھتے ہیں، "و از جملہ علماے کبار در زمانِ سلطان سکندر شیخ عبداللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلنبی در سنبھل بودند، و ایں ہر دو عزیز ہنگامِ خرابیِ ملتان بہ ہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند، و قبل ازیں غیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود[3]" ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے سن کر کہتے ہیں کہ ایک شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علماے متبحر پڑھ کر نکلے[4]، سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا، اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس میں شاہی آداب و تکلفات سے خلل نہ پڑے، چپکے سے صفِ پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا، اور آخر میں سلام مسنون کرکے رخصت ہوجاتا تھا[5]۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی،

---

[1] دیباچہ اخبار الاخیار شیخ دہلوی ص۹ مطبوعہ احمدی مطبع دہلی ۱۲۸۰ھ [2] یہ تلنبہ ملتان میں ایک گاؤں تھا، [3] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [4] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [5] ایضاً۔

پورب میں ان دونوں عزیزوں کی درسگاہ سے دو کامل نکلے، ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے ملا الہداد جونپوری المتوفی ۹۶۲ھ، پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا، اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا، اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے فقہ میں ہدایہ کی، نحو میں کافیہ کی شرحیں، اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا۔

مولنا الہداد جونپوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو شرقیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی، پورب مولنا الہداد کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا، جون پور کے محلہ رضوی خاں میں مولنا کی درسگاہ تھی، مگر اب نشان تک نہیں، ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری جونپوری تھے، سلطان سکندر کا عہد پایا تھا،

سکندر لودی کے زمانہ میں عرب سے ایک اور خضر طریقت کا ورود ہندوستان میں ہوا، یہ سید رفیع الدین محدث شیرازی ہیں، یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوانی کے اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے ۹۵۴ھ میں وفات پائی، ان کی ذات معقول و منقول دونوں کا مرج البحرین تھی،

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب ذیل اکابر کے وجود سے فیضیاب تھی،

۱- شیخ معروف چشتی جونپوری مرید مولنا الہداد جون پوری،

۲- شیخ دانیال جونپوری استاد سید محمد جون پوری،

۳- شاہ ٹھکن غازی پوری میر عدل غازیپور المتوفی ۹۰۰ھ،

۴- سید محمد جون پوری، المتوفی ۹۱۰ھ،

۵- شیخ حسن بن طاہر بہاری جونپوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہے،

۶- شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جون پوری، المتوفی ۹۴۴ھ دہلی میں دفن ہوئے،

۷- قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری، نبیرہ قاضی نظام الدین کیکلانی،

تیموریوں کا زمانہ | ۹۲۳ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا، علم و فن نے ملک میں وسعت پائی، سلاطین اور امراء کی قدر دانیوں نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی، اس عہد میں سید عبد الاول جون پوری ذکر کے قابل ہیں، جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، قاضی صلاح الدین خلیل کے شاگرد تھے اور غالباً حدیث کا فیض گجرات و عرب کے سفر سے لائے، بیرم خان خاناں کی دعوت پر دہلی آئے، اور آخر وہیں کی خاک ان کی ابدی خوابگاہ ہوئی، ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے[1]،

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفرآبادی ہیں، شیخ حسن بن طاہر سے فیض علم پایا، ہمایوں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس کی نذر قبول فرمائیں، مگر دستِ قناعت شرمندۂ احسان نہ ہو سکا، ۹۷۰ھ وفات کا سال ہے،

تیموری عہد کا شباب شاہجہاں کا زمانہ ہے، پورب کی سرزمین اس زمانہ میں علم و فن کے ستاروں کی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی، ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت استاد الملک ملا محمد افضل جونپوری کو حاصل تھی، ان کے پدر بزرگوار روماوند سے چل کر ہندوستان آئے اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت خطۂ پورب کو حاصل ہوئی، وہ ردولی میں مفتی مقرر ہوئے، ۹۷۰ھ میں یہیں ملا محمد افضل کی پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر پچھم کا رخ کیا، دہلی پہنچکر ملا شیخ حسین شاگرد ملا طاہر لاہوری

[1] تجلی نور ص ۴۰،

سے فن کی کتابیں پڑھیں، اور حدیث کا درس ملا ابو حنیفہ شاگرد مخدوم الملک و حکیم علی گیلانی سے لیا، علوم و فنون کی تکمیل کے بعد جون پور کو اپنے فیض و برکات کا مرکز بنایا، اس درسگاہ کے فیض نے جونپور کو دار العلم بنا دیا اور شاہجہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوا دیا جو ابد تک یادگار رہیگا،

"پورب شیراز ماست"

اس مطلع علم سے جو علماے وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں، جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبد الرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علماے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے دیوان عبد الرشید وہ ہیں، جنھوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے شاہجہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا، ملا محمود نے دنیا کو فلسفہ میں شمس بازغہ، اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں دیں، پہلے شاہجہاں کے دربار میں تھے، پھر ایک درویش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سُنکر جون پور میں درسگاہ جاکر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے،

استاد الملک کے دوسرے شاگرد ملا ضیاء الدین محدث[۱]، شیخ چندن محدث اور ملا شیخ احمد زین زاہد المتوفی ۹۶۳ھ ہیں، استاد الملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ اُن کے بھائی شیخ محمود، اُن کے بیٹے شیخ حامد، اُن کے بیٹے ملا محمد یوسف، ان کے پوتے شیخ احمد اور اُن کے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں قاضی کوزہ جہان آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیئے سے دیا جلاتے رہے،

عہد شاہجہانی و عالمگیری میں قاضی محمد حسین جونپوری (جو فتاوی عالمگیری کے مرتبین میں سے ایک ہیں) ملا محمود ثانی جونپوری شاگرد دانشمند خاں، شیخ محمد ماہ جونپوری، شیخ شمس الدین جونپوری

[۱] تجلی نور ۹ م
[۲] ایضاً ص ۹

۱۲

ملا نورالدین جونپوری اور آخری دور میں ملا باب اللہ جونپوری، شیخ محمد افضل سید پوری (غازیپوری) الہ آبادی، علم وفن کے نامور فرمانروا گذرے،

عالمگیر کے زمانہ میں سُہالی کا آفتاب بلند ہوا یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اوران کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محب اللہ صدر پوری الہ آبادی، قاضی آصف صدر پوری الہ آبادی ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ ممتاز ہوے، جن کے بدولت اودھ کے حدود سے لیکر بہار کی اخیر سرحد تک علم وفن اور فضل و کمال کی بہار پھیل گئی

غرض اس وقت شاہجہاں اور عالمگیر کی فیاضی اور علمی قدردانی کے بدولت قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک میں علما اور مدرسین پھیلے تھے، بادشاہوں کی طرف سے اُن کو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں جسکے سبب سے وہ بے نیاز ہوکر علم وفن کی خدمت میں لگے تھے، ان میں کچھ ایسے مستغنی بھی تھے جنھوں نے یہ دردسر نہیں خریدا، اور اپنا سارا کاروبار خدا کے سپرد کرتے رہے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب جگہ جگہ نوابیاں قائم ہوگئی تھیں، پورب کے جو قصبے اپنی مردم خیزی میں نامور ہوے اُن کے نام ترتیب سے یہ ہیں، بدایوں، امروہہ، سنبھل، مرادآباد، رامپور، بریلی، شاہجہاں پور، فرخ آباد، قنوج، شمس آباد، سندیلہ، بلگرام، خیرآباد، صدرپور، ملیح آباد، کاکوری، نصیرآباد (رائے بریلی) ولکھنو، مالک پور، سلون، الہ آباد، و خاص پورب میں جونپور غازی پور، سید پور، گھوسی، بھیرا، چریاکوٹ، شمس پور، مئو پور وغیرہ،

| جون پور کے مدرسے | ملک العلما شہاب الدین دولت آبادی کے عہد سے لیکر اخیر زمانہ تک جون پور میں جو

درسگاہیں علماے مدرسین کے زیر اہتمام عہد بہ عہد قائم ہوتی رہیں، ریاض[1] جون پور کے مصنف نے اپنی کتاب

---

[1] مؤلفہ سید محمد مہدی جون پوری، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۱ء،

کے آخر میں اس کی حسب ذیل فہرست دی ہے، اور لکھا ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ تک وہ قائم تھیں،

۱- مدرسہ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۹ھ،
۲- مدرسہ مولانا الہداد المتوفی ۹۲۳ھ،
۳- مدرسہ ملا محمود صاحب شمس بازغہ المتوفی ۱۰۶۲ھ
۴- مدرسہ ملا عبدالباقی،
۵- مدرسہ ملا نورالدین،
۶- مدرسہ مفتی سید مبارک،
۷- مدرسہ ملا محمد حنیف،
۸- مدرسہ ملا شیخ حامد،
۹- مدرسہ ملا شیخ محمد ماہ،
۱۰- مدرسہ ملا معمور، اکبر سے محمد شاہ تک،
۱۱- مدرسہ ملا محمد اعلیٰ " "

تجلیٔ نور تاریخ جون پور کی تلاش سے چند مدرسوں کے نام اور معلوم ہوئے ہیں،

۱۲- مدرسہ میر محمد ملیح،
۱۳- مدرسہ ملا صدر جہاں سنہ ۱۱۹۰ھ،
۱۴- مدرسہ ملا شمس الدین، سنہ ۱۱۹۰ھ،
۱۵- مدرسہ حافظ غلام شاہ،
۱۶- مدرسہ میر محمد عسکری، سنہ ۱۱۱۹ھ،
۱۷- مدرسہ مولوی ثناء اللہ،
۱۸- مدرسہ مولوی عطاء اللہ،
۱۹- مدرسہ سید ضیاء الدین خاں،
۲۰- مدرسہ معین الدین حکاک،
۲۱- مدرسہ استاد الملک المتوفی سنہ ۱۰۶۲ھ،
۲۲- مدرسہ شیخ رکن الدین " سنہ ۱۱۲۱ھ،
۲۳- مدرسہ ملا عبدالباری خضری " سنہ ۱۰۳۶ھ
۲۴- مدرسہ خانقاہ مداریہ، ملا مداری " سنہ ۱۰۷۶ھ
۲۵- مدرسہ ملا شمس پور، " سنہ ۱۰۴۷ھ،
۲۶- مدرسہ ملا شیخ محمد صادق " سنہ ۱۰۶۴ھ،
۲۷- مدرسہ ملا خلیل " سنہ ۱۰۷۹ھ،
۲۸- مدرسہ ملا باب اللہ،
۲۹- مدرسہ ملا جمیل " سنہ ۱۱۲۳ھ

اودھ کی نوابی کا زمانہ تیموریوں کے اخیر دور میں لکھنؤ میں شیوخ نے طاقت پائی تھی، عالمگیر کے زمانہ میں فدائی خاں یہاں کے حاکم تھے، ان کے بعد شیوخ میں سے نواب ابو المکارم خاں نے جن کے نام سے لکھنؤ میں مکارم نگر کا محلہ آباد ہے، لکھنؤ کی حکومت پائی، مگر رعایا ان کی سخت گیری سے چیخ اٹھی یہی وہ وقت ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں برہان الملک[1] سعادت خاں (المتوفی ۱۱۵۱ھ) نے ۱۱۳۶ھ میں اودھ کی صوبہ داری پائی وہ مذہبًا شیعہ تھا، اس نے اپنے صوبہ میں بہت سی علمی خاندانوں کی جاگیریں، معافیاں اور وظیفے ضبط کر لیے، نتیجہ یہ ہوا، کہ اکثر خاندان جو درس و تدریس اور علم کی اشاعت میں مصروف تھے، نوکری اور سپاہ گری کی خدمت پر مجبور ہوے، برہان الملک کے بعد اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا، ۱۱۵۹ھ میں الٰہ آباد کا صوبہ بھی اسی کے سپرد ہوا، جس میں جون پور وغیرہ قصبات داخل تھے، نواب نے یہاں کے علماء اور شرفا کی جاگیریں اور معافیاں بھی ضبط کیں، اور اہلِ علم کے خاندان تباہ حال ہوگئے میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں :- "بر ملتفتانِ ایں اوراق و حقائق جویانِ انفس و آفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و عمل است، سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیاء کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی است قدس سرہٗ می گوید کہ "مولنا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولنا علاء الدین نیلی اودی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف بود"

---

[1] نوابانِ اودھ کا سلسلۂ حکومت یہ ہے :-

۱ - برہان الملک سعادت خاں، ۱۱۳۶ھ ۱۷۲۳ء - ۱۱۵۲ھ ۱۷۳۹ء

۲ - ابو المنصور خاں صفدر جنگ، ۱۱۵۲ھ - ۱۱۶۷ھ

۳ - نواب شجاع الدولہ، ۱۱۶۷ھ - ۱۱۸۸ھ

۴ - آصف الدولہ یحییٰ خاں، ۱۱۸۸ھ - ۱۲۱۲ھ

۵ - نواب سعادت علی خاں، ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء - ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۳ء

۶ - نواب غازی الدین حیدر، ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۳ء - ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء

۷ - نصیر الدین حیدر، ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء - ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء

۸ - محمد علی شاہ، ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء - ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء

۹ - امجد علی شاہ، ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء - ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء

۱۰ - واجد علی شاہ، ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء - ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء

و مولنا شمس الدین یحییٰ و دیگر علماے اوده سامع بودند" ترجمہ مولنا شمس الدین یحییٰ در اوائل این فصل گذشت، اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند، سیما حصار پاے تخت خلافت کہ بہ واسطہ مرجعیت صاحب کمالاں ہر قسم در آنجا فراہم می آیند، و از تراکم افکار و اجتماع عقول اہل ہر عصر کمالات نفس ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی و چہ غیر آں بہ پایہ بالاتری رسانند، اما صوبہ اوده و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ تمام صوبہ اوده و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کروه نہایت ده کروه تخمیناً آبادی شرفا و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند، و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہاده، و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بہ روے دانش پژوہاں کشاده، وصلاے اطلبوا العلم در داده، و طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحب توفیقاں ہر معموره طلبہ علم را نگاه می دارند، و خدمت ایں جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند، صاحبقران ثانی شاہجہاں انار اللہ برہانہ می گفت، "پورب شیراز مملکت ما است" و تا حدود سنہ ۱۱۳۰ھ ثلثین و مائۃ و الف ہنگام علم و علما دریں گل زمین گرمی داشت تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاه حاکم صوبہ اوده شد، و اکثر بلاد عمده صوبہ الہ آباد نیز مثل دار الخیر جونپور و بنارس و غازی پور و کڑه مانک پور و کوزه جہان آباد و غیرہا ضمیمہ حکومت گردید، و وظائف و سیورغالات خانوادہاے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد، و کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپاه گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بہ آں درجہ نماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ہاے ارباب کمال بیشتر برہم خورد انا للہ و انا الیہ راجعون" و بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہرزاده او ابو المنصور خاں صفدر جنگ رسید و وظائف و اقطاعات بہ دستور زیر ضبط ماند و در اواخر عہد محمد شاه سنہ ۱۱۵۹ھ تسع و خمسین و مائۃ و الف صوبہ داری الہ آباد

نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد، وتتمہ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفتِ ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار بر ارباب وظائف تنگ تر گرفت، وتا حین تحریر کتاب این دیار پامالِ حوادثِ روزگار است، لَعَلَّ اللهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا، باوجود این خرابیہا رواجِ علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجا است در قلمروِ ہندوستان ہیچ جا نیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طراز ند، وبہ وصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز، مصرع

"باصد جہاں کدورت باز ایں خرابہ جاے است"

(ماثر الکرام آزاد ص ۲۲۱)

بنگالی مورخ مسٹر لا اپنی کتاب "ترقی تعلیم ہند بہ عہد مسلمانان" میں لکھتا ہے:-

"تذکرۃ العلما، اور سیر الملوک میں جن کے اقتباسات تذکرہ میں موجود ہیں، اس شہر کے متعلق دلچسپ تفصیلات ہیں، جن سے نہ صرف وہاں کے علما، اور طلبہ کی نجی زندگی، بلکہ دوسرے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی، ہندوستان کے تمام حصے خصوصاً صوبۂ اودھ اور الٰہ آباد کے لوگ یہاں تحصیلِ علم کے لئے جمع ہوتے تھے، سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں یہ شہر اس کا پایۂ تخت ہوا، اس وقت یہاں سینکڑوں مدرسے اور مسجدیں تھیں، طلبہ اور اساتذہ کو جاگیریں ملتی تھیں، تاکہ وہ تمام مادی ضرورتوں سے بے فکر ہو کر علم وفن میں مشغول رہیں، ہمایوں کی حکومت میں بھی جون پور علم وفن کے مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا، اس کی شہرت جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی قائم رہی، شاہجہاں نے تو اس کو شیرازِ ہند کا نام عطا کیا، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد تک یہ دستور رہا کہ دہلی کے فرمانروا جونپور کے حاکم کے پاس برابر فرامین بھیجا کرتے تھے کہ وہ شہر کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں جون پور کے واقعہ نگار ہر مدرسہ کی روداد احتیاط سے مرتب کیا کرتے تھے، اگر روداد سے کسی مدرسہ کی

کوئی احتیاج معلوم ہوتی تو امداد دی جاتی، شہزادے اور امرا جب اس شہر سے گذرتے تو یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کرتے اور سلاطینِ دہلی کو خوش کرنے کے لئے ان کو عطیے دیتے۔ ۱۱۴۲ھ (۱۷۳۰ء) میں نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جون پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، ایک بار وہ اس شہر میں آیا، لیکن یہاں کے علما اس سے ملنے نہیں آئے، جس سے اس نے اپنی اہانت محسوس کی، انتقاماً اس نے ان کی تمام جاگیریں اور وظائف ضبط کر لینے کا حکم جاری کر دیا، حکم کی تعمیل ہوئی جس کے بعد سے جون پور برباد ہو گیا، طلبہ اور اساتذہ منتشر اور مدرسے خالی ہو گئے، ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں نواب آصف الدولہ نے مختار الدولہ کی مرضی کے مطابق ان جاگیروں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن ایلچ خاں نے احتجاج کیا، اسی زمانہ میں جون پور انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔"

(پروموشن آف محمڈن لرننگ از، ان، ان، لا، ص ۱۰۲-۱۰۳)

اس کے بعد ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے حوالہ سے وہ کہتا ہے:-

"وارن ہسٹینگز نے شاید اس شہر کا معاینہ کیا تھا، سرایر کوٹ تو اس شہر میں ضرور آیا، ۱۸۰۱ء میں ڈنکن کی آمد کا ذکر روداد (PROCEEDINGS) کی ان جلدوں میں موجود ہے جو بنارس کے کلکٹر اور کمشنر کے کاغذات کی الماریوں میں سڑگل رہی ہیں، وہ اس شہر کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتا ہے، اس کے زوال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور اربابِ علم کا مستقر تھا، اسی لئے اس کو ہندوستان کا شیراز کہتے تھے،

یہاں کے مدارس کی گذشتہ شہرت کے قصوں کے سوا، اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے لیکن مسٹر ڈنکن کے مذکورۂ بالا بیان کے علاوہ اور بھی بہتر اسباب موجود ہیں، جس کی بنا پر ہم اس شہر کو ہندوستان کا شیراز یا ازمنۂ وسطیٰ کا پیرس کہہ سکتے ہیں، فیروز شاہ نے اپنے بھائی کی شہرت اور عظمت کے مطابق اس کو علوم و فنون کا مرکز بنانا چاہا،

جون پور کے ہر حکمراں نے فنون کی سرپرستی کرنا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھا، چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شاہی پایۂ تخت میں جب ہنگامے شروع ہوئے تو شہر کے علماء اور فضلا منتشر ہو گئے، اسی زمانہ میں جون پور کی پُر امن اور پُر سکون فضا میں علوم و فنون کا فروغ ہوا، محمد شاہ کے عہد میں بھی جون پور میں ۲۰ مشہور مدارس تھے، اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، ان مدارس میں سے ایک کے بانی کا انتقال پندرہویں صدی کے وسط میں اور دوسرے کا سترہویں صدی کے وسط میں ہوا، یہاں صرف مدارس کے علوم ہی کا فروغ نہیں ہوا، بلکہ ابراہیم اور حسین کی مساجد فنِ تعمیر کی ترقی کی بھی شہادت دیتی ہیں۔"

(آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا جلد اوّل (جونپور کی شرقی تعمیرات) از فوہرر (۱۸۸۹ء) ص ۲۱-۲۲)

بہرحال ان سیاسی و مذہبی حوادث کے طوفان میں بھی علم و فضل کی وہ شمعیں روشن رہیں جن کی روشنی شاہانہ عنایتوں کے چشمۂ نور سے مستعار نہ تھی، اس زمانہ میں پورب کا خطہ اور خصوصیت کے ساتھ جون پور اور غازیپور کے اطراف میں ایسی ممتاز ہستیاں تھیں جن کے بوریائے فقر کی بلندی مسندِ شاہی سے کم نہ تھی، جیسے مولانا محمد حسن چریاکوٹی شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ابو الغوث گرم دیوان ساکن بھیرا (اعظم گڈھ) المتوفی ۱۱۷۰ھ و مولانا شاہ محمد علی بھیروی نبیرۂ شاہ ابو الغوث گرم دیوان (اعظم گڈھ) شاگرد ملا بحر العلوم، ملا باب اللہ جون پوری شاگرد ملا احمد اللہ سندیلوی، شاہ نثار علی جونپوری المتوفی ۱۲۱۵ھ شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی، مولوی کرامت اللہ چریاکوٹی شاگرد میر عسکری جونپوری و ملا حمد اللہ سندیلوی، شاہ محمد افضل غازیپوری الہ آبادی المتوفی ۱۱۲۴ھ، ملا محمد ماہ دیوگامی (اعظم گڈھ) شاگرد ملا رکن الدین بہریابادی و دیوان عبد الرشید جون پوری، قاضی خوب اللہ جونپوری المتوفی ۱۱۰۰ھ قاضی حسن سعید خاں جونپوری المتوفی ۱۱۵۷ھ، مولانا میر محمد عسکری شیعی المتوفی ۱۱۱۹ھ، مولوی عبد القادر

سوگھرپوری (اعظم گڈھ) المتوفی ۱۲۱۲ھ مولنا غلام حسین جون پوری مصنف جامع بہادر خانی المتوفی ۱۲۰۵ھ، ملا ابو الخیر بن قاضی ثناء اللہ (ساکن اٹاوہ پرگنہ منڈیاہو ضلع جون پور) وغیرہ،

دلی کے آخری خانوادۂ علم کا اثر پورب پر

آخری زمانہ میں جب دلی میں تیموریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا اور دلوں میں علم و فن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا، دلی کے خانوادہ میں اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز صاحب المتوفی ۱۲۳۹ھ اور اُن کے بھائیوں اور عزیزوں کا دور تھا، دور دور سے طلبہ دلی آتے تھے اور عقل و نقل کے چشموں سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ معقولات میں میر زاہد ہروی کا اور حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے واسطہ سے مدینہ منورہ کے علماء اور محدثین سے فیضیاب تھا، اور مرج البحرین کا یہی رنگ نکھر کران کے اخلاف میں نمایاں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب (۱۲۳۰ھ) شاہ رفیع الدین صاحب (۱۲۴۹ھ) شاہ عبدالغنی صاحب، اور اُن کے اخلاف نیز شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ نواسۂ شاہ عبدالعزیز صاحب، اور مجددی خاندان کے ایک اور بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کے دم سے نئی رونق پیدا ہوئی، اور وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ اُن تمام بدعات و خرافات کے داغ سے پاک ہو، جو جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے پیدا ہوگیا تھا، تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں شاہ صاحب کے خاندان میں دو نئے [illegible] وقت پیدا ہوئے مولنا اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی (۱۲۴۶ھ) اور مولنا عبدالحیٔ صاحب دہلوی مولنا شاہ اسمٰعیل، شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے اور شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحیٔ

صاحب المتوفی ۱۲۴۳ھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور امام الزماں مولنا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید اور داعی تھے،

اس دوآتشہ تحریک نے جو عوام میں وہابیت کے نام سے مشہور ہی مسلمانوں میں مراسم شرک، غیر شرعی رسم و رواج اور بدعات کے مٹانے میں بڑا کام کیا، ان بزرگوں کے شاگرد اور شاگرد کے شاگرد سارے ملک میں پھیل رہے تھے، جس سے پورب کا خطہ خاص طور سے متاثر تھا، خاص جون پور اور اس کے اطراف میں متعدد بزرگ اس نیک کام میں لگے ہوئے تھے،

۱- مولوی کرامت علی جون پوری نے اپنے لئے بنگال کے علاقہ کو پسند کیا، اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام اُن سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، اردو فقہ میں مفتاح الجنۃ ان کی مشہور کتاب ہی ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی، اس خاندان کے اخلاف نسلاً بعد نسلٍ اب تک اس فرض کو کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں،

۲- مولنا محمد فصیح صاحب غازی پوری جو شاہ افضل سید پوری غازیپوری الہ آبادی کے پرپوتے تھے، بنارس میں حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور مولنا اسمٰعیل شہید صاحب سے فیض حاصل کیا، بہار، بنارس، اور اعظم گڈہ وغیرہ میں ان کے ذریعہ دین کی خدمت ہوئی ۱۲۸۵ھ مین وفات پائی، شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازی پوری اُن کے بیٹے، اور شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازیپوری اُن کے پوتے تھے،

۳- مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری، منڈیاہو ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، حضرت شیخ محمد کوفی ظفرآبادی کی اولاد میں تھے، مولنا فضل رسول صاحب بدایونی اور مولنا احمد اللہ انامی شاگرد مولنا شاہ اسحاق دہلوی اور دوسرے بزرگوں سے پڑھا، اور آخر مولنا اسمٰعیل شہید اور مولنا عبدالحئی صاحب

دہلوی سے علوم کی تکمیل کی، کچھ دنوں باندہ میں نواب باندہ کے ہاں رہے، آخر جون پور آکر طرحِ اقامت ڈالی، اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، کچھ دنوں کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور وہیں حج و زیارت کے بعد ۱۲۷۴ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی،

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ بابرکات سے پورب کے خطہ میں بڑا فیض پھیلایا سینکڑوں علما آپ کے درس سے کامل ہو کر نکلے، اور دور دور تک دین کے اثر کو وسیع کیا، بدعات کو مٹایا، اور علمِ دین کو رواج بخشا، اس بابرکت فیض سے اعظم گڈھ کے اس طبقہ میں بھی جس میں اب تک عربی اور مذہبی تعلیم کا رواج نہ تھا (یعنی اعظم گڈہ کی نومسلم برادری) عربی تعلیم کا خیال پیدا ہوا، اور آپ ہی کی تحریک سے جون پور میں منشی امام بخش صاحب نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر آگے آتا ہے،

اُن کے مشاہیر تلامذہ میں حسب ذیل نام قابلِ ذکر ہیں، مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی جونپوری، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا سید محمد یعقوب دیسنوی بہاری، مولانا مصطفیٰ شیر بہاری مدرس مدرسۂ خانقاہ سہسرام، مولانا شجاعت حسین بہاری، مولانا ولی محمد صاحب سکروری (اعظم گڈہ) محمد عمر غازیپوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی (استاذ مولانا شبلی مرحوم) مولانا رحیم اللہ ساکن بستی وغیرہ،

اہلِ حدیث اور غایتِ حنفی

دہلی کے اس خانوادہ کے فیضِ تعلیم سے دو اہم سلسلے چلتے ہیں، ہندوستان میں ایک ترکستان و خراسان کے اثر سے صرف فقہ حنفی کا رواج تھا، عرب سے خال خال شافعی آتے تھے، مگر ان کا اثر سواحل تک محدود تھا، اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جب سمندر کی طرف سے عربوں کی آمد و رفت کا دروازہ کھلا، تو ہندوستان اور عرب میں علمی تعلقات کا آغاز ہوا، چنانچہ شیخ بہلول حضرت

مجدد الف ثانی کے شیخ الحدیث) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس فیض کو وہیں سے لائے، اس سے حنفیت کے غلو کے ساتھ حدیث و سنت کی پیروی کا خیال دلوں میں پیدا ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے جب عرب کا سفر کیا، اور مختلف مذاہب کے علماء سے فیض پایا تو ان کا مشرب زیادہ وسیع ہو گیا، وہ عملاً گو حنفی ہی رہے، مگر نظری اور علمی حیثیت سے وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اس شان کا علانیہ جلوہ اُن کی مسوّی و مصفّی شروح موطا میں نظر آتا ہے، بانکی پور کے مشہور کتبخانہ میں صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ ہے جس پر شاہ صاحب کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنے کو عملاً حنفی اور علماً و تدریساً حنفی و شافعی لکھا ہے، اور اپنی بعض تالیفات میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کو ترجیح دی ہے جو فقہ حنفی کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب کے بعد یہ رنگ اور نکھر گیا، مولنا شاہ اسحاق صاحب مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولنا شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولنا عبدالحیٰ صاحب دہلوی نے ردّ بدعت اور توحید خالص کی اشاعت میں جو جد و جہد فرمائی، اُس نے دلوں میں سنّت کی پیروی کا عقیدہ راسخ کر دیا، ان کے شاگردوں میں یہ دونوں رنگ الگ الگ ہو گئے، شاہ اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں مولنا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی اور مولنا احمد علی صاحب سہارنپوری ہیں، مولنا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز شاگرد مولنا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ (بانی مدرسہ دیوبند) ہیں، اور پورب میں مولنا شاہ اسمٰعیل صاحب کے شاگرد مولنا سخاوت علی صاحب جون پوری وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں ردّ بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا، مولنا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے[۲] شاگرد مولنا سید نذیر حسین صاحب بہاری

---

[۱] زبدۃ المقامات [۲] مولنا سید نذیر حسین صاحب کی مولنا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی

دہلوی ہیں، اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور ردّ بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتبِ حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اُس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا، اور اسی سلسلہ کا نام اہلحدیث مشہور ہوا

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا، اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علماء تھے،

مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی، موصوف کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا، انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی، اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، پنجاب میں مولانا عبد اللہ غزنوی، مولانا عبد الجبار غزنوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا عبد المنان وزیر آبادی وغیرہ، یورپ کے خطہ میں مولانا امیر حسن سہسوانی، مولانا بشیر صاحب قنوجی، مولانا عبد اللہ صاحب مئوی غازیپوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) اہل حدیث و احناف میں ما بہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہلحدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھ کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں تصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے، عبارت یہ ہے: "و درہمیں سال (سنۃ الف و مائتین و تسع و اربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحاق مرحوم مغفور شروع فرمودند ... مولوی محمد گل کابلی و مولوی عبد اللہ سندھی و مولوی نور اللہ سرروانی و حافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم حرفاً حرفاً خواندند و ہدایہ و جامع صغیر بمعیت مولوی بہاء الدین دکھنی و عبد الماجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی و نواب قطب الدین خاں دہلوی در قاری اکرم اللہ وغیرہم، و کنز العمال ملا علی متقی علٰحدہ شروع فرمودند و دو سہ جزء خواندند و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و موطا امام مالک تماماً ہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند و اجازۃ از شیخ الآفاق حاصل نمودند، البتہ شاہ صاحب سے سند و اجازت تحریری انھوں نے ۱۰ر شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کرکے حجاز جا رہے تھے،

مولنا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (دربھنگہ) مولنا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری اعظم گڈھی، اعظم گڈھ کے ضلع پر خصوصیت کیساتھ مولنا فیض اللہ صاحب مئوی شاگرد مولنا سخاوت علی صاحب جونپوری مولنا عبداللہ غازیپوری اور مولنا سلامت اللہ جیراجپوری کا زیادہ اثر پڑا، ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان تینوں فریقوں میں مدتوں مناظرہ کا بازار گرم رہا، یہی وہ مذہبی ماحول ہے جس میں مولنا شبلی مرحوم کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا،

پورب کے دو نئے مدرسے انگریزی عہد میں جب انگریزی عملداری شروع ہوئی تو پورب میں پھر سے نئے مدرسوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے بعض بعض نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے دو ذکر کے قابل ہیں، مدرسۂ اسلامیہ امام بخش جون پور اور مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور،

مدرسۂ اسلامیہ امام بخش جون پور جونپور میں منشی امام بخش ایک رئیس تھے، انگریزوں کی شروع عملداری میں جب سررشتہ داری بڑی اہمیت رکھتی تھی وہ غازیپور میں فوجداری کے سررشتہ دار تھے، اس سے بڑی نیک نامی اور دولت پیدا کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی تحریک سے غالباً ۱۲۶۷ھ میں انھوں نے جونپور میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی،[1] ۱۲۷۰ھ میں انھوں نے اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ وقف کردیا اور بقیہ جائداد اپنے بیٹے مولوی حیدر حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ کے سپرد کرکے ہجرت کے قصد سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، وہاں ایک ہی سال کے بعد ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی، ان ہی مولوی حیدر حسین کے فرزند و جانشین نواب عبدالمجید خاں بیرسٹر مرحوم تھے، اور اب ان کے صاحبزادہ نواب سر محمد یوسف ہیں، مولوی حیدر حسین خاں نے اپنے والد کی وفات کے چودہ برس بعد ۱۲۹۲ھ میں[2] انتقال کیا، مولوی

---

[1] القول الجلی فی تذکرہ سخاوت علی ص ۲ مثنوی تذکرۂ ہدی ص ۹۵ جون پور،

حیدر حسین صاحب کے زمانہ میں پانچ سو ماہانہ مدرسہ کے مصارف کے لئے دیئے جاتے تھے، مدرسہ میں دو مدرس تھے، اور سو کے قریب طالب علم پڑھتے تھے[1]،

اس مدرسہ میں صدر مدرسی کی خدمت کے لئے مولنا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۷ھ میں فرنگی محل کے نامور عالم مولنا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کا انتخاب کیا، جو باندہ میں مولنا کے ساتھ رہتے تھے، اور جنھوں نے بہت کچھ مولنا سے کسب فیض کیا تھا[2]، موصوف نو برس تک یہاں مدرس رہے، مولنا عبد الحی صاحب مرحوم فرنگی محلی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گذرا، ۱۲۷۶ھ میں مولنا عبد الحلیم صاحب لکھنؤ جا کر ۱۲۷۷ھ میں حیدرآباد گئے، اُن کی جگہ پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی جو مولنا عبد الحلیم صاحب کے استاد تھے، مدرسہ میں آئے، موصوف کے زمانہ میں مدرسہ کی دھوم دور دور پہنچی اور لائق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہوا، ان ہی میں مولنا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ہیں، جنھوں نے انہیں مفتی صاحب سے علوم و فنون کے سبق لئے، اور مشہور روزگار ہوئے، مفتی صاحب نے چند روز کے بعد حجاز کا سفر کیا، اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی[3]، موصوف کے حواشی بر ملا حسن و میر زاہد کے چند نسخے دار المصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولنا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ سنہ ۱۲۶۳ھ ثبت ہیں۔

[1] ریاض جونپور صفحہ ۲۵ [2] القول الجلی فی تذکرۃ مولنا سخاوت علی صفحہ ۵۳ مولنا فاروق صاحب نے ۱۲۸۶ھ میں اپنے استاد کی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی، اور اُن کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دلم در شوقِ زلفش نالہ ساز است	چہ می نالم غمِ زلفش دراز است

آگے چل کر ہے:۔

جنابِ اوستاد کعبۂ جاہ	دلیلِ راہِ مردانِ حق آگاہ
چہ یوسف مصر معنی را عزیزے	نیرزد ملکِ جم پیشش بہ چیزے
ادب گیرد بہ بستانش ارسطو	بہ پیشش بو علی تہ کرد زانو

[3] (تاریخ علمائے ہند صفحہ ۲۰۹)

اس مدرسہ کے آخری نامور مدرس مولنا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری شاگرد مولنا فضل حق خیرآبادی تھے، جن کے فضل وکمال کے آوازہ سے ابھی تک ہندوستان پُرشور ہے، ۱۸۹۳ء میں مدرس ہوئے، ان کے لائق شاگردوں میں مولنا شیر علی صاحب، مولنا احسن صاحب بہاری، مولنا سلیمان اشرف صاحب بہاری، مولنا لطف الرحمان صاحب بردوانی وغیرہ تھے، مولنا شبلی نے بھی چندروز اُن سے پڑھا تھا، اور اُن سے راہ ورسم رکھتے تھے، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی،

مولوی لطف الرحمان صاحب بردوانی ۱۹۰۲ء میں مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے، جب یہ خبر مولنا شبلی کو معلوم ہوئی تو اپنے ایک شاگرد کو جو جونپور میں پڑھتا تھا، اور جس نے یہ خبر دی تھی لکھا "از نامہ ات بحال مدرسہ دلم بہ درد آمد کہ سپہر دون لطف الرحمان وغیرہ را بہ کار تعلیم وتعلم گماشتہ است آورخ از دست فلک کہ ہمان جاے افادت مفتی محمد یوسف صاحب اکنوں ایں شعر بر زبان حال دارد،

از ہجوم چند در ویرانۂ ما جا نماند   آں قدر آباد شد آخر کہ ما می خواستم

(۵- نومبر ۱۹۰۲ء)

مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور | فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ غازیپور میں طلوع ہوا، نام مولنا رحمت اللہ صاحب تھا، جو چار واسطوں سے ملا قطب الدین سہالوی کے سلسلۂ اولاد میں تھے، اپنے چچا ملا ظہور اللہ سے تعلیم پاکر غازی پور میں قیام کیا، اور چشمۂ رحمت کے نام سے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اور درس وتدریس میں مصروف ہوے، ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، مشہور اردو شاعر شمشاد لکھنوی فرنگی محلی المتوفی ۱۹۱۷ء یہیں کے استاد تھے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی کے ایک نامۂ فارسی میں ہے، اس مدرسہ کے دوسرے مشہور استاد مولنا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اور مولنا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری (شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی و مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی

و مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی و مولٰنا نذیرحسین صاحب دہلوی) ہیں ایک زمانہ میں اس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، پورب کے اچھے اچھے طلبہ نے یہاں پڑھ کر فراغ حاصل کیا اور فروغ پایا، مدرسہ اب تک چل رہا ہی، مگر اب اُس کی شہرت اگلی سی نہیں،

اعظم گڈہ اور اُسکے اطراف

اعظم گڈہ ایک نئی آبادی ہی، البتہ اُس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں، اور پہلے وہ جون پور میں شمار ہوتے تھے، اس لئے موجودہ ضلع اعظم گڈہ کے اکثر اگلے مشاہیر جون پوری مشہور ہوئے، اُس زمانہ میں سرکار جون پور کی وسعت آجکل سے مختلف تھی،

سرکار جون پور کا رقبہ | اس موقع پر ایک اصطلاحی غلطی کا دور کرنا ضروری ہی، مغلوں کے زمانہ میں کارون کی جو تقسیم تھی وہ موجودہ انگریزی تقسیم سے بالکل الگ تھی، آئین اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس زمانہ میں سرکار جون پور کا رقبہ موجودہ فیض آباد کی سرحد سے لیکر موجودہ غازیپور کے حدود تک پھیلا تھا، جن کو آج کل اضلاعِ مشرقی کہتے ہیں، سرکار جون پور اس زمانہ میں اہم محال یعنی پرگنوں پر منقسم تھی، ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام آئینِ اکبری میں گنائے گئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہی کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڈہ اور موجودہ ضلع بلیا کا پرگنہ سکندرپور، غازیپور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری، اور فیض آباد کے پرگنے چاند بڑہ، ٹانڈہ اور سرہرپور، سب سرکار جون پور میں داخل تھے، یہی سبب ہی کہ ان مقامات کے اکابر اور مشاہیر باہر کی دنیا میں جون پوری ہوکر رونما ہوئے،

اعظم گڈہ | اعظم گڈہ کا ضلع گو انگریزی عہد میں پیدا ہوا ہی، مگر اُس کا نام و نشان بہت پہلے سے ملتا ہے، اعظم گڈہ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں اکثر راجپوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہی،

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آبا و اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں
سے ہجرت کرکے یہاں آئے یا آباد ہوئے، اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہے،

اعظم گڈھ کے نومسلم خاندان | نومسلم خاندانوں میں سے جو وقتاً فوقتاً اسلام کے خلعت سے سرفراز ہوتے
رہے، دو قومیں پیدا ہوئیں، ایک وہ لوگ جو اپنی اصل و نسل میں بالکل خالص رہے، ان میں قابلِ ذکر
اعظم گڈھ کے باؤں اور سدھاری متصل اعظم گڈھ کے بابوؤں کے خاندان ہیں،۱ اور جو اب تک اسی طرح
بے میل مسلمان راجپوت ہیں، دوسری قوم وہ ہے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے خاندانوں
میں شادی بیاہ کرنے لگی، اُن کو عرفِ عام میں عام طور سے روتارہ کہتے ہیں، جو حقیقت میں اصل ہندی
لفظ راوت کی خرابی ہے، یہ راوت کا لفظ پہلے راجپوتوں کے لئے بولا جاتا تھا، اور اب بھی کہیں کہیں بولا
جاتا ہے، امیر خسرو دہلوی قران السعدین میں کہتے ہیں، ع راوتِ تروپین زن و خارا شگاف" (صفحہ ۳۳ مطبوعہ علی گڈھ)
مرہٹی میں راوت سوار سپاہی کو کہتے ہیں، ۱ اور وہ بہت سی خاندانوں کا سرنام ہے،

اعظم گڈھ | گڈھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری
جز گڈھ ہے، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا یعنی کسی زمیندار یا رئیس نے اپنے اور
اپنی رعایا کے لئے کوئی گڑھ بنایا، اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کردیا، اعظم گڈھ بھی اسی قسم کا شہر ہے،
راجہ اعظم جن کے نام کی طرف یہ نسبت ہے، اعظم گڈھ کے مسلمان راجپوت راجاؤں میں سے تھے، اس راجہ کا
خاندان یہاں اب بھی موجود ہے، ۱ اس کا قلعہ عرفِ عام میں کوٹ (قلعہ) کہلاتا ہے، اور اس کے آس پاس
کی آبادی کا نام محلہ کوٹ ہے،

اعظم گڈھ کا بانی | روایت یہ ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ آگرہ جا کر مسلمان ہوگیا

جہانگیر نے اس کی بڑی قدر کی، اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا، اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ ۲۴ پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڈھ میں واقع تھے، تزک جہانگیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام ایک امیر کا ذکر موجود ہی شہنشاہ لکھتا ہی:۔ "دولت خاں بفوجداری صوبہ الہ آباد و سرکار جونپور تعین یافتہ بود آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد" (تزک جہانگیری جشن ہفتمیں نوروز)

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بطور یادگار باقی تھا جس کی نقل شروع انگریزی عملداری میں شامل مسل ہو کر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں محفوظ ہے، اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شدہ، کہ ابھمن سنگھ زمیندار منجھگواں نظام آباد از بندۂ مقبول بارگاہ والاجاہ بدین اسلام درآمدہ، نظر بر استحقاق بہ خطاب راجہ نادر دولت خاں ممتاز شدہ بست و دو پرگنہ از صوبہ الہ آباد ابتدا از نیساں خریف سخاقوئیل حسب الضمن مرحمت فرمودیم باید کہ فرزندان نامدار و الاتبار و وزرائے ذوی الاقتدار و حکام کرام و عمال کفایت فرجام و متصدیان مہمات دیوانی و متکفلان معاملات سلطانی و جاگیرداران حال و استقبال ابداً و مؤبداً در استقرار و استمرار ایں حکم مقدس و معلی کوشیدہ بر زمینداری پرگنات بہ خطاب مذکورہ نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن خالداً و مخلداً بحال و برقرار داشتہ بہ زرہائے مشخص مال واجب سرکار مبلغ یک لک و بست و پنجہزار روپیہ نانکسار[1] بر قبولیت مجرا دادہ باشند کہ مع سرحد و سردیہہ وغیرہ ابواب زمینداری صرف معیشت خود پردازد و از تصادم تغیر و تبدیل ایں امر مقدس مصون و محروس دانستہ سند مجدد نہ طلبند از یرلیغ کرامت تبلیغ والا انحراف نہ ورزند" (یازدہم شہر ربیع الآخر سنہ چہارم جلوس فقط)

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہی:۔ "بر کتاب حسب ضمنی بست و دو پرگنہ نانکار[1] یک لک ۲۵ ہزار پرگنہ نظام آباد، پرگنہ کوڑیہ، پرگنہ تلھنی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ چکیسر، پرگنہ نتھوپور

[1] یا نانکسار؟

پرگنہ چریا کوٹ، پرگنہ قریات متھو پور، پرگنہ بھا بانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ مئوناتھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بھیری آباد،
پرگنہ بچوتر، پرگنہ سید پور بھتری، پرگنہ ظہور آباد، پرگنہ بھوداؤں، ابواب زمینداری سی صد یک روپیہ؛

یہ جن پرگنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڈہ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں،

راجہ دولت خاں مینھ نگر میں لاولد فوت ہوگئے، وہیں ان کی قبر ہے، وہ اپنے بعد اپنے ہندو بھتیجے
ہرنبس کو ریاست کا مالک بنا گئے تھے، آگے کے سلسلہ میں ایک نامور بکرماجیت نامی ہوا جس نے پھر
اسلام قبول کیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں اور عظمت خاں، اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں
اعظم گڈہ کی بنیاد ڈالی، اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڈہ بسایا، جو اب تک اسی نام سے
اسی ضلع میں آباد ہے،

جب سرکار جون پور میں اودھ کی نوابی قائم ہوئی، تو اعظم گڈہ کے راجوں اور اودھ کے نوابوں
میں کئی دفعہ لڑائیاں ہوئیں،

عظمت خاں کے بیٹے مہابت خاں بڑے دبدبہ کے راجہ ہوئے، مدھوبن پرگنہ گھوسی لیکر پرگنہ
اتر ولیا ضلع گورکھپور تک اُن کی حکومت قائم ہوئی، آخر نواب سعادت علی خاں سے لڑکر گورکھپور میں
قید ہوئے، جہاں ۱۷۳۱ء میں وہ فوت ہوگئے، اُن کے بیٹے ارادت خاں نے صفدر جنگ نواب اودھ
کے مقابلہ میں نواب احمد خاں بنگش والیِ فرخ آباد کی مدد کی،

۱۷۵۶ء میں ارادت خاں کی جگہ اُس کا بیٹا جہان خاں ریاست کا مالک بنا لیکن ارادت خاں
کے رہتے ہی جہان خاں کے چچا جہانگیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے ریاست پر قبضہ کرنا چاہا، اور
آخر ناکام رہ کر جون پور میں پناہ لی، جہان خاں اور نواب اودھ کے عاملِ نظام آباد کے درمیان ۱۷۶۱ء

میں لڑائی ہوئی جس میں دونوں مارے گئے اور فضل علی خاں نے غازی پور نے اس پر قبضہ کرلیا،

محمد آباد گوہنہ (ضلع اعظم گڈہ) میں حضرت غلام فرید صاحب فاروقی ایک فاضل اجل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے جب فضل علی خاں نے اعظم گڈہ پر قبضہ کیا تو موصوف کو بڑی تمناؤں سے لکھا، کہ آپ تشریف لائیں، اور اس خطہ کی حکومت قبول فرمائیں انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا،

بیچارہ خر آرزوے دُم کرد ۔۔۔ نایافتہ دُم دو گوش گُم کرد

آخر فضل علی خاں تین برس کے بعد غازی پور اور اعظم گڈہ دونوں سے الگ کر دیئے گئے[1]،

شجاع الدولہ نے جب ۱۷۶۴ء میں بکسر میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کھائی، تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کرلیا، یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر تھا "سنگار درپن" اس کی ہندی کی تصنیف ہے، ۱۷۷۱ء میں وفات پائی، اس کے درباری شاعر برجو مصر نے اعظم خاں کی تعریف میں اعظم خانی ستسائی لکھی، جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۷۷۵ء[؟] میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۲ بیگہہ زمین انعام میں پائی، اس کے کچھ دنوں کے بعد نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے اس علاقہ کو جہاں یار خاں سے چھین کر نوابی میں شامل کرلیا، اور یہ اودھ کی حکومت کا ایک چکلہ (ضلع) بن گیا[2]، اور نواب کی طرف سے ایک عامل رہنے لگا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں یہاں مرزا عطا بیگ خاں کابلی عامل تھے، لکھنؤ اور جونپور کے بیچ میں اعظم گڈہ کا علاقہ پڑتا تھا، اس لئے اعظم گڈہ کے عامل اس راستہ کی حفاظت کرتے تھے[3] ۱۸۰۱ء

---

[1] تجلی نور ص ۹۶ تین برس کا تعین گزیٹیر میں ہے ص ۱۷۵ [2] اعظم گڈہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۲۳ء ص ۲۹ [3] محمد علی تمنا خلف خواجہ عبد اللہ تائید عظیم آبادی اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور و ممتاز ادیب و شاعر و مورخ تھے، ریاض المنشآت ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، مرشد آباد وغیرہ کے امراء اور رؤساء اور دوسرے منشیوں کے نام خطوط ہیں، اس مجموعہ میں میرزا عطا بیگ خاں عامل اعظم گڈہ کے نام بھی ایک خط ہے، اس مجموعہ سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ [illegible] نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے اردو اور فارسی کے جو تذکرے بہ نسبت ابراہیم وغیرہ لکھے ہیں وہ درحقیقت اسی مجموعہ کے مؤلف محمد علی تمنا کی محنت ہے، اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں [illegible] گنج میں بھی ہے،

تک یہ چکلہ دار یا عامل اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ کا ایک تاریخی پتھر اس وقت لکھنؤ کے عجائب خانہ میں رکھا ہے، اس میں حکومت کے تمام شہروں کے درمیان کا فاصلہ ریاضی کے قاعدہ سے کھدا ہے، اس میں لکھنؤ اور الہ آباد کے بعد تیسرا نام اعظم گڈھ کا ہے۔

۱۸۰۱ء میں جب یہ علاقہ انگریزی عملداری میں شامل ہوا، تو جہان خاں کے بیٹے نادر خاں کو، جو یہاں کے عاملوں سے برسرپیکار رہتا تھا، ڈیڑھ سو ماہوار کی پنشن اور بارہ گاؤں کی زمینداری دے کر ضلع میں امن و امان قائم کیا، جہان خاں نے ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا، اُن کی جگہ ان کے بیٹے مبارک خاں نے لی، جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی، اور ان کے صاحبزادہ راجہ سلامت خاں مسند نشین ہوئے، راجہ صاحب گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے، مولنا شبلی مرحوم ان ہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اور اکثر اُن کا نام عزت سے لیتے تھے، ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

اعظم گڈھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات

شاہ گنج سے جو شاہ عالم کے نام سے آباد ہے، اور جو جون پور میں شامل ہے، دو فرلانگ آگے سے اعظم گڈھ کا ضلع شروع ہو جاتا ہے، شاہ گنج سے چند میل دور بہ سمت مشرق سرائے میر آتا ہے جس نے حضرت میر عاشقاں علیہ الرحمۃ کی نسبت سے سرائے میر کا نام پایا ہے، یہاں ان کا مزار اب تک یادگار ہے، اور اب اسکی شہرت کا ذریعہ وہ مدرسۂ اسلامیہ ہے جس کا نام "مدرسۃ الاصلاح" ہے جس کو ۱۹۰۸ء میں یہاں کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا، اور جس سے مولنا شبلی اور مولنا حمید الدین کو تعلق خاص رہا ہے،

سرائے میر سے دس میل بہ جانب مشرق نظام آباد کا قصبہ ہے، یہ بہت سے علماء و اہل اللہ کا مولد و مسکن رہا ہے، سنا ہے کہ دیوان عبدالرشید صاحب رشیدیہ کا اصل وطن یہی تھا، حضرت میر عاشقاں کے پیر حضرت

شاہ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ عرف شاہ قدن یہیں مدفون ہیں،

سرائے میر سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر ملیتھ نگر ایک مقام ہے جو یہاں کی پرانی آبادی ہے اور جس میں پرانے قلعہ کے آثار اب تک نظر آتے ہیں، دوسری پرانی آبادی ماہل کی ہے جہاں پرانے اشراف سکونت پذیر ہیں، سرائے میر سے متصل پھریہا نام ایک گاؤں ہے جہاں انصار کا ایک گھرانا آباد ہے، یہی گاؤں مولنا شبلی کا ننہال، اور مولنا حمید الدین صاحب کا وطن ہے،

اس کے بعد اعظم گڈھ کا شہر آتا ہے، اس کی مشرقی سمت میں دوسرے مشہور مواضعات اور قصبے ہیں، ان میں سب سے پرانا گھوسی کا قصبہ ہے جہاں کے مولنا غلام نقشبند تھے، جو لکھنؤ میں قیام کے باعث لکھنوی مشہور ہوئے، اور آج سے چالیس پچاس برس پہلے یہاں مولوی عبد القادر صاحب نام ایک مشہور عالم اور زمیندار تھے، جن کو امامت کا دعویٰ تھا، اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے، اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے، اور اسی لئے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے جو اعظم گڈھ میں زمانہ تک مہتمم بندوبست رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آدھا مصرع مولنا شبلی مرحوم کی زبانی مجھے یاد رہ گیا ہے، ع "تعمم تقمص وانتطق او تسربل" موصوف کے پاس ایک عمدہ کتاب خانہ تھا جو اب بھی ان کے صاحبزادہ کے پاس ہے،

انہی اطراف میں اعظم گڈھ کا دوسرا مشہور قصبہ چریاکوٹ ہے قدیم آبادی ہے، ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے، اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازیپور اور اعظم گڈھ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولنا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحبزادے مولنا عنایت رسول اور مولنا فاروق تھے،

اعظم گڈہ اور چریاکوٹ کے بیچ میں مئوناتھ بھنجن واقع ہے جس کا حوالہ اعظم گڈہ کے راجاؤں کے شاہی فرمان میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا شاہی نام جہان آباد[1] رکھا گیا تھا شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے کے کاریگروں کو جمع کیا، اور ایک جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی کمال صنعت و حرفت کے ساتھ علم و فن کی خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک نیا مدرسہ مفتاح العلوم قائم ہے اور اس کے پرانے حجروں کی جگہ اب نئے حجرے بن رہے ہیں، اس قصبہ میں کثرت سے علما پیدا ہوئے، اور اب بھی ہیں، مولنا عبداللہ صاحب غازیپوری کا اصل وطن یہی ہے،

مئو اور اعظم گڈہ کے بیچ میں محمد آباد گوہنہ نام مشہور قصبہ ہے، حضرت مولنا غلام فرید صاحب جن کا ذکر اوپر گذرا یہیں کے باشندے تھے، انگریزی عہد میں یہاں کے شرفا نے تعلیم پاکر اعلیٰ انگریزی عہدے حاصل کئے، جن میں قابل ذکر ڈپٹی محمد کریم صاحب ہیں جو علی گڈہ میں تقرر کے زمانہ میں سرسید کے رفقا میں تھے، اور دوسرا خاندان جسٹس سید عبدالرؤف صاحب کا ہے، اسی قصبہ سے متصل ولید پور کا قصبہ ہے، جہاں کے مولنا محمد کامل تھے، جو ۱۸۶۱ء میں جونپور میں منصف مقرر ہوئے، اور بعد کو بستی وغیرہ اضلاع میں اس خدمت پر مامور ہوے، ساتھ ہی صوفی کامل بھی تھے، مریدی کا بڑا حلقہ تھا، مولنا فاروق صاحب چریاکوٹی کی پہلی شادی ولید پور میں انہی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی

محمد آباد کے قریب مبارکپور نام بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے، اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علما پیدا ہوئے ہیں،

---

[1] یہ نام ان فرامین میں ہے جو اس قصبہ کے لوگوں کے قبضہ میں اب تک موجود ہیں،

حسب و نسب و مولد | اعظم گڈہ کی دوسری سمت میں ایک پرگنہ سکرڑی ہی، یہ بھی قدیم آبادی ہی آئین اکبری میں اس کا نام ہی، اور اس کو راجپوتوں کا مسکن بتایا ہی، چنانچہ اب بھی اس علاقہ میں راجپوت آباد ہیں، اسی پرگنہ میں بندول کا قصبہ ہی جس کو مولنا شبلی کے مولد بننے کا فخر حاصل ہی، مولنا نے اپنے اس مولد کی تعریف میں تفریحاً یہ شعر کہے ہیں،

فضلِ بندول اگر تو نہ شناسی — آدمی نیستی تو نسناسی

نتواں یافت ہیچ جاے چو او — خرم و سبز و دلکشاے چو او

ہست از غایتِ فرح بسرشت — مرغزارے مگر ز باغِ بہشت

مولنا کی پیدائش سے پہلے چاہی یہ بیان مبالغہ سے خالی نہ ہو مگر اُن کی پیدائش کے بعد تو یہ یقیناً مبالغہ سے خالی ہی، اسی کے قریب بالکل ملی ہوئی خانقاہ نام قدیم شرفا کی ایک آبادی ہی، یہی وہ مقام ہی جو ڈپٹی محمد خلیل صاحب اور ان کے صاحبزادہ جسٹس اسمٰعیل صاحب جج (ہائی کورٹ الہ آباد) کا اصل مسکن ہی، اسی کے قریب جیراج پور بھی ایک آبادی ہی جس میں متعدد علما پیدا ہوے، جن میں سے ایک مولنا سلامت اللہ صاحب ہیں،

خانقاہ میں غالباً صوفیاے کرام کا کوئی خاندان آباد تھا جس کے سبب وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوا، یہی وہ جگہ ہی جس کی مسجد کا ذکر مولنا کے قصیدۂ کشمیریہ میں ہی، اور جس کے لئے اپنی جائداد متروکہ کے ایک حصہ کی وصیت اس میں لکھی تھی،

خاصہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است — کہ ز بے مہریِ ما خستہ و بے برگ و نوا ست

نسب | بندول میں بھی راجپوتوں ہی کی آبادی تھی جس کے مورثِ اعلیٰ آج سے چار سو برس پیشتر مسلمان

ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولنا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی، کیا عجیب بات ہو کہ ایک ہندی نژاد راجپوت آگے بڑھ کر اس قابل ہوا کہ رسول مطلبی و ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج و معارف سے دنیا کو آشنا کرے، فاروق اعظم کی سطوت و عظمت کا دلوں میں سکہ بٹھائے، نعمان بن ثابت کوفی امام اعظم کے فقہ و قانون کے مصالح و حِکَم کو نیا جلوہ دے فصحاے عرب و ایران کی نکتہ سنجیوں کی شناسائی داد دے، اور غزالی و رازی اور مولانائے روم کے اسرار حقیقت کو بر ملا فاش کرے، ڈاکٹر اقبال نے جو خود بھی ایک ہندی نژاد برہمن تھے، کیا خوب کہا ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

مولنا کا خاندانی سلسلہ وہی نومسلم راجپوتوں کا ہی جو راوت کہلاتے ہیں، شجرہ نسب یہ ہی،

شیوراج سنگھ = سراج الدین

شہباز

شیخ سہراب

شیخ احمد چودھری

شیخ لعل محمد

شیخ مہدی چودھری

شیخ محمد اسمٰعیل

شیخ امان اللہ

شیخ محمد فخر جہاں

شیخ محمد قاسم　　شیخ محمد تاج　　شیخ محمد رضا

شیخ کریم الدین

شیخ عباد اللہ

منشی شیخ حسن علی صاحب

شیخ حبیب اللہ　　شیخ مجیب اللہ　　شیخ عجیب اللہ　　شیخ نجیب اللہ

علامہ شبلی　　محمد مہدی　　شیخ محمد اسحاق　　محمد جنید　　شیخ علی احمد

شیخ محمد حامد　　محمد فاروق　　انور　　جسٹس شیخ اقبال احمد　　سلطان احمد
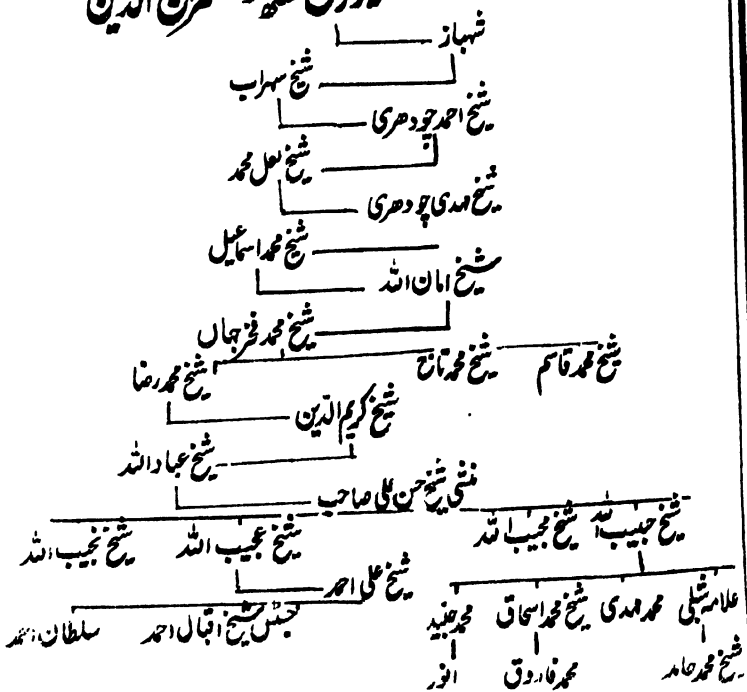
قبولِ اسلام خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبولِ اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے،

"ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقۂ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہوگئی، دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے، گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے، یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں اتار دیں، ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں، اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب و دانہ تھیں، بگڑ کر بولیں "کیا نرے ترک ہی ہوگئے، جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے، اور سارا کھانا بھرسٹ کر ڈالا"، ایک راجپوت پر ایک عورت کے اس چبھتے ہوئے طعنہ نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علماء کے بحث و مناظرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنا تو کہا مجھے ترک ہونے کا طعنہ دیتی ہو تو میں سچ مچ ترک ہوا جاتا ہوں، چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جاکر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی، بلکہ دینِ حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے، اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا، خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی، اور اب تک یہ لوگ بندول کے قریب دھرسن نامی ایک موضع میں آباد ہیں"[1]۔ یہ تو خاندانی روایت ہے، لیکن قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیوراج سنگھ خانقاہ کے کسی بزرگ کی صحبت اور تلقینات سے دل ہی دل میں متأثر ہو رہے تھے، اور آہستہ آہستہ ہندو دھرم کی بندشوں سے آزاد ہوتے جارہے تھے، اسی سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اسی سے بھاوج کا طعنہ بھی بجا تھا، اور دفعۃً شیوراج سنگھ نے خانقاہ کی مسجد کی راہ بھی اسی لئے لی، یہ واقعہ شاہانِ شرقی کے زمانہ کا ہے،

خاندانی حالات سراج الدین نے قبولِ اسلام کے بعد اپنا حصۂ زمینداری الگ کرلیا، بعد کو اس خاندان

---

[1] سیرتِ شبلی، از مولوی اقبال احمد خان سہیل ایم اے، ایل ایل بی، مندرجۂ الاصلاح نومبر ۱۹۳۶ء ص ۵۱ و ص ۵۲،

نے مزید رسوخ حاصل کیا یعنی اس کو آس پاس کے مواضعات کی چودھرائی کا منصب مل گیا جو اثر اور اقتدار کے لحاظ سے آجکل کی تحصیلداری سے کچھ اونچا تھا، یہ منصب مدت تک اس خاندان میں قائم رہا،

سراج الدین کے پوتے سہراب نے دنیاوی عزت کے علاوہ مذہبی اعزاز بھی حاصل کیا یعنی دینی باطنی کیفیت میں یہ ترقی کی کہ اُن کے مرشد نے ان کو بیعت کی اجازت دی، اور شیخ کے معزز لقب سے سرفراز کیا، اسی لئے نومسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف یہ لوگ خاں کے بجائے شیخ کہلاتے ہیں،

ناتھال انصاری شاید اسی لئے نومسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف ان لوگوں نے شادی بیاہ میں صرف اپنے ہی خاندان تک محدود رہنے کی پابندی نہیں کی، بلکہ دوسرے مسلمان شرفا کے خاندان میں بھی شادیاں کیں، چنانچہ مولنا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی، جو پھریہا میں آباد ہیں، شیخ صاحب کے خسر اور مولنا کے نانا کا نام حاجی قربان قنبر انصاری تھا،

بزرگوں کے حالات مولنا کے جدِ اعلیٰ شیخ کریم الدین صاحب گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانہ میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے، اور اپنی ذاتی آمدنی سے بڑھا واحسام الدین پور نام ایک علاقہ خریدا جس میں دس بارہ گاؤں تھے، یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہے،

مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڈہ میں مختار تھے، اور مولانا کے نانا شیخ قربان قنبر انصاری انگریزی تسلّط کے ابتدائی زمانہ میں اعظم گڈہ کے ایک مشہور وکیل تھے، مولنا سے سنا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار بھی سناتے تھے جو شاید اہلبیت رضی اللہ عنہم کی منقبت میں تھے، مولانا حمید الدین مرحوم مصنف نظام القرآن ان ہی شیخ قربان قنبر انصاری کے پوتے ہیں،

شیخ حبیب اللہ | مولنا کے دادا نے چار اولادیں چھوڑیں، حبیب اللہ، مجیب اللہ، عجیب اللہ، نجیب اللہ

مولنا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے، انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا، چنانچہ مولنا نے شعر العجم میں اُن کے اس حسنِ ذوق کی ایک مثال لکھی ہے، فرماتے ہیں؛

"میرا طالبعلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا،

سر بہ بستان چو دہد جلوهٔ یغمائی را | اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا، کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لئے شاعر اگر "کند" کے بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہوگئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے، کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اتارے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروائے جائیں یا نچوائے جائیں، فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی[1]"

[1] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۲

اس زمانہ میں فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چونکہ شیخ صاحب کے گھر میں زمینداری اور مقدمات و قانون عدالت کا چرچا تھا، اس لئے الہ آباد ہائیکورٹ کی وکالت حاصل کی، اور اس پیشہ میں اُن کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے،

اُن کی جوانی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، دوسرے شہروں کی طرح اعظم گڈھ میں بھی شور ش

پیدا ہوئی جیل خانہ کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا' اس زمانہ میں یہاں وینیلس صاحب کلکٹر تھے اُن کے ساتھ مل کر شیخ صاحب نے اپنے پرگنہ سگڑی میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں گاؤکشی کا جو مشہور ہنگامہ اعظم گڈھ میں ہوا، اس میں بھی امن وامان قائم کرنے میں گورنمنٹ کو مدد دی، اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا جس سے شہر خطرہ میں تھا، اس وقت حکام کے ساتھ ملکر شہر اور دریا کے بیچ میں ایک بند بندھوانے میں بڑی مدد دی،

اسی طرح شہر اور ضلع کے پبلک کاموں میں وہ ہمیشہ شریک اعظم رہے اُس زمانہ میں میونسپلٹی کے صدر (چیرمین) ضلع کے حکام ہوتے تھے اور اُن کی ماتحتی میں شہر کے معززین آنریری سکریٹری ہو کر عملاً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، شیخ صاحب جب تک ان کی صحت کام دیتی رہی اس خدمت کو اعزازی طور سے انجام دیتے رہے، فیضِ فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں محترم تھے، اُس زمانہ کی سیاست میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی، اس لئے وہ ہندو مسلمان ہر ایک کے کام آتے تھے اور ہر ایک اُنکی عزت کرتا تھا

اس زمانہ میں نیل کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، شرقی اضلاع میں کثرت سے نیل کی کاشت ہوتی تھی اور چمپارن و گورکھپور سے لے کر اعظم گڈہ تک نیل کی کھیتی کھڑی اور نیل کی کوٹھیاں جاری تھیں، شیخ حبیب اللہ صاحب کی بھی نیل کی کوٹھیاں تھیں جن سے سال میں خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، مولنا شبلی مرحوم کے مکاتیب میں کہیں کہیں اس کا ذکر ہے[1]، اس زمانہ میں زمیندار دیسی شکر بھی بناتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، شیخ صاحب نے بھی دیسی شکر کے کارخانے قائم کئے تھے، بزرگوں کے موروثی

---

[1] مکاتیب شبلی اوّل صفحہ ۱۳ و دوم نامہ فارسی نمبر ۱۰؛

علاقہ میں اپنی ذاتی آمدنی سے خرید کر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، چنانچہ گنگا گھر ؟ کے کنارے دیوارہ کا علاقہ جو اس خاندان کی ملکیت میں ہے، ان ہی کا حاصل کیا ہوا ہے، وکالت و زمینداری اور نیل اور شکر کی تجارت سے اونکی تقریباً تیس ہزار سال کی آمدنی تھی، اور سرکار کو چھ ہزار سال کی مالگذاری دیتے تھے،

غرض علمی قابلیت، قانونی لیاقت، اخلاقی شرافت، دنیاوی وجاہت، ہر دلعزیزی، دولت و ثروت اور سعادتمند اولاد ہر طرح کی نعمت شیخ صاحب کے حصہ میں آئی تھی، مذہبی مذاق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری کے مرید تھے[1] خلیفہ الٰہی شاہ صاحب (ساکن سبرہد ضلع جونپور) کے مرید، شیخ صاحب کے دوسرے بھائیوں نے فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مکاتیب میں مولنا کا ایک فارسی خط اُن کے ایک چچا کے نام جو غالباً شیخ عجیب اللہ ہیں موجود ہے[2] جس میں پوری انشا پردازی صرف کی گئی ہے، شیخ عجیب اللہ صاحب کے نام ایک اردو خط بھی مکاتیب[3] میں ہے، اس میں بھی شاعرانہ تکلفات ہیں، اور ان کو علی گڈہ آنے کی دعوت اور بعض علمی اطلاعات درج ہیں، انہی شیخ عجیب اللہ صاحب کے پوتے جسٹس محمد اقبال ہائیکورٹ الٰہ آباد کے جج ہیں،

شیخ حبیب اللہ صاحب کو اپنے بھائیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی، چنانچہ انھوں نے جو جائداد حاصل کیں وہ صرف اپنے نام نہیں رکھیں، بلکہ برابر برابر سب بھائیوں کو بانٹ دیں،

والدہ ماجدہ مولنا کی والدہ جو حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحبزادی تھیں، نہایت نیک اور دیندار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں، مولنا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر

---

[1] مکاتیب دوم نامہ فارسی ۱۲ میں ان کا ذکر ہے۔ [2] مکاتیب دوم نامہائے فارسی (۳) [3] مکاتیب اول،

فرمایا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اُن کو سحر خیزی کی عادت ان ہی کے حسنِ تربیت سے پڑی، شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو شادی کر لی تھی اس سے وہ بہت دلگیر رہا کرتی تھیں، اور آخر اسی غم میں ۱۸۸۶ء سے پہلے وفات پائی[1]، مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں دو چار شعر اور لکھے جن کو بعد میں کاٹ دیا تھا ان ہی میں ایک بند کا مصرع یہ تھا، ع

ماتمِ مادرِ دلگیر بھی دیکھا میں نے

اور اُن کی یادگار میں اپنے نیشنل اسکول میں جو آجکل "شبلی جارج ہائی اسکول" اعظم گڈھ ہی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں "صدر المنازل" کے نام سے ایک ہال بنوایا ہے،

اولاد | شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے انکی ان بیوی سے چار بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی، بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد شیخ صاحب کے سامنے ہی مر چکی تھی، بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے، ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے، ان کی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور خردانہ اطاعت و پاسِ ادب کا اعتراف

---

[1] مولنا ۲۰ جنوری ۱۸۹۶ء کو اپنے ایک عزیز کو جن کی والدہ کا ابھی انتقال ہوا تھا ایک تعزیت کا خط لکھا ہے جس میں اپنی ماں کی وفات کے سانحہ پر اپنے احساسِ غم کا تذکرہ کیا ہے[2] اس ہال پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

هو الله

این ایوانِ دلکشا کہ صدر المنازلِ این مدرسہ ہست

از زرِ عطیۂ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

الملقب بہ

شمس العلماء

سکرٹری این مدرسہ و فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد

بہ یادگار

والدۂ مرحومۂ ایشاں تغمد اللہ بغفرانہ

بماہ دسمبر ۱۸۹۸ء شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت

مولٰنا کو ہمیشہ رہا، اور مولٰنا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی، چنانچہ جب اپریل ۱۸۸۵ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولٰنا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی، جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرعہ پر تھا ع "بہ سلامت روی و باز آئی"۔ اس نظم کے صرف دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے۔

خار در دیدۂ عدو شکنی　　　حاسداں را جگر گداز آئی

ما بہ نادیدہ در رہت باشیم　　　کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی، اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی، اس نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا، اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے اُمنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی، اس لئے ۸۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اُن کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے اُن کا استقبال کیا گیا تھا، اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا، کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کی گئی، جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا، افسوس کہ یہ ہنگامۂ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہوسکیں، ولایت ہی میں اُنکی صحت خراب ہو چلی تھی، جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی، مجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ۱۸۹۲ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۶ء میں اعزہ کو داغ مفارقت دے گئے، مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادی تھیں، جو مولٰنا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں،

ملہ تاریخ وفات ۲۹ جون ۱۸۹۶ء ہے، دیکھئے (صبح امید)

مولنا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الٰہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے،
اور قابلیتِ قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعتِ خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے، مگر انھوں نے
بھی جوانی ہی میں اگست ۱۹۱۷ء میں وفات پائی، مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہ اور دو صاحبزا
دیاں یادگار چھوڑیں، بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولنا حمید الدین صاحب کے
چھوٹے صاحبزادے محمد عباد سے بیاہی تھیں، چھوٹی نے چند سال ہوے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۳۹ء
میں وفات پائی،

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لئے ناقابلِ برداشت تھا جس کا
شاہد حال ان کے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے، اور آخر یہ کانٹا اُن کی جان لیکر نکلا،

مولنا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولنا کے صاحبزادے حاجی
محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے، کچھ دنوں اعظم گڈہ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے، اور تقریباً پچپن ۵۵
برس کی عمر میں جبکہ وہ بہ مقام کان پور سب جج تھے دہلی میں جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے ۱۹۳۳ء
میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوے، یہی وہ جنید ہیں جن کی نسبت مولنا نے مولوی اسحاق مرحوم
کے مرثیہ میں یہ لکھا تھا،

"خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید"

مولنا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی جن سے ایک
صاحبزادے محمد مرحوم تھے، یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے، اور گریجویٹ ہو چکے تھے،
مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی اسی دن چند گھنٹے پہلے دو دن کی علالت

میں وفات پا چکے تھے، مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا،
ایسی سعادتمند اور کامیاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوانِ شباب میں انتہائی جانکاہ حادثہ تھا،
مرحوم نے ایک بچہ "مظفر حسین" اپنی یادگار چھوڑا، اس حادثہ کے بعد سے قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم
کی تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی نازبرداریاں
کرتے، چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے،

ہاں آں قدر بماں کہ مظفر جواں شود — میسند اینکہ بیکس و بے خانماں شود

ولادت | مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعد ۱۲۷۳ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام
طور سے "غدر" کے نام سے مشہور ہے، اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڈہ کے باغیوں
کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے،

نام | والدین نے بچہ کا محمد شبلی نام رکھا، عجب نہیں کہ یہ نام شیخ صاحب نے اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا ہو، چھوٹے کا نام
جنید رکھا تھا، وہ بھی اسی ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی المتوفی ۳۳۴ھ کا نام مشہور
ہے، مگر درحقیقت یہ نام نہیں، ان کا نام ابوبکر دلف بن جحدر بتایا جاتا ہے، اور شبلی انکے وطن شبلیہ (واقع اشروسنہ ترکستان)
کی طرف منسوب ہے[1]، یہ نسبت ان پر ایسی غالب آئی کہ اس نے نام کی جگہ لے لی،
ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کیساتھ نعمانی لکھنے لگے،
لطیفہ:۔ مولانا شروانی صاحب فرماتے ہیں میری بڑی پھوپھا عنایت اللہ خانصاحب رئیس بھیکن پور سر سید
کے ابتدائی ہمدرد و مخلصوں میں تھے، انکی عنایت کی یادگاریں اب بھی یونیورسٹی میں قائم ہیں، علامہ شبلی کے تقرر کے

---

[1] انساب سمعانی،

ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی و جنید نام سنے تو کہا گیا یہ بغداد سے آئے ہیں،

"نعمانی" کی اس نسبت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں، یا وہ اپنے کو اُن کے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولنا ابتدا میں نہایت سخت حنفی تھے، اور حنفی کہلانا اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے اور طبیعت جدت پسند تھی اس لئے حنفی کے بجائے اپنے آپ کو نعمانی کہا، بلکہ یہ نسبت انھوں نے خود سے اختیار نہیں کی، اُن کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی نے اُن کا لقب نعمانی رکھدیا تھا، مولنا فاروق مرحوم بھی سخت غالی حنفی تھے، اور ان دنوں مولنا عبداللہ صاحب (مئوی ثم غازیپوری) کے سبب سے جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے، مقلد و غیر مقلد کی صدائیں ان اطراف میں بلند تھیں اور حنفی و اہل حدیث میں معرکے برپا تھے، اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی، اسی ماحول میں استاد نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا جو بعد کو شاگرد کے نام کا جزو بن گیا،

مولنا نے ابتدائے جوانی میں اردو میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا، فارسی میں شبلی اکثر اور ایک آدھ غزل میں نعمانی بھی رکھا ہے،

بخواری کہ زکوے تو رفت نعمانی	گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید

دو غزلوں میں پورا نام ہی تخلص میں ڈال دیا ہے،

اے شبلی نعمانی ایں پردہ دری از چیست	اینہا کہ زخود گفتی من نیز خبر دارم
ہم زفیض شبلی نعمانی است	ایں کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی صرف وزن کے سبب سے ہے، اسکا مطلب یہ نہیں کہ نعمانی ان کا تخلص تھا،

بچپن مولنا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گذرا، فطرۃً ذہین تھے، اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت ہی
بچپنے کی بعض باتیں سناتے تھے، ایک دفعہ کا اسی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے، کہ چاندنی رات تھی،
صحن میں لیٹے تھے، اور لوگ اٹھا کر ان کو سائبان میں لے جانا چاہتے تھے، اور یہ نہیں جاتے تھے، کسی
نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا، فوراً جواب دیا واہ چاند تو نکلا ہی، پانی کیسے برسے گا، لوگ اس پر ہنس پڑے
مگر اس ذہانت کے ساتھ ان کی اس طفلانہ سادگی کا قصہ بھی سنئے، ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ
مقرر تھا، ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا، شیخ صاحب کا ایک پرانا ملازم ان کی دیکھ بھال کرتا تھا
وہی پیسہ دیا کرتا تھا، مولنا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ لیتے اور ضد کرتے تو وہ پیسہ کو آگ پر رکھ دیتا اور
کہتا کہ ابھی پیسہ بن رہا ہے، اور آخر وہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا،

تعلیم و تربیت مولنا کی والدہ مذہبی تھیں، اور خود شیخ صاحب بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا
سے ناآشنا تھے، اس لئے اپنی پہلی اولاد کو خدا کا نام لے کر علم دین کی خدمت کے لئے وقف کیا، بعد میں
سر سید مرحوم کی (جو بنارس اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک حاکم عدالت رہے)
تقریر و تحریر کے اثر سے بہت کچھ متاثر ہوگئے تھے، اسی لئے اپنے دوسرے بچوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوائی
شیخ صاحب مرحوم نے قدیم رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بیٹے کا مکتب
کیا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، اُن کے گاؤں کے قریب جیراجپور
کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء تھے، جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور
مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، وہی پہلے معلم مقرر ہوئے، چنانچہ مولنا نے
ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی، اور کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب المتوفی ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء سے جو سبرہد

ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے، پڑھا،

فطری آثارِ کمال | مولوی عبداللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثارِ کمال پائے جاتے تھے، ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا یکایک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں، حالانکہ اُن کا یہ بچپن تھا، مولوی محمد عمر صاحب بزرگانِ قدیم کی ایک عمدہ یادگار تھے، وہ مولانا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے وہ بسبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولانا میں ادبی مذاق بھی بچپن ہی سے تھا، اس زمانہ میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لئے بیتاب ہو جاتے، اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا،

وہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے تھے، کتابیں اُلٹتے پلٹتے اور شعراء کے دیوان پڑھتے اور مناسبتِ طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے[1]،

مدرسہ عربیہ اعظم گڈھ | شیخ صاحب مرحوم اور شہر کے دوسرے اہلِ استطاعت اصحاب نے مل کر اعظم گڈھ ہی میں علومِ عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں پہلے تھوڑے عرصہ تک مولانا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، مولانا نے اسی مدرسہ

[1] مضمون مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم بی اے وکیل اعظم گڈھ، معارف جلد سوم ۱۹۱۸ء ص ۵۲ یہ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ کے باشندے تھے، آخر میں مطب کرنے لگے تھے، اور اسی تعلق سے دانا پور پٹنہ میں رہتے تھے، وہیں ۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں وفات پائی، ان ہی کے صاحبزادہ مولوی ابو المکارم محمد علی مئوی تھے، جو مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے، اور انھوں نے مختلف مسائل پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں، ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء میں وہ بھی وفات پا چکے،

میں مولوی صاحب موصوف سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں،

مولنا علی عباس صاحب چریاکوٹی سے تلمذ — تذکرۂ علمائے حال میں جو ۱۳۰۹ھ میں مولنا کے علم اور مشورہ سے لکھا گیا[1] مولانا کے استادوں میں ایک نام مولانا علی عباس صاحب چریاکوٹی کا لکھا ہے،

مولوی علی عباس صاحب چریاکوٹی بن شیخ امام علی ماں کی طرف سے ملا باب اللہ جونپوری کی اولاد سے تھے، بڑے منطقی، مناظرہ پسند اور عربی کے شاعر و ادیب تھے، ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی[2]،

مولنا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پور — مولوی عبد الحلیم صاحب شرر نے جو مولنا کی جوانی کے دوست تھے، مولانا کے حال میں لکھا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حنفیہ امام بخش جون پور میں غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری سے جو سلسلۂ خیرآباد کے نامور مدرس تھے، چند روز پڑھا تھا، مولنا کے مکاتیب فارسی میں بھی اس مدرسہ کے چند حوالے آئے ہیں، جن سے اس مدرسہ سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے،

لیکن درحقیقت مولنا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مولنا فاروق صاحب چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں،

مولنا فاروق صاحب — مولنا محمد فاروق[3] صاحب چریاکوٹی ان دنوں چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس تھے

---

[1] مؤلفہ مولنا محمد ادریس صاحب نگرامی مطبوعہ نول کشور لکھنؤ [2] تذکرہ علماے ہند ص ۱۴۲ [3] مولنا محمد فاروق عباسی اور مولنا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی اس زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، یہ دونوں قاضی علی اکبر ابن قاضی عطار رسول چریاکوٹی کے صاحبزادے تھے، اور معقول و منقول و ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالامال تھے، مولنا عنایت رسول صاحب ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، علوم معقول و ریاضی و حساب و ہیأت مولوی احمد علی چریاکوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول صاحب بدایونی المتوفی ۱۲۸۹ھ سے جو دو واسطوں سے ملا بحر العلوم کے شاگرد تھے حاصل کیا، اور حدیث مولنا حیدر علی رامپوری شاگرد شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جاکر پڑھی، واپس آکر عبرانی پڑھنے کا شوق ہوا، تو اس زمانہ میں کلکتہ جاکر یہودیوں سے عبرانی پڑھی، اور توراۃ و انجیل و زبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا، آخر وطن آکر قیام کیا۔ ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، سید احمد خاں مرحوم بنارس و غازیپور کے قیام کے زمانہ میں ان کے علم و فضل سے واقف ہوئے، اور توراۃ و انجیل و زبور کے مباحث کے حل کرنے میں انکی

ان کی تعلیم و تدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا، اور شیخ صاحب سے خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان کے پیر
الٰہی شاہ صاحب (ساکن سبرہ ضلع اعظم گڈھ) کے پیر مولانا کامل صاحب ولید پوری کے داماد تھے
اس لئے شیخ صاحب نے مولنا کو ان ہی کے پاس غازیپور بھیجدیا، غازیپور میں گنگا کے کنارے قدیم
شرفا کا ایک محلہ ہے، جس کو میاںپورہ کہتے ہیں، یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان
آباد ہے، جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اس خاندان کے مشہور افراد میں ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) پوری مدد لی، اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، سرسید کے مطبوعہ خطوط میں انکے نام بھی چند خط موجود ہیں

مولنا محمد فاروق صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولنا عنایت رسول سے پڑھا، علاوہ ازیں ہیئات کا فن مولنا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی (بانی چشمۂ رحمت غازی پور) سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے، اور حاشیہ زاہدیہ پر شرح ملا جلال مولوی ابوالحسن صاحب منطقی سے اور بعض علوم ملا نعمت اللہ فرنگی محلی سے پڑھے، علوم معقول و منقول و ریاضی و ادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی، ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علیحدہ ہو کر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اسکا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے تو چشمۂ رحمت غازیپور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڈھ کے مدرسہ میں آئے، کانپور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسۂ خانقاہ میں جو اب بھی قائم ہے، کچھ دنوں رہے، الہ آباد کے مدرسۂ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۷ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، خاکسار کو وہیں آپ سے استفادہ کا موقع ملا، اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں جب مولنا شبلی نعمانی مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے، موصوف نے ترک ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی، اور بعض شائق انگریز حکام کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۹۰۹ء میں مولنا شبلی مرحوم نے پھر ان کو دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا، چند روز رہ کر غازیپور گئے تھے، کہ اسباب و سامان یہاں آئیں کہ وہیں ۲۰- اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی،

مولنا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم و نثر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنائع و بدائع کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقوط قصائد اور خطبے، مولنا کی تصنیفات میں سے عربی و فارسی نظم و نثر کے بعض رسائل یادگار ہیں، مثلاً منظومۂ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف الاقناع عن وجوہ الامتناع اور تطلیقات ثلثہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے، اردو شاعری بھی کرتے تھے، چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڈھ کے ۱۸۹۳ء کے ہنگامۂ گاؤکشی کا واقعہ نظم کیا ہے، اور دوسرا مسدس عوالی ہے، جو مسدس حالی کے جواب میں ہے، جسمانی یادگار محل اولیٰ یعنی مولانا کامل صاحب ولید پوری کی صاحبزادی سے دو صاحبزادے ہیں، شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب اور مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریا کوٹی،

دوسری شادی غازیپور میں کی تھی جس سے کئی صاحبزادے ہوئے، مگر ان میں سے عربی تعلیم صرف ایک نے پائی یعنی م

* محمد یٰسین مرحوم نے، ان تینوں نے جو کچھ پڑھا اپنے والد مرحوم ہی سے پڑھا ۱۲

مورث اوّل شاہ جنید کی بنوائی ہوئی مسجد کا لب دریا نہایت دلکش منظر ہے، اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے، مولانا شبلی مرحوم غازیپور میں اسی مکان کی کوٹھری میں رہتے تھے، خاکسار جب غازیپور گیا تھا تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی،

استاد کی نسبت شاگرد کا بیان

اکتوبر ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں مولانا شبلی مرحوم نے اپنے استاد کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ معتبر بیان ان کے متعلق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لکھتے ہیں:-

"مولانائے موصوف چریاکوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، انھوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے،

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لئے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے، نہ اس کی ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سی سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلّم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے، اور وہ بھی ناتمام رہ گئے، تمام مسائلِ علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے، اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فرو گذاشتوں سے تعرض کرتے تھے،

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں، اور میری تمامتر کائنات ان ہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے، اکثر

اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔

چونکہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی، اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں کہ مُشتِ نمونہ از خروارے

رسیدی در بودی زین دل ز جُنبشِ چشمے　　　بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی

گلشن آمدی غنچہ را در خون جگر کردی　　　نسیم آسا سمندِ ناز بر گل تاختی رفتی

نہ دارد دل دگر تابِ طپیدن　　　نگاہِ خویش را رحم آشنا کن

نہ دارد چشمِ من تابِ جمالت　　　بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن

زمانہ گر ز خطِ حکم تو بہ پیچد سر　　　دو رشتۂ شب و روزش بہ تن شود زنار

مولنٰا فاروق مرحوم منطق کی تعلیم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی دیتے تھے، یعنی نسب اربع قضایا اور اشکال سب کی باقاعدہ مشق کراتے تھے، اور اس کے لئے شرح مطالع کا درس خاص طور سے دیتے تھے، چنانچہ مولنٰا شبلی مرحوم کو بھی ان کی مشق کرائی تھی، اور اس کا درس دیا تھا، (دارالعلوم میں مولنٰا فاروق صاحب نے ہماری جماعت کو بھی تہذیب اسی اصول سے پڑھائی تھی) اسی کا نتیجہ تھا کہ مولنٰا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں میں مشاق ہو گئے تھے، اور منطق اور فن مناظرہ کے اصول سے اُن کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا،

استاد و شاگرد میں اتحادِ مذاق کی متعدد جہتیں جمع ہو گئی تھیں، اسی اتحادِ مذاق نے استاد و شاگرد کے معنوی ربط کو اور زیادہ قوی کر دیا، اور بالآخر جس طرح استاد کی کشش شاگرد کو غازی پور کھینچ کر لے گئی تھی اب شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڈھ کھینچ لائی، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰ھ کے پس و پیش کا ہے، اسی مدرسہ میں جو شیخ صاحب نے قائم کیا تھا مولنٰا فاروق صاحب مدرس اول ہوئے، باہر سے بھی کچھ طلبہ کھینچ کر آئے

جس میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم ہے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو ڈاکٹر انصاری کے مختصر نام سے معروف تھے اور جو یوسف پور ضلع غازیپور کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب جو "حکیم نابینا" کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، اسی زمانہ میں مولنٰا شبلی مرحوم کے ساتھ اسی مدرسہ میں مولنٰا فاروق صاحب سے پڑھتے تھے، شاید ۱۹۲۳ء میں حکیم صاحب سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے، اور اس مدرسہ کا حال پوچھتے تھے[1]،

مولنٰا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولنٰا فاروق کا سا متبحر استاد فیضِ تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں، اور ہونہار شاگرد استاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا، چنانچہ مولنٰا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے تھے "انا اسد وانت شبلی" (میں شیر ہوں اور تو بچہ شیر) اس میں شبلی کی تلمیح قابلِ توجہ ہے،

فلسفہ کی تعلیم پر استاد نے پوری ہمت صرف کی تھی، اور شاگرد نے بھی پوری محنت سے حاصل کی تھی، ایک خط میں خود لکھتے ہیں:- "میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا، اور مدتوں اس میں منہمک رہا" (مکاتیب ۲ شروانی) اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کے علم کلام کی مہارت اور دلچسپی میں اس فن کی مہارت نے خاص طور سے مدد دی،

مولنٰا کو سالہا سال کے بعد بھی جب فلسفہ کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا، فلسفیانہ مباحث پر اتنا عبور حاصل تھا، کہ ۱۹۰۵ء میں ہمارے درجہ میں شمس بازغہ کا سبق شروع ہوا اور اس اہتمام سے شروع ہوا کہ ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب پوری تیاری سے اس کو پڑھاتے تھے، اور مولنٰا درجہ میں آکر اس پر اعتراض وارد فرماتے تھے اور دونوں میں دیر تک رد و قدح جاری رہتی تھی اور ہم لوگ محو تماشا رہتے تھے،

---

[1] افسوس کہ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں دلی میں وفات پائی،

ہمارے عزیز دوست مولانا سید مناظر صاحب گیلانی اُن دنوں ٹونک میں سلسلۂ خیرآباد کے مشہور مدرس مولنا حکیم ابوالبرکات صاحب سے فلسفہ پڑھتے تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے تو راستہ میں لکھنؤ میں ہم لوگوں کے پاس ٹھہر جاتے، مولنا کا قیام اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھا، مولوی مناظر صاحب ان کے پاس ایک دو دفعہ ملنے گئے تو سلسلۂ خیرآباد کے تعلق سے ان سے بعض فلسفیانہ مسائل امتحاناً پوچھے اور اس کے بعد ان پر ایسی اچھی بحث فرمائی کہ مولوی مناظر صاحب اب تک اُسکی مدح فرماتے ہیں۔

مدرسۂ اسلامیہ اعظم گڈہ کی ویرانی کا منظر

مولنا نے قریب قریب درجۂ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولنا فاروق صاحب سے تعلیم پائی، یہ مدرسہ اعظم گڈہ کی موجودہ آبادی سے دکھن طرف پرانی تحصیل کی عمارت سے متصل واقع تھا، اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہی ہے، اور یہ سارا حصہ کھیت ہوگیا ہے، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ "مولنا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڈہ آتے تو اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے، اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولنا پر ہوتی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی زبانِ قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے، ایک مرتبہ وہ بھی ساتھ تھے، شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ، سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے، بہار کا ولولہ انگیز موسم، شام کا سہانا وقت کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول، ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لئے باغ باغ ہو جاتا، مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعتہً ایک کھیت کی مینڈ پر رُک گئے، آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہوگئے، اور اپنے دلگداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے،

جائیکہ بود آں دلستاں در بوستاں با دوستاں	شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن
از فرِ بازِ خسروی ایواں ہمی بسیتم تہی	وز قدِ آں سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

بر جاے طل و جام کر گوزن نہاد ستند پے   بر جاے چنگ و نائے و نے آواز زاغ ست و زغن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا "میری نگاہوں میں وہ سماں پھر رہا ہے جب اسی مقام پر مولنا فاروق مرحوم شرح مطالع کا درس دیا کرتے تھے، یا آج یہ عالم ہے کہ در و دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہے،

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل

رامپور اور لاہور کے تعلیمی سفر ۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ

علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولنا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن اُن کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا، مولنا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے، علاوہ بریں وہ بلا ضرورت شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، مگر مولنا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں مولنا کی بیتابی شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا، ان ہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولنا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں کو خیرباد کہا،

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علما اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں تھیں، لکھنؤ میں مولنا عبدالحیٰ فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بہار علم تازہ تھی، سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث، اور دیوبند میں مولنا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولنا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا، رامپور میں خلد آشیاں نواب کلب علیخاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دیئے تھے، راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے

کہ اول اول ان کو مولنا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامۂ مرحوم کچھ تو فطری جودتِ طبع اور کچھ فیضِ فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے، اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لئے زانوے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے، اور رامپور کا رخ کیا، یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتاے روزگار تھے معقولات میں سلسلۂ خیرآبادی کے خاتم مولنا عبدالحق خیرآبادی اور فقہ میں مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی، ابتداءً مولنا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں مگر ان بزرگواروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا،

مولنا ارشاد حسین رامپوری | معقولات میں مولنا فاروقی کے فیض سے خود علامۂ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لئے صرف مولانا ارشاد حسین[1] کے شرفِ تلمذ پر اکتفا کی، علامۂ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعتِ نظر، اصابتِ رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا، اور اکثر بسبیل تذکرہ ان کے کمالِ فہم و ادراک اور قوتِ تفقہ کے واقعات بیان فرماتے، مولنا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی ایثار الحق کے جواب میں انتصار الحق ان ہی نے لکھی ہے، اور علامۂ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا، غالباً یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو، بہرحال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب

[1] مولنا ارشاد حسین صاحب حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے، کتب معقول لکھنؤ میں پڑھی تھیں، اور باقی علوم ملا نواب صاحب افغانی سے جو اس عہد کے بڑے باکمال عالم تھے حاصل کئے تھے، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی کے مرید تھے، ظاہر و باطن دونوں آراستہ تھا، نواب کلب علی خاں مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ۸ رجمادی الاخری ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی، تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرہ کاملانِ رامپور حافظ احمد علی خاں شوق ص ۳۰ ،

کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی،

دیوبند کی حاضری | اس زمانہ میں دیوبند کے مدرسہ میں مولنٰا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے پڑھتے تھے، اس کشش سے وہ دیوبند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم وہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ وہیں پڑھا، مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں جن پر مولنٰا نے اپنا نام لکھا تھا، وہ کتابیں وہاں اب تک ہیں، اور ان پر اُن کا نام لکھا اب تک موجود ہے،

مولنٰا فیض الحسن لاہور | اس زمانہ میں مولنٰا فیض الحسن[1] سہارنپوری پروفیسر اورنیٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو، طلب کی تشنگی نے اس چشمۂ فیض سے بھی شادکام ہونا چاہا، اور سفرِ پنجاب کے لئے کمربستہ ہو گئے، اولاً مولنٰا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ختم ہو چکی، اب وکالت کے امتحان کی تیاری کریں، مگر آخر کار مولانا کے عزم و استقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی، اور صرف پچیس روپیہ زادِ راہ لیکر لاہور چل کھڑے ہوئے، ان دنوں

[1] مولنٰا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سلسلۂ خیرآباد کے حلقۂ زریں مولنٰا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے، مولنٰا خیرآبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاد تھے، عربی قصائد اُن کے یادگار ہیں، موصوف نے ۱۲۷۸ھ میں قید فرنگ میں جزیرۂ انڈمان میں وفات پائی، مولنٰا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو قدیم شعراء ادب کی طرف متوجہ کیا، حماسہ کا درس ان ہی نے رائج کیا اور حماسہ کی شرح فیضی کے نام سے ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں لکھی، ان کا عربی دیوان اُنکے شاگرد مولنٰا حمید الدین صاحب نے ۱۳۲۴ھ میں حیدرآباد میں چھپوا دیا ہے، اور خود مولنٰا فضل حق صاحب نے یہ فیض حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی سے حاصل کیا تھا، حضرت شاہ صاحب ہی کے ایسے ادیب شاعر تھے کہ خود عربی کے اہل زبان اُنکا لوہا مانتے تھے،

اعظم گڈھ تک ریل نہ تھی، اعظم گڈھ سے جون پور تک تین روپیہ کا یکہ کرایہ کیا، اس پر آئے، جون پور سے سہارنپور تک سات روپیہ کا اور سہارنپور سے لاہور تک پانچ روپیہ کا ٹکٹ لیا، طبیعت چونکہ ہمیشہ سے خوددار اور غیور تھی، اس لئے عربی کے عام طالب علموں کی طرح خانۂ خدا میں ناخواندہ مہمان بن کر جاگیر کی روٹیوں سے شکم سیری گوارا نہ کرسکے، ایک روپیہ مہینہ کے کرایہ کا ایک چھوٹا سا مکان یا کمرہ لیا، اور آٹھ دس روپئے میں دو مہینے کسی نانبائی کی دکان سے کھانے کا بندوبست کیا، اور اتنے زمانہ تک تنگدستی کی تکلیف کو ہنسی خوشی جھیل لیا، مگر والد بزرگوار کو اس لئے زحمت نہ دی کہ وہ اس سفر کے راضی نہ تھے

یہ پوری داستان خود مولانا کی زبان سے سنیئے، دو مہینوں کے بعد جب ہاتھ بالکل خالی ہو گیا تو مجبوراً اپنے والد ماجد کو لکھا، "مرا دو ماہ می گذرد کہ ترکِ وطن کردہ ام و بے گانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بہ کرایۂ یکہ از اعظم گڈہ تا جون پور رفت، ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارنپور شدہ بود، پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی می ماند، اوّل کہ دریں جا رسیدیم دو یک روپیہ بہ حوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد،

مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، انچہ باقی می ماند بہ صرف طعام آمد، اگر انصاف رود بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از و متصور نیست، چوں مزاج عالی اند کے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم اکنون کار مشکل افتادہ است، دیگر چہ گویم" (مکاتیب نامۂ فارسی۔ ۱)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبِ علم کی راہ میں دلدادگانِ کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا، موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا

تصور بھی نہیں کرسکتے،

مولنا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے، اس لئے زیادہ وقت وہیں صرف ہوجاتا بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا، کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کررہے تھے، جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ہرایک کے اوقات مقرر تھے، اس ماحول میں اگر کوئی اور استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولنا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو انہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا، مگر ایک طرف تو مولنا شبلی کا عزم راسخ بے نیلِ مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولنا فیض الحسن کا ذوقِ افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آخرکار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسی میں مولنا ادبیات کا درس لیا کریں، یعنی آنے جانے میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اٹھے وہ بھی افادہ و استفادۂ علم سے خالی نہ ہو،

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم من آں روزی کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانہ میں تعطیل ہوئی، اور مولنا فیض الحسن صاحب دو ماہ کے لئے سہارنپور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناغہ نہ ہو شاگرد نے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا، اپنے والد کو لکھتے ہیں:- "حضرۃ استاذ بہ وطن خویش یعنی سہارنپور تشریف خواہند برد، ایں قدر ناغہ نتواں کرد، مرا ہم عزم سہارنپور است دیگر ہرانچہ مرضی باشد" مولنا کے لئے مولنا فیض الحسن صاحب کی یہ صحبت بہت مؤثر ثابت ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولنا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچایا، مولنا فاروق

مرحوم نکتہ آفرینی کے دلدادہ تھے، اور وہ متأخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبی ہی، شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولنٰنا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالبًا یہی رہا ہوگا، مگر لاہور آئے تو دنیا بدل گئی، شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اُتر گئی، یہاں تک کہ مولنٰنا نے حماسہ گویا حفظ کر ڈالا، اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے،

جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی جو مولنٰنا فیض الحسن صاحب کے ذریعہ سے اُن تک پہنچی، اور پڑھی، اور اس کو استاد سے مانگ کر ساتھ لائے، اور مولنٰنا فاروق صاحب کو دیکھنے کو دی، ایک خط میں لکھتے ہیں:- "نامہاے حضرت مولنٰنا فیض الحسن پے درپے می رسند، جمہرۃ العرب از مولوی فاروق صاحب طلب دارد و بہ من بنویس"۔ (نامۂ فارسی ۲۳)

مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا، جو انھیں علی گڈھ آنے کے بعد ملیں، مگر پھر بھی اُس کا تخم مولنٰنا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا، چنانچہ اسی زمانہ کا ان کا ایک عربی خط مجھے ملا ہے جو آگے نقل ہوگا،

مولنٰنا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآنِ پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولنٰنا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالبعلموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولنٰنا شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا، ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے، ادھر اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دارالعلوم ندوہ میں آکر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا قرآنِ پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیئے،

غرض اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولنا فیض الحسن صاحب کے قلیل المدت درس کا نقش علامۂ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا یہی وجہ تھی کہ استاد مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولنا فیض الحسن صاحب کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی، مولنا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اُس مرثیہ میں صاف طور پر نمایاں ہے، جو مولنا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالم تاثیر میں لکھا ہے، اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہے،

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم	جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسینِ صبوری چند بفسر بہی مرا ناصح	دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن ور نالہ با من ہم نوا باشد	ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
گہے بے خود بہ بر ہم گشتنِ بزمِ ہنر نالم	گہے بے خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں،

نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید	عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستاں بودن
بہ آئینِ دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن	بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستاں بودن

مولنا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء میں وفات پائی، سید سجاد حیدر صاحب (علیگ) بیان کرتے تھے کہ مولنا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ، اور اسی اثر میں ان کا وہ مرثیہ لکھا، جو اُن کے کلیات میں ہے۔

مولنا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے تعلیم حدیث

اُس زمانہ کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم و فنون سے فراغت پا لیتے تھے، تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولنا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی، اور جس طرح انھوں نے دوسرے

فنون کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں یگانہ تھے، اسی طرح حدیث کیلئے بھی انھوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا، مولنا اپنے شیخ حدیث کو اکثر "ہمارے مولنا" کہا کرتے تھے،

مولنا احمد علی سہارنپوری، اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، پہلے ہندوستان میں مولنا شیخ وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری، اور مولنا عبدالحیٔ (تلمیذ مولنا شاہ عبدالقادر دہلوی) سے حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ جاکر حضرت مولنا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی، اور سند واجازت حاصل کی، اس زمانہ میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس وتدریس کے مولنا سہارنپوری کا اہم کارنامہ یہ ہے، کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کرکے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی، مولنا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح وتحشیہ میں بسر کئے، اس زمانہ کے اکثر بڑے بڑے علمائے احناف محدث سہارنپوری کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کیساتھ عمل، اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی، پہلے کتابوں کی تصحیح وطباعت کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوے، بایں ہمہ مولنا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے، کہ وہ بیحد منکسر، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہوکر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے، مولوی شبلی صاحب مرحوم فرماتے تھے، کہ ایک دفعہ بازار میں مولنا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولنا کسی طرح اس پر

راضی نہ ہوے اور خود اپنے ہاتھ سے لیکر گھر واپس آئے،

۷ رجمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو سہارنپور میں وفات پائی،

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی مال و دولت سے بھی متمتع فرمایا تھا، حج سے واپس آکر دہلی میں مطبع قائم کیا اور کتب حدیث کی طبع و اشاعت فرمائی، اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں سب کچھ لٹ گیا، دو برس تک اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس کیمپ میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جاکر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچسو ماہوار کی آمدنی تھی، اس زمانہ میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے نو بجے تک مسجد حافظ جمال الدین صاحب میں جاکر درس دیتے تھے، تقریبًا دس برس کلکتہ میں قیام رہا، اس کے بعد جب آپ کی عمر ساٹھ برس کی ہوئی تو استعفا دے کر کلکتہ سے چلے آئے، اور پھر وطن میں بیٹھ کر ہمہ تن درس حدیث میں مصروف ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپکے درس میں بھی برکت بخشی، اور سیکڑوں علماء اس فیض سے سرفراز ہوئے،

آپ کی سند حدیث کو ہم یہاں تبرکًا اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ سے ہو سکتی تھی[۱]،

سند حدیث | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ وصحبہ اجمعین، امّا بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحٰق عفی اللہ عنہ ان الشیخ الناسك الحافظ احمد علی السّہارنفوری قد حصّل قراءۃ کتب الحدیث وسمعہا عندی فی مکۃ المعظمۃ زاداللہ شرفا وتکریما بعد التفصیل ان الحافظ الموصوف قرء طرفا

---

[۱] یہ سند اور مولانا احمد علی صاحب کے حالات میں نے ان کے صاحبزادہ مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری مرحوم سے خط لکھ کر منگوائے تھے" س"

من الصحیح البخاری وطرفا سمع بقراءۃ الغیر علی وکتاب تیسیر الاصول والجامع لابی عیسی الترمذی
وشمائلہ وکتاب النسائی وابن ماجۃ القزوینی والموطا للامام محمد بن الحسن الشیبانی
ومسند ابی حنیفۃ من روایۃ الحصفکی والعدۃ لمحمد بن محمد الجزری صاحب الحصن الحصین
قرأۃ علی من اولہا الی اخرہا بلا مشارکۃ الغیر فی القراءۃ وکتاب الصحیح لمسلم وسنن ابی
داؤد ایضا اسندہما علی بتمامہا قراءۃ وسماعۃ ومسند الدارمی قرأ علی قدرا معتدا
وشیئا من الجامع الصغیر للسیوطی ومشکوۃ المصابیح والحصن الحصین والحزب الاعظم
والورد الاخیر لعلی القاری وایضا سمع بقراءۃ الغیر علی شرح النخبۃ فی اصول الحدیث وقرأ
علی من التفاسیر شیئا من المعالم للبغوی والبیضاوی والجلالین وجامع البیان و
تفسیر الرحمانی وحصل لی الاجازۃ والقراءۃ والسماعۃ من الشیخ الاجل والحبر الاجل الذی
فاق بین الاقران بالتمیز اعنی الشیخ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ وحصل لہ الاجازۃ
والقراءۃ والسماعۃ من والدہ الشیخ ولی اللہ بن الشیخ عبد الرحیم الدہلوی واسانید
اکثر الکتب موجودۃ فی تصانیفہ وقد اجزت الحافظ الناسک الشیخ احمد علی لقرأۃ
الکتب المذکورۃ ان یشتغل بہا ویعلم المستفیدین بالشروط المعتبرۃ عند اہل الحدیث
واللہ المستعان وعلیہ التکلان واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

محمد اسحٰق ۱۲۵۸

طالب علمی میں مناظروں کا شوق

مولانا کی تعلیم میں منطق کی عملی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ

گفتگو میں منطقی ترتیب، استدلال اور اصولِ مناظرہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے، اور اس حیثیت سے ان کے عہد کے طالب علمانہ حلقوں میں ان کا نام خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ جب طالب علموں کی کسی مجلس میں پہنچ جاتے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی، اور یہ اُس زمانہ کا عام طرز تھا کہ طلبہ میں بات بات پر مناظرے ہوتے تھے، اس طرز میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ تیز اور ذہین طلبہ کی علمی مشق اس کے ذریعہ سے بڑھ جاتی تھی، مسائل زبانی یاد رکھنے کی عادت پڑتی تھی، اور باہمی منافست اور مسابقت میں طالب علم شروح وحواشی پڑھنے، سوال وجواب کرنے، اور ہر روز کچھ آگے بڑھنے کے خوگر ہو جاتے تھے۔

مولوی حافظ شاہ تجمل حسین صاحب[1] (دیسنوی بہاری) جو مؤلف کے ہموطن اور رشتہ میں چچا تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی اور بعض بعض مدرسوں میں اُن کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں میرے سامنے دونوں کی ملاقات ہوئی، اور بے تکلفی کی طالب علمانہ باتیں شروع ہوگئیں، مولانا نے حافظ صاحب سے فرمایا کہ "تم تو میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب) پڑھائی تھی"

[1] حافظ شاہ تجمل حسین صاحب مرحوم نے بڑے بڑے علماء کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے واقعات وحکایات دہراتے تھے، تو سننے والوں کو بڑا کیف آتا تھا، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید وخلیفہ تھے، بڑے باغ وبہار آدمی تھے، فکروغم کبھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا، باتیں بہت ظریفانہ کرتے تھے، ہر محفل اور ہر مجلس میں وہ دلچسپ ثابت ہوتے تھے، اونچے اونچے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں، منشی امتیاز علی صاحب وزیر کے زمانہ میں بھوپال میں بہ ضمن علماء ان کا وظیفہ تھا اور وہیں رہتے تھے، وہ کبھی کسی سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے، اور کبھی کسی کی کڑی سے کڑی بات کا جواب نہیں دیتے تھے، ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب کی مدتوں صحبت اٹھائی تھی، ان کے حالات میں فیض رحمانی وغیرہ کئی کتابیں ہیں، مولد ابی القاسم سیرت میں ان کا چھوٹا سا رسالہ ہے، عمر بھر جہاں گردی میں بسر کی، اخیر عمر میں اپنے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں بڑی عمر پاکر، ۲ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ کو وفات پائی، اور وہیں وہاں کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے، مکاتیب شبلی فارسی ۲ میں ان ہی حافظ تجمل حسین صاحب کا ذکر ہے۔

حافظ صاحب نے جواب دیا "تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ مجھ کو بزعم خش بنا کر اپنی منطق صاف کرتے تھے پھر حافظ صاحب نے اپنا دوسرا احسان یاد دلایا کہ وہ یاد ہے جو سہارنپور کی جامع مسجد میں تم سے اور مفتی عبداللہ ٹونکی سے مناظرہ ہوا تھا اور پنجابی طلبہ اُن کے ساتھ اور پوربی تمہارے ساتھ تھے، اور آخر مناظرہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کر لی، اور ہم لوگ تم کو اپنی حفاظت میں لیکر قیامگاہ پر لوٹے، وہ یہ کہہ رہے تھے اور مولنا مسکرا رہے تھے،

مولنا نے خود بھی مکاتیب میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو اپنا ہم سبق لکھا ہے، (شروانی ۹۱) ہم سبقی سہارنپور میں ہوئی جب وہ اور مولنا دونوں مولنا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے پڑھتے تھے، مفتی صاحب کے صاحبزادہ مفتی انوار الحق صاحب کی کتاب اثبات الوجود یہ الندوہ (ستمبر ۱۹۱۱ء) میں لکھتے ہیں:- وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم اور مولانا ے ممدوح (مفتی عبداللہ صاحب) ایک ساتھ حضرت مولنا احمد علی محدث سہارنپوری کے فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے، سہارنپور جانے کے لئے جب مولنا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنؤ پڑی، یہاں اُن کے بعض احباب فرنگی محل میں مولنا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے، وہ طالب علموں کے مجمع میں داروغہ حیدر بخش[1] کی مسجد میں جا کر ٹھہرے اور مناظرے

[1] یہ مسجد لکھنؤ میں چوک کے بیچ میں اب بھی ہے، اوپر مسجد ہے نیچے دکان ہے، مسجد میں ایک دو چھوٹے حجرے ہیں، یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے ایک طرف فرنگی محل ہے جہاں عربی کے طلبہ پڑھتے تھے، اور دوسری طرف جھوائی ٹولہ ہے جہاں طب پڑھنے والے پڑھتے تھے، اس لئے یہاں علوم عربیہ اور فنون طبیہ کے طالب علموں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا، کوٹھریوں میں طلبہ کا مختصر سامان رہتا تھا، صحن میں ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا تھا، گو حالات بدل گئے ہیں مگر اس مسجد کی یہ خصوصیت اب بھی کسی قدر باقی ہے، طالب علمی میں سینکڑوں علماے جید کے قیام کا شرف اسکو حاصل ہے، استاذی مولنا حفیظ اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حیدر بخش مرحوم واجد علی شاہ کی کسی بیگم کی سرکار میں داروغہ

شروع ہو گئے، مولنا نے جب اسکات المعتدی لکھی ہے تو اس کے جواب میں مولوی نور محمد صاحب ملتانی نے ۱۲۹۸ھ میں تذکرۃ المنتہی لکھی، اس کے دیباچہ میں مولنا کے متعلق عربی میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

"مصنف اسکات المعتدی جب اپنے رامپوری استاد (مولنا ارشاد حسین) کے پاس جا رہا تھا تو لکھنؤ میں ٹھہرا، اور یہاں طالب علموں کی گرفت میں آ گیا تھا، طالب علموں سے مناظرے کرتا تھا، اور اس میں غیظ و غضب ظاہر کرتا تھا اور گفتگو میں بند ہو جاتا تھا، تو جس کا حال طالب علموں کے مقابلہ میں ایسا ہو وہ علماء کے مقابلہ میں کیا ٹھہرے گا۔

مولنا جب رامپور پہنچے ہیں تو یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور میں مولنا عبدالحق خیرآبادی بن مولنا فضل حق خیرآبادی کے سبب سے معقولات کا بڑا شہرہ تھا، ہر طرف منطق اور فلسفہ کے پیچ در پیچ مباحث پر علماء کی آستینیں چڑھی رہتی تھیں یہی اثر وہاں کے طلبہ پر بھی تھا، مولنا رامپور پہنچے تو ہر طرف سے طالب علموں نے گھیر لیا، آخر ہر طرف سے سمٹ کر مولنا ارشاد حسین صاحب کے درس میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ "جب مولنا شبلی علی گڈہ سے جا رہے تھے تو لکھنؤ ٹھہر گئے اور میں وہیں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں اُن سے ملا تھا، اور ان کے چہرہ سے محسوس کرتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۹) کی خدمت پر دس پندرہ روپیے کے ملازم تھے، داروغہ اس زمانہ میں نگڑں کا رکو کہتے تھے، اس زمانہ میں بیگمات جو پاپوش پہنتی تھیں ان میں موتی ٹکے رہتے تھے، یہ پاپوشیں پرانی ہونے پر داروغہ صاحب کو ملجاتی تھیں، وہ ان کے موتی الگ کر کے جوہریوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے، اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، اور اس سے بڑی دولت پیدا کر لی تھی، انہی نے یہ مسجد غالباً ۱۲۸۸ھ کے قریب بنوائی تھی، اور مولنا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے اس کا افتتاح اپنے وعظ سے فرمایا، مولوی حفیظ اللہ صاحب اسی زمانہ میں مولنا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے پڑھنے کیلئے لکھنؤ تشریف لے گئے، اور مولنا عبدالحی صاحب کی سفارش سے اسکا ایک حجرہ ان کو رہنے کیلئے ملا، فرماتے تھے کہ اسوقت وہ بالکل تازہ بنی ہوئی تھی،

کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں سے تھے" جس وحشت و بدگمانی کا ذکر مولنا شرر فرماتے ہیں، وہ اسی مناظرانہ عادت کا اثر تھا،

تکمیل | مولنا احمد علی صاحب کا آستانۂ علم مولنا کی آخری درسگاہ تھی، اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا، کہ مولنا کے والد اور خاندان کے بعض اعزہ نے حج کا قصد کیا، مولنا کو بھی اس سفر کا شوق دامنگیر ہوا، مگر ادھر حدیثِ رسول کی کشش تھی، اور اُدھر روضۂ رسولؐ کی، اس کشمکش میں مولنا نے خود اپنے شیخ کو اپنا رہبر بنایا، اور ان سے مشورہ چاہا، فرمایا کہ پڑھنا تو ہر وقت ہو سکتا ہے، اور یہ سفر ہر وقت میسر نہیں آسکتا، چنانچہ مولنا نے بھی عزم سفر کیا، اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہو گئے اس وقت مولنا کی عمر ۱۹ برس کی تھی، اور کل مدتِ تحصیل چودہ[۵] برس ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی،

سفرِ حج ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء | بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ مولنا بھی حجاز کو روانہ ہو گئے، اس واقعہ کا ذکر مولنا نے اپنے اُس قصیدہ کے ایک شعر میں کیا ہے جس میں انھوں نے ۹۲ء میں سفر قسطنطنیہ کے واقعات کو نظم کیا ہے،

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدا — خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

مولنا کے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض سے ایک مثنوی کے وہ چند شعر ملے ہیں جن کو مولنا نے روضۂ اطہر کے سامنے پڑھا تھا،

---

[۵] تذکرہ علماے حال مولوی ادریس صاحب نگرامی مطبوعہ نولکشور و انگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب غازیپور شائع شدہ مسلم ریویو الہ آباد اگست ۱۹۱۰ء - ص ۱۵۲،

اے بہ کرم کارِ جہاں کردہ ساز | مرہمہ را پیش تو روے نیاز
چوں بہ درت آمدہ ام با اُمید | از کرمِ خویش مکن نا اُمید
چوں بہ درت آمدم اُمید وار | سایۂ لطفے ز سرم بر مدار

اس مذہبی سفر میں مولنا کی علمی تگ و دو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتبخانے ہیں ان سب کی سیر کی، فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا، ابن عبد البر کی کتاب التمہید کا جو موطا امام مالک کی شرح اور حدیث کی دائرۃ المعارف ہے، ایک مرتبہ ذکر آگیا تو فرمایا "میں نے مدینہ منورہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا"

اس سفرِ حج کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے، کہ ایک صاحبِ حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں، تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے، وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے، اور موچنے سے کانٹے نکال رہے تھے، مولنا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پُر سوز لہجے میں یہ شعر پڑھا،

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے | کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہلِ عرب کی فیاضی، سادگی، غیر تمندی، اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا، چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی میں اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتا اور ھلمّوا کہہ کر آس پاس کے اور بدّوں کو جمع کر لیتا اور سب کو تقسیم کر لینے کے بعد خود کھاتا، اتفاقاً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابلِ تقسیم

نہ تھی مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلا کر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا تو مولنا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا، نہ تمھیں کو مزا ملا، نہ تمھارے کسی ساتھی کو، شتربان نے اس کا جو جواب دیا اس سے عرب کی شرافتِ قومی کا پتہ چلتا ہے، اس نے کہا:- یا شبلی ھٰذا عار علینا ان ناکل وحدنا (اے شبلی اکیلے کھالینا ہمارے لئے عار ہی) مردانہ غیرت وخودداری اور شریفانہ عفو و درگذر کی مثال میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولنا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی، ایک بڈھا بدو بار بار ادھر سے گذرتا، اور اس سے گرد اڑتی تھی جو ہانڈی میں پڑتی تھی مولنا کے ایک رفیقِ سفر نے بار بار منع کیا مگر وہ نہ مانا، عاجز آکر انھوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا بدو کے لئے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی، غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہو گئے، یہ بڈھا بدو جوشِ انتقام میں بیتاب تھا، زمین سے تھوڑی سی خاک لیکر کفِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا کہ اس طرح تم کو برباد کردوں گا، مولنا نے اُس سے بہت لجاجت سے معافی مانگی تو معاف کیا، بہت ممکن ہو کہ علامۂ مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر کی مصوّری اسی واقعہ تو ماخوذ

یارمی پرسید شبلی را کہ چوں برباد رفت مشت خاکے در ہوا ایشش پریشاں کردہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ غالباً ۱۸۹۹ء میں وہ علامۂ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے، ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا،

الرمح لا املأ کفی بہ واللبد لا اتبع تزوالہ

نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی شرح میں مولنا نے حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی

کا طریقہ عملاً سکھلایا، تب جاکر اس شعر کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں آیا، فرمانے لگے کہ اہلِ عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں پکڑتے بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں، اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لئے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں، تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی اَنی کافی حد تک پیوست ہو سکے، اسی طرح اصلی اور کتابی زبان کا فرق بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ دورانِ حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو نحو کی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اعراب کا پورا پورا لحاظ رکھتا، یہ دیکھ کر جمال نے آخر ایک روز کہا کہ "یا شبلی انت نحوی" میں نے بوجہ ناواقفیت پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا، مگر بعد کو پتہ چلا یہ تعریف تھی نہ کہ تحسین،

پہلا قومی کام ۱۸۷۷ء جس زمانہ میں مولٰنا تعلیم سے فارغ ہوے، دنیاے اسلام میں ایک بہت بڑی تحریک پھیل رہی تھی، وہ "اتحاد اسلامی" کی تحریک تھی، اس تحریک کے پہلے داعی سید جمال الدین افغانی مرحوم تھے، جنھوں نے آخر میں قسطنطنیہ میں قیام کر لیا تھا، یا قیام کرنے پر مجبور تھے، بہرحال سلطان عبدالحمید خاں نے جو "سلطان روم" کے نام سے اس زمانہ میں مشہور تھے، اس تحریک سے فائدہ اٹھایا اور دنیاے اسلام کی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کی حیثیت سے اُن کو ہر جگہ خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین تسلیم کیا گیا، اور اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، جس وقت یہ تحریک اٹھی تو اس نے جس کی حریص نگاہیں آبناے باسفورس کی زرّین شاخوں پر ہمیشہ پڑتی رہتی تھیں، اور جس کی سلطنت میں تین کروڑ ترک مسلمان بستے تھے، جن سے وہ ڈرتا تھا، اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ اس سلطنت کو مٹا کر دم لے گا، انگریز گو باسفورس کے ساحل پر روسیوں کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے،

لیکن دل سے یہ چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط ہونے نہ پائیں تاکہ کروڑوں مسلمان جو اُس کی سلطنت میں بستے ہیں وہ ترک سلطان کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں حالانکہ یہ خیال سرابسے زیادہ بے حقیقت تھا،

انہی حالات میں ۱۸۷۷ء میں روس اور روم (ترک) کی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان کی فتح و نصرت کی دعا، مانگی جانے لگی، زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے جانے لگے، اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور شور سے تقریریں ہونے لگیں اور تحریریں لکھی جانے لگیں، مولنا شبلی مرحوم کا آغازِ شباب تھا، اس چنگاری نے ان کے تمام قویٰ کو مشتعل کر دیا تھا، انھوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڈہ میں چندہ جمع کرنا شروع کیا، اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ جن کا نام حسین حبیب آفندی تھا قسطنطنیہ روانہ کیا، اپنے دوست حکیم محمد عمر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "چندۂ ایں شہر تا بہ دو ہزار و شش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار بیشتر گرد آید . . . . سپاس ایزد کہ روسیان تبہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند، ہشت ہزار طعمۂ جحیم شدند، وبست و چہار ہزار زخمہاے گراں برداشتہ بر بسترِ خاک طپیدند، نسیمِ فتح و ظفر بر پرچم علم سلطانی وزید، و برادر شاہ گرنیڈ ڈیوک نکلس از بیم ضربتِ دلیران ترک از میاں رمید[1]"

سفرنامہ میں لکھتے ہیں: حسین حبیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ٹرکش کانسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے، کہ محاربۂ روس میں میں نے بحیثیت سکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی" اسی سفرنامہ میں عثمان پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں جو اُن کے سفرنامہ کی تاریخ

[1] مکاتیب فارسی ۱۲

ہے، ۱۸۷۷ء کی جنگِ پلونا کے شیر عثمان پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی یاد اُن کے دل میں کس طرح باقی تھی،" یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے، جس کے مقابلہ میں شہنشاہِ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہِ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے، اور بچہ بچہ اس نامور بہادر کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا، لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا"[1] مولانا مرحوم کے دل میں اسی زمانہ سے جس اتحاد اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا واقعات بتائیں گے کہ اخیر اخیر وقت تک وہ ان کے دل سے نہیں نکلا، بلکہ وقتاً فوقتاً اور اندر ہی اندر جڑ پکڑتا گیا،

ان ایام میں مولانا کے علمی اور ادبی مشاغل ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک

مولانا ۱۸۸۲ء تک اعظم گڈہ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا، مگر ان تمام بے اطمینانیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ان کے علمی، ادبی، مذہبی اور قومی مشاغل ہر حال میں جاری رہے،

تعلیم و تدریس کی خدمت ہمارے علماء کی زندگی کا لازمی جزو رہا ہے، خواہ کوئی وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتا کی مسند پر یا اور کسی سرکاری خدمت پر، کیونکہ یہ مشاغلِ دنیا ان کو اپنے

---

[1] سفرنامہ غازی عثمان پاشا کی ملاقات، ۱۲،

اصلی فرض سے غافل نہیں رکھتے تھے، چنانچہ فرنگی محل کے وہ اکثر علما جو نوابی کے زمانہ میں افتا کی خدمت پر مامور تھے، یہاں تک کہ مولنا کے استاذ الاستاذ مفتی محمد یوسف صاحب بھی جب تک لکھنؤ میں مفتی رہے، درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، یہی حال اُس زمانہ کے دوسرے سرکاری عہدہ دار علما کا تھا، مثلاً مولنا فضل حق صاحب خیرآبادی سررشتہ دار دہلی مفتی عنایت احمد صاحب مفتی صدرالدین صاحب دہلی مفتی سعداللہ صاحب مرادآبادی وغیرہ، یہ سب لوگ اپنے سرکاری عہدوں کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، مولنا کے استاذ مولوی محمد فاروق صاحب کبھی کبھی وکالت کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہیں مقدمات کے کاغذوں کے ساتھ طلبہ کے اسباق کی کتابیں بھی کھلی رہتی تھیں،

شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویو الٰہ آباد میں مولنا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے اور جس کے واقعات خود مولنا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے:- "تکمیل سے فراغت کے بعد انھوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کئے"

اُس زمانہ میں مولنا جن لوگوں کو پڑھاتے رہے اُن میں سب سے پہلا اور بڑا نام تو خود مولانا کے ماموں زاد بھائی مولنا حمیدالدین صاحب مرحوم کا ہے، جو عمر میں مولنا سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے، دوسرے صاحب مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم ہیں جو مولنا کے نہایت عزیز اور مطیع شاگرد تھے، ان کی کتابیں پوری نہیں ہوئیں، لیکن ان کا فارسی مذاق بہت اچھا تھا، وہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۸۲ء میں عدالت میں نقل نویس ہوے، اور بعد کو ترقی کرکے ججی کے محافظ دفتر ہوگئے تھے[۱]

[۱] استاد کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۱۷ء میں وفات پائی، ۱۲

مولنٰنا کے اکثر پرانے خطوط اور قصائد ان ہی کے پاس محفوظ تھے، تیسرے صاحب دیناپارہ (اعظم گڈھ) کے مولوی محمد عمر صاحب تھے، جو بعد کو جون پور کے مدرسہ میں چلے گئے، مولنٰنا کی ابتدائی فارسی غزلیں اور نامے انہی سے ملے، اسی زمانہ میں اپنے دلی دوست وہموطن حکیم مولوی محمد عمر صاحب بندولی کو فارسی میں خط لکھتے ہیں:- "دریں فرصت بہ ادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم، و دیوانِ حماسہ بہ دیگرے می آموزم" (مکاتیب نامہائے فارسی ۷)

معلوم نہیں یہ حماسہ کس کو پڑھاتے تھے، اکبر صاحب اور عثمان صاحب وغیرہ بعض دوسرے عزیزوں کو بھی اس زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھایا کرتے تھے، ۱۰ مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب دیناپاروی کو لکھتے ہیں:- "دریں روزہا دکاں کشادہ ام وتن بہ آموختن کساں دردادہ" (نامۂ فارسی - ۱۳)

اس زمانہ میں مولنٰنا کا دوسرا شغل شعر وشاعری تھا، اس زمانہ کے بعض سربرآوردہ علما، جیسے مفتی صدرالدین آزردہ جو غالب کے ہمعصر اور دوست تھے، فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے، مولنٰنا فیض الحسن صاحب عربی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، مولنٰنا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے، اور نہ صرف شاعر تھے بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے، مولنٰنا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر اٹھا دیتے اور، پوچھتے، شبلی بھیرویں سنوگے؟ پھر گاکر بتاتے، قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جس پُراثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے فرماتے تھے کہ وہ بھی اُستادہی کا فیض تھا، اُس زمانہ میں عموماً فارسی غزلیں کہتے، فارسی قصیدے لکھتے، فارسی نامے بڑی محنت سے انشا کرتے، ورنہ اردو شاعری کا تو اُن دنوں عام چرچا تھا، خود اعظم گڈھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں

پڑھی جاتیں، واہ واہ کا شور بلند ہوتا،

اُن کی اسی زمانہ کی ایک چیز رزمیۂ کابل و قندھار ہے، ۵ صفر ۱۳۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی اُس کی نقل ہمارے سامنے ہے، اعظم گڈھ میں کوئی انگریز تھا جس نے محاربۂ کابل و قندھار میں شرکت کی تھی اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا، اس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کو کوئی اُردو نظم میں ترجمہ کردے، یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لیا، اردو ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کرلیتے، شروع کے شعر یہ ہیں:۔

لو سُنو تیغ و سناں کی داستاں — رایت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں — شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

حکمرانِ بحر و کاں کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

والیِ کابل نے کی جب سرکشی — ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرحِ آشتی — ہو چلا تھا کچھ خیالِ خودسری
روس پر تھا جو گمانِ اختیار — ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سنتے ہی فرمانِ دارائے جہاں — ہوگئی آراستہ فوجِ گراں
تھا رسالہ آٹھواں بنگال کا — ساتھ جس کے ہم ہوئے تھے رہ گرا

اس کے بعد انگریز افسروں کا اور سفر کی منزلوں کا اور واپسی کا تذکرہ ہے، جنرل بیبس اور ڈاکٹر رائٹ کے نام اس میں خصوصیت سے لئے گئے ہیں،

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا، اس رد میں جوان کو غلو تھا، اس کی پرورش میں ان کے استاد مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص ہاتھ تھا، بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلے ہیں، بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو، بندول مولٰنا شبلی کا، اور جیراجپور مولانا سلامت اللہ[1] صاحب کا وطن تھا، مولٰنا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جاکر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا، اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی، اور اس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آکر ترکِ تقلید اور آمین بالجہر رفع یدین اور قرأتِ فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لئے وعظ و تبلیغ شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڈہ کے اطراف میں تقلید و عدمِ تقلید اور ان فقہی مسائل کا شور مچ گیا،

خود مولٰنا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمید الدین صاحب کے عمِ محترم مولوی محمد سلیم صاحب جو پھریا ضلع اعظم گڈہ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولٰنا عبد اللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے (مکاتیب میں ان کا ذکر ہے ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں وفات پائی) ان کے سبب سے گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آکر تفرقہ پڑ گیا تھا،

[1] مولانا سلامت اللہ صاحب حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری (استاد جامعہ ملیہ دہلی) کے والد بزرگوار تھے مولٰنا سلامت اللہ صاحب آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی طلب پر بھوپال چلے گئے تھے، نواب صاحب نے وظیفہ کردیا تھا، اور بھوپال کے بعض مدرسوں کے اہتمام کی خدمت سپرد کردی تھی ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں وفات پائی، ہمارے استاد مولٰنا حفیظ اللہ صاحب بھی اُن کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں،

غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولنا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لئے کمر ہمت چست باندھی، سنا ہے کہ جب یہ سُن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی، اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے، اُدھر سے مولنا سلامت اللہ صاحب اور رُواں ضلع اعظم گڈہ کے مولوی اسد اللہ صاحب المتوفی ۱۳۲۹ھ جو مولانا عبد اللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، مقابلہ کو نکلے، دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوے، اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہئے،

اس عہد میں مولنا شبلی مرحوم نے جو رسالے لکھے ان میں سے صرف ایک کا مجھ کو علم ہے اور وہ "ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام" ہے، یہ چالیس صفحوں کا اردو رسالہ ہے، جو سنہ ۱۲۹۲ء میں کانپور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا تھا، یہ مولنا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں ہے، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترکِ قرأت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے اور آخر میں مخالف کے حدیث و فقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے،

اس رسالہ کا دیباچہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

"کیا عبرت کا مقام ہے، کیا افسوس کا وقت ہے، زمانے کا دور آخر ہے، اہلِ بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمعِ اسلام سنبھالا لے رہی ہے، ادھر بادِ مخالف کے جھونکے چلنے لگے، اب تک تو خیر تھی کیونکہ وہ شمع ہنوز حمایتِ علما کی فانوس میں

اغیاروں کے دستِ ستم سے محفوظ تھی، لیجئے اب اپنے بیگانے ہو گئے، خود محفل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اُسے گُل کرنے کو دوڑے، وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ[1] جمعیتِ اسلام برہم ہو چکی تھی، اعدا نے دین کو بیکس و بیچارہ سمجھ کر دستِ تعدی دراز کر رکھا تھا وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بنتے، دینی عزت کو دنیاوی جاہ و وقار کے ساتھ حاصل کرتے، ملحدوں کے تیر باران اعتراضات کو استدلال و احتجاج کی سپر پر روکتے، جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر و منصور رہتا آیا ہے، آج بھی اس کے نقارۂ فتح و ظفر کی صدا غنیم کے لشکر میں گونجتی، مگر بیدردوں کو اس سے کیا غرض، انھوں نے نام و نمود کے پیچھے جمعیتِ اسلام کو وہ درہم برہم کیا کہ جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے، اور اسکی مضبوط و پائدار بنا متزلزل ہو گئی، جمعہ جماعت میں تفرقہ پڑ گیا، سب و شتم سے گذر کر طعن و ضرب کی نوبت پہنچی، رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا، اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علما اور مجتہدین کے فیصلے ناقابلِ تسلیم قرار دیئے گئے تھے، اب حکامِ انگریزی نے فیصل کئے فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار،

غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے تھے، سمجھتے اور اس پر کاربند ہوتے، مگر یہاں تو وہ مثل ہی

ع "میں تو ڈوبا ہوں وے تجھ کو بھی لے ڈوبوں گا"

اشتہار جاری ہوئے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہب حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں، جو جواب دے وہ انعام لے، علمائے حنفیہ کو اوّل تو درس و تدریس و دیگر مشاغلِ علمی سے فرصت کہاں، دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھائیے تو کس پر، جواب لکھئے تو کس کا؟ اس تمام فرقۂ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درسِ نظامیہ کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتداد علماء میں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولٰنا احمد علی محدث مرحوم

---

[1] آیت قرآنی میں قصداً تبدیلی کردی ہے، "س"

وجناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس دیوبند وجناب مولنٰنا محمد عبدالحیٔ صاحب وغیرہم کو بہت کم اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا، ادھر یہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجئے مسلمانوں سے

رازِ معشوق نہ افشا ہوجائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

حضرات غیر مقلدین اس بے اتفاقی اور عدم اعتنا کو داخل عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، خم ٹھوک میدانِ مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیہ ان چھوٹی جوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی عالم حنفی نے عنانِ التفات ایک ذرا اُدھر پھیر دی تو مدتوں کے لئے فرصت ہوگئی، ایک انتصار الحق کا جواب مرپٹ کر الٹا سیدھا آٹھ دس برس میں تیار ہوا، سو بھی کیا، کاغذ بادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہرچند اس شور وفتنہ انگیزی پر بھی ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ (شعر سعدیؒ)

چو با سفلہ گوئی بہ لطف وخوشی فزوں گردوش کبر وگردن کشی

مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دار وگیر کردی جائے، اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جائے،

اصل مقصود

واضح ہو کہ اس فرقۂ نو کا یہ دعوی ہے کہ ہم قرآن وحدیث کے پیرو ہیں، اور بہ مقابلہ حدیث نبویؐ کسی امام ومجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے، اس رسالہ میں بہ ضمن مسالۂ قرأت فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے، ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قرآن وحدیث سے صاف صاف ثابت ہے، پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چونکہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف

ہے، اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل از راہ فریب و مکر ہے، دوسرے یہ کہ حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کس قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دامِ فریب میں پھنساتے ہیں، اے برادرانِ اسلام اس رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمھیں ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں تو ان سے بیزار ہو جاؤ، اور پھر ان کے دامِ فریب میں نہ آؤ،

امرِ اوّل واضح ہو کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے واجب ہے، ہر نماز میں خواہ وہ سری ہو خواہ جہری، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو کسی قسم کی نماز میں قرأتِ فاتحہ کرنا مستحب بھی نہیں اور واجب کا تو کیا مذکور، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا مدعا ثابت اور اُن کا دعویٰ باطل ہوتا ہے"

اس مقدمہ کو میں نے یہاں اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڈھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا، نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سر سید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا، دعویٰ اور دلیل کی ترتیب اور اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھا کر کہنے کا سلیقہ ان میں فطری تھا، تیسری بات، اس سے اُن کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے جو اس نازک زمانہ میں باہمی فرقہ آرائیوں سے اُن کے دل کو پہنچا تھا،

احناف میں مولٰنا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی "قرأتِ خلف الامام" کے مسئلہ میں ایک معتدل روش رکھتے تھے یعنی ان کو اس مسئلہ میں وہ غلو نہ تھا جو اس زمانہ کے دوسرے علمائے احناف کو تھا، مولٰنا موصوف نے ۱۲۹۴ھ میں "امام الکلام فیما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام"

کے نام سے ایک مفصل کتاب بطور محاکمہ کے لکھی تھی، اور اس میں فقہاے اربعہ کے مسلک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، اور نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہی، جیسا کہ سمجھا جاتا ہی، بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں، اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہی، نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہی کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے، آخر میں مولانا عبدالحئی صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی ہی کہ جہری میں امام کے سکتات میں یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو، اور سری میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے،

عام علماے احناف کی طرح مولانا شبلی مرحوم کا یہ خیال تھا کہ امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہی، اسی بنا پر اسکات المعتدی علی انصات المقتدی کے نام سے ۴۲ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا، اور مشہور مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۹۰ھ میں اس کو چھپوایا، اس کے چھپوانے کا خرچ ان کے چچا شیخ مجیب اللہ نے اپنے ذمہ لیا (نامۂ فارسی ۲۴) رسالہ چھپا اور شائع ہوا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، یہاں تک کہ ہندوستان سے نکل کر مصر و شام اور روم تک پہنچ گیا، ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا تو اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے بعض علما نے اُن کی بڑی قدر کی تھی، مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کا خود ذکر کیا ہی، (ص ۳۶)

اس رسالہ میں مولانا شبلیؒ نے متن میں قال بعض العلماء لکھ کر مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا، اور بین السطور میں مولانا عبدالحئی صاحب کے نام کی بھی

تصریح کردی تھی، لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، رسالہ کی زبان بہت ہی ادیبانہ ہے، دیباچہ میں مشکل الفاظ قصداً لائے گئے ہیں، جو خاص مولنٰا فاروقی صاحب کا ڈھنگ تھا۔

یہ رسالہ جب مولانا عبدالحیٔ صاحب اور اُن کے شاگردوں تک پہنچا تو اُنھوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولنٰا عبدالحیٔ صاحب کے شاگرد مولنٰا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا، رسالہ کا نام "تذکرۃ المنتھی فی ردّ اسکات المعتدی" ہے، ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ "الافادات فی ردّ الاسکات" ہے، اور تیسرا "التنبیہات علیٰ ھفوات الاسکات" ہے، چوتھا رسالہ "الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات"[1] حافظ ملا شعیب حنفی کابلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اسکے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد و عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے، گو خود مولنٰا عبدالحیٔ صاحب نے اس رسالہ کا براہِ راست جواب نہیں دیا، لیکن چند سال کے بعد انھوں نے اپنے رسالہ "امام الکلام" کو دوبارہ چھپوایا تو غیث الغمام کے نام سے اُس پر ایک حاشیہ بڑھایا جس میں منجملہ اور دوسری باتوں کے مولنٰا سے تعرض کئے بغیر اُن کے اعتراضوں کے جواب دیئے ہیں،

مولانا فرماتے تھے کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ مولنٰا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی سے جاکر

---

[1] ایماضات کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے: "لکنه لما کان ظن العوام انه قد اصاب فی مارامه علی انه لایکاد ان یحوم حول المرام، صرفتُ الیه عنان العنایة"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مولنٰا شبلیؒ کے رسالہ کو پسند کیا تھا، اور اس کی مقبولیت ہو چکی تھی،

ملا تھا تو مولٰنا ممدوح نے احناف کی باہمی خانہ جنگی پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ ہم آپس میں لڑتے ہیں اور اہلحدیث کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وہ کس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہتے اور کام کرتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ "مولٰنا کا اشارہ میرے رسالہ کی طرف تھا، اس لئے مجھے ندامت ہوئی"

اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جو ان کے فضل و کمال کا طرۂ امتیاز تھیں موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب و حسن استدلال اور دوسری عربی انشا پردازی، اسی لئے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے انھوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے، مولانا ان جوابی رسالوں کے جواب کے لئے بھی پوری طرح تیار تھے۔ نامۂ فارسی ۱۴ میں، ۷ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو لکھتے ہیں:-

"انشاء اللہ در اندک زمانے از عہدۂ رد تذکرہ بدری آیم، مردماں گویند کہ ایضاحات و رسالۂ دیگر ہم از حافظ صاحب است، تا حال بر علم و استعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم، اکنوں آں ہم برخاست، انشاء اللہ در قریب وقتے بہ غازی پوری رسم و دریں اغلاط و بالغزہا ے مصنف تذکرہ و ایضاحات ہمہ باز خواہم گفت"

اس تذکرہ اور ایضاحات سے اوپر کے وہی دونوں رسالے مقصود ہیں،

اردو زبان و ادب کی طرف گو ان دنوں مولٰنا کی توجہ بہت کم تھی، پھر بھی مولٰنا کے شباب کا یہ عہد وہ تھا جب لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے اور ہر قسم کے اخبارات اور رسالے نکلنے لگے تھے، ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم کا ظریفانہ اخبار اودھ پنچ نکلنا شروع ہو چکا

تھا، اس زمانہ میں اس اخبار میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر مضمون لکھا کرتے تھے، اخبار سیاسیات میں کانگریس کا حامی تھا، اور سرسید کی مخالفت میں نہایت شوخ مضامین لکھا کرتا تھا، مولانا مرحوم اس اخبار کو اُن دنوں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور زبان کا لطف اٹھایا کرتے تھے، میر اکبر حسین (یعنی اکبر الٰہ آبادی) سے مولانا کی واقفیت اسی اخبار کے ذریعہ علی گڈھ جانے سے پہلے ہو چکی تھی، اور اودھ پنچ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں مولانا کو اخیر زمانہ تک یاد تھیں اور خود مجھے سنائی تھیں؛

اس زمانہ میں لکھنؤ سے اردو غزلیات کا ایک دلچسپ ماہوار گلدستہ پیام یار کے نام سے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے، چوک میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے پاس ان کی دوکان[1] تھی

---

[1] مرزا محمد عسکری صاحب بی اے (لکھنؤ) مترجم تاریخ ادب اردو جو مولانا کے پرانے ملنے والے تھے، اپنی اس کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: "منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر "پیام یار" مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے، انکی چوک میں عطر کی دکان تھی جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے، اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے، یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی عبد الحلیم شرر، شوق قدوائی، لڈن صاحب خورشید، ابو صاحب جلیس، سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور اور بے تکلف احباب جمع ہوتے، اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، وزیر تمبولی کی خوش ذائقہ گلوریوں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کی جاتی کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھیں مچکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے، اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے، ایک دن جب کہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے، شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی وقت ۷-۸ بجے شام چوک میں بڑا مجمع تھا، تعزیئے معہ جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے، شور وغل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی، سب لوگ اس سیر میں مشغول، مگر مولانا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلہ میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی اس قدر مشغول و منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوری کتاب اسی حالت میں تقریباً ۱۰-۱۱ بجے تک ختم کر دی، یہ غالباً علیگڑھ کے ابتدائی قیام کا واقعہ ہے،

اور مسجد کی سامنے والی گلی میں اُن کا عطر کا کارخانہ تھا، اور اسی میں اُن کے اس گلدستہ کا بھی دفتر تھا، جو ہر مہینہ مشام روح کو اپنے کلام سے معطر کرتا تھا، مولانا اس کو بھی پڑھتے تھے، اور شاید اسی تعلق سے انہی منشی نثار حسین صاحب کے ذریعہ سے مولانا کی مثنوی "صبح امید" اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پہلی دفعہ چھپی،

اس زمانہ کی بعض اردو غزلیں مکاتیب میں ملتی ہیں اور بعض پرانے شاگردوں کی بیاضوں میں نقل ہیں،

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا، جو اس زمانہ میں بھی موجود تھا، گو اس زمانہ کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا، فرماتے تھے کہ اعظم گڈھ میں کتابوں کی کوئی دکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے، یا دواوین دیکھا کرتے، اس زمانہ کے خطوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، مولوی محمد عمر صاحب دیناپاری کو فارسی میں، ۷ر مارچ ۱۸۸۱ء کو بستی سے جہاں وکالت کر رہے تھے، جونپور لکھتے ہیں:

"درآنجا کتابہاے نایافت فراھم آرند" (نامۂ فارسی ۱۴)

ابن ابی حجلہ تلمسانی حنفی المتوفی ۷۷۶ھ کی ایک تالیف کا نام دیوان الصبابہ ہے، اس میں اس نے عرب عشاق کے واقعات اور عشق و محبت کی لطیف عربی نظمیں اور غزلیں جمع کی ہیں، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا شبلی کے پاس تھا، جو اس وقت دارالمصنفین میں ہے، اس دیوان کے اوراق میں مولانا کے دستِ خاص کا ایک عربی خط کسی کے نام لکھا ہوا رہ گیا ہے، اس نسخہ پر سعدالدین حیدر علوی ۱۲۳۹ھ کی مہر ہے، اور آخر میں سعدالدین حیدر صاحب

کی تحریر ہے کہ "یہ نسخہ میرے ماموں سید محمد حسن خاں نے ۱۲۴۴ھ میں مجھے عنایت فرمایا۔" بہر حال اس
دیوان کے اوراق میں مولانا شبلی مرحوم کی حسب ذیل عربی تحریر ہے،

سلام علیکم

هذا دیوان الصبابة یصل الیکم
واما انی فلا یمکننی حضور
ندیکم لانی اشتغلت بامور
غیر طائلة وقعدت همتی، و
صرفت عنان العنایة الی الدنیا
الدنیة وبرئت من تحصیل
کمال العلم والادب ذمتی، فانی
بحمد الله خلقت وکسب
الفضل سیط من دمی، فهو لا
یفارقنی ان شاء الله فی حالتی وجودی
وعدمی. بل لانی لملازمتی هذه
العهدة الرذیلة ادوم التفکر
فی حالتی، فیزید همی ویزداد ملالتی
وبیدکم الانصاف، ما هذا

سلام علیکم

یہ دیوان الصبابہ آپ کے پاس جا رہا ہے، میں خود
نہ آسکوں گا، اس لیے نہیں کہ میں کسی غیر مفید شغل
میں مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے
اور میں نے عنانِ توجہ دنیائے دنی کی طرف موڑ
دی ہے، اور علم و ادب میں حصولِ کمال کی کوشش
سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھالی ہیں بحمد اللہ
اس طرح بنا ہوں کہ فضل و کمال کے حصول
کا جذبہ میرے خون میں ملا ہے، جو انشاء اللہ مجھ
سے نہ جیتے نہ مرتے کبھی جدا ہوگا، بلکہ میرے
نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے جو یہ معمولی
سی ملازمت کرلی ہے اس کے سبب سے میں
ہمیشہ اپنی نسبت سوچا کرتا ہوں، اس سے
میرا حزن و ملال بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے
ہاتھ میں ہے، اور میری نسبت اس کے سوا

الا الجوس والاعتساف فصبر جمیل وھو حسبی ونعم الوکیل
(۱۲ ش نعمانی)

کچھ سمجھنا صریح ظلم ہے، صبر اس حالت میں خوب ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے، اور کیسا کارساز ہی،

یہ خط غالباً ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء کا ہے، کیونکہ مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ش نعمانی" کرکے دستخط وہ اسی زمانہ میں کرتے تھے، اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُن کی عربی انشا، اسی زمانہ میں کیسی صاف، دلچسپ فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی، اور جو ہندوستانیت اور متاخرین کے تکلفات بارد سے بالکل پاک ہے، دوسرے نادر کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ ان کا مرغِ ہمت اپنے لئے ہمیشہ کسی بلند آشیانہ کا طالب تھا،

اسی دورِ ابتدا میں ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آوردہ ام سزاے آن است کہ سررشتۂ اش بہ ایں چنیں کار رہا بند باشد، دیگراں نہ دانم تا در سرچہ دارند من خود دریں خیال از کشمکش وآویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ بایں ہمہ خوار میا ہاں شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بنجم یاوری کرد ہماں خواہم بود کہ ہستم" (نامۂ فارسی ۱۲)

وکالت کی تعلیم ۱۸۸۱ء و ۱۸۸۲ء ہر باپ کی طرح مولنا کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ پڑھنا پڑھانا جو اُن کے نزدیک بے شغلی کا ایک کام تھا چھوڑ کر وہ کسبِ معاش کی طرف متوجہ ہوں، اور اسکے لئے مولنا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا کیونکہ اعظم گڈھ میں اس وقت مولنا کے والد اور ماموں بڑے کامیاب وکیل تھے اس لئے قدرتی طور پر مولنا کے والد نے یہی شاہراہِ عمل ان کے لئے تجویز کی، مگر خود مولانا کی بلند فطرت

اور مذاقِ سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں:-

"از تطاولِ دہر بہ حفظِ قانون مشغول ہستم بسلیم سمروی ہم دریں کار ماند" (نامۂ فارسی -۸)

بااینہمہ باپ کے حکم سے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ قانون کی ورق گردانی شروع کی، ہر روز کچھ قانونی دفعات یاد کر لیتے اور اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کو جو اس زمانہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے، سنا دیا کرتے، امتحان کا وقت آیا تو مولانا امتحان دینے کے لئے تیار نہ تھے، مگر والد کے اصرار سے امتحان کی فیس بھیجی گئی، اتفاق یہ کہ اتنی ہی تیاری پر مسٹر مہدی مرحوم کو بھی تفریحًا امتحانِ وکالت میں شرکت کا خیال پیدا ہوا، اور فیس بھیجدی، حالانکہ نہ اُن کا ارادہ وکالت کا تھا، نہ انھوں نے پوری تیاری کی تھی، صرف مولانا کے اسباق سُن سُن کر کچھ مسائل حافظہ میں رہ گئے تھے،

مولانا کو غالبًا اپنے جوابی پرچوں کی کمزوری کا احساس تھا، اس لئے امتحان دے کر وہ الٰہ آباد میں کالون صاحب سے جو اُن کے والد کے دوست تھے اور جو اُن دنوں اس امتحان کے ممتحن ہوا کرتے تھے ملے، لیکن جب اُن سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سال ممتحن نہیں تو ملول ہوے، دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا،

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم   ایں قدر ہست کہ تغیرِ قضا نتواں کرد

اس شعر نے اور بھی افسردہ خاطر کیا، اور لوگوں کا یہ طعن کہ انگریزی کے بغیر کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، اپنے بھائی مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"حیاک اللہ دی با کالون صاحب برخوردم، از نام و نسب پہ سید ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد"

معذرت خواست کہ ارسال صحف اردو نگریستن نہ خواہم، دل زدہ بخانہ رسیدم، واز دیوان غیب تفاؤل خواستم ایں شعر بر آمد۔

انچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم — ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوے حرماں نشستم، ہمانا در دل خواہی گفت کہ بایں ہمہ آزادی بہ بیچے دل بستن و کاسۂ آرزو بر سر پایں شکستن یعنی چہ؟ مگر چہ تواں کرد کہ سر بسنگ آمد، و فسحتِ خانۂ دل از تراکم افکار تنگ آمد، دو سہ سالے است کہ پائے طلب در دامن کشیدم و بچیزے نہ رسیدم، عزیزاں گویند کہ بغیر از تعلم انگریزی نخواہی بسر برد، و ایں خود چہ حرف است، جمعے را بیں کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند، و باز بمناصب جلیلہ می رسند، آخر در تحصیلداری وغیرہ او خود مشروط نیست، فی الجملہ ستیزۂ چرخ و آویزشِ بخت برآنم آورد کہ لختے از عمر بہ بادیہ پیمائی و ہرزہ درائی گذارم[1]" بہرحال نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا، مولانا امتحان میں ناکامیاب رہے اور عجیب بات یہ کہ مہدی حسن پاس ہوگئے، اس واقعہ سے مولانا کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی اور تہیّہ کرلیا کہ اب وکالت پاس کرہی کے دم لیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے پہلے قانون کی ایک ایک کتاب کو بالاستیعاب پڑھ کر اصولی کلیات مرتب کئے، اور دفعات کے جزئیات کو محفوظ رکھنے کے خیال سے چند مختصر اشارات وضع کئے، اس طرح پر ایک اپنا خلاصہ مرتب کیا، اس دماغی کاوش کی بدولت مسائلِ قانونی پر خود عبور ہوگیا، اور دوسرے سال ۱۸۸۰ء میں پاس ہوگئے، مولانا کا یہ خلاصہ اتنا کارآمد ثابت ہوا کہ اس کی مدد سے اُن کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے

---

[1] مکاتیب نامہ ہائے فارسی ۔ ۴۴

اعظم گڈھ میں وکالت ۱۸۸۱ء

کامیابی کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ ہوئے، مگر اس راہ میں اُن کی ایمانداری اور سچائی کی بنا پر ہر قدم پر اُن کو مشکلات کا سامنا ہوا، اُن کے یہ دن عجیب کشمکش میں گذرے۔ علی گڈھ جانے کے بعد ۱۶ جنوری ۱۸۸۴ء کو اپنی موجودہ چھوٹی نوکری سے گھبرا کر دوبارہ وکالت کا خیال کر کے کانپتے تھے۔ اپنے چچا کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "والد قبلہ را جز بوکالت روے ورا ہے نیست و باین آزادہ دلی اگر بوکالت نساختہ باشم در نظرِ انصاف مرا دریں میانہ گناہے نخواہد بود، در ظلِ والد قبلہ ہستیم ہمچنیں خواہد بود، آہ! ازاں ہنگام کہ دولت روئے گرداند و کار بدستِ من افتد و دراں آشوب، وے بر جاے ندارم و خواست و ناخواست روے بہ وکالت آرم و خویش را اندازہ نہ نہم، مردماں را بہ ہرزہ و لاف فریب دہم و ایں خواری بخویش در پذیرم و ہم بدیں ذلت و خستگی حسد و ستم باز رہم" (۳) بہرحال مولانا نے والد کے کہنے سے ۱۸۸۱ء میں اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی، مگر اس عزم اور ارادہ کے ساتھ کی کہ ایک حرف بھی حق و صداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس ورع و تقویٰ کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے چل نہیں سکتا،

ملازمت ۱۸۸۲ء

وکالت کے بعد پڑھے لکھے آدمیوں کا شغل ملازمت سمجھا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، نواب وقار الملک وغیرہ بہت سے مشہور اکابر قوم نے انہی معمولی ملازمتوں سے ترقی پائی تھی، شیخ

صاحب کا خیال بھی قدرتی طور پر اسی جانب مائل ہوا، اور مولانا کو عدالت کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت دلوادی، تنخواہ دس روپیے ماہوار تھی، جس میں سے نو روپیے تو مکان سے کچہری تک کرایۂ آمد و رفت میں اُٹھ جاتے تھے، اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی، اور امانت کے فرائض اس دیانت سے انجام دیئے کہ اہل معاملہ کے ہاں پانی پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایۂ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر اور جھلسا دینے والی دھوپ میں روزہ رکھے ہوئے گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرا کرتے تھے، افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا، سائیس دال چاول اُبال دیتا اسی کو کھا لیتے، ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے،

چنانچہ اپنے ایک عزیز کو اسی زمانہ میں ۲۵ راگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں :" ما ہے دو در کار امانت روز از شب نشناختم و در راہ طلب از غایتِ جد و جہد تاب و توان در باختم غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بآمیزش کسے نمی دادم اکنوں از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار و خس افتادہ است، اگر من وخدائے من کہ ایں ہمہ محنت بر دہی و نفس گدازی

از آں دوست تر دارم کہ تر ہاتے چند درہم بافند، دروغ راست مانا را پیش کساں جلوۂ ظہور و فروغ قبول دہند" (نامہ فارسی ۲۰) مولانا مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اور محنت و دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے، مگران کو افسروں کی دربارداری کا سلیقہ کہاں تھا، اور اس کے بغیر ملازمت اور وہ بھی ماتحتی کی ملتی کیونکر، اور مل بھی جائے تو چلتی کے دن، چنانچہ امانت کے اس چند روزہ دوادوش کا انجام خود انہی کی زبانی سنیے، اسی خط میں فرماتے ہیں :" دہر چند دور

راہ پرخطر دوا سپہ تاختم و در آنجا این کار بہر کس و ناکس ساختم مگر با این ہمہ بجائے نہ رسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامن قناعت کشیدم فرمانِ تقدیر ہم نہ داوند تا بہ سند کار گذاری چہ رسد۔" (نامۂ فارسی ۲۰)

نیل کا کام ۱۸۸۲ء

مولانا کے والد زمینداری کے ساتھ نیل سازی کی تجارت وسیع پیمانہ پر کرتے تھے اور اپنے علاقہ میں نیل کے متعدد کارخانے (جو ان اطراف میں گودام کہے جاتے ہیں) کھول رکھے تھے، مولانا کی بے شغلی دیکھ کر اُن کے والد نے اس کام کی نگرانی اُن کے سپرد کی، صبر و شکر کے ساتھ کچھ دنوں یہ کام بھی سر انجام دیا، ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔" چو ازیں کشمکش فارغ نشستم دیگر روئے داد، یعنی کارم بہ گودام و متعلقاتِ او افتاد و ہر چند آں چناں کار سے سزائے ایں ہیچ کارہ نبود، مگر مرا از امتثالِ امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نہ بود" (۴۱ نامۂ فارسی)

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بستی میں وکالت اخیر ۱۸۸۲ء

اس زمانہ میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ویدپوری منصف تھے وہ اتفاق سے اعظم گڈہ آئے اور مولانا کو وکالت کے لئے اپنے ساتھ بستی لے گئے، چنانچہ ۱۸۸۲ء میں چند مہینے بستی میں وکالت کی،

مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی پر اپنا آپ تبصرہ

خوش قسمتی سے ہم کو مولانا کا ایک خط جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو سید محمد فاروق صاحب شاہپوری کے نام لکھا گیا تھا مل گیا ہے، مکتوب الیہ نے یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپوایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:" علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا، خاندان میں علم کا چرچا تھا، اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے،" اس زمانہ

کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا، یہ خاص التزام رہا (اور اس میں مَیں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصولِ فقہ کے لئے ان ہی علمار کے پاس دور دراز کا سفر کرکے گیا، جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارن پوری ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہور میں،

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا، چند روز وکالت کی لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی، اور علمی اشغال میں مصروف ہوا، اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اول علی گڈھ کی پروفیسری ملعت ہوا ..... ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا، اور یہ فطرت تھی" مولنا ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور وکالت سے بعدِ عدمِ مناسبت کے سبب تنگ دل رہتے تھے، با ایں ہمہ اُن کی بلند نظری اور علوے ہمت اُن کو اُن کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی تھی، ۲۵ راگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں "با ایں ہمہ خوار یہا ہماں شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بچشم یاد آوری کردہ ہماں خواہم بود کہ ہستم" (نامۂ فارسی ۲۰)

علی گڈھ کا سفر ۱۸۸۳ء اور سر سید سے ملاقات

آخر وہ وقت بھی آگیا جو اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کے لئے مقرر تھا، علی گڈھ کی تحریک اس زمانہ میں سب سے پُرزور تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، سرسید مرحوم چونکہ مشرقی اضلاع

میں بہت دنوں تک رہے تھے، اس لئے اس تحریک نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کافی اثر پیدا کر لیا تھا، اور خود مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی ہو گئے تھے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں انگریزی پڑھانا شروع کیا، اور ان کو علی گڈھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے، اور وہیں سے اُس سال انٹرنس پاس کیا اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لئے علی گڈھ تشریف لے گئے، منادیِ غیب نے آواز دی "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم" مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے، سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان، اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڈھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء[1]) میں چھپوا دیا،

المجد یصحب علما حیثما یصل	والعلم عن قومنا لا زال یرتحل
یہ۔گی جہاں جہاں جاتی ہے علم کو بھی ساتھ	لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے
نالوا من الذل مالا نالہ احد	اذ لا یری فیھم علم و لا عمل
ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل	نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ان میں نہ علم نظر آتا ہے نہ عمل
ولا تزال تری ینشت شملھم	فی کل یوم وقد ضاقت بھم حیل
اُن کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کیلئے تمام	راستے بند ہو گئے ہیں

[1] علی گڈھ گزٹ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶ نمبر ۲۰ ص ۱۱۷۵،

لا یرغبون الی ما کان ینفعھم — فجل صنعتھم للغی والخطل

مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان نہیں ہے — ان کا تمامتر کارنامہ گمراہی اور پریشان زنی ہے

ترنھم الیوم فی کاب وفی قلق — فلا افاد فتیلا ما بہ اشتغلوا

آج تم اُن کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو — ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا

لا ینتھون وقد ذاقوا وبالھم — عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا

باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن — ان سے باز نہیں آتے نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں

وھل یجازیھم الا بما اکتسبوا — من کان من عندہ الاحکام تنفصل

خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا — ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالھم — فاللہ جازیہ یوما یقطع الامل

پس جس شخص نے انکی اصلاح کے لئے کوشش — کی خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا

ان کنت تسئلنی من ھذہ صفتہ — قلت الامام الھمام السید البطل

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہونگا — امام سردار، بہادر سید،

ھو الذی فاق فی الآفاق منزلۃ — ونال ما لم تنلہ الاعصر الاول

وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ — بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی

من اقبل الدین والدنیا علیہ معا — والآن فی نجح ما قد رام مشتغل

جسکو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک — اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے

نال المکارم من آبائہ وشئی — فی المکرمات علی آثار ما فعلوا

اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کئے اور اس شاہراہ میں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلا

فجدّہ سیّد الاعراب والعجم قد قال یا امتی لما دنا الاجل

اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے اور انکی موت کا وقت آیا تو صرف یا امتی کا لفظ انکی زبان سے نکلا

وھکذا اصنعُ ھذا السیّد العلم یقول یا لھفَ قومی لبئس ما عملوا

اسی طرح اس نامور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا،

یا خیر من سیط حب القوم من دمہ احسِنْ ولا تبتئس من سوء ما عملوا

اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہو گئی ہے عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں ان سے نہ غمزدہ ہو

اَحسِن الیھم ولو جازوک سیئۃً ولا تبال بما قالوا و ما فعلوا

ان کے ساتھ احسان کر اگر وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ وہ کریں اسکی پروانہ کر

اس قصیدہ میں اگرچہ فن کی بعض کمزوریاں ہیں، لیکن اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب یہ طرز ہندوستان میں مفقود تھا اور متنبی وغیرہ شعراے متاخرین کے تتبع کے سوا ہندوستان کے علماے ادب کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، ادب عربی کی یہ نئی شاہراہ جو مولنا فیض الحسن صاحب کی رہنمائی سے اُن کو نظر آئی خاص توجہ کی مستحق ہے، اس قصیدہ میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر خالص عرب شعراء کے کلام کی نقل کرنا چاہتا ہے، قصیدہ میں سرسید کی صرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک اُن کے حسب و نسب و سیادت کی، اور دوسرے اُن کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی قسم کا مداحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح گداگرانہ ذلت وابتذال نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی، علوے نفس، اور ذہنی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔

غالباً اس پہلی ملاقات کا ہلکا اثر سرسید کے دل و دماغ پر اس لئے بھی رہ گیا ہوگا کہ وہ مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پوری طرح واقف اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کے فضل وکمال کے خوشہ چیں تھے۔

علی گڈھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء

اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلّم کی ضرورت ہوئی، اس وقت اس دھندلی سی یاد کو تیز کرنے کا موقع آیا، مولانا فیض الحسن کی تصدیق وتوثیق سے درخواست بھیجی اور بستی سے جہاں وہ وکالت کررہے تھے، لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڈھ گئے[1]، اس زمانہ میں محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے ڈپٹی محمد کریم صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، مولانا علی گڈھ جاکر ڈپٹی صاحب کے یہاں مقیم ہوئے اور ڈپٹی صاحب کی وساطت سے سرسید کے عزیز دوست اور رفیق کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں[2] سے ملے، انھو

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے مولانا کی وفات پر جو مضمون دلگداز میں لکھا تھا اس میں اس موقع پر لکھتے ہیں، علی گڈھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انھوں (مولانا شبلی) نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق وسفارش سے درخواست بھیجی، سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کرلیا، چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڈھ گئے ہیں اس وقت داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا [2] مولوی سمیع اللہ خاں دلی کے عمائد سے تھے، عربی کے فارغ التحصیل عالم، مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے شاگرد، ان کی قانونی نکتہ سنجی مسلم تھی، الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کی، نامور ہوئے، انگریزی داں وکلاء آئے تو یہ طبقہ ہٹا، سب ججیاں ان کو دی گئیں، مولوی صاحب کا باوجود دیوانی حاکم ہونے کے رعب اس قدر تھا کہ سارا ضلع مرعوب تھا، ایک بار پنڈت اجودھیا ناتھ کو بحث کرتے وقت سر اجلاس ڈانٹا اور پنڈت نے معافی چاہی، بہت وجیہہ اور شاندار، دارالسلطنۃ کے اعلیٰ شرفاء کا نمونہ تھے، سرسید کے دست راست، آخر میں دونوں میں بعض مسائل میں سخت اختلاف ہوگیا، اور وہ

نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، اور سرسید سے ملایا[۱]،

بہرحال دونوں کی پسند سے مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک[۲] پروفیسر کے عہدہ پر جنوری ۱۸۸۳ء کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپئے ماہوار پر ہوگیا، اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج کا کام شروع کیا، کالج میں ایف اے اور بی اے کے لڑکوں کو فارسی اور انٹرنس اور سکنڈ کے لڑکوں کو عربی پڑھانے لگے[۳]، کالج کے فارسی کورس میں ان دنوں درۂ نادرہ اور دیوانِ عرفی شامل تھا، یہی دونوں کتابیں پڑھانے کو ملیں[۴]،

بہرحال اُس وقت چالیس روپیے ماہوار کی نوکری مولانا کے حساس دل کے لئے ایک چھپا زخم تھا، اسی زمانہ میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:- "ایں جا کہ آرمیدہ ام وایں ذلت برخویش پسندیدہ۔ نہ دانم کہ تا چرخ را دریں پردہ چہ نیرنگیہا است[۵]" مولانا ایک دفعہ فرماتے تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) علی گڈھ سے علیحدہ ہو کر الہ آباد چلے آئے، اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی کے قریب مسلم ہوسٹل کی عمارت بنوائی، جو اب تک یادگار ہے، ان کے صاحبزادہ نواب سربلند جنگ بہادر مرحوم تھے، (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) [۱] مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے مولانا کی وفات پر ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کے علی گڈھ گزٹ میں اس موقع پر لکھا ہے: نوجوانی میں علی گڈھ تشریف لائے، خان بہادر محمد کریم اس زمانہ میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے، مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا، کتنے آدمی ان کی جوہر شناسی کے بدولت کیا سے کیا ہوگئے، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لئے انتخاب کرکے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا۔" [۲] اس وقت کالج میں عربی پروفیسر مولوی محمد اکبر صاحب تھے [۳] مکاتیب فارسی د [۴] مکاتیب فارسی ۲۵ [۵] مکاتیب فارسی،

میں مولنا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر آنکھ پرنم ہوے بغیر نہ رہی، بہرحال چونکہ علمی شغل تھا اور علمی صحبت، اس لئے اس لذت کے لئے انھوں نے اس تلخی کو گوارا کیا، آگے چل کر مولنا کی تنخواہ سنو روپیے ماہوار ہوگئی، اور عربی کے پروفیسر ہوگئے، اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے، کالج کے علاوہ شہر کے بعض عربی طلبہ بھی کبھی کبھی آکر پڑھتے تھے، اس زمانہ میں علیگڈھ میں مولنا مفتی لطف اللہ صاحب کی درسگاہ عربی طلبہ کا مرجع عام بنی ہوئی تھی، اُن سے جو لوگ پڑھنے آتے تھے اُن میں سے جس کو ادب کا شوق ہوتا وہ مولانا سے پڑھنے آتا تھا، مولانا ماجد علی صاحب جنھوں نے بعد کو بحیثیت مدرس کے شہرت حاصل کی، وہ مولنا کے ادب میں اسی زمانہ کے شاگرد ہوں گے، مکاتیب میں اتنا ہی ہے، کہ "مولوی ماجد علی میرے شاگرد ہیں، ادب مجھ سے پڑھتے ہیں" (شروانی ۱۰)

قیام | مولانا جنوری بھر ڈپٹی محمد کریم صاحب کے یہاں مہمان رہے، یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شہر میں پانچ روپیہ ماہوار کا ایک مکان لے کر اس میں اٹھ گئے۔ مولانا کے منجھلے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم اور ان کے چچا زاد بھائی محمد عثمان صاحب اور ایک اور عزیز عبدالغفور صاحب تعلیم کی غرض سے اُن کے ساتھ گئے تھے، چنانچہ یہ مختصر قافلہ اسی مکان میں جاکر مقیم ہوا،

لیکن اس مکان سے کالج دور تھا، اس لئے آنے جانے کے لئے سواری کا انتظام کیا، مولنا اس مکان میں کئی مہینے رہے، اس مکان کے قریب خواجہ محمد یوسف صاحب[1] وکیل علی گڈھ

---

[1] خواجہ محمد یوسف نے متوسطات تک عربی تعلیم پائی تھی، مولنا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، نیز مولوی سمیع اللہ خاں کے قانون میں ان کا تفوق مسلم تھا، خصوصاً قوت جرح میں، سرسید کے ہواخواہ و معاون تھے، مخالفت کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کا ساتھ دیا، (حبیب الرحمن)

(والد خواجہ عبدالمجید صاحب بیرسٹر) کا مکان بھی تھا، ۲۰ راپریل ۱۸۸۳ء کو اپنے عزیز شاگرد محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا جو مکاتیب میں شامل ہے، اس خط سے اس مکان کی وضع، رہنے سہنے کا انداز اور اس زمانہ کے احباب اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے،

علی گڑھ کے ابتدائی مشاغل اور احباب

عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو جناب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمھیں ہو یا نہ ہو مگر میں تمھاری طرف سے فرض کرکے اپنے طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان وشوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دوگے اور سادے فقروں پر قناعت کروگے، میں جس مکان میں رہتا ہوں شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکھن کی طرف ایک خوشنما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے، اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے، صدر مقام کے دائیں جانب ترکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے، اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے،

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے، اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے

شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اُردو ہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں، اور قیس تخلص کرتے ہیں۔ خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے،

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں، اور بفضلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی، مدرسہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں،

افسوس کہ میرے قصیدہ کی متعدد کاپیاں نہیں، ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کہ گل دل کر پرزے پرزے ہو گیا، اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کر لیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا،

مرثیہ[۱] (جو تم بھی دیکھ چکے ہو گے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے از بس پسند فرمائی ہے، میر اکبر حسین[۲] صاحب بھی ان میں داخل ہیں،

یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں، اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں، بہت ساحصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں، اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے فخریہ کتابیں بھیجدیا کرتے ہیں۔"

---

[۱] سالار جنگ اوّل کا مرثیہ مراد ہے، جو دیوان میں شامل نہ ہوا، مگر علی گڈھ گزٹ میں چھپا ہے،
[۲] مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی مراد ہیں، وہ اس زمانہ میں علی گڈھ میں منصف تھے،

سرسید سے میل جول | مولانا چونکہ کالج کے احاطہ سے باہر رہتے تھے اس لئے دونوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع کم ملتا تھا، مگر جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے ایک دوسرے کی قدر پہچاننے لگے، مولانا کو سرسید کے کتب خانہ کی محبت تھی، اور سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے۔ سرسید کے بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کا نشان اب بھی باقی ہے، سرسید نے مولانا کو اس میں جگہ دی، اور وہ شہر سے اٹھ کر اس بنگلہ میں چلے آئے، یہاں آجانے کے بعد دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہوگئی، اگر مولانا کسی دن نہ جا سکتے تو آدمی بھیجکر بلواتے، اور مختلف علمی اور قومی مذاکرے درمیان ہوتے،

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید صاحب بوعلی سینا کی اشارات جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے دیکھ رہے تھے، کوئی بھاری ایسا تھا جس کو وہ حل نہیں کرسکتے تھے، اتنے میں وہ جا پڑے، سید صاحب نے کہا خوب آئے، یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا، مولانا فرماتے تھے کہ بلاقصد میری زبان سے نکل گیا کہ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، کہنے کو تو کہدیا مگر سخت شرمندگی ہوئی، سید صاحب چپ رہے، مولانا نے کتاب کا مطلب سمجھایا تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر جو مولانا کے پرانے دوست تھے، اور اس زمانہ میں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، مولانا شبلی کے پاس علیگڈہ جا کر کبھی کبھی مہمان ہوتے تھے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

"علی گڈہ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے

سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا، ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھکر سید صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا، اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولٰنا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی،

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے؛ اور تحقیق و تدقیق کے لئے انھیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا، اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش و جستجو اور جلبِ روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے، اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا، مولٰنا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بے تکلّفی تھی، اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں، سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے، اور مولٰنا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم

جو ان دنوں شائع ہوئی تھی، "صبحِ اُمید" ہے، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے، اور اُسی زمانہ میں علی گڈھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔"

علی گڈھ میں ابتدائی مشاغل

تعلیم و تدریس کے علاوہ علی گڈھ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعر و شاعری تک محدود معلوم ہوتے ہیں، ان ہی لوگوں سے اُن کو دلچسپی تھی، جن کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، فارسی نامے اب بھی لکھے جاتے تھے، مگر اب قلم نے اردو خط کا بھی آغاز کر دیا، فارسی میں غزل اور قصیدے اور اردو میں صرف غزل لکھتے تھے، ۲۰ اپریل ۱۸۸۳ء کے مذکورۂ بالا خط سے اُن کا شاعرانہ ذوق بالکل نمایاں ہے، اردو غزلیں بھی لکھ لکھ کر وطن کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیجتے، مکاتیب جلد اوّل میں محمد سمیع صاحب کے خطوط میں کئی اردو غزلیں نظر آئیں گی، ان غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۸ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط ۵ میں لکھتے ہیں :- "آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کر لیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی، دو تین شعر مزے کے ہیں، تمھیں بھیجتا ہوں۔" پھر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط ۶ میں اپنی دو اردو غزلیں محمد سمیع صاحب کو اور ایک فارسی مولوی حمید الدین صاحب کو بھیجتے ہیں، ۱۰ فروری ۱۸۸۴ء کو پھر ایک اردو غزل محمد سمیع صاحب کو ان کے خط ۸ میں سنائی جا رہی ہے، اسی تاریخ کے خط میں ایک قصیدہ عیدیہ کے لکھے جانے کی بشارت ہے، جو ۱۸۸۳ء میں لکھا جا چکا تھا اور گزٹ میں چھپا تھا، اور دیوان

مین بھی شامل ہے، اسی خط میں اپنے فارسی دیوان کے مرتب کیے جانے کے خیال کا بھی اظہار ہے۔
۲۷ مارچ ۱۸۸۳ء کو یہ خیال اتنا غالب ہوتا ہے کہ اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے
درخواست کرتے ہیں کہ اُن کے فارسی کلام کو دیکھ لیں کیونکہ وہ چھاپا جائے گا، اسی تاریخ
کے خط میں ایک فارسی واسوخت اور ایک اردو نامہ لکھے جانے کی خبر دی ہے، فرماتے
ہیں: "قابل دید ہیں، خود اپنی زبان سے سناؤں گا" (سمیع ۱۰) ۲۴ - اپریل ۱۸۸۳ء کے خط
(سمیع ۱۲) میں فرماتے ہیں: "واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں یعنی ۹۰ شعر، اور اسی قدر نامۂ اردو
کے، حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا، میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سب
چھپ جاتا، مگر روپیہ نہیں۔"

کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شہرہ

اب کالج مولانا کے شعر و سخن کے چرچوں سے چمکنے لگا، انہی
دنوں اپریل ۱۸۸۴ء میں "حیراں و فراواں" کے قافیہ اور "چہ کنم"
کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، لڑکوں میں چرچا ہوا، کچھ نے کہا کہ استاد کی غزل پر
غزل لکھنے سے کیا حاصل؟ آخر اس زمانہ کے دو مشہور فارسی شاعروں خواجہ عزیز الدین[1] صاحب
مصنف قیصر نامہ پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ، اور غالب کے شاگرد نیر دہلوی کو حکم مان کر مولانا اور
حزیں دونوں کی غزلیں بحذفِ مقطع بھیجی گئیں، دونوں نے تسلیم کیا کہ مولوی شبلی نے جو لکھا وہ
اہلِ زبان کا کلام ہے، حضرت نیر نے تو بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے؛
(مکاتیب اوّل سمیع ۱۲)

---

[1] خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے، لکھنؤ میں اس زمانہ میں انکی فارسی دانی کی دھوم تھی، اُن کا فارسی کلیات چھپ گیا ہے

مولنا کی یہ غزل دیوان میں نہیں صرف دو شعر ہیں،

خود گرفتم کہ بہ زلفش نفرو شم دل و دیں   در بشارت بر و آں نرگسِ فتاں چہ کنم

چاکے از دستِ جنوں بہرہ من باشد و گر   ارمغانش نفرستم بہ گریباں چہ کنم

لیکن مولنا کے ایک پرانے شاگرد کے ذریعہ سے ہم کو یہ پوری غزل مل گئی ہی، مطلع یہ ہی:-

گرِ کم عقل نہ گیرم منِ حیراں چہ کنم   می دہد بنچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

یہ پوری غزل دوسرے موقع پر ہدیۂ ناظرین ہو گی،

اسی واقعہ کا یا اسی قسم کے دوسرے واقعہ کا ذکر مولنا ذکار اللہ صاحب نے اپنے اُس تبصرہ میں کیا ہے جو انھوں نے مولنا کے مجموعۂ نظمِ فارسی کے پہلے اڈیشن پر لکھا تھا، اور جو ۸- ستمبر ۱۸۹۳ء کے علی گڈہ گزٹ میں چھپا تھا، وہ لکھتے ہیں :- "مجھے ایک دفعہ کا ذکر خوب یاد ہے کہ انھوں نے (مولنا شبلی نے) اپنی غزل کے اور شیخ علی حزیں کی غزل کے اشعار ملا کر لکھے اور قدر شناسانِ سخن ذوالقدر خاں بہادر خواجہ غلام غوث صاحب اور جناب نواب ضیاء الدین خاں فردوس مکاں کے پاس اس درخواست سے بھیجے کہ جو اشعار اس غزل میں آپ کو زیادہ پسند آئیں اور اچھے معلوم ہوں ان پر صاد لکھ کر میرے پاس عنایت فرمائیے، ان مبصرانِ سخن نے مولوی صاحب کی استدعا کے موافق غزل کے اشعار پر صاد لکھ کر کے واپس بھیجدیا تو زیادہ تر صاد مولوی صاحب ہی کی غزل پر تھے"، اس حوصلہ افزائی کا غالباً یہ اثر ہوا کہ مولنا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) اُن سے آگے چل کر مولنا کے عزیزانہ و بزرگانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولنا لکھنؤ جاتے، اُن سے ملتے، بلکہ ان کے پاس ہی ٹھہرتے، اخیر اخیر زمانہ میں غالباً ۱۹۰۸ء میں ایک دفعہ خاکسار بھی مولنا کی ہمراہی میں خواجہ صاحب کے یہاں گیا تھا، بڑے اہتمام سے انھوں نے کشمیری چائے پلائی تھی، ۸۰ برس کی عمر پا کر ۱۹۱۵ء میں وفات پائی،

نے حزیں کی تتبع میں اور بھی غزلیں لکھیں (دسمبر ۱۲)

مولنا کی ان شاعرانہ جولانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا کوئی جلسہ ہوتا اُس کے پروگرام میں مولنا کی نظم ایک ضروری چیز ہوگئی، جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی،

نیا رنگ

اب مولنا ایسی آب وہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم وجدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد وپیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علٰحدہ کرنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی، بحمد اللہ کہ مولنا میں یہ بصیرت موجود تھی،

جدید تعلیم پر مولنا کا پہلا تبصرہ

اب تک جدید تعلیم کے محاسن ومعائب کی خبریں مولنا دور سے سنتے تھے، اور اب اُن کو اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جانے کے چند ہی مہینوں کے بعد اپنے وطن میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمایش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھکو بی، اے کی نسبت (اس زمانہ میں بی اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کردیں گے، لاحول ولا...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی[1]" اس بیباکانہ اظہار وبیان سے معلوم ہوگا کہ نئی تعلیم کی ظاہری

[1] مکاتیب جمع ۱۰

چمک دمک سے اُن کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی

علی گڈھ کے اثرات: موضوعِ شعر میں تغیر

بہرحال علیگڈھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کرلیا، ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن و عشق کی جھوٹی کہانیوں سے بریز ہوتے تھے، اب قوم و ملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے "مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے؟" یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا، اسی سال ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسو رلا گئی، ایک قصیدہ عیدیہ لکھا، جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دوگانۂ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں ان کے چند قطرے یہ ہیں:-

حیف کیں شور و طرب یک دو نفس بیش نماند	چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمعِ اسلام چو باشد ہدفِ تیرِ بلا	خود چو کج باخت بہ ایشاں فلکِ عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید	آہ از فتنہ گری ہائے سپہرِ کج باز
خود ہماں جمع کہ می داشت ہم تیغ و قلم	خود ہماں قوم کہ بودہ است بہر پایہ فراز
اینک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن	خود بہ بیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز
شرحِ ایں حادثہ از شبلیِ دل خستہ مخواہ	شب بود کوتہ و افسانہ درازست دراز

یہ اثر روز بروز تیز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی "صبح امید" لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پُردرد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ اُمید کے طلوع کی خوشخبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبولِ عام ہوئی،

سرسید نے ایک بار نمائش گاہ کے موقع پر علیگڈھ میں ایک قومی تماشہ کا جلسہ کیا، جس میں قوم کے حالِ زار کا پُر اثر منظر دکھایا، اس میں خود سرسید اور دوسرے اکابر نے تقریریں کیں، اور نظمیں پڑھیں، مولٰنا نے اس میں اپنا وہ اردو مسدس پڑھا جو اسی مثنوی کے ساتھ چھپا ہے، انھوں نے اس مسدس کو اپنے پُر درد و پُر سوز لہجہ میں جب پڑھا، تو سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، تفصیل آگے آتی ہے[1]،

بہرحال اس وقت سے مولانا کی نظموں کا موضوعِ سخن بدل گیا، کالج کے یونین میں، ایجوکیشنل کانفرنس میں، اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں وہ نظمیں پڑھیں کہ جب وہ پڑھی جاتی تھیں تو صدر سے لے کر پائیں تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا تھا، ان کی یہ نظمیں دیوان میں موجود ہیں، اور ہر شخص آج بھی ان کو پڑھ کر ان کی تاثیر کا امتحان کر سکتا ہے،

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس

علی گڈھ تحریک کا دوسرا اثر اُن پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر منکشف ہوگئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انھوں نے خود شروع کیا، اُنکے مکاتیب میں ان کے عزیزوں کے نام کے خطوط انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اُس کے حصول کی تاکید سے بھرے ہوے ہیں، علی گڈھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کریں، چنانچہ ۲۰۔ جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڈھ میں قائم کیا، خود سکریٹری ہوئے اور عزیزوں کو ممبر بنایا، اُن کے والد بزرگوار اور دوسرے عزیزوں اور ہمدردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی، اس کی عمارت اور تعمیر کے لئے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی، اعزہ اور برادری کے لوگوں سے چندے لئے، اور صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں

[1] مولٰنا شروانی فرماتے ہیں:- "میں بھی اس تماشے میں بحیثیت تماشائی شریک تھا، علامہ کی پُر درد آواز اب تک دل کے کانوں میں گونج رہی ہے"

سے کام شروع ہوا، رفتہ رفتہ مدرسہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہوگیا، مولانا کے مکاتیب میں اُن کے عزیزوں کے نام کے خطوط میں اس اسکول کا جس کثرت سے ذکر ہے، اور اس کی طرف اپنے عزیزوں کو جس شدت کے ساتھ ملتفت کیا ہے اس سے اُن کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جو ان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کیسا پیدا ہوگیا تھا، برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لئے "موازنۂ ترقی قومی" کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی، جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی رووداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنۂ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے،

ایک دوسرا اسکول اپنے گاؤں بِندَوَل میں قائم کیا، جو غالبًا ابتدائی تھا اور آگے نہ بڑھ سکا، (دیمع ۶) شہر پٹنہ میں سرسید کے رفقا میں سے قاضی رضاحسین صاحب اور دوسرے اعیانِ شہر کی کوشش سے اینگلو عربک اسکول قائم ہوا تھا، جو اب تک قائم ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کا خاص مدرسہ ہونا، اور اس میں آٹھ لڑکوں میں سے پانچ مسلمان لڑکوں کا انٹرنس پاس کرنا ایسا واقعہ تھا جس پر خوشی کی جاتی تھی، چنانچہ ٨۔ مئی ۱۸۸۶ء کو مولانا فخر و مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع اپنے عزیزوں کو بھیجتے ہیں:۔ "ابکی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے جن میں پانچ مسلمان ہیں۔" (دیمع ۔ ۲۲) مولانا کو انگریزی کی ضرورت کا احساس اتنا ہوگیا تھا کہ علما کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، اس احساسِ ضرورت کا ایک دلچسپ واقعہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا، علما کے لئے انگریزی دانی کی ضرورت کے سلسلہ میں فرمایا، "جب میں ترکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو

۱۲- بجے تار آیا، میں نے اس کو کھولا، دل میں وہ دھڑکا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیسا تار ہے، خیر میں دوڑا ہوا سر سید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا، انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے، وہ آپ کو تُرکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارکباد دیتے ہیں، یہ حال ہم مولویوں کا ہے۔[۱] اسی لئے وہ ندوہ کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر بجد تھے، چنانچہ دار العلوم ندوہ کے نصاب میں اس کے داخل کئے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی (شروانی ۲۱ و ۲۲) مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر اُن ہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی، فرمایا، عجیب بات کہتے ہو، اگر آج ہمارے فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے، اصل یہ ہے کہ مولانا کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے، اس لئے من نہ کردم شما حذر بکنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علما، ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجا لا سکیں،

تاریخی ذوق اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا، لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکایک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے، مولانا کی طبیعت میں اس ذوق کا بیج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر لائیٹنر (G.W.LAITNER) کی کتاب سنینِ اسلام کے مطالعہ سے پڑا، ڈاکٹر لائیٹنر عربی وفارسی کے مشہور عالم اور اورنیٹل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے، انھوں نے عربی کے طالبعلموں کے لئے ۱۸۷۱ء

[۱] رودادِ ندوۃ اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۶

میں سنین اسلام کے نام سے اُردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی، اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولنا فیض الحسن صاحب سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج اور مولوی غلام مصطفیٰ صاحب نے مدد دی تھی، اور اس کی اردو زبان کے درست کرنے کا کام مولنا محمد حسین آزاد نے انجام دیا تھا، غالباً تاریخ کی یہی پہلی کتاب تھی جو عربی خواں طالبعلموں کے ہاتھوں میں آئی، اور غالباً مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہور ہی کے زمانۂ قیام میں ہاتھ آئی، میں نے سنا ہو کہ مولنا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات کے واقعات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا جب علی گڈھ پہنچے تو اس کتاب کی یاد اُن کو پھر آئی، اُس کا نسخہ مولانا سے ان کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب نے لے لیا تھا، ۲۷ - مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ اپنا نسخہ ان سے منگواتے ہیں (سمیع ۱۰ و ۱۱) اس سے پہلے ۲۶ جنوری کو مولنا محمد حسین صاحب آزاد کو خط لکھواتے ہیں کہ کتاب کا ایک نسخہ الہ آباد ایک صاحب کے پاس بھیجدیا جائے، (سمیع - ۶) اس سے ایک سال پہلے ۱۸۸۲ء میں مولانا نے جو فارسی عیدیہ قصیدہ لکھا تھا، اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں،

اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعہ سے تھے، جب وہ علی گڈھ پہنچے اور سر سید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ وجغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا،

تصنیفی ذوق مولنا میں تصنیفی ذوق تو پہلے سے موجود تھا، اُن کی پہلی عربی تالیف اسکات المعتدی
اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے مناظرانہ رسالے چھپ چکے تھے، یہاں آکر اُن کے تصنیفی ذوق کا
محور بدل گیا، مولانا مجھ سے فرماتے بھی تھے، اور مکاتیب میں اڈیٹر زمانہ کے ایک استفسار نامہ کے
جواب میں بھی لکھتے ہیں :- "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا
جو یورپ میں چھپی ہیں، اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا"
یہ یکجا کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا، فرماتے تھے کہ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں
کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا،
کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی، اس
حکایت کی تصدیق مکاتیب سے بھی ہوتی ہے، ۱۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں :- "سید صاحب نے اپنے کتبخانہ
کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید
صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیۂ عرب کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے،
مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں" (ضمیمہ۔ ۴۰) یورپ والوں
کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط کا نمونہ مولانا کے سامنے گبن کے رومن
امپائر کا اردو ترجمہ ہے، جس کو سرسید نے اپنے لئے کرایا تھا، ایک خط میں ۱۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں
"گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے[1]"
(ضمیمہ۔ ۴۰) اس کے بعد دوسری کتاب جو ان کے ہاتھ میں آئی وہ مشہور عربی داں انگریز مسٹر پامر کی

۱؎ تاریخ گبن کے ترجمہ کا یہ مسودہ کالج کی لائبریری میں تھا، جو سرسید کے بعد چوری گیا، اور آخر مولنا حالی کو

حیاتِ ہارون الرشید ہے، اس کا ترجمہ مولانا کے زیر نظر تھا جس کی شہادت مولوی عبدالرزاق صاحب مصنفِ البرامکہ نے جو ان کے معاصر ہیں دی ہے، مولانا نے المامون میں گبن کا کئی مقامات پر اور پامر صاحب کا ایک دو جگہ ذکر کیا ہے،

تصنیف کی تیاری | ان کتابوں کے مطالعہ سے مولانا کو پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ کا خیال آیا اور پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی العباس تک محدود ہو گیا، اور غالباً اس کے لئے اُن کے سامنے سنین اسلام کا نقشہ تھا، چنانچہ اس دوران میں انھوں نے وطن سے سنینِ اسلام کا نسخہ منگوایا (ضمیمہ ۱۰) اور اسی سال ۱۹۰۳ء میں تاریخ بنی العباس کا کام بڑی محنت سے شروع کیا، (ضمیمہ ۱) اور ۹ اپریل ۱۹۰۴ء کو خلیفہ معتصم کے حالات تک وہ پہنچ چکے تھے، (ضمیمہ ۱۱) لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، اور اس کو نامورِ فرمانروایانِ اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) اس کا پتہ لگا، مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے وہ نسخہ لاکر مولانا حالی کے حوالہ کیا، مولانا حالی ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں: "۴۴۸ صفحہ کی ایک ضخیم جلد ہے خفی قلم سے لکھی ہوئی جس کے ترجمہ کی اجرت میں سید صاحب نے مولوی ابوالحسن صاحب کو جو حیدرآباد میں نوکر ہیں، ایک ہزار روپیہ دیا تھا، کالج کی مہریں جابجا لگی ہیں، مگر چوہے نے بعض کو جو حاشیہ پر تھیں کتر کر وہاں اور کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، اور اکثر جگہ پہلے مہر کی سرخی کو سیاہ قلم سے کاٹا ہے، اور پھر کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، مگر ہر ایک چپی چغلی کھاتی ہے اس کے سوا اس مسودہ کے بہت سے آدمی پہچاننے والے موجود ہیں، بہرحال یہ مسودہ میرے قبضہ میں آگیا ہے، کہئے تو محسن الملک کے پاس بھیجدوں اور کہئے آپکے یا مزمل اللہ خاں صاحب کے پاس روانہ کردوں، مگر مجھ کو آپ کی نگہداشت پر زیادہ اطمینان ہے، اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں، (مکتوبات حالی ص ۱۳۰ جلد اول)

مثنوی صبحِ امید

بہرحال ۱۸۸۲ء تک کا زمانہ انھوں نے کامل مطالعہ اور تصنیف کی تیاری میں گذارا، اس وقت تک اُن کی جو چیز منظرِ عام پر آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے، ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبحِ امید چھپ کر شائع ہوئی، جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا افسانہ اور علی گڈھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آیند مرقع ہے، جس کو صبحِ امید سے انھوں نے تعبیر کیا تھا، مولنٰنا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کردیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے،

یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی

کالج پہلا مقام تھا، جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یکجا تھے اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے،

مولنٰنا کو کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لئے سب سے پہلا مسالہ تو سرسید کے کتب خانہ سے اُن کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ اور مولنٰنا شبلی کے تعلقات کی دلچسپ داستان ایک "شاہد عینی" کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولنٰنا شروانی لکھتے ہیں:۔ "بڑی خوش قسمتی علامۂ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست اُستاد کالج میں تھا، یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں، علامۂ شبلی کی صداقت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب

نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے اُنکو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ اُنکو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، نمائشی چیزوں کو رد کر دیا، پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا، اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا، علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی، علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے" کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی ایسے گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بیگانگی دور ہو گئی تھی، پروفیسر ممدوح روزانہ ان کو فرنچ پڑھانے، ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے، اور وہ خود مولانا سے عربی پڑھتے تھے، اس سلسلہ میں تعلیم کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات اور معلومات سے بھی روزانہ واقف ہوتے تھے، مولانا اپنی مجلس میں پروفیسر صاحب کے بہت سے واقعے سنایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کا جو وقت انھوں نے مقرر کیا تھا، اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا، ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہو گئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی، اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے، فرماتے تھے کہ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر لے کر چپکے چپکے از خود عربی صرف و نحو کے مسئلے پڑھنے شروع کئے، چند روز کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے میں عربی عبارت پڑھتا ہوں کہیں غلطی تو نہیں ہوتی، اس کے بعد عبارت پڑھی، ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہو گئی، پروفیسر صاحب کا ایک عربی خط مولانا کے پاس تھا، اور مجھے دکھایا تھا، اس کی عربی کی تعریف کرتے تھے، اس کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے، وحلیلتی تقرئک السلام

(میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے) یہ فصیح ترین عربی ہے، اس کے بجاے یہ مضمون اگر کوئی مولوی لکھتا تو شاید یہ لکھتا وزوجتی تسلم علیک۔

پروفیسر آرنلڈ[1] اور مولانا کے ان ہی تعلقات کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب ۱۸۹۲ء میں جب انگلستان جانے لگے تو مولانا بھی ان کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لئے آمادہ ہو گئے اور آخر ان ہی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تنہا گئے، اور ان ہی کے متعلق اپنے

---

[1] پروفیسر آرنلڈ کالج میں دس برس رہ کر فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڈہ سے لاہور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے، وہیں انھوں نے عربی لغت میں "سواء السبیل فی معرفۃ المعرب والدخیل" لکھی، لاہور کے قیام میں ان کے سب سے لائق شاگرد ڈاکٹر اقبال ہوئے، ڈاکٹر اقبال اور مولانا میں تعلقات کی زنجیر وہی تھے۔ علی گڈہ سے ان کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا جس میں مولانا شبلی مرحوم نے حسب ذیل تقریر کی تھی: "یہ یورپ کی تلوار نہیں جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بگوش کر دیا ہے، بلکہ یورپین قوموں کی خوش اخلاقی ہے جس نے تمام دلوں کو تسخیر کیا ہے، اور آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خصائل کی ایک زندہ تصویر ہے" مولانا نے اس زمانہ کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فرنچ پڑھا کرتے تھے، ایک واقعہ بیان فرمایا جو انھوں نے آرنلڈ صاحب کے نیک اخلاق کی شہادت میں پیش کیا یعنی آرنلڈ صاحب ہر روز صبح کے چھ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لایا کرتے تھے، ایک دن چھ پر صرف ۵ منٹ زیادہ گذر گئے، اور میں دیکھتا کیا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ سرپٹ بھاگے چلے آ رہے ہیں، مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ "مولوی صاحب! ہم آپ کا مجرم ہیں، ہم نے آج دیر کی، آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں" مولوی صاحب نے بڑے افسوس سے فرمایا کہ وہ اس نظم کو تیار نہ کر سکے جو ان کا ارادہ تھا کہ آرنلڈ صاحب کی جدائی پر لکھیں گے، لیکن اس نظم کے بجائے اس وقت صرف دو اشعار پڑھے اور وہ یہ ہیں:

آرنلڈ آنکہ دریں شہر و دیار آمد و رفت ۔۔۔ دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت

آمد آں گونہ بکالج کہ بہ گلزار نسیم ۔۔۔ رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

لوگوں کو یہ شعر اس قدر پسند آئے کہ تین تین دفعہ پڑھوا کر سنے" (کالج میگزین فروری ۱۸۹۸ء ص ۱۵)

سفر روم کے قصیدہ میں یہ شعر لکھا ہے، ع "آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استاد مرا"
آرنلڈ اور شبلی کے سلسلۂ کلام کی دو حکایتیں مولنا کی زبان سے سنی ہوئی مجھے اور یاد ہیں،
فرماتے تھے کہ ایک دفعہ کوئی یورپین فاضل علی گڈھ آکر مجھ سے ملا، اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا، اس
سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی، دو سال کے بعد اُس نے
فارسی ادب پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی، مولنا فرماتے تھے کہ اس کو دیکھکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) وہ لاہور سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے، مولنا اس زمانہ میں حیدرآباد تھے، ان کو پہنچانے حیدرآباد سے بمبئی گئے، اور کوئی تحفہ دیا (حمیدہ ۲۵) انگلستان پہنچ کر وہ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کے سرکاری مشیر ہوے اور ۱۹۲۰ء سے آخر تک وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے،

مولنا کی زبان سے پروفیسر آرنلڈ کا نام میں نے اتنی دفعہ سنا تھا کہ جب مجھے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ملاقات کا شوق تھا، اتفاق یہ کہ وہ خود ملنے آئے اور مولنا شبلی کی نسبت سے بہت محبت سے ملے، وہ اس زمانہ میں انڈیا آفس کے مشرقی صیغہ میں ملازم تھے، ہندوستان میں سرسید اور ان کے دوستوں کے جو خیالات خلافت عثمانیہ کے بارہ میں تھے اور مولنا شبلی نے جو مضمون علی گڈھ میگزین میں لکھا تھا وہ ان سب سے واقف تھے، وہ بار بار آکر مجھے مولنا کے اس مضمون کی طرف متوجہ کرتے تھے اور میں جواب دیتا تھا کہ اس کی حیثیت تاریخی ہے، مذہبی نہیں، اُس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کے سامنے جب ہمارے وفد نے اس مسئلہ کو پیش کیا تو وزیر اعظم کی امداد و مشورہ کے لئے پروفیسر صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے ذریعہ سے مجھے انڈیا آفس کے کتب خانہ کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی،

وہ ۱۹۳۰ء میں مصر کے جامعۂ مصریہ میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ پر لکچر دینے مصر آئے تھے، یہاں سے واپس جاکر ۹ جون ۱۹۳۰ء کو اچانک انتقال کیا، (ان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے معارف اپریل ۱۹۳۱ء) ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "پریچنگ آف اسلام" کی تصنیف اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں شرکت ہے،

مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا، انھوں نے پوچھا کہ آپ اُن سے کب ملے تھے؟ فرمایا دو سال ہوئے، جواب دیا، مولانا یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے،

ایک دفعہ فرماتے تھے کہ میں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت کرتے ہیں وہ آپ لوگ نہیں کرتے، آرنلڈ صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علم ہر روز آگے کو بڑھ رہا ہے اس لئے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لئے وہ اُس کی رسمی عزت کہاں تک کرے"!

یہ دونوں واقعے اس بات کا نمونہ ہیں کہ یورپ کے سیاسی لوگوں کو چھوڑ کر ان دنوں یورپ کے فضلا بھی اپنی قوم کی دماغی فضیلت اور ذہنی برتری کا سکہ کس طرح ایشیا والوں کے دلوں میں بٹھاتے تھے، حالانکہ آرنلڈ صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ مجسم علم تھے، اور علم کی خدمت کے سوا اُنکا کوئی اور مطمحِ نظر نہ تھا، مولانا شبلی مرحوم نے سفرنامہ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے اس کی تصدیق ہو گی، لکھتے ہیں:- "لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر تک مجھ کو سخت پریشان رکھا، ۱۰- مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے، اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے اُن سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر

برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹہ کے بعد انجن درست ہوا، اور بدستور چلنے لگا" مولنا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے حرف شناس ہو گئے تھے، اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے، آرنلڈ صاحب سے انھوں نے فرنچ سیکھنی شروع کی، کیونکہ اسلامی مباحث پر اکثر کتابیں فرنچ اور جرمن میں تھیں، اس لئے ان دو میں سے کسی ایک زبان کو جانے بغیر اسلامیات کے متعلق اہل یورپ کی تحقیقات اور کاوشوں سے براہ راست واقفیت ممکن نہ تھی، مولانا، آرنلڈ صاحب سے موسیو سیدیو کی کتاب "تمدنِ اسلام" سبقاً پڑھتے تھے، اور جس نسخہ میں پڑھتے تھے وہ تبرک دار المصنفین کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے،

مولانا کو یورپین تصانیف اور مطبوعات سے جو واقفیت ہوئی اس کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا، جس کا تعلق علی گڈھ سے نہیں بلکہ حیدر آباد سے ہے، مولوی سید علی بلگرامی جو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے، اور جو یورپ کے فضلا، اور ان کی تصنیفات سے براہ راست تعلقات رکھتے تھے اور اُن کے کتب خانہ میں ان معلومات کا بڑا سرمایہ تھا، ان سے اور مولنا سے ملاقات گو ۱۸۹۰ء میں ہوئی، مگر تعارف کا آغاز المامون کی اشاعت سے ہو گیا تھا، یہ تعارف، ملاقات کا اور ملاقات تعلقات کا ذریعہ بن گئی، مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے مولنا کو یورپ کی مطبوعات کے بہت سے نسخے بھی نذر کئے تھے، جو مولنا کے ذاتی کتب خانہ میں تھے اور جن کو بعد کو انھوں نے ندوہ میں وقف کر دیا، اور اس وقت وہ وہاں موجود ہیں، فہرست ابن ندیم کا نسخہ اسی زمانہ میں مولنا کو ان ہی سے ملا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے یونانی ناموں کے

صحیح تلفظ انگریزی میں اُس کتاب پر اپنے قلم سے لکھے تھے، مولٰنا کا مضمون "تراجم" اسی نسخہ پر مبنی ہے،

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی جب حیدرآباد سے الگ ہو کر ہردوئی میں رہنے لگے تھے تو مولانا سے ملنے لکھنؤ آئے، اسی زمانہ میں مولٰنا دارالعلوم ندوہ کے معتمد تھے، مدرسہ میں اُن کی تقریر کا انتظام ہوا، اُس تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا "اگر آپ کو یورپ کی کوئی زبان علم کی خاطر سیکھنا ہے تو فرنچ یا جرمن پڑھئے، انگریزی تو بنیوں کی زبان ہے"

مولٰنا نے کتب خانۂ اسکندریہ کی تحقیق پر جو رسالہ لکھا تھا اس میں بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین کا ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی ہی نے کر کے دیا تھا، جو رسالۂ مذکور کے ساتھ انہی کے نام سے چھپا ہے،

علی گڈھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھین وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں، مولٰنا انکے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابلِ اعتراض باتوں کا جواب دیتے تھے،

چنانچہ مسٹر پامر نے اپنی انگریزی کتاب ہارون الرشید کی لائف مین مسلمان بادشاہوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام قائم کیا تھا، مولانا نے المامون میں ضمناً اس کا پورا جواب دیا ہے، اسی طرح پروفیسر شیلڈون ایموز (Sheldon Amos) نے جو اس زمانہ میں لندن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے اپنی کتاب "رومن سول لا" میں فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا، مولٰنا نے سیرۃ النعمان کے ایک حاشیہ میں اُس کا مدلل جواب لکھا ہے، ان کتابون کا یا ان کے مفید مطلب ابواب کا ترجمہ ان کے شاگرد اُن کے لئے کر دیا کرتے تھے،

مصری مطبوعات کا سرمایہ

اسی سلسلہ میں کالج پہنچکر مصر کی نئی عربی مطبوعات اور تصنیفات سے بھی مولانا کو آگاہی ہوئی، مصر کی حالت اس لحاظ سے ہندوستان سے بہتر تھی کہ وہ ہندوستان کی طرح انگریزوں کا پورا غلام نہ تھا اور نہ وہاں کے علمی حلقہ پر انگریزی کا تسلط تھا، یورپ کی قوموں اور زبانوں میں سے مصر کو سب سے پہلے فرانسیسی سے سابقہ پڑا، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ قبضہ گو بہت جلد اٹھ گیا مگر اس کا علمی و ادبی تسلط اس سرزمین سے نہیں اٹھا، اس لئے مصر کو یورپ کی زبانوں میں سے "بنیوں کی انگریزی زبان" سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ یورپ کی ایک ایسی زبان سے واسطہ پڑا جو سرتاپا علمی تھی، اور جس میں اسلامی معلومات و تحقیقات کا بڑا سرمایہ تھا، بہرحال مولانا مرحوم کے پاس مصر و شام کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں برابر راست آتی تھیں، اور وہ خود بھی وہاں سے ہر نئی کتاب جو مطبع سے چھپ کر نکلتی تھی منگوایا کرتے تھے جدید فلسفہ جدید ہیئت، جدید طبیعیات اور عربی صرف و نحو و بلاغت پر نئی نئی طرز کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ ان کے پاس پہنچتی تھیں، اور مولانا ان کے ذریعہ سے یورپ کی جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرتے تھے، اسی طرح قدما، کی تصانیف جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں اور جو متاخرین کی کج مج اور پیچیدہ منطقیانہ طرز تعبیر کے بجائے زیادہ واضح اور صاف ہیں، مولانا ان کے پورے قدردان تھے، وہ جہاں سے مل سکتیں اُن کو منگواتے تھے اور پڑھتے تھے، قلمی ہوتیں تو اُن کی نقلیں لیتے،

عربی اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا اور سمجھنا اُس زمانہ میں ہر مولوی کا کام نہ تھا، تمام ہندوستان میں شاید مولانا پہلے شخص تھے جنھوں نے اُن کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا، بلکہ الہلال

وغیرہ مصر کے عربی رسالوں میں ان کے مضمون بھی چھپتے تھے، ایک خط میں وہ اپنے عربی اخبارون اور اپنے یہاں آنے والے رسالوں کے یہ نام لکھ کر بھیجتے ہیں:۔ ثمرات الفنون قسطنطنیہ، اسلام طرابلس، المؤید، المنار، الہلال، المقتطف، (ریاض حسن خاں ۔۱)

آگے بڑھ کر جب مولنا کے فضل و کمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انھوں نے بھی مولنا سے تعلقات پیدا کئے، اور وہ یورپ کی مطبوعات اُن کو کبھی کبھی ہدیہ بھیجتے تھے چنانچہ ڈوزی کا مشہور عربی لغت انگلستان سے مسٹر تھارنٹن (Mr Thornton) نے ۱۶۔ اپریل ۱۸۹۸ء میں ہدیہ بھیجا تھا، اس کتاب کے پہلے صفحہ پر مولنا کی یہ یادگار تحریر ہے،

اھدیٰ الیَّ ھذا الکتاب مسٹر تھارنٹن (Mr Thornton) احد کبار الانکلیز فی عاصمۃ لندن

شبلی النعمانی ۱۶ اپریل ۱۸۹۸ء، ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ

مولنا کی یہ بھی عادت تھی کہ جب انگریزی کی نئی کتابوں کے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے اُن کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمایش کرتے کہ فلاں مقام یا بحث کا خلاصہ لکھکر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئے معلومات اگر تمھاری نظر سے گذرے ہوں تو مطلع کرو، چنانچہ مکاتیب میں اُن کے خاص خاص دوستوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں ان میں یہ باتیں اکثر نظر آئیں گی،

کالج پر مولنا کے اثرات محمڈن کالج علی گڈھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے

تمدّن و تہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا، اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہے، اور کالج نے قدیم و جدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا،

اس بزم میں گو دوسرے علما بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے وہیں رہے، لیکن مولنا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے، اور ہر علمی بحث میں اُن کا قول فیصل تھا، وہ اپنے فضل و کمال کی بنا پر بجائے اس کے کہ نئے علوم و فنون کے اہلِ کمال سے مرعوب اور اپنے علوم کو اُن کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علماے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا، اور اپنے قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسرون کو اُن کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا، اور ایسے زمانہ میں جبکہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی ایک مولنا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا،

کالج کوئی پرانے طرز کا عربی کا مدرسہ نہ تھا، جہاں عربی شروح و حواشی کا درس دیا جاتا، وہ سرتاپا جدید علوم و فنون کے ہوشربا مناظر کا تماشا گاہ تھا، اس فضا میں طلبہ کے اندر اپنے پرانے علوم فارسی ادب، اور عربی زبان کا ذوق پیدا کر دینا کتنا مشکل کام تھا، مگر مولنا نے کالج میں اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی، مولوی حمید الدین

صاحب، مولوی بہادر علی صاحب، مولوی داؤد بھائی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں،

مولنا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنادیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ "میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے" سید سجاد حیدر صاحب کہتے تھے کہ مولنا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصول بلاغت اور صنائع و بدائع کو بتاتے تھے، اور اُن صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے،

طلبہ میں ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدر الاسلام لکھا، اور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا، اور شاید اب تک ہے، اسی سلسلہ میں مولنا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے بنگلہ پر کرتے تھے، اور تھوڑے سے آدمی مدعو ہوتے تھے نشست کرسی اور میز پر ہوتی اور مولنا خود سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کسی پہلو پر تقریر فرماتے تھے، رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دلچسپی بڑھنے لگی تو ۳۰۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سیرت و میلاد کا پہلا عام جلسہ نہایت شان و شوکت سے سالار منزل میں ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال میں ہونے لگا[1] انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مولنا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا اسکا بیان خود انہی کی زبان سے سنیے:

---

[1] کانفرنس گزٹ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء از مضمون خان صاحب میر ولایت حسین صاحب،

"اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنئے اور میں دل سے اُٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرستہ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر ان دنوں ہوا کا رُخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے، جس کو وہ انجمن الصلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی اے سکریٹری ہے، اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل بھنا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں، اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں، اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، میں نے بھی ۵۰ روپئے ہیں، سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے، اور مسجد کی نیو کھودیں گے۔ لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپئے ہے

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے، اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا، اس جوش مسرت میں اور بھی لکھتا، مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحٰق و عثمان یاد آگئے، اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا، جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے،

ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے، حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا

سے نرالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔" (مکاتیب محمد عمر۔ ا)

مولنانے کالج میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا جو کام انجام دیا اس نے کالج کے ماحول کو سرتاپا علمی رنگ میں رنگ دیا، اس زمانہ میں مولنا حالی بھی اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے، اور بھی دوسرے اہلِ علم کی آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا مجموعی اثر اور بھی زیادہ تھا، طلبہ میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور اُن کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، مولوی عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، اور مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو (بشرطیکہ وہ مانیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں، جن طالب علموں میں تحریر و انشا کا ذوق تھا، وہ ذوق بھی مولنا کی تحریک سے ابھر کر نمایاں ہوا، اس سلسلہ میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ صاحب وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، جن طالب علموں کو شعر و سخن کا چسکا تھا وہ مولنا کی سخن سنجیوں سے متاثر ہوئے مولوی ظفر علی خاں، مولوی ہدایت اللہ صاحب (سی پی) اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر کی سخنوری اگر تنہا مولنا کی نہیں تو مولنا شبلی اور مولنا حالی دونوں کی دوگونہ تاثیروں کی رہینِ منت ہے، ان صاحبوں میں سے جنھوں نے مولنا کے اس فیضِ اثر کو تسلیم کیا ہے، ایک قابلِ ذکر ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے المتخلص بہ محوی کی ہے، جو حیدرآباد دکن میں پہلے جج تھے، اور اب دارالترجمہ میں ہیں اور فارسی کے خوش مذاق شاعر ہیں، ان کا مجموعۂ نظم فارسی نذرِ عقیدت کے نام سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کے مقدمہ میں مولنا مرحوم کے فیضِ صحبت اور فیضِ تعلیم کا اعتراف فرمایا ہے، لکھتے ہیں:۔ "علی گڈھ کالج کے بی اے

کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے مولنا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولنا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، مولنا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک وصاف ہو گئے، اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی، اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آجتک کامیاب نہ ہو سکا" (دیباچہ د) مولنا شروانی فرماتے ہیں" مجھکو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے، تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشوونما پذیر ہوا، اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے وہ مولنا کے ترنم کی نقل اُتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے، مولانا شرر لکھتے ہیں: ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبولِ عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے، اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے پسند کیا، اور طلبہ نے اُسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبولِ عام دُھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا" مولنا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی ناموری میں بہت کام آئی ہے، جتنے اکابر اور امرا یہاں اُس زمانہ میں آئے اُن کو درو ملت سے آشنا اور کالج کی ہمدردی اور اعانت کی طرف ملتفت کرنے میں مولنا کی شاعری نہیں ساحری بڑا کام دیتی تھی، چنانچہ وہ اسکو کبھی غرناطہ کبھی بغداد اور کبھی صفاہاں بتاتے تھے اور مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی امیدگاہ ٹھہراتے تھے،

آنکہ گو ہر طلبد جانب عماں گذرد ... بوسہ بر در او ہر کہ بود طالبِ فن

گر بدیں گونہ بود گرمیٔ ہنگامۂ او   خود زغرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد

ہر دم ایں مدرسہ لاریب بگرمی گردد   اندکے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد

تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود   بوسے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود

تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد   تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود

ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امراء کی مدح سرائی کو عار سمجھا لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کرکے فرمایشوں کی تعمیل کرتے تھے، مگر یہ بات اُن کو دل سے پسند نہ تھی، اس لئے یہ فرمایشی نظمیں اُن کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پا سکیں،

ابھی مولانا کالج میں گئے ہی تھے کہ چند روز کے بعد فروری ۱۸۸۳ء میں حیدر آباد دکن کے مشہور مدبر مدار المہام سر سالار جنگ اوّل نے انتقال کیا، سالار جنگ محسنین کالج کے قافلہ سالار تھے اس لئے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور کالج اُن کے ماتم میں ایک روز بند ہو گیا (مکاتیب فارسی ۲۵) اور اظہار غم کیلئے ایک خاص جلسہ ہوا، مولانا نے اس سانحہ پر فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جسکو اس موقع پر پڑھکر سنایا،

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر   آہ ایں چہ ماتم است کہ خون شد دل و جگر

تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر   ہم شرع را نماند کنوں محسنِ دگر

سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر

شادی ز دل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر[1]

---

[1] اس بند کے بعد مرثیہ کے دوسرے اشعار حسب ذیل ہیں،

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار   کز یمنِ او نظامِ ریاست شد استوار (باقی ص ۱۵۵ پر)

یہ مرثیہ شاید اس لئے بھی کلیات میں جگہ نہ پا سکا کہ مولنا کے مخصوص انداز سے اسکا رنگ ہلکا اور مزہ پھیکا ہے لیکن بہرحال اسکو مولنا سے نسبت ہے اور اسکا علیگڈہ سے دکن تک پورا اثر ہوا تھا اِسلئے یادگار کے طور پر یہاں یہ پورا مرثیہ نقل کردیا جاتا ہے، یہ بہت ابتدائی کلام ہے اس لئے صرف زبان اور شاعری کی حیثیت سے

آئین و رسم و داد ازو بود برقرار — بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار

آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است — ہر کس چو شمع ز آتش غم درگرفتہ است

آں کو فلک بہ درگہ او سر نہادہ است — افسر بہ فرق خود ز مہ و خور نہادہ است

چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است — طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است

تا ایں خبر بکوچہ و برزن فتادہ است — کار جہاں بنالہ و شیون فتادہ است

ایں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر — آئینہ دار طلعت او بود ماہ و مہر

ہم دانشش نصیب و ہم از داوریش بہر — شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر

در تنگنائے تیرہ مغاک آرمیدہ است — خورشید زیر پردۂ خاک آرمیدہ است

امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود — پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود

زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود — با آسماں بجاہ برابر جز او کہ بود

اکنوں اگر کنارہ ازیں خاکداں گرفت — آوازہ اش محیط زمین و زماں گرفت

آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او — آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہ او

اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او — رحم است بر ریاست و روز سیاہ او

مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نداشتست — دردے بود کہ ہیچ مداوا نداشتست

آں داور جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود — پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود

فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود — تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود

خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست — بار غم است اینکہ فلک را کمر شکست

از رفتنش اگرچہ جہانے بجاں بود — اما ہر آنچہ خواستۂ آسماں بود

باشد ہماں چہ سود بود و چہ زیاں بود — اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود

کو را بود بہ رحمت پروردگار جائے — خود زیر سایۂ حرم کردگار جائے

اس کو پڑھا جائے،

مارچ ۱۸۸۶ء میں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کالج میں آئے تو مولانا نے کھانے کے بعد سید محمود کی فرمایش سے فارسی کے چند بند پڑھے جنمیں پہلا بند یہ تھا

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود | آخر ایں سستی از خمار کہ بود
چشمِ شوقت بہ رہ گذار کہ بود | ہوسِ سرمۂ غبار کہ بود

ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردۂ دیدہ فرشِ راہ کہ ہست

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اس بند کے پڑھتے وقت عجب سماں بندھ گیا تھا، حضار مجلس حقیقت میں بیتاب ہو گئے، سید محمود اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے تھے، وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ "افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا"

۱۸۹۵ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامراء بہادر مدار المہام حیدر آباد دکن کی علی گڈہ میں تشریف آوری کے موقع پر سرسید کی تحریک پر ایک قصیدہ[1] لکھا اور پڑھا جس میں مسلمانوں کے ادبار، علی گڈہ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور امیدوں کا دلچسپ اور موثر بیان تھا، یہ

---

[1] قصیدۂ خیر مقدم نواب وقار الامراء بہادر،

در جہاں چوں سخن از شوکت و از شاں گذرد | نامِ دستورِ دکن بر سرِ عنواں گذرد
صدر جم مرتبہ نوابِ وقار الامراء | آنکہ گردوں بدرش بندۂ فرماں گذرد
اے خوشا بخت کہ آں داورِ جمشید حشم | بسرِ مدرسہ باایں سر و ساماں گذرد
ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست | خواجہ ابر یست کہ بر طرفِ گلستاں گذرد

یہ قصیدہ بھی کلیات میں شامل نہیں، مگر مطالعہ کے قابل ہے، کالج کی تعریف میں اوپر جو شعر نقل کئے گئے وہ اسی قصیدہ کے ہیں، یہ پورا قصیدہ آپ کو حاشیہ میں ملیگا،

گذر افتادہ بما کوکبۂ جاہش را — تشنہ بنگر کہ برو چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سر خاک — موکب خواجہ بما نیز بدنیساں گذرد
بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد — گر حدیث از شرف و پایۂ مہماں گذرد
داورا مدح تو اندازۂ ما نیست و لے — خوش بود گر سخن از عالم احساں گذرد
یادگار کرم دولت آصف جاہی است — بہ نظر ہر چہ دریں منزل و ایواں گذرد
میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد — جائے آن است کہ از طارم کیواں گذرد
خاص و عامی ہمہ از فیض کفش سیراب اند — ابر ہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا! گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم — آنچہ بر ما ز سیہ کاریٔ دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگی رتبۂ ما — بیش ازاں بود کہ در وہم سخنداں گذرد
حالیا کار بآں بے سروپائی بکشید — کہ بما ہر کہ رسد بر زدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار بپایے بر ما — آنچہ بر شیشہ ز افتادن سنداں گذرد
ہر چہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی — خود عیاں است و مپرس آنکہ بپنہاں گذرد
گرنہ ایں کتب و ایں مدرسہ برپا می گشت — بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد
ایں مسیحانہ اگر بہر مداوا می خواست — بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
برسد بر در او ہر کہ بود طالب فن — آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامۂ او — خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب دگر می گردد — اندکے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود — جوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد — تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود
گر بدیں گونہ بود مائدۂ فیض دراز — یک جہاں زلہ ربائے سر خواں خواہد بود

اسی طرح جب ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء میں نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد دکن علی گڈھ آئے تو مولانا نے سرسید کی فرمایش سے رودکی کے مشہور قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا، خود مولٰنا نے شعر العجم جلد اوّل میں رودکی کے بیان میں ایک حاشیہ دے کر لکھا ہے :- "جس زمانہ میں میں علی گڈھ میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدر آباد دکن) علی گڈھ میں آئے، سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے اور وہ تم لکھدو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے :-

ہمچناں با شیم گرم گفتگو — قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شورِ مبارکباد و بس — ایں حدیثش بر زباں آید ہمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶)

دوست افسانۂ شادی بزباں خواہد راند — خصم را دیدۂ حسرت نگراں خواہد بود
ہست چوں در کنفِ قیصرِ دارائے دکن — ایں از فتنۂ و آسیبِ زماں خواہد بود
ملک و ملت ہدفِ تیرِ حوادث بودہ است — آستانش حرمِ امن و اماں خواہد بود
آرزو ہاست درِ اندیشہ و از فضلِ خدائے — انچہ اندیشہ نمودیم ہماں خواہد بود
گر بہ آئینِ سلف بہرہ بیابیم ز علم — رخشِ اقبال دگر در تگ و راں خواہد بود
باز در راہِ طلب گرم بخیزیم ز جائے — خوابِ دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود
می تواں غلغلۂ اوج و ترقی انگیخت — تا بکے بر لبِ ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بما نیز گہے یار شود — چرخ تا چند بکامِ دگراں خواہد بود
ہاں بسنجی کہ نژاد عرب و آلِ تو ے — ایں چنیں خستۂ و رسوائے جہاں خواہد بود
آں چمن زار کہ پروردۂ ابرِ کرم است — ہاں میندیش کہ تاراجِ خزاں خواہد بود
بس بود اینکہ نہ داریم بسر تاج و کلاہ — بخت زیں بیش چہ در فکرِ زیاں خواہد بود
باہمہ خستگی آں فطرتِ ما باقی است — خاک گشتیم و ہنوز آں سرِ سودا باقی است

آسماں جاہ از سوئے ملکِ دکن　　　جانب ہندوستاں آید ہمی

مولنا کا ذخیرۂ ادب جب تک زندہ ہے، کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندۂ روزگار ہیں، اور رہیں گے،

علاوہ ازیں مولنا کے پے بہ پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے، اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دی، اس زمانہ میں کالج ہر قسم کی علمی و ادبی تحریکات کا مرکز تھا، یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں، نئی تصنیفات شائع ہوتی تھیں، اور نئے نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولنا جہاں گئے علی گڈہ کالج کی شہرت کے دائرہ کو بڑھاتے چلے گئے، اُس زمانہ میں ریاست بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسنِ ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولنا کی ان ہی تصنیفات کا نتیجہ ہے، اسی طرح حیدرآباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامہ نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی مولنا کی یہی تصنیفات ہیں، اس کا ذکر سرسید کے ان خطوط میں ہے جو انھوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں،

مولانا نے اپنی ان تصانیف کے ذریعہ جو کالج کے زمانہ میں کیں کالج کی صرف معنوی ترقی میں مدد نہیں کی، بلکہ جہاں تک ہو سکا انھوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصنیفات کالج کے نذر کرکے اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا، چنانچہ ان کی یہ فیاضی یاد رکھی جائے گی کہ کالج کے زمانۂ قیام تک انھوں نے اپنی تصانیف سے ایک حبہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ اُن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین مہینوں میں ان کا پہلا اڈیشن ختم ہوجاتا تھا، ایک بار مولنا کے ایک

دوست نے ایک کلب قائم کیا اور اس کے لئے اُن سے اُن کی تصنیفات ہدیۃً مانگیں تو ان کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑا، "میں اپنی تصنیف نذر نہیں کرسکتا، میری تصنیفات جو اس وقت معرض بیع میں ہیں، المامون والجزیہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سیدصاحب نے کالج کے لئے چھاپی ہیں، مجھ کو حق تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا وہ دے نہیں سکتا، اس وقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا نہ اس سے فائدہ اٹھایا۔" اس کی تصدیق خود سرسید کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۰- مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک بلگرامی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں:- "پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمتِ عالی میں روانہ کئے ہیں، "گذشتہ تعلیم مسلمانان" کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اس لئے وہ نہیں بھیج سکا، آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حقِ تصنیف وغیرہ کالج کے نذر کردی ہیں، اُن کی قیمت یا منافع سے ایک حبّہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا، اور آیندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدہ کے لئے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلاقیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہرچند اصرار کیا کہ جس قدر تمھارا دل چاہے لو، ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید کیں اور اپنے دوستوں کو بھیجدیں۔" (خطوط سرسید ص ۱۳۵)

کالج میں عربی زبان کی ترقی، اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لئے انھوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی، اس لجنۃ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے، اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، دوسری انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم تھی جس میں اردو کے عام مضامین پڑھے جاتے

اور تقریریں کی جاتی تھیں، اُس میں بھی مولنا کا حصہ تھا، ان ہی دونوں انجمنوں نے مل کر شمس العلماً کے خطاب پر مولنا کو تہنیت دینے کے لئے ۱۹-جنوری ۱۸۹۴ء کو جلسہ کیا تھا جس میں تمام اکابر شریک تھے

یہاں طلبہ کی سب سے بڑی مجلس کا نام یونین تھا، اور جو اب بھی ہے، مولنا اس میں بھی حصہ لیتے اور طلبہ میں حسنِ تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے تھے، یہ وہی یونین ہے جس نے سفر روم و مصر و شام سے واپسی پر مولنا کے لئے ۲- دسمبر ۱۸۹۲ء میں بزم دعوت ترتیب دی تھی، اور جس میں مولنا نے یہ قصیدہ پڑھا تھا،

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد	کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید	یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد
کالج امروز بآں فرّ و شانست کہ بود	بزم را گرمیِ ہنگامہ ہمانست کہ بود
یونین آنکہ بما شیوۂ گفتار آموخت	ہم بدانسان ہنر آموز بیانست کہ بود

ایک دفعہ ۱۹- نومبر ۱۸۹۴ء میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا؟ مولنا نے اپنی ایک مدلل تقریر میں یہ ثابت کیا کہ بے شبہ مسلمانوں کا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا، یہ تقریر ایسی مؤثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ مسٹر سید محمود نے بھی اُن سے موافقت کی، (دسمبر ۳۷)

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی، اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور مؤثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے اُن کی موافقت میں رائے دی،

یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھون نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی، بلکہ ایک مضمون بھی لکھا، تب جاکر کہیں اُنکی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سرسید نے اپنا یہ مضمون "ایشیائی اور اسلامی طرزِ حکومت" کے عنوان سے ۲۸- جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا،

۱۸۹۲ء میں جب مولٰنا نے کتب خانۂ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہے اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۹ء میں الجزیہ پر جو مضمون لکھا تھا جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانون کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تصحیح کے لئے ایک مجلس بنائی جائے چنانچہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ میں سرسید نے اس کا اعلان کیا، اور مولٰنا مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلہ میں داخل کئے گئے، اور مولٰنا کو اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا، اُن کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی شائع کئے گئے، عربی میں خود مولٰنا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ الجزیہ کا ترجمہ کیا، اسی سلسلہ کا مولٰنا کا لکھا ہوا مشہور مقالہ "حقوق الذمیین" ہے،

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے "محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج میگزین" کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا جس میں کالج کے حالات، مجلسوں کی رودادیں، انجمنوں کی تقریریں، اور اکابر کالج کے مضمون چھپتے تھے، ۱۸۹۴ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا، اس نئے انتظام میں مولٰنا مرحوم نے اس کے اردو حصّہ کی اڈیٹری قبول فرمائی اور اس کا مقصد خود مولانا کے الفاظ میں یہ قرار پایا، "اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو اور زیادہ وسعت دینی چاہی، تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بنجائے جس میں کالج کی علمی خبروں کے علاوہ مسلمانون

کے علوم و فنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پُر زور مضامین لکھے جائیں، اس غرض سے اس کے ۱۲ صفحے اردو کے لیے مخصوص کر دیئے گئے، اور اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا" مولنا کا خیال تھا کہ اسلامی سلطنتوں کے اہم تمدنی اور انتظامی صیغوں پر اس میں مضامین لکھے جائیں اور جب وہ معتدبہ حد تک پہنچ جائیں تو ان کو مستقل کتابوں کی صورت میں شائع کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون انھوں نے جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں "اسلامی حکومتیں اور شفاخانے" کے عنوان سے شائع کیا، اور اس کے دیباچہ میں اس مقصد کی پوری توضیح کی، یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوا، اور اس میں مولانا شبلی کے علاوہ، مولنا حالی اور مولنا ذکاء اللہ صاحب وغیرہ کے مضامین ماہ بماہ چھپتے رہے، اس کے جون نمبر میں مولانا کا وہ خطبہ چھپا جو انھوں نے ۱۲- اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوۃ العلما کے دوسرے اجلاس میں "علما کے فرائض" پر دیا تھا، ۱۸۹۶ء میں "حقوق الذمیین" کا معرکۃ الآرا مضمون اسی کے اپریل اور مئی نمبر میں شائع ہوا، اس آخری نمبر میں قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز مولانا نے پیش فرمائی، اور ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ جلسہ کی روداد اپنے قلم سے لکھ کر شائع کی، ان کے علاوہ اس رسالہ میں "املا اور صحت زبان" اور "سرسید اور اردو لٹریچر" وغیرہ مضامین ان کے قلم سے نکلے، غالباً اس رسالہ میں مولانا کا یہ آخری مضمون تھا جو جون ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں نکلا، اسی مہینہ سرسید نے وفات پائی، اور کچھ روز کے بعد مولنا بھی علحدہ ہوگئے، ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند،

کانفرنس کی خدمت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سرسید نے ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا،

چنانچہ ۱۸۹۵ء تک وہ تعلیمی کانگریس کہلاتی تھی، (خطوط سرسید بنام عماد الملک ص ۱۳۶) مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پروفیسر ماریسن کے مشورہ سے کانگریس کے بدلہ یہ کانفرنس بنگئی، بہرحال یہ تعلیمی مجلس مولنا کے علیگڈہ جانے کے چندسال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی، اور اسکا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڈہ میں ہوا جسمیں کل ساٹھ ستر آدمی شریک تھے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولنا کی شرکت بعض ریزولیوشنوں کی تحریک و تائید تک رہی، دوسرے اجلاس میں جو ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں ہوا، مولنا نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھ کر پڑھا، جس سے مسلمانوں کی اپنی پچھلی تاریخ کا کارنامہ سن کر آنکھیں کھل گئیں، اس اجلاس کی اخیر تاریخ میں انھوں نے اپنا قصیدۂ عیدیہ جس کو وہ ۱۸۸۳ء میں لکھ چکے تھے اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنایا، یہ قصیدہ کلیات میں شامل ہے، اس میں تشبیب کے موقع پر دوگانۂ عید کی کیفیت، نمازیوں کا ہجوم، اسلامی جوش کا سمان دکھایا ہے، پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے، مولنا نے جلسہ میں جب یہ قصیدہ پڑھا تو تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہوگئے[۵] اسی لئے پہلی دفعہ یہ قصیدہ "گذشتہ تعلیم" کے ضمیمہ کے طور پر چھپا ہے، اسی اجلاس میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی تھی، کہ "انگریزی کے جو چھوٹے چھوٹے اسکول جابجا قائم ہورہے ہیں یہ قوم کے لئے مضر ہیں" اس پر مخالف و موافق تقریریں ہوئیں، مولنا نے بھی گویا مخالفت ہی میں تقریر کی، اور سرسید کی تجویز بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی،

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولنا نے شرکت نہیں کی، چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڈہ میں ہوا، مولنا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا جسکا مطلع ہے

[۵] ضمیمہ گذشتہ تعلیم مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ۱۲

چرتم می برد اینک کہ بدیں زینت و ساز | چیست کیں بزم بآئینِ دگر بست طراز
باہمہ فرّہ و فر باہمہ تمکین و شکوہ | چارمیں مجلسِ تعلیم بنہادند آغاز

کانفرنس کے آسمان پر اس وقت مولانا حالی، مولنا نذیر احمد اور مولنا شبلی، تین آفتاب و ماہتاب جمع تھے، تینوں کا تذکرہ اس شان سے اس ترکیب بند کے دوسرے بند میں آیا ہے، اور اپنا ذکر کس خاکساری لیکن کس خوبصورتی سے کیا ہے:-

نگہ از ہرسوے حالیِ آزادہ فگن | واں نذیر احمدِ طوطیِ شکر خابنگر
آں یکے رابلب آں نغمۂ جاں سوز ببیں | واں دگر را بکف، آں دفترِ انشا بنگر
پس ازاں پا بہ فرود آئی و بہ پائینِ بساط | شبلیِ دل زدہ را، زمزمہ پیرا بنگر

پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا، اس کانفرنس کے متعلق اپنے ایک عزیز[1] کو لکھا "کی کانفرنس میں مجمع تو بہت نہ ہوگا لیکن بڑے بڑے لائق آدمی جمع ہوں گے اور اپنا جوہرِ کمال دکھائیں گے۔" (ہمیع ۲۸) اس کانفرنس میں مولنا شریک ہوئے اور یہ تجویز پیش کی:- "اس جلسہ کی یہ راے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کئے تھے اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے، اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل و مباحث کو بالتفصیل بحوالۂ اسناد ثابت کیا جائے" اس تجویز کو پیش کرتے وقت انھوں نے اس پر ایک مختصر سی عالمانہ تقریر کی، جو کانفرنس کی اُس سال کی روداد میں ہے، سر سید نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا: "یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت بڑی ضرورت ہے، تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر

[1] نواب علی حیدر آباد سے اکر اس میں شریک ہوئے تھے۔ (شروانی)

بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے " جو بولے وہی گھی کو جائے " پس مولوی شبلی ہی اسکو لکھینگے، شبلی ہی لکھیں گے، تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے، مولوی شبلی ہی لکھیں گے[1] "

اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء ہی میں آچکا تھا، چنانچہ گذشتہ تعلیم کے ایک صفحہ پر انھوں نے لکھا تھا: " اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور اُن کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا، اور شاید اسی انجمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو " (ص۲۱) مگر مولانا کو اس کا اتفاق نہیں ہوا، اور نہ اس تجویز کی تعمیل میں کوئی مستقل کتاب لکھی، البتہ بعد کو الندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ کے مختلف مسئلوں پر متعدد مضامین لکھے،

۱۸۹۲ء میں کانفرنس پہلی دفعہ دہلی میں ہو رہی تھی، مولانا نے ۲۴، اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس میں شرکت نہیں کریں گے، فرماتے ہیں: " دسمبر میں شاید آنے کا قصد اس لئے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکو، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس غالبًا ایکی پھیکی ہوگی، مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت کی بڑ بہت سُن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالبًا چپ رہیں، اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا " (اسحاق ۴) ۱۸۹۳ء کی کانفرنس میں مولانا نے ایک اردو ترکیب بند لکھکر پڑھا جس کے شروع کے شعر یہ ہیں،

[1] روداد کانفرنس الہ آباد ص۱۹۱، ۱۲

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں — یہ اُن کی بزم ہے جو یادگارِ نسلِ عدناں ہیں

خلیل اللہ سے مہماں نوازی جنکو پہنچی ہے — ہزاروں کوس سے آ آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

مولانا نے خلافِ معمول یہ قصیدہ اردو میں لکھا، اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا، میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شبلی چونکہ فارسی میں کہتے ہیں جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں جس سے سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے ورنہ فی نفسہٖ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں، مولانا نے یہ سُن کر اس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں کہا، اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے، مگر محفل پر رنگ وہی چھایا رہا، اس نظم کا مضمون بھی مولانا حالی کی نظموں سے ملتا جلتا ہے،

سرسید کی وفات کے بعد بھی مولانا کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے، سنہ ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اصرار کیا کہ امسال رامپور کی کانفرنس میں وہ شریک ہوں (اسحاق، ۱) سنہ ۱۹۰۱ء میں خیال تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کر دینا چاہتی ہے اس لئے اس سال کی کلکتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ "بی اے کی ڈگری کے لئے فارسی بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ نصابِ تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے، اس میں اصلاح و ترقی کی گنجایش ہے" مولانا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پر زور اور مدلل تقریر کی جس میں انھوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں، اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور

حقیقی شاعری ہے، ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے، انھوں نے بتایا کہ علوم و فنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں، وہ فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق، اور علم طب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں، اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار ہے، پھر انھوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خود نوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا، جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد انھوں نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا نے "ہفت بند کاشی کے" اشعار جب اپنے خاص انداز میں پڑھے ہیں تو کانفرنس مجلسِ ماتم بن گئی اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر اوڈبرن بھی اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں "مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح پر تاثیر تقریر کر سکوں[۱]"

۱۹۰۲ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد پڑی، اور مولانا اسکے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے

۱۹۰۴ء میں دہلی میں تاجپوشی کے موقع پر جو کانفرنس ہوئی اور جس کے صدر ہز ہائی نس آغا خاں تھے: "اسلام کی بے تعصبی" پر ایک عالمانہ لکچر دیا، اس لکچر کو مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر

[۱] میں نے یہ واقعہ اس کانفرنس کے ایک شریک منشی محمد صدیق صاحب مختار دیسنوی بہاری سے سنا، جو میرے ہموطن مخدوم تھے، اور سر سید کے معتقدوں اور ان کی تحریک کے پرانے حامیوں میں تھے، مولانا شیروانی فرماتے ہیں:" میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا، لفٹنٹ گورنر نے خاص طور پر مولانا شبلی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ آئیں اور مدرسہ عالیہ کو مفید بنانے کی کوشش کریں، مولانا نے وعدہ کیا مگر اسی زمانہ میں کلکتہ میں طاعون پھیلا، اس لئے نہ جاسکے"۔

ابن بشیر نے جلسہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلمبند کر لیا تھا، اور بعد کو چھاپ کر شائع کیا، لیکن چونکہ تقریر ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے اس لئے مولانا نے اخباروں میں لکھا کہ یہ اُن کی بعینہ تقریر نہیں،

۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھاکہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور میرزا شجاعت علی خاں کونسل ایران کی صدارت میں ۲۲۔ دسمبر کو "تاریخ اسلام" پر لکچر دیا۔ (ریاض حسن ۔ ۱۰۰)

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے رہے، اور اس کی دلچسپی کو بڑھاتے رہے، غالبًا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے عہدِ نظامت میں کانفرنس سے انکی دلچسپی بہت کم ہوگئی، اور اُس کی جگہ ندوہ کے اجلاسوں نے لے لی،

نینی تال کا سفر مئی ۱۸۹۵ء

مئی ۱۸۹۵ء کی گرمیوں میں سرسید نینی تال گئے تھے، یہ رمضان کا مہینہ تھا، مولانا بھی اُن کے ساتھ نینی تال گئے، اور سید صاحب کے ساتھ ایک کوٹھی میں ٹھہرے چونکہ کسی پہاڑی مقام کا یہ پہلا سفر تھا اس لئے ایک خط میں پہاڑی منظر کی دلچسپ کیفیتیں لکھ کر بھیجیں، موقع کے لحاظ سے مولانا کا یہ خط اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے،

"تمام راستہ قدرتِ الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے، اگر اس پہاڑ میں سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے"

ان قدرتی مناظر کی دلچسپیاں ایک طرف، مگر ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک کی نظر ان ظاہرداریوں سے ہٹ کر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی، ان پہاڑوں کا کاٹنا، ان میں راستے بنانا، کج و پیچ بلکہ پُرپیچ راستوں سے اوپر چڑھنا، اور ان پر بڑے بڑے مکانات بنانا، پانی اور روشنی کا انتظام کرنا، ان باتوں سے مولنا کا ذہن انگریزوں کی بے روک ہمت، اور پُرجوش محنت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کا اصلی جوہر ہے، اس کے علاوہ انھوں نے دوسرا نتیجہ جو نکالا وہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے: "یہاں جو کچھ آرام ہے وہ یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عملداری نہیں ہونے پاتی، یہی بات ہے جس کے لئے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کر دیئے ہیں، درحقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہئے، کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں، رمضان تو خوب گذرے گا، مجھ کو اگر دلچسپی ہے تو اسی سے" ایک دوسرے عزیز کو لکھتے ہیں:- "مجھ کو نینی تال میں کچھ دلچسپی نہیں، بس اتنا ہے کہ روزے یہاں گرمی نہیں دکھاتے" (سمیع - ۲۲)

ان پہاڑوں پر جو لوگ گئے ہیں ان کو تجربہ ہے کہ یہ پہاڑی مقامات درحقیقت انگریزوں نے اپنی بے تکلف زندگی کے لئے بنائے تھے کہ وہ کھلے بند وہاں عیش و لطف اٹھا سکیں، اس لئے ہر چیز وہاں انھوں نے اپنے مذاق کی بنائی ہے، انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی وہاں جانا شروع کیا، اور وہ انگریزوں کے لئے وہاں یار شاطر نہیں، بارِ خاطر بن گئے ہیں، اور جو ہندوستانی ان کے یارِ شاطر بنے وہ اپنے سے کھو گئے، اس حیثیت سے اس مقام کا جو اثر مولنا کی طبیعت پر پڑا وہ یہ تھا، "..... مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ

امید رکھنا عبث ہے کہ میں اس کو فرحت زائجی مان لوں گا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہرادا پہ جان دیتے ہیں ان کا مذہب کیا پوچھنا، ع ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست۔ (مکاتیب بنام شیخ حبیب اللہ)

اس سفر کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا پہلا خاکہ مولانا کے ذہن میں یہیں آیا، یہ مئی کا مہینہ تھا، اور دسمبر میں اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، یہیں سے ۲۸ مئی ۱۸۸۷ء کو مولانا نے اپنے ایک عزیز کو اس مضمون کی اطلاع دی، (دیکھو ۲۲)

قصیدۂ بہاریہ جو ۱۸۸۶ء میں مکمل ہوا بلکہ ناتمام ہی رہا، اس کا خیال بھی پہلے پہلے اسی بہارستان میں آیا تھا، اور اسی کے لئے کلیاتِ غالب کا نسخہ یہاں منگوایا تھا، تاکہ توارد نہ ہو۔

تصنیف کا آغاز

۱۸۸۷ء

۱۸۸۳ء میں مولانا نے علی گڈھ میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے لیکر اب تک وہاں ان کے جو کمالات ظاہر ہوئے تھے وہ شاعری تک محدود تھے، مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موزوں ہو تلاش کر رہے تھے، بالآخر ان کو نظر آیا کہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا ہے، اور جس کے مقابلہ میں اُن کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آتا ہے اُس کو دور کیا جائے، اس وقت یورپ کے اہلِ قلم اور مصنفین کا یہ کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا اس کو مٹانے کے لئے اسلام، سلاطینِ اسلام، اور علومِ اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ لکھ کر لوگوں میں

پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پودھ کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے، اور اُن کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ اُن کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں، چنانچہ اُن کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی، اور مسلمانوں کو خود اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی، اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھ کر اُن کو چکا چوندھ لگ رہی تھی، مولنا نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا، اور اسی کے مقابلہ کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی،

اس سلسلہ میں مولنا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" ہے ۱۸۸۷ء میں لکھی، اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اس سال لکھنؤ کے ممتاز وکیل منشی امتیاز علی صاحب (والد منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری) کی دعوت پر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے زور و شور سے لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اس لئے سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہلِ علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمایش کی، (سرسید بنام عماد الملک ص۱۳۱) مولانا نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا عنوان اپنے لئے پسند کیا، سرسید نے اس عنوان کا عام اعلان کیا، ۸ مئی ۱۸۸۷ء کے ایک خط میں مولنا نینی تال سے لکھتے ہیں:۔ "محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شائع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا، شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں اور گرانمایہ لکھوں" (مسیح-۲۲) یہ گرانمایہ مضمون لکھا گیا، اور ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقامِ اجلاس تھا پڑھکر سنایا گیا، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی، یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا، اس خطبہ میں مولنا نے تفصیل

سے مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم اور اسلامی مدرسوں کے نام اور خصوصیات و حالات، بیان کئے تھے، یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی، اس لئے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا، بلکہ الگ رسالہ کی صورت میں چھپا، اسی لئے مولنا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں:۔" اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ (یعنی مولنا) تاریخی تحقیق وتنقید میں مصروف تھے، جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر اُن کا لکچر تھا، جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا، لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو ہوا ہے، تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو" ۱۸۸۶ء میں اُردو میں نئی طرز کی پہلی سوانح عمری "حیاتِ سعدی" مولنا حالی نے لکھی اور مولنا شبلی نے پسند کی، ایک خط میں ۱۰- مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھتے ہیں:۔" ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے" (سیمع - ۱۵)

دوسری تصنیف المامون | اس کے بعد اُردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے، جو ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولنا کی پہلی مستقل تصنیف ہے، جو اُن کے نامور فرمانروایانِ اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنی العباس کا نچوڑ کہنا چاہئے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ مولنا فرماتے تھے کہ تین مہینے میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا، اور دوبارہ چھپا،

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:۔ (گذشتہ تعلیم کے بعد) اسی نوعیت کی اُن کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم پسند کی گئی، اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولنا شبلی کس

قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آیندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں"۔ المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے جس کو پڑھ کر مولنا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا۔

مولنا شروانی سے تعلقات

المامون اہلِ علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری، اس پر اخبارات میں بہت سے ریویو نکلے، اُن میں سے قابلِ ذکر ریویو اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا جسکو ملک اب نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمان خان شروانی کے نام سے جانتا ہے۔ مولنا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱۔ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اُس کے اڈیٹر کے پے درپے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا۔ مولنا شروانی لکھتے ہیں:

"علامۂ مرحوم سے میری سب سے اوّل ملاقات اندازاً ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا۔ کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ایک ریویو تھا جس کا علامۂ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا۔

رسی آنکہ بدردِ من چو من | خامہ گیری و حرف بنگاری

رامپور کے سرکاری کتبخانہ اور مدرسہ عالیہ میں ۱۸۸۸ء

رامپور سے مولنا کو پرانا تعلق تھا، اُن کی طالب علمی کا زمانہ یہاں بھی گذرا تھا، اُن کے استاد مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی اب تک زندہ تھے، اور اُن سے نیازمندی کی وابستگی بھی تھی، اب اُن کے تعلق کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوئی، اس زمانہ میں نواب کلب علی خان والیِ رام پور کا انتقال ہو چکا

تھا، ان کی جگہ نواب مشتاق علی خاں مسند نشین تھے، اور ریاست کا سارا نظم و نسق جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدار المہام کے ہاتھ میں تھا، یہ اُن لوگوں میں سے تھے، جنھوں نے اس زمانہ میں سرسید کی طرح جدید انگریزی طور و طریق و تمدّن کو اختیار کیا تھا، بڑی شان و شوکت اور دبدبہ و عظمت کے آدمی تھے، نجیب آباد کے خاندان کے تھے، میر شکار اور فنونِ جنگ میں بڑا نام پیدا کیا تھا، سرکار انگریزی میں اُن کو بڑا اقتدار حاصل تھا، اور جنرل کے عہدے سے ممتاز تھے، ساری ریاست میں اُن کے قوی پنجہ اور مضبوط دست و بازو کی دھوم تھی، اور لوگ اُن کے نام سے کانپتے تھے، موصوف نے اپنے زمانہ میں جو بڑے بڑے کام کئے ان میں سے ایک مدرسۂ عالیۂ رامپور کی تنظیم ہے، ہمارے استاذ مولٰنا حفیظ اللہ[1] صاحب جو مولٰنا عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس کے مدرسِ اوّل مقرر ہوئے،

[1] مولٰنا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں چھ ماہ کے تھے، اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی قریب محمد آباد جائے سکونت ہے، فارسی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی، اور اس کی تکمیل چشمۂ رحمت غازی پور میں کی، عربی تعلیم بنارس جاکر شروع کی، جہاں مولوی سلامت اللہ صاحب جیراج پوری عربی کی اعلیٰ کتابیں اس وقت پڑھ رہے تھے، ایک سال کے بعد پھر وہاں سے غازیپور پہنچے، اور مولٰنا غلام جیلانی صاحب نامی ایک فاضل وقت سے جو مولٰنا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی (والد ماجد مولٰنا عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، متوسطات تک تعلیم پائی، اس کے بعد غالبًا ۱۸۷۷ء میں وہ لکھنؤ جاکر فرنگی محل میں مولٰنا عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور وہیں علوم کی تکمیل کی، معقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال پیدا کیا، فراغت کے بعد استاد کے حسب الحکم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرسی قبول کی، وہاں سے مولٰنا عبد الحیٔ صاحب کی سفارش پر وہ مدرسۂ عالیہ رامپور میں صدر مدرس ہوئے، اور مولوی عبد الحق صاحب

مولٰنا شبلی کے رسالہ گذشتہ تعلیم نے عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کر دیا تھا، اور اس بنا پر کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان، خود مولٰنا سے اصلاح پسند حکام نے مشورہ چاہا، چنانچہ جنرل صاحب ممدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق رائے دینے کے لئے جن علما کو تکلیف دی تھی ان میں ایک مولٰنا شبلی مرحوم تھے، مولٰنا کی دلچسپی کی بڑی چیز وہاں کا کتب خانہ بھی تھا، المامون کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف واقفیت بلکہ عشق ہے اس لئے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لئے وہی سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے

(حاشیہ صفحہ ۱۷۰) خیرآبادی سے ان کے مناظرے رہے، زمانۂ قیام رامپور میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے یہیں کے قیام کے زمانہ میں علم ہیئت کی کتاب تصریح پر نواب حامد علی خاں کے ابتدائی عہد میں حاشیہ لکھا، جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، وہ دس برس کے قریب رامپور میں رہے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ دار العلوم میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۸ء تک برابر اس عہدہ پر قائم رہے، اس کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مدرس عربی ہوئے اور شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے، ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن پا کر حجاز گئے، اور فریضۂ حج ادا کیا، واپسی کے بعد لوگوں کے اصرار سے پھر دار العلوم ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی، اور کئی سال تک مفوضہ خدمت انجام دے کر ۱۹۳۰ء میں وطن واپس آئے، جہاں اب تک بحمد اللہ صحیح و سالم ہیں،

مولٰنا عبد الحیٔ صاحب مرحوم کی شاگردی کے باوجود آخر عمر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے ہیں، عدم تقلید کا میلان پہلے سے تھا، جو شاید اوائل عمر میں مولوی سلامت اللہ صاحب کی صحبت کا اثر ہو، غرض دس بارہ برس سے اب وہ عامل بالحدیث ہیں،

مولٰنا کی صحت و توانائی قابلِ رشک تھی، اور اب بھی ہے، سیر و شکار اور تفنگ اندازی کا شوق ہے جو عجب نہیں کہ جنرل عظیم الدین خاں کا فیض ہو،

۱۸۸۸ء میں مولانا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیب اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے تین روز رہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ ۱۴- اکتوبر ۱۸۸۸ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں الماریوں کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق، اور دوسری ضروری ہدایتیں درج فرمائیں، اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم نے فہرست کا جو نمونہ بنایا تھا، اُسکو کسی قدر اصلاح کے بعد پسند فرمایا، اور اُسی طریق پر پورے کتب خانہ کی کتابوں کی از سرِ نو ترتیب کا مشورہ دیا، کتابخانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیاتِ رند اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف دونوں ایک صف میں تھیں. مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کیساتھ مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوشخطی اور حسنِ ظاہری کی بنا پر کیا گیا تھا، اور اچھی اچھی کتابیں چھانٹ دی گئی تھیں، مولانا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی، کچھ دنوں بعد نواب مشتاق علی خاں کا انتقال ہوا، اور کونسل قائم ہوئی، اور جنرل صاحب موصوف کونسل کے صدر ہوئے، (اُس وقت نواب حامد علی خاں نابالغ تھے) تو مولانا شبلی مرحوم کی تجویزوں پر پوری طرح عمل ہوا، فن وار رجسٹر بنائے گئے، اور ۱۸۹۱ء میں کتب خانہ کے لئے ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی، اور ۳۱- مارچ ۱۸۹۲ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، (دیباچۂ جلد اوّل فہرست کتب خانۂ رام پور) مگر افسوس کہ جنرل صاحب موصوف اس سے ایک سال پہلے اس دنیا سے رخصت

ہو چکے تھے،[۱]

کتابخانہ رامپور کے موجودہ ناظم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہو کہ مولانا کی

---

[۱] جنرل موصوف کی موت بلکہ شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہو ۱۸۹۱ء کی بات ہو کہ وہ رات کو ایک تقریب سے تنہا ٹم ٹم پر واپس آرہے تھے کہ چند آدمیوں نے ان پر طپنچہ سے ایک ساتھ فائر کیا، گولی ٹھیک نشانہ پر پڑی، اور اس پر بھی اُن میں اتنا دم خم تھا کہ چند قدم چل کر ایک دوست کے دروازے تک پہنچے اور وہیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے، اس واقعہ کا اثر سارے ملک پر پڑا، ایک عالم اور شاعر کا دل ایسے علم دوست مصلح کے سانحہ سے کیسے متأثر نہ ہوتا، چنانچہ مولانا نے اُن کا مرثیہ لکھا جو ۲۷- اپریل ۱۸۹۱ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں مولانا کے اس خط کے ساتھ چھپا ہے،

"جناب اڈیٹر صاحب! اگرچہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے، تاہم جو واقعہ عالم آشوب اور جانگداز ہوتا ہی وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا، اس قحط الرجال میں جنرل اعظم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئیں، اُن کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب فسیع سانحہ و حادثہ ہی، مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا، لیکن اُن کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے، اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا، اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں، اسی رنج و قلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے موزوں ہوئے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں، امید ہے کہ اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دی جائے"

مرثیہ کلیات میں شامل ہے، موقع کے لحاظ سے چند شعر یہ ہیں:-

تا کے زغم نہاں نہ گویم — گویند مگو چساں نہ گویم

درماتم خان اعظم الدین — جز قصۂ خوں چکاں نہ گویم

درخاک شد آں امیر ذیجاہ — یا تہمتن او فتادہ درچاہ

مہمان یکے بہ شب شد و خاست — تا بازرود بسوے بنگاہ

کم حوصلگانِ سفلۂ چند — بودند نشستہ در کمیں گاہ

کا سلکہ چو در مقابل آمد — آں کج روشانِ دوں بناگاہ

اکثر اصلاحی تجویزوں پر عمل کیا گیا، کتابیں زبان اور فن پر منقسم ہوئیں، متعدد مجموعے بھی از سرِ نو مرتب کئے گئے،

مولٰنا نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس کتب خانہ کو دیکھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا، سب سے آخری بار ۶- اپریل ۱۹۱۴ء کو اُس کو ملاحظہ فرمایا، اور اپنے ہاتھ سے اس پر چند سطریں لکھیں، جنمیں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اعتراف فرمایا ہی[1]

مولٰنا نے کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست کی تحریر پر جو رپورٹ لکھی ہے، وہ آج معمولی بات معلوم ہوگی، مگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے لائیے، جب مشرقی کتبخانے نئی ترتیب سے آشنا نہ تھے، اور نہ علماء کے سامنے اس کام کا کوئی نمونہ تھا، اس کتب خانہ کی اس علمی ترتیب سے جو فیض علماء اور اہلِ علم کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے، وہ ان ہی جنرل مرحوم کی کوشش اور مولٰنا کے حسنِ تجویز کا فیض ہی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۸)

یک بار بر و کشادہ دادند — شش تیر و یکے خطا نہ شد آہ

بر جبہۂ صبر چیں نیفگند — با آں ہمہ زخمہاے جانکاہ

برخاک فتاد و باز برخاست — پس طے بنمود پارۂ راہ

آسود دمے براہ وزاں پس — افسانۂ عمر گشت کوتاہ

اے کشتۂ ظلم ہاں خبر گیر — ایں نالۂ ما بگوش در گیر

برخیز و بہ آں بہ رسم پیشیں — ہم تیغ بدست وہم سپر گیر

ترکانہ کلہ بفرق بشکن — چار آئینہ و زرہ ببر گیر

آں رونقِ رامپور باز آ — آں آئینہ را دگر بہ زر گیر

[1] مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی نے مولٰنا کی روداد اور معائنہ کی دونوں تحریریں معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء میں چھپوا دی ہیں،

لطیفہ آجکل مجھے (سنہ ۱۹۴۲ء میں) رامپور جانے کا اتفاق ہوا، تو وہاں کے بزرگوں کی زبان سے ایک دلچسپ حکایت سننے میں آئی جس سے اُس زمانہ کا ماحول اور علماء کے حسنِ اخلاق اور سادگی مزاج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، مولنا کسی تقریب سے رامپور میں وارد تھے، جنرل صاحب مرحوم نے اس حسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا، اور لوگون کو شرکت کی دعوت دی، جس میں بعض علما بھی تشریف لائے، جلسہ میں جب مولنا تشریف لائے تو جنرل صاحب نے انکی آمد پر چیرز دیئے، اور ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں، علماے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے اپنی پرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالی پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں، انھوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "مولوی شبلی کیسے ہی بد دین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے، جنرل صاحب کو اُن کی یہ توہین کرنی نہیں چاہئے تھی"۔ اب جب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوے تو خود ان بزرگ نے تالیاں بجائیں، اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالی پیٹو، انھوں نے مہمان کی توہین کی ہے، ان کی بھی توہین کرو، اور اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسہ سے اٹھے اور اپنی پالکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے، جنرل صاحب کو ان کی ناراضی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اسکو شاباشی دی گئی ہے، قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں، اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے، اس لئے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ سے اسکو ٹھونکتے ہیں، یہ تالی نہیں ہے"۔ اس تاویل سے ان نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہوگئی اور جلسہ میں

واپس تشریف لے آئے۔

تیسری تصنیف سیرۃ النعمان

مولانا نے اس کے بعد جیسا کہ انھوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھا ہے "الفاروق" کی طرح ڈالی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کا کام تھوڑے دنوں کے لئے روک دیا، اور سیرۃ النعمان کی طرف توجہ کی، ۱۸۸۹ء میں اُس کی بنیاد پڑی، اور اخیر سال یعنی دسمبر ۱۸۸۹ء میں اس کا پہلا حصہ ختم کر دیا[1]، اور دوسرا حصہ جو بہت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۰ء میں شروع[2] ہوا، اور اسی سال کے اخیر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں وہ بھی ختم ہوا[3] ۱۸۹۱ء کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی، اور ۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کے نسخے اعظم گڈھ بھیجے گئے[4]

یہ کتاب[5] درحقیقت مولانا کے اُسی ذوق وشوق کی دوسری شکل ہے، جو اُن کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا، بقول مولانا کے ع شمع ہمان است لگن دیگر است"

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں :۔" اعظم گڈہ اور دیہات و اطراف میں اس کتاب کے بہت سے نسخے شائع ہونے چاہئیں، جنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چند اشتہارات بھی بھیج دیئے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے واقف ہونا چاہئے"۔ (رسمیع ۲۹) یہ کتاب بھی کالج کی طرف سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں :۔ سیرۃ النعمان کب کی ہو چکی، دوسری بار چھپ رہی ہے" (سمیع ۳۱)

---

[1] (سمیع ۲۵) [2] (محمد عمر ۲) [3] (سمیع ۲۸) [4] (سمیع ۲۹) [5] مصنف نے یہ کتاب جس محنت سے لکھی اُس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اثنائے مطالعہ میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے بارہ میں اساتذۂ وقت سے انھوں نے استفسارات کئے، چنانچہ انھوں نے اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب سے جو استفسار کیا تھا اس کی نقل مع جواب مولانا ارشاد حسین صاحب کے مجموعۂ فتاویٰ ارشادیہ میں نظر سے گذری استاد و شاگرد دونوں کے خطوں کو تبرکاً یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان نے ملک میں مولنا کو کافی حد تک روشناس کر دیا تھا، اور لوگ اس نادر روزگار کو جو اپنی قومی تاریخ کے ان قابل فخر کارناموں کو منظر عام پر لا رہا تھا ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) مولنا شبلی مرحوم کا خط اپنے استاد مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی کے نام اور اُن کا جواب

مخدوم و مطاع ما دامت افضالہم - بعد ادائے مراسم تحیت و تسلیم آنکہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جد و جہد سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری لکھ رہا ہوں جس کے لئے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کئے، اس وقت جو جزو زیر تحریر ہے وہ اُن کے فتاوے ہیں، عقود الجمان میں ان کے چند فتاوے مذکور ہیں، لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا اس لئے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے، اصل عبارت لکھ کر شبہہ لکھتا ہوں:- قال یا ابا حنیفۃ یا ابا الخطاب ماتقول فی رجل غاب عن اھلہ اعواماً ونعی الیھا فظنت امراتہ انہ میت فتزوجت ثم قدم زوجھا الاول وقد ولدت ولدا فنفا الاول وادعاہ الثانی - اکل واحد منھما قذف فھما ام الذی انکر الولد

مجھے اس میں شبہہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا، پھر قذف کے کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے، اس پر دو سوال ہیں (۱) کیا ایسی دلالت التزامی سے قذف کا جرم قائم ہو سکتا ہے؟ (۲) وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے،

دوسرا فتویٰ یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آکر گرا، اُس نے دوسرے پر پھینک دیا، اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا، اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی، اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، اس پر یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے پھینکا یہ اُس کا اضطراری فعل تھا، اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد تر مرحمت ہو، ورنہ میرا حرج ہوگا،

حیدر آباد کا سفر ۱۸۹۱ء | سر سید نے کالج کے چندہ کے لئے حیدر آباد کا پہلا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا، جب حیدر آباد میں سر سید کے دست و بازو نواب وقار الملک انتصار جنگ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی معزز عہدوں پر مامور تھے، دوسرا سفر ۱۸۹۱ء میں اُس وقت کیا جب یہ اکابر سرکار نظام کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اس سفر میں سر سید تنہا نہ تھے، بلکہ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا جس میں ان کی تحریک سے بہت سے عمائد وارکان شریک تھے اُن میں سے ایک مولنا شبلی بھی تھے،

اس سفر میں مولنا شبلی کی ہمرہی اس حیثیت سے تعجب انگیز ہے کہ وہ کوئی ایسا سرکاری امتیاز یا شان ریاست نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر وہ اس وفد کے رشتہ میں منسلک ہو سکتے مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد میں اس وقت دو بلگرامی بھائی ایسے تھے جو علم کے حقیقی قدر دان اور شیدا تھے، یعنی مولوی سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، سر سید نے نومبر ۱۸۹۰ء میں نواب عماد الملک کو اپنی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ بھیجی تو اُس کے ساتھ مولانا کا رسالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" بھی بھیجا، اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا: "مولوی شبلی صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ)　　بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفے از محمد ارشاد حسین عفی عنہ، مولوی صاحب محبی ومخلصی مولوی محمد شبلی صاحب وفقہم اللہ سبحانہ لرضائہ، پس از سلام مسنون مطالعہ نمایند، رقیمۂ کریمہ بورود مسعود باعث مسرت و کاشف مندرجہ شد، حال کم فرصتیہائے فقیر آں مخلص را معلوم است، پس بقدر ضرورت جواب ورفع اشتباہ کلمۂ چند نوشتم وتفصیل آں بر وقت ملاقات وحصول فرصت موقوف است . . . . الخ

یہ پورا جواب فتاویٰ ارشادیہ مطبوعہ میں مذکور ہے،

نے تاریخانہ مضمون "گذشتہ تعلیم مسلمانان" اختیار کیا وہ رسالہ مرسل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی۔" (خطوط سرسید بنام عماد الملک ۲ صلا) اس کے بعد اُن کے پاس المامون بھیجی گئی اور وہ بھی قدر و منزلت سے دیکھی گئی، ساتھ ہی الفاروق کی تالیف کا خیال بھی پیش کیا گیا، نواب عماد الملک مرحوم نے اُن کی تصنیفات کی قدر کی، المامون کے پچاس نسخے منگوائے اور ان کی مدح و توصیف فرمائی، اس سلسلہ میں سرسید نے ۲۰ رمارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ارقام فرماتے ہیں، "ان کو (مولوی شبلی صاحب کو) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے، میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں، ان خیالات خام کا جن میں غالباً امید کامیابی نہیں ہے، پھر کسی وقت ذکر کروں گا مگر وہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں، اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہے اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں" (صلا) مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ "وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔"

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کئے ہیں جو اُن کے کلیاتِ فارسی میں چھپا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڈھ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے، وہاں سے لکھنؤ اور کانپور ہو کر اس سفر کے لئے روانہ ہوئے، سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا، اس لئے راہ میں ملاقات نہیں

ہوئی، اس سوء اتفاق سے مولنا پریشان خاطر تھے، اتفاق سے ریل میں دو اور معزز مسلمان مسافر ساتھ سوار ہوے، جو مولنا کے غائبانہ مشتاق تھے، انھون نے مولنا کا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے، اور راستہ بھر خدمت کرتے رہے، مولنا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے آگے کو روانہ ہوگیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد حیدرآباد پہنچے

حیدرآباد میں سرسید اور ان کے رفقا کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانہ میں اتارے گئے، احباب نے دعوتیں کیں، جلسے ہوے، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے ابھی ابھی اختیار پایا تھا وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دوچند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا، نواب اقبال الدولہ وقار الامرا کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید اور ان کے رفقا نے تقریریں کیں، مولنا حالی نے اپنا اردو، اور مولنا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقار الامرا کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدرآباد میں کی گئی ہے، مولنا فرماتے تھے کہ حیدرآباد میں قیام گاہ کی چھت پر میں چلا گیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہیں ٹہل ٹہل کر شعر کہہ رہا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی یہ کہتے ہوے سیدھے وہاں پہنچ گئے کہ میں کسی کے روکے نہیں رک سکتا، یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔

یہ قصیدہ جب جلسہ میں پڑھا گیا تو ایک سماں بندھ گیا تھا، اس قصیدہ کے شروع میں اس دور دراز سفر کی غرض کی تمہید، پھر مسلمانوں کی تباہ حالی کی تصویر، اور اس کے بعد علیگڈھ

کی تعلیمی تحریک کی تشریح ہے، آخر میں دربار میں پہنچنے اور باریاب ہونے کا کیسا اچھا مرقع کھینچا ہے۔

پس بفرمودۂ دانش ز علی گڈھ آخر / کارواں شد سوے اقلیمِ دکن راہ گرائے

بہ نیایش بہ درِ دولتِ سلطانِ کریم / ہم بہ فرمانِ ادب پشت نمودیم دوتائے

از پسِ کرنش و تسلیم بہ آدابِ نیاز / عرضِ مطلب بنمودیم و ستادیم بہ پائے

شاہ از لطف اشارت بہ نشستن فرمود / امر چوں فوقِ ادب بود نشستیم بہ جائے

پس ازاں معتمدِ شاہ عماد الدولہ / کہ دبیرے ست ہنرپرور و معنی پیرائے

بہ ادب آمد و توقیعِ ہمایوں برخواند / ما ہمہ گوش بر آوازش و او نکتہ سرائے

شہ بدستورِ گرامایہ فرستاد پیام / کاینک آں مبلغ پیشینہ دوچنداں فرمائے

بسکہ زیں مژدۂ جاں بخش بخود بالیدیم / غنچہ ساں در برِ ما تنگ ہمی گشت قبائے

چوں بما بیش ز اندازۂ خواہش بخشید / بیش ز اندازۂ خواہش دہدش اجر خدائے

شاہ تنہا نہ کرم کرد و نوازش فرمود / کہ شدیم از ہمہ اعیانِ دکن بہرہ ربائے

آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ / بازوے دولت و دستورِ شہ و ملک آرائے

واں وقار الامرا زبدۂ اعیانِ دکن / آں ہنرپرور و دانا دل و فرخندہ لقائے

پایۂ ما بفزودند و کرم فرمودند / شکرِ ایں منت و احساں چہ تواں کرد ادائے

شائگاں گشت قوافی و ازیں چارہ نبود / خوشتر آں ست کہ اکنوں کنم آہنگِ دعائے

یارب آں باد کہ شہ با ہمہ اعیان و وزیر / تا ابد باشد و گردوں بدرش ناصیہ سائے

بعد ازیں جملہ دعا ہا کہ پذیراد خدا / خویش را گر بہ دعا یاد کنم ہست بجائے

یعنی از نسبتِ آں شاہ گرامی باشم
شہ نظام ست و بہ زیبد کہ نظامی باشم

مقطع میں حضور نظام کے لقبِ شاہی کی مناسبت سے نظام اور نظامی کی کیسی اچھی مناسبت پیدا کی ہے،

مولٰنا شبلی اپنی نظمیں جس دلکش انداز میں پڑھتے تھے، وہ بیحد مؤثر تھا، یہ قصیدہ پڑھا تو در و دیوار سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہو گئی، نواب وقار الامراء نے اپنے محل فلک نما میں مولٰنا حالی اور مولٰنا شبلی کو بلوا کر دوبارہ اُن کے قصیدے سنے، اور بیحد متاثر ہوئے، اور آخر حضور تک یہ روداد پہنچی، اور مولٰنا سے سنا ہے کہ خود اعلیٰ حضرت نے مولٰنا سے اس قصیدہ کو اپنے سامنے پڑھوا کر سننا چاہا، مگر ریاستوں میں ہر چیز سیاست اور سازش بنجاتی ہے، دراندازوں نے یہ زور لگایا کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی،

حیدرآباد سے واپسی کے وقت نواب سید علی حسن خان مرحوم خلف نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اصرار سے چند روز یہ قافلہ بھوپال ٹھہرا، وہ کیونکر ٹھہرا، اور کیسے ٹھہرا اس کی تفصیل اس حیثیت سے خاص دلچسپی رکھتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے سرسید اور علی گڈھ تحریک کی نہایت سخت مخالفت تھی، گو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا اس سے ایک سال پہلے ۱۸۹۰ء میں انتقال ہو چکا تھا، مگر شاہجہان بیگم مرحومہ والیۂ بھوپال خود نواب صاحب مرحوم کے اثر سے سرسید کی تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں، ایسی حالت میں سرسید اور اُن کے رفقاء کا یہاں ٹھہرانا سخت مشکل کام تھا،

میں نے نواب علی حسن خاں مرحوم کے عزیز خاص خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی سے جو اُن دنوں وہیں نور محل میں رہتے تھے، یہ پوری روداد اس طرح سُنی ہے،

بھوپال میں قیام | اس زمانہ میں بھوپال نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے علما و فضلا کا مرکز تھا، نواب صاحب مرحوم اور دوسرے علما کے نزدیک سرسید کا نام لینا بھی جرم تھا اور والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ بھی اسی خیال کی تھیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادہ حسام الملک صفی الدولہ نواب سید محمد علی حسن خانصاحب کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ فطرت کی طرف سے مذاقِ سلیم لے کر آئے تھے، فارسی کے خود بھی شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدرداں بھی تھے، پہلے پہل اسی تعلق سے مولٰنا شبلی کا نام اُن کے کانوں تک پہنچا، اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں مولٰنا کی گذشتہ تعلیم اُن کی نظر سے گذری، اور اس کے بعد المامون اُن تک پہنچی، ان کتابوں کو دیکھ کر ان کی حالت ہی عجیب ہوئی، ان کتابوں کے متعدد نسخے چپکے چپکے ڈاک سے منگوائے جاتے اور قدردانوں میں تقسیم ہوتے، اس کے ذریعہ سے کالج کے ساتھ اُن کی دلچسپی اور ہمدردی بڑھتی گئی، اب ۱۸۹۱ء میں جب سرسید کا قافلہ بھوپال سے گذرا اور حیدرآباد سے کامیاب واپس ہوا تو نواب صاحب ممدوح نے منشی محمد امتیاز علی صاحب کے ذریعہ سے جو اُس زمانہ میں بھوپال مین وزیر تھے، بیگم صاحبہ کو یہ سوجھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں، مگر چونکہ بڑے بڑے انگریز حکام سے اُن کی دوستی ہے اس لئے ریاست میں ان کا مہمان ہونا انگریز حکام کی خوشنودی کا باعث ہوگا، اس رائے کو بیگم صاحبہ نے بھی پسند فرمایا اور واپسی میں سرسید

اور ان کے رفقار کو بھوپال میں سرکاری مہمان بنا کر روک لیا گیا اور بیگم صاحبہ اُن سے ملنے پر راضی ہوئیں، ملاقات میں سرسید نے قوم کی بیکسی اور تباہی کی ایسی پُر درد تصویر کھینچی کہ وہ بے اختیار ہو گئیں، اور کالج کو دس ہزار روپیہ اپنی طرف سے اور دس ہزار اپنے جاگیرداروں کی طرف سے عنایت کیا، اور سرسید ہنسی خوشی علی گڈھ روانہ ہوے،

مولنٰا شبلی مرحوم یہاں نواب علی حسن خاں صاحب کے پاس ٹھہر گئے، اس وقت اُن کے علم و فضل کے یہ نئے مناظر علما، میں اچنبھے کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، شہر کے اکثر علما، اور شعرا نے اُن سے ملاقاتیں کیں، دن دن بھر یہ صحبت اتنی طول کھینچتی کہ مولنٰا گھبرا جاتے تھے، مولانا کی اور نواب صاحب کی یہی پہلی ملاقات ہے جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدر شناسی کی اخیر حد تک پہنچ گئی تھی، اور جس کے کچھ شواہد مکاتیب شبلی میں نواب صاحب کے نام کے خطوط میں نظر آئیں گے،

مولانا نے جو فارسی قصیدہ حیدر آباد دکن میں پڑھا تھا وہ پہلی بار اسی سفر میں اور اسی بھوپال میں صاف ہوا اور چھپا تھا،

سلسلۂ علالت کا آغاز اور سفر کشمیر کا خیال اپریل ۱۸۹۲ء

علی گڈھ کی آب و ہوا مولنٰا کے مزاج کے موافق نہ تھی، خصوصاً سرسید کے جس بنگلہ میں وہ رہنے لگے تھے وہ نشیب میں تھا، اور وہاں پانی مرتا تھا، اس لئے وہ جگہ ملیریائی تھی، اور مولنٰا کو ملیریا کی شکایت پیدا ہو گئی، جس کے حملے اخیر اخیر تک ہوتے رہے، اس کا پہلا حملہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا، چنانچہ یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ مولوی حمید الدین صاحب کے قلم سے لکھواتے ہیں، "تین چار مہینے سے

اکثر صحیح نہیں رہتا، آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سو چھ درجہ پہ حرارت تھی، چار دن تک یکساں حالت رہی، اور نہایت سخت تکلیف رہی۔ . . . . کونین جو بہت سی کھلائی ہے تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں" (ضمیمہ۔ ۳۱) پھر ۵۔ اپریل کو لکھواتے ہیں :۔" بخار کے دورے ہو جاتے ہیں، آج ڈاکٹر نے بڑے سروسامان سے بخار کے روکنے کے لئے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے" (ضمیمہ ۳۲) ناممکن ہے کہ مولانا کی نگاہ میں کشمیر کی تعریف میں عرفی کا یہ شعر نہ ہو،

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید　　گر مرغ کباب است کہ باباں و پرآید

مولانا کو خیال ہوا کہ اس "سوختہ جانی" کی حالت میں کشمیر کا سفر کیوں نہ کیا جائے، چنانچہ ۵۔ اپریل ۱۸۹۲ء[1] کو اپنے ایک عزیز کو لکھواتے ہیں :۔" میں انشاء اللہ اگر اچھا ہو گیا تو اسی مہینہ میں کشمیر جاؤں گا، اور ڈیڑھ دو مہینہ وہاں رہوں گا، اگر تم کشمیر تک چلو، تو ضرور چلے آؤ، سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہوگا تمھارے ذمہ، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمہ، علاوہ میری ہمراہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئیگا مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے" (ضمیمہ۔ ۳۲) ذرا کشمیر کی بدمست آب و ہوا کا قیاس کیجئے کہ صرف اس کا تخیل ایک شاعر کو کتنا بدمست بنا سکتا ہے، اس کے پانچ دن بعد ۱۰۔ اپریل کو ان ہی کو لکھتے ہیں، " اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاء اللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤنگا . . . . . . کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمھارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی نتواں شستن از زنگی سیاہی غلط ہو جائے" یہ مزاح کی بہار بھی اس علالت میں اسی کشت زعفران کے

[1] یہ خط مکاتیب میں نہیں، مولوی سمیع صاحب مرحوم کا، رنگ اچھا خاصہ سیاہ تھا،

خیال کا اثر ہے، مگر بہرحال اس سفر کی فال اس سال نہ نکلی، تبدیلِ آب و ہوا کی اس سے بہتر صورت نکل آئی یعنی صحت کے بعد مئی ۱۸۹۲ء میں روم و شام کے سفر پر روانہ ہو گئے، اور کشمیر کا سفر کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھ رہا،

سفر قسطنطنیہ مئی ۱۸۹۲ء

علمی شوق کے پورا کرنے کے لئے دور دراز مقامات کا سفر کرنا، اگرچہ ہمارے اسلاف کا قدیم ترین شیوہ تھا، لیکن موجودہ علمی دور کے تنزل اور انحطاط میں یہ صرف ایک افسانہ ہی افسانہ رہ گیا تھا جو ہمارے خون کے بجائے صرف ہماری علمی صحبتوں میں گرمی پیدا کر سکتا تھا،

تنگنائے اعظم گڈھ سے نکل کر اگرچہ علی گڈھ میں مولانا کے پرپرواز کے لئے ایک وسیع فضا مل گئی تھی تاہم کتابوں سے جو عشق اُن کو پیدا ہو گیا تھا اس کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع فضا کی ضرورت تھی،

اب اُن کو علمی تشنگی بجھانے کے لئے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہیں، سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لئے وہ بیتاب تھے، اُس کے لئے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس لئے مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے کنگھالنے کی حاجت تھی، اس کے علاوہ ان کے دل میں گذشتہ شاہانہ اسلامی شان و شوکت کی واحد یادگار ٹرکی کے ساتھ جو عقیدت و محبت تھی، اس نے بھی ان کو مجبور کیا کہ وہ عمر میں ایک دفعہ دیارِ محبوب کی سیر کر لیں،

اپنے سفرنامہ کے دیباچہ میں وہ خود اپنے اس ذوق و شوق کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں،

"قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا۔" انھوں نے مئی ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ کیا، اور اپنے ساتھ اپنے ایک عزیز کو بھی لے جانا چاہا، چنانچہ ان کو ایک خط میں لکھا کہ :- "ہاں وہ ضروری امر جو اس خط لکھنے کا باعث ہی یہ ہے کہ میں انشاء اللہ مئی ۱۸۹۱ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا، اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کرونگا میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو، صرف راہ سے تم کو تعلق نہیں۔ تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے، تم اس تجویز کے ہر پہلو پہ غور کرکے مجھ کو جواب لکھو، میرا سفر ہر طرح قطعی ہو چکا ہے" (دیمع) لیکن چند در چند اسباب سے اس سال یہ سفر ملتوی رہا، بلکہ یہ عزم ایک ضعیف سا خیال ہو کر رہ گیا، لیکن ۱۸۹۲ء میں اس سفر کی تکمیل کے چند قدرتی اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ دوبارہ اس خیال کو تحریک ہوئی، ان دنوں مولنٰا اکثر بیمار رہتے، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آکر تبدیلِ آب و ہوا کا ارادہ کیا، اور مکان وغیرہ کے بندوبست کے لئے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خطوط لکھے اور کشمیر کا خیال جیسا کہ گذر چکا زیادہ غالب تھا، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ آج ہی کل میں ولایت جانے والے ہیں، اب دفعۃً مولنٰا کو خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کی رفاقت؛ خوش قسمتی سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے نہایت خوشی ظاہر کی، اور سفر کے ضروری کاموں میں کافی مدد دینے کا وعدہ کیا،

اس وقت جہاز کی روانگی کو کل تین چار روز باقی رہ گئے تھے، اعزہ و احباب نے

سنا تو سخت متعجب ہوئے، اور اکثروں نے کہا کہ اس عجلت اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کونسی دانشمندی کی بات ہے؟ لیکن مولنا کا جواب صرف یہ تھا ؎

انچہ با دا با دمن کشتی درآب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی اور مولنا کو تین مہینے کی رخصت کا مزید حق حاصل تھا، اس طرح چھ مہینے کی رخصت لی، اور ۲۶ ر رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۶-اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڈہ سے روانہ ہوگئے، جھانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا، اور بمبئی پہنچکر حاجی رحمت اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا،

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن جہاز روانہ ہوگیا، پہلی مئی کی صبح کو نو بجے جہاز پر سوار ہوئے، بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا، اور مولنا نے چھ مہینہ کے لئے ہندوستان کو خیرباد کہا، راستہ میں مسٹر آرنلڈ نے مولنا سے عربی پڑھنی شروع کی، اس سے جو وقت بچتا وہ دریائی سفر کے سیر تماشے میں صرف ہوتا،

مناظر کی خوش آیند دلچسپی نے شاعر کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، مولنا نے سفر کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا، جو سفرنامہ اور کلیات دونوں میں موجود ہے،

۷ر مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا، عدن میں مولنا کو مسافروں کی دلچسپی کی ایک بڑی چیز یہ نظر آئی کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں، اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں،

اور کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے ہیں اور تعلین بجاتے ہیں، اُن کا بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دوانی، چونی، پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہیں وہ سمندر میں پھینک دیتے ہیں اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، مگر ایک دردمند دل تھا جو اس منظر کو دیکھ کر بیتاب ہو رہا تھا، یہ مولنا شبلی تھے، مورخِ اسلام کے دل کو ٹھیس لگی کہ وہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشورکشا تھے آج ان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے سامنے مسخرگی کرکے پیٹ پالتے ہیں، یہ خیال آنا تھا کہ مولنا کی زبان سے بے اختیار "قم یا عمر" کے الفاظ نکل گئے، بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عرب نہیں، سالی ہیں تو تسکین ہوئی۔

۱۳۔ مئی کو جہاز سوئز پہنچا، خوانچہ اور پھیری والوں میں سے ایک نے مولنا کو ہندوستانی سمجھ کر اُردو میں گفتگو شروع کی، مولنا کو بڑا تعجب ہوا، اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اُردو کی عالمگیری پر اُن کو اور بھی تعجب ہوا (مجھے بھی ۱۹۲۰ء میں یورپ جاتے ہوئے پورٹ سعید میں یہی اتفاق پیش آیا، جس ڈونگی پر بیٹھ کر جہاز سے ساحل پر آیا اُس کا ملاح بے تکلف اردو بولتا تھا، حالانکہ وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جہاز ہر روز یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اُن ہی جہازیوں سے ملنے جلنے میں ان سے یہ زبان سیکھ لی)

۱۴ ارمئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا، جہاز سے اتر کر جب مولنا نے ساحل پر قدم رکھا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور حیرت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ یہ حرمین محترمین کے بعد پہلا موقع تھا کہ انھوں نے سلطنتِ اسلام کی آبادی دیکھی، یہاں سے مسٹر آرنلڈ الگ ہوئے، وہ یورپ کو روانہ ہوئے

اور مولنا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوے، یہان سے مولنا کی دلچسپی کا نیا سامان یہ پیدا ہوا کہ مسلمان اور شامی عرب مسافرون کی صورتین جہاز مین نظر آنے لگین، اتنے دنوں مین مسلمانون کی صورت کو ترس گئے تھے۔

۱۵ مئی کو جہاز یافہ پہنچا جو شام کا ساحلی شہر ہے اور ۱۶ مئی کو بیروت، گو وقت نہ تھا، مگر ایک ایسے اہم شہر کے دیدار سے محرومی جس کو خیال کی آنکھوں سے وہ تاریخ کے صفحون پر بارہا دیکھ چکے تھے گوارا نہ ہوئی اور ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے، ۱۷ مئی کو جہاز سائپرس پہنچا جس کو عربی مین قبرص کہتے ہین، قبرص وہ مقام تھا جو ایک اسلامی مورخ کی نگاہ مین دلچسپی کا بڑا سامان رکھتا تھا، مولنا اُس کے شہر لاموں مین اترے، سب سے پہلے جامع مسجد مین گئے، مسجد ہی سے متصل ایک اسلامی مکتب نظر آیا، اُس میں چلے گئے، وہاں کے مدرس سے جو ایک عالم تھے ملے، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اُس نے قرآن مجید کی چند آتیں پڑھیں تو مولنا پر بیحد اثر ہوا، اُن کو خیال آیا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان اور کہاں بحر روم کا یہ دور دراز جزیرہ، اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی رو بن کر دوڑ گئی،

۱۸ مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ بھی ابتدائی اسلامی تاریخ کا دلچسپ موضوع ہے، اسی لئے مولنا اُس کی سیر کے بہت مشتاق تھے، لیکن اتفاق سے رات کا وقت تھا اس لئے اس کی سیر سے محروم رہ گئے، ۲۰ مئی کو صبح کے وقت ازمیر (سمرنا) پہنچے اور یہاں جہاز دو روز تک مقیم رہا اور مولنا نے تفصیل کے ساتھ یہاں کی سیر کی، جمعہ کی نماز

جامع حصار میں پڑھی، مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر اُس کتب خانہ میں گئے، وہاں چند علماء اور ترکی محکمۂ تعلیم کے کچھ افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور متعہ کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، یہ لوگ فارسی سمجھتے تھے، اُن کی اجازت سے مولانا نے اس مسئلہ پر ایسی عمدہ تقریر کی کہ سب نے پسند کی،

یہاں سے ۱۲ر مئی کی شام کو روانہ ہو کر ۲۳ر مئی کو صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، اور قلیوں اور ملاحوں کی کشمکش سے رہائی حاصل ہونے کے بعد ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے آئے، اسی کشتی میں شیخ عبد الفتاح سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور یہی اتفاقی ملاقات اُن کی تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی، دونوں نے ساتھ سرائے میں جا کر قیام کیا، چھ سات دن تک اس سرائے میں رہے پھر بابِ عالی کے پاس ایک اچھا مکان کرایہ پر لیا، اور چند روز کے بعد دوسرا مکان لیا، اور اخیر تک اسی میں مقیم رہے،

شیخ عبد الفتاح جن سے مولانا نے دوستی پیدا کی تھی شام کے ایک خاندانِ مشائخ سے تھے جن کو ہندوستان سے بھی ایک طرح کا تعلق تھا، حضرت خالد نقشبندی جو خالد رومی کے نام سے بھی مشہور ہیں، وہ ملک شام سے ہندوستان آ کر دہلی میں حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے تھے، اور یہاں سے نقشبندی طریقہ کی تعلیم پا کر اپنے وطن واپس تشریف لے گئے، اور ہندوستان کی اس دولت کو روم و شام میں جا کر لٹایا، اور نقشبندیہ طریقہ کو جاری کیا، شیخ عبد الفتاح کا نام سُن کر اُن کی زیارت کے لئے شامی عربوں کا گروہ در گروہ آنا شروع ہوا، اور اس ذریعہ سے مولانا کی ملاقات بھی ان سے ہونے لگی، ان ہی آنے والوں

میں ایک نوجوان شامی عالم شیخ علی ظبیان تھے، ایک دن وہ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے، تو مولنا بھی پاس ہی بیٹھے تھے اور سامنے مولنا کی عربی تصنیف اسکات المعتدی رکھی تھی، شیخ علی ظبیان کی نظر اس پر پڑی، تو کہا "آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا، اور انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شکراللہ مساعیہ" شیخ علی ظبیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے مصنف یہی ہیں تو اٹھکر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مولنا کو اس بات سے کہ ان کی ایک معمولی سی تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے نگاہ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی، شیخ علی ظبیان سے مولانا کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے، اور وہ اس سفر میں ان کے بہت مدد و معاون ثابت ہوئے چند روز کے بعد انھوں نے مولنا سے منطق پڑھنی شروع کی، ان کے ساتھ فواد بک وغیرہ چند اور نوجوانوں نے بھی شرکت کی،

کتبخانوں کی سیر

اس سفر سے مولنا کا اصلی مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا، قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت دور دور واقع تھے، مولنا ایک ایک کتبخانہ، اور ہر کتب خانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو اُن کے مقصد سے تعلق رکھتی تھی دیکھتے پھرتے تھے، اور اس غرض سے اُن کو روزانہ تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ روزانہ یہ تکلیف اٹھاتے تھے، اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کتب خانوں کی سیر کرتے رہتے تھے، چنانچہ قسطنطنیہ سے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں" (سرسید۔۱)

یہاں جو کتابیں نظر سے گذریں، اُن میں سے سرسید کو ان کے فلسفیانہ مذاق کے مطابق جن تصنیفات اور مصنفوں سے باخبر کیا ہے اس کا تھوڑا سا حال سرسید کے نام کے خطوں میں ہے۔ ۲۲-مئی کو وہ قسطنطنیہ پہنچے اور تین ہی روز کے بعد ۲۵-مئی کو وہ اُنھیں خط لکھتے ہیں: "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپیے بھیجدیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جاسکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں، اور بو علی سینا کی تو شاید کل تصنیفات ملسکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں، . . . .

معتزلہ کی کتابیں یہاں بھی نہیں،

پھر ۱۵-جون ۱۸۹۲ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، (یعنی خریدنے کے لئے نہیں ملیں) مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے، یہاں امام غزالی کی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات[1] کا نسخہ بھی ہے، بو علی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں . . . . . معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں" . . . .

۵-جون ۱۸۹۲ء کو اپنے والد ماجد کے نام لکھتے ہیں:- "کتابیں یہاں عجائب وغرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہوسکتیں نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل

---

[1] سرسید نے مکاتباتِ امام غزالی کا جو نسخہ شائع کیا ہے، کیا وہ یہیں سے منگوایا گیا تھا،

پیادہ سفر کرتا ہوں، کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں، ماموں صاحب سے فرما دیجئے کہ آجکل یہاں عینی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے، نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات ان میں ایسی ہیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتیں، قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی، ایک مشترکہ کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایہ کی ہے، جس نے عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے، اسی میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔"

سفرنامہ میں مولٰنا نے یہاں کے کتب خانوں کے علمی سرمایہ پر جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتبخانوں میں کیا کیا دیکھا، فرماتے ہیں :- "میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے دنیا سے ناپید ہوگئے، لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے یہ بھی غنیمت ہے۔" اسی سلسلہ میں ابن سینا کی حکمت مشرقیہ کا ذکر کیا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں :- "مشہور حکماء اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں، اکثر یہاں موجود ہیں۔" اسی سلسلہ میں مولٰنا نے تاریخ و ادب کی حسب ذیل نادر کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ "اسرار البلاغۃ جرجانی، دلائل الاعجاز جرجانی البیان والتبیین للجاحظ، تذکرۂ ابن حمدون، معجم الادبا یاقوت، کتاب الاشراف بلاذری، تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب القضاۃ وکیع، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ الاسلام ذہبی، تاریخ الحکما قفطی، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم ابن جوزی، مرآۃ الزمان سبط ابن جوزی، مسالک الابصار ابن فضل اللہ، عقد الجمان بدرالدین عینی، تاریخ دمشق ابن عساکر، رحلہ ابن خلدون، نہایۃ الادب نویری، طبقات کبری ابن سعد،

طبقات الامم صاعد اندلسی، سیرۃ العمرین ابن جوزی، کتاب الصناعتین عسکری، شرح تبریزی برحماسہ دیوان ابونواس مکمل، سرقات المتنبی ابن عمید، مجموعۂ رسائل ابواسحاق صابی وغیرہ"۔

کیا زمانہ کی نیرنگی ہے، جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے یہ محنتِ شاقہ اٹھائی تھی وہ ان ہی کے زمانہ سے چھپ کر عام ہونے لگی تھیں، اور اب تو شاید اُن کی ان پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ چھپی ہو، ایک منتظم اور تاریخ کبیر بخاری تھی وہ بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ رہی ہے، تاہم اس سے مولانا کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر فن میں ان کی نگاہِ انتخاب اُدھر ہی جا کر رکی جو انتخاب کے قابل تھی، اور وہ مولانا ہی تھے جنھوں نے ان کتابوں کے ناموں سے ہندوستان کو سب سے پہلے روشناس کیا،

الفاروق کے لئے جن کتابوں سے معلومات ان کو مل سکتے تھے، اُن کو مطالعہ کیا، اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاۃ محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں، اور مصنف نے الفاروق کے مقدمہ اور حاشیہ میں بھی اس کی تصریح کر دی ہے،

مدارس کا معائنہ

کتب خانوں کے بعد یہاں کے مدارس دیکھنے کی چیز تھے اور مولانا کو جو شوق وآرزو یہاں تک کھینچکر لائی تھی اس میں اس چیز کا مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھا، سفرنامہ میں فرماتے ہیں:- "اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کرنا تھا" چنانچہ اسی لئے اس پر بہ نسبت اور باتوں

کے زیادہ توجہ کی، اور جہاں تک ہو سکا اس کے لئے کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، وہ چند بار سررشتہ کے دفتر میں گئے، تعلیم کے افسروں سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے اسکول اور کالج خود جاکر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملے، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، وہ ہندوستان کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں تھے جو مسلمانوں کی نئی امیدوں کا مرکز تھی اور خود پرانی تعلیم کے مدرسوں کی پیداوار تھے، اس لئے دونوں کے حسن و قبح سے واقف تھے، اور یہ جاننے کے لئے بیتاب تھے کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے قدیم و جدید کو کس طرح پیوند دیا گیا ہے، لیکن جب یہاں پہنچکر انھوں نے دیکھا کہ یہاں بھی قدیم و جدید کے درمیان وہی حدّ فاصل قائم ہے تو اُن کے دل کو چوٹ لگی، ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں:۔ افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے، اور جو قدیم طریقۂ تعلیم تھا اُس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں، اور جب تک یہ ڈانڈے نہیں میں گے اصلی ترقی نہ ہو سکیگی، یہی کمی ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے" نئے طریقہ کے جو اسکول اور کالج تھے مولانا نے اُن کو ایک ایک کرکے دیکھا، مکتب حربیہ (ملٹری کالج) مکتب الحقوق (لا کالج) مکتب الصنائع (ٹکنیکل کالج) مکتب بحریہ، مکتب الزراعۃ (اگریکلچر کالج) مکتب سلطانیہ مکتب ملکیہ (سول سروس کالج) وغیرہ میں گئے، وہاں طلبہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو غور سے دیکھا، اُن کے بورڈنگ کے انتظام اور طور طریق پر غائر نگاہ ڈالی، اور ان میں جو باتیں قابلِ ذکر تھیں ان کو سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، تاکہ وہ کالج میں رائج کی جائیں،

اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو

بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے، اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے، مجھکو یہ بات بہت پسند ہوئی، ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے۔" مولنا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا، اور اس کے رواج دینے کی کوشش کی، اس وقت کالج میں جس یونیفارم کا رواج ہے وہ اسی تجویز کی ادھوری تعمیل ہے: حیات جاوید میں ہے:۔ "پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لئے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکا، لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے ہمچشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کر لیتے ہیں۔" (۲ صفحہ ۹۴)

اسی طرح مولنا سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں: "ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے، اور دولت مند ترکوں کی طرف سے اُن کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے، اور غرباء کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا، ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے، بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا، اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلافِ مراتب پر افسوس کرتا تھا . . . . . میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع،

خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے، اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹا دیجائیں اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں"۔ (سفرنامہ ۶۰) مکتب ملکیہ یعنی سول سروس کے کالج میں جب وہ گئے ہیں تو اتفاق سے ظہر کی نماز کا وقت آگیا، اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے، وہ سماں مولنا پر اثر کر گیا، لکھتے ہیں:۔" اس اثنا میں ظہر کا وقت آگیا، مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی، عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے، اور اس لباس میں اُن کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا، اور وقار و احترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزّلی ہزار درجہ بہتر ہے"۔ (صلے) ترکی کے مصنفین اور ادبار سے بھی ملاقاتیں کیں، اور جدید ترکی ادب کا جو سرمایہ پیدا ہوا تھا اس کا بھی اندازہ لگایا، یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور علمی رسائل دیکھے، اور ان کی ظاہری شکل و صورت، چھاپہ کی خوبی، ٹائپ کی خوبصورتی، صفائی، اور مضامین کے تنوع اور بلندی سے اُن کو خوشی ہوئی، مگر یہ دیکھکر افسوس کیا کہ حکومت نے سیاسیات کے میدان کو اتنا تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ اس نمک کے بغیر وہاں کا ہر بہتر سے بہتر کھانا بھی بدمزہ ہو رہا ہے،

یہاں ہر طرف ترکی زبان کا ماحول دیکھ کر مولنا نے ترکی پڑھنی شروع کی، چنانچہ اپنے والد کو لکھتے ہیں:۔" ترکی پڑھنی میں نے شروع کر دی ہے، دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں"

ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے ایک عرب تھے جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے، مولنا نے ان ہی سے ترکی سیکھنی شروع کی، مولنا نے گو سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جو ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے

ان سے سیکھی تھی وہ بھی اب محفوظ نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی ترکی سیکھ گئے تھے کہ انھوں نے اپنے ایک استاد زادہ مولانا محمد امین صاحب چریاکوٹی خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کو اس زبان میں اپنا شاگرد بنایا، اور وہ بعد کو ترکی اچھی طرح سیکھ گئے، اخیر اخیر زمانہ تک مولانا کا یہ حال تھا کہ ترکی اخبار ہم لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے، اور عربی لفظوں کے سہارے سے اُس کا کچھ حاصل نکال لیتے تھے،

یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر مولانا کو جو خوشی ہوئی اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر اُن کو تکلیف ہوئی، بلکہ یہاں تک اُن کی رائے ہوئی کہ "موجودہ (پرانی) تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہی، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی، (سفرنامہ ص۸۴)

قسطنطنیہ میں مولانا کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طالب علم بیس ہزار سے کم نہ تھے، مگر سب کی حالت افسوسناک تھی، اُن کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک، صحن مختصر، مکانات بند بند، ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ وخیرات، بایں ہمہ مولانا نے ان مدرسوں کو دیکھ کر ترکوں کی اس علمی فیاضی کا اعتراف کیا کہ وہ ہر چند کم حیثیت سہی، تاہم آج سینکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے، اور انصاف یہ ہو کہ یہ مدرسے جس زمانہ کی یادگار ہیں اُس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کہ بجائے خود ایک اقلیم ہے، حکومتِ اسلام کی شش صد سالہ مدت کی

ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں، (سفرنامہ ص۸۰)

اس تفاوتِ حال کا سبب تو ظاہر ہے کہ ترکوں کی اسلامی سلطنت باقی تھی اور ہندوستان کی مٹ چکی تھی، بہرحال یہ تو دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم مدارس کی اس حالت کو دیکھ کر اُن کو بڑا درد ہوا، آج ترکی میں جو مذہبی وتمدنی انقلاب برپا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری کا نتیجہ ہے اور ہر قدیم کو مٹا کر ہر جدید کی طلب کا جوشوق جنون کی حد تک مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں پیدا ہوا وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدیم وجدید تعلیم کے درمیان تطبیق کی کوئی کوشش اتنے زمانہ تک وہاں نہیں کی گئی، میں نے اپنے سفر افغانستان میں افغانستان کے وزراء اور امراء کی خدمت میں یہی عرض کیا تھا، اور اسی نتیجہ سے اُن کو ڈرایا تھا،

مولانا کے دل کو ترکی میں جس دوسری چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ یہ ساری رونق، یہ ساری چہل پہل، یہ ساری ترقی جو کچھ تھی وہ سلطنت کے دم سے تھی، اس میں ترکی قوم کی کوشش وعمل اور جد وجہد کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ اسی طرح سُست وساکن اور بے خبر تھی جیسی خود ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم، یہ دیکھ کر ان کے دل پر جو اثر ہوا، اس کو سفرنامہ میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

"(سیاسی قید وبند کا) یہی اثر ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے۔ . . . . . . اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ . . . . . . تمام کالج اور اسکول جن کا میں نے ذکر کیا حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دار السلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولتمند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہوسکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں جس قوم کی تمام ضرورتیں

گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بےکار ہو جاتی ہیں" (صلہ ۲۱)

مولٰنا کی دوررس نظر نے ٹرکی کی جس بیماری کا اُن دنوں احساس کیا تھا، اسی کا علاج مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی حکمت اور تدبیر سے کیا، یعنی ترکی سلطنت کو ترکی شہنشاہی سے نہیں، ترکی قوم کے ذریعہ سے زندہ کرنا، البتہ اس راہ میں مصطفیٰ کمال سے جو بے اعتدالی ہوئی، اس کا افسوس ہے،

قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم ملکوں کا تفاوت، اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں کا فرق ہے، وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہموطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی، اور اپنی زبون حالی کا احساس اور قوی ہو گیا، تاہم جب اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روحِ مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوتا ہوگا، دلِ بیتاب سے جوشِ سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ کو رسمِ سلاملق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکبِ سلطانی کا پُرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولٰنا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی، مولٰنا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکبِ سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے، جس کا ہر نقطہ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا ساغر ہے، اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے،

بگذر از یں حرف و مکرر مپرس — خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

تندیے بود خـــرابم ہنوز   دیدۂ من بازو بخوابم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی، کیا محض اس لئے کہ دولت وثروت اور جاہ واقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس جاہ وحشم کے آئینہ میں اُن کو اسلام کی حیات ملی کا تابناک چہرہ نظر آرہا تھا، عیدگاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے، فرماتے ہیں:۔

غلغلہ برخاست کہ باد اوید   ہرجہاں تابِ خلافت دمید

قاعدۂ دولت ودیں رامدار   آئینۂ رحمتِ پروردگار

شاہ فلک کوکبہ عبد الحمید   ایدک اللہ بنصرٍ مزید

فرۂ شاہی بہ جبیں آشکار   حاشیہ بوساں بہ یمین ویسار

آگے چل کر دعائیہ اشعار میں اُن کے جذبات اور نمایاں ہو جاتے ہیں،

جز تو کہ ہست ای شہ انجم سپاہ   آنکہ بود شرعِ نبی راپناہ

تازگیِ بدر وحنین از تو ہست   زیب وطرازِ حرمین از تو ہست

چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است   زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی، نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی، بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر گیا ہے،

رسمِ سلاملق دیکھنے کے بعد مولنا پر جو کیفیت طاری تھا اس کی تصویر ان کے سفرنامہ سے زیادہ ان کے ایک مکتوب میں ہے، جو مکاتیب میں شامل ہے، یہ خط چونکہ عین اسی دن لکھا گیا ہے اس لئے

اس سے اُن کے تاثر کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹ جون ۱۸۹۲ء کے خط میں اپنے والد ماجد کو لکھتے ہیں،

قبلہ ام!

آج میں نے "عجیب و دلآویز" خواب دیکھا ہے، "عجیب" اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں، اور "دلآویزی" کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے، مفصل سنئے، آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا، جامعہ حمیدیہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گذرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے،

محلِ سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نہایت پُر تکلف جامع مسجد ہے جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے، اس گذرگاہ میں ایک مکان ہے، اور دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار جو موکبِ ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں اور اُس مکان کی چھت پر بیٹھکر یہ تماشا دیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیونکہ سواری کے وقت دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے، اور کوئی شخص اُس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا، حسین حبیب[1] آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مجھ کو اجازت

[1] جنگِ روم و روس میں مولانا نے چندے ان ہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ بھیجے تھے، یہی ذریعۂ تعارف تھا،

دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے، اُدھر سواری کا وقت قریب آگیا اور طرقوا اور دورباش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا، اور صفِ اوّل میں جا کر بیٹھا، سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصہ پر جہاں نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا تشریف لے جاتے ہیں، وہاں ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے منبر کے بائیں طرف ہے، یہ سلطان کی نماز کی جگہ ہے جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو طلسی پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اور کوئی شخص اُن کو دیکھ نہیں سکتا، خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا اَللّٰھُمَّ انصر مولانا السلطان السلطان الغازی عبد الحمید خان تو میرے بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے صحابہؓ کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ آج ظلِ اللہ ہیں تاہم ان کا رتبہ حضرت صدیق و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، نماز کے بعد حسین حبیب آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے سلطان مقصورہ سے اُتر کر زینہ کے قریب پردہ کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے گذرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹہ کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا، قریباً دس ہزار فوج تھی، مختلف رسالے، اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے، میں کیا کہوں، ترکی جوانوں کی دلیرانہ صورتیں، چمکتے ہوئے اسلحہ، موزوں اور باقاعدہ رفتار، گھوڑوں کی جست و خیز، پاشاؤں کا

زرکار لباس، جگمگاتے ہوئے تمغے، عجیب سماں تھا جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا، اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر نو دس برس کی ہی لیکن جس شان و شوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے، فوجیں گذر چکیں تو سلطان گاڑی پر سوار ہوے اور ہمارے سامنے سے گذرے، سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا، سلطان دونوں ہاتھوں سے اُن کا جواب دیتے تھے، یورپ کے اکثر معزز اشخاص یہ تماشا دیکھنے آئے تھے، حالانکہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہی، عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے، خدا وہ دن بھی دکھلائے،

خدا نے یہ دن بھی اُن کو دکھایا، اس دن سلاملق نہ تھی، اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی لیکن شان و شوکت، جاہ و جلال، جوش و اثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، قریبًا ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا، اس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے، یکایک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں معلوم ہوا کہ تمام وزرا، پاشا، افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدہ دارانِ ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زریں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوے، ان سب پر آفتاب کا عکس، تمام میدان جگمگا اٹھا، یہ صف جا چکی تو سلطان کا جمال جہاں آرا نظر آیا، گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتا تھا، اور ہر قدم پر اس زور سے بادشاہم چوق یشا (زندہ باد) کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا، مولنا عید کا یہ سماں دیکھ کر واپس آئے تو اُن کا دل شاعرانہ جذبات سے معمور تھا، چاہا کہ جو تماشا انھوں نے دیکھا ہی وہ دوسروں کو بھی دکھائیں، مثنوی عیدیہ کے نام سے یہ نظم اُن کے سفرنامہ اور کلیات میں درج ہی، اسی مثنوی کے وہ چند شعر ہیں جو اوپر گذر چکے

مولنا کا یہ سفر جیسا خالص علمی اور تعلیمی مقصدوں کے لئے تھا، ویسے ہی تائید غیبی نے انکی عزت افزائی کا ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس کے حصول کی کوشش کیا وہم و گمان بھی کسی غیر ملک کے آدمی کو نہیں ہو سکتا تھا، اور جس کے عطا میں اعترافِ کمال کے سوا دینے والے کی کوئی سیاسی مصلحت بھی نہیں ہو سکتی،

جنگِ روم و روس کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام اُن دنوں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور اس جنگ سے جو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہی اس لئے قسطنطنیہ پہنچ کر اس نامور ترکی سپہ سالار کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا، یہی کشش اُن کو غازی موصوف کے درِ دولت تک کھینچ لے گئی،[1]

پہلی ملاقات کے بعد پاشائے موصوف نے مولنا سے دوسری ملاقات کی خواہش کی، مولانا نے دوسری بار اُن سے ملاقات کی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تپاک سے ملے اور کہا کہ جب یہاں سے جائیے گا تو مجھ سے مل لیجیئگا، اسی اثنا میں انھوں نے مولنا کے لئے سلطان سے تمغہ مجیدی کے عطا ہونے کی درخواست کی تھی اور وہ منظور بھی ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو خود اس کی خبر نہ تھی، ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنے مکان میں سو رہے تھے، کہ اتنے

[1] اس ملاقات کا پورا حال سفرنامہ میں موجود ہی، مگر ایک واقعہ ایسا ہی جو صرف سینہ بسینہ منقول ہی، مولنا شروانی فرماتے ہیں کہ "غازی عثمان پاشا کی ملاقات کا ایک واقعہ خود مولنا نے مجھ سے بیان کیا تھا، ملاقات کے وقت جب ایک تلوار دوسرے کے ہاتھ میں تھی، مولنا نے غازی سے درخواست کی کہ جس ہاتھ سے آپ نے کفار کو قتل کیا تھا اس کے چومنے کی اجازت مجھ کو دیجئے، پاشا نے کہا کہ آپکا ہاتھ بھی چومنے کے قابل ہے، جس نے علمی خدمات انجام دی ہیں، اور یہ کہکر مولانا کا ہاتھ چوم لیا!" ۱۲

ایک دوست دوڑے ہوے آئے اور مولنا کو جگا کر کہا " یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان "
مولنا کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا، لیکن قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو یہ خبر صحیح نکلی، دوسرے
دن تمام احباب مبارک باد دینے آئے، اور مولنا نے اس خوشی میں ایک مختصر سا جلسۂ دعوت
ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولنا عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے کہا
" تمغۂ مجیدی مبارک " پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارکباد دی، تمغہ سامنے
میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مولنا کے حوالہ کیا،
مولنا سرو قد کھڑے ہو گئے اور سلطان کو دعا دی، رخصت کے وقت پاشائے موصوف
نے مولنا کو اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی عطا ہوا جو سفرنامہ
میں نقل ہے،

اس تمغہ اور فرمان کے ملنے کی تاریخ ۱۴۔ محرم ۱۳۱۰ھ ہے، مولانا نے ہندوستان پہنچکر
اس تمغہ کو استعمال کرنا چاہا لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲۔ مئی ۱۸۹۶ء کے قانون کے مطابق
اس کی اجازت نہیں دی،

قسطنطنیہ سے روانگی قسطنطنیہ میں مولنا قریب قریب تین مہینے تک رہے، ان تین مہینوں
کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا جس کے تفصیلی حالات
سفرنامہ میں مذکور ہیں، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، اس سے فراغت ہو گئی تو یہاں سے
طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات کو جو سلطان کی تخت
نشینی کی رات ہے بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، لیکن مولنا اس کا بھی انتظار نہ کر سکے،

اور ۲۶ محرم ۱۳۱۰ھ کو چل کھڑے ہوئے،

بیروت! ساتویں دن بیروت پہنچے اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہے، بیروت میں قیام کی اصلی وجہ شیخ طاہر مغربی کی ملاقات کا شوق تھا، یہ شیخ رہنے والے تو شمالی افریقہ کے کسی ملک کے تھے، مگر زیادہ تر یہ مصر اور شام میں رہتے تھے، یہ زندہ کتب خانہ تھے، قلمی کتابوں، اور کتبخانوں کی نادر کتابوں کے نام اُن کی نوکِ زبان تھے، اُن کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتب خانہ کے نوادرات کے نام درج تھے، توجیہ النظر وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں،

بیروت خود بھی اس وقت شام میں شامی عرب عیسائیوں کی جدید علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز تھا، علمی انجمنیں، ادبی مجلسیں، اور نئے علم و فن کے کالج، اچھے اچھے عربی مطبعے قائم تھے، جن سے عربی ادب کی عمدہ عمدہ کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اور ان ہی مطبعوں سے عربی اخبار اور رسالے نکل رہے تھے، اور عربی زبان میں نئے علوم اور نئے خیالات کے لئے الفاظ بن رہے تھے، مولانا نے ان سب پر غائر نظر ڈالی اور وہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی، جس کا پورا مرقع سفرنامہ میں موجود ہے،

بیت المقدس! بیروت سے مولانا کے شامی دوست شیخ علی ظبیان اپنے والد کے اصرار سے دمشق چلے گئے، اور مولانا نے ۵۔ صفر ۱۳۱۰ھ کی شام کو بیت المقدس کی راہ لی اور وہاں پہنچکر وہاں کے ہندوستانی زاویہ میں قیام کیا، اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت، اور وہاں کے مفتیِ شہر سید طاہر اور دوسرے علماء و فضلا سے ملاقاتیں کیں، اور بعض مجلسوں

میں علمی مسائل پر گفتگو کی، یہاں سے فارغ ہو کر مصر کا رُخ کیا، اور اسکندریہ سے ریل پر بیٹھ کر قاہرہ پہنچے

قاہرہ | قاہرہ میں مولنا نے مصر کے قدیم تعلیمی مرکز جامع ازہر میں رواق الشامیین کے ایک حجرہ میں قیام کیا، اور وہاں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے، چونکہ قاہرہ قدیم و جدید دونوں قسم کی تعلیم کا مرکز ہی، اس لئے مولانا نے یہاں کے نظامِ تعلیم کو نہایت غور سے دیکھا، اور ان کو نظر آیا کہ جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہی وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہی، اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے

مولانا کو صرف ایک کالج جس کا نام دار العلوم تھا نظر آیا جو مولانا کے خیال میں دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا تھا، اگرچہ افسوس ہی کہ ابھی پوری طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا، دار العلوم کے علاوہ مولنا نے متعدد مدرسے اور کالج مثلاً مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترجمہ، مدرسۃ الطب وغیرہ دیکھے اور اُن کے متعلق مفید و مستند معلومات حاصل کیں،

مصر میں سب سے زیادہ مولنا کی دلچسپی کی جو چیز تھی وہ جامع ازہر تھا، مولنا نے اسی میں قیام کیا تھا، لیکن دورانِ قیام میں وہ جس نتیجہ پر پہنچے اس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہی، "مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد ۱۲ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے، اور کرتا جاتا ہی، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہی اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت، غرض

تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں، جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں اس لئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دنارت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ بحق سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائینگے، ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر اُن سے بھی گیا گذرا ہی، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے، اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب معانی و بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دار العلم کے کسی طرح شایان نہیں"۔ مدارس کے ساتھ مولانا کا ایک بڑا مطمح نظر کتب خانے تھے، مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ، کتبخانہ خدیویہ تھا جو اب کتبخانہ مصریہ کہلاتا ہے، مولانا نے اس کو جا کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ "ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت حسن انتظام خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے" اس وقت اس کتب خانہ میں ہر علم و فن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود تھیں (اب تو اس کی تعداد اس سے دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے) مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا، اور ہر علم و فن کے نوادر کتب کی ایک فہرست مرتب کی، جو ان کے سفرنامہ میں موجود ہی، تاریخ اور ادب کی جن نادر کتابوں کو مولانا نے اس وقت چنا تھا، ان میں سے اکثر آج کل چھپ چکی ہیں، البتہ تفسیر

اور حدیث کی جن کتابوں کے نام لئے ہیں ان میں سے اکثر اب تک غیر مطبوعہ ہیں،

مدارس اور کتب خانوں کے ساتھ مولانا نے مطابع، اخبارات، انجمن، کلب اور مصر کے عجائبات وغیرہ دیکھے، مصر میں قدیم وجدید تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی اور دونوں تعلیم کے اکابر وہاں موجود تھے، مولٰنا نے اس موقع کو غنیمت جان کر دونوں سے ملے، نئے تعلیم یافتوں میں سے علی پاشا مبارک، علی پاشا ابراہیم، امین بک فکری، اور احمد زکی سے، اور پرانے تعلیم یافتوں میں سے شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہٗ سے خاص طور پر ملے، اور اُن سے عربی تعلیم اور عربی مدارس کے نظام پر گفتگو کی،

مصر میں عربی زبان پر جو نئے انقلابات آئے، اور نئے خیالات، نئی چیزوں، اور نئی باتوں کے لئے جو نئے عربی لفظ بن گئے تھے یہاں مولٰنا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا، اور غالبًا ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہِ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی، مولٰنا نے اپنے سفرنامہ کے آخر میں بہت سے نئے الفاظ کی فہرست شامل کر دی ہے،

صحت پر عمدہ اثر مولٰنا کے اس سفر کی ایک ضمنی غرض صحت کی بحالی تھی، بحمد اللہ کہ اس سفر میں یہ غرض بھی پوری ہوئی، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے، ایسی تندرستی پھر اُن کو نصیب نہیں ہوئی[1]،

واپسی اور سفر کے تاثرات اور نتائج مولٰنا کا یہ علمی سفر مصر میں تمام ہوگیا، وہ وہاں سے سیدھے ہندوستان تشریف لائے، اخیر اپریل ۱۸۹۲ء سے ان کا سفر شروع ہوا تھا، اور اسی

[1] مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ ۷، ارجنوری ۱۹۱۵ء،

سال کے شروع نومبر میں ختم ہوا، ان چھ مہینوں میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز حصوں کو دیکھکر جن کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، مولانا کے حساس دل کو اسلام کی گذشتہ علمی یادگاروں کو دیکھ کر جہاں مسرت ہوئی وہیں مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو دیکھ کر اُن کو بڑا رنج ہوا قسطنطنیہ ہی میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر مولٰنا نے اپنے والد ماجد کو لکھا: "اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی وقوت کی نسبت بالکل برباد ہوگئی ہیں، کیونکہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں، تاہم سفر بے شبہہ ضروری تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتا، افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہوجاتی ہے"

ان فقروں سے اندازہ ہوگا کہ کیا چیز اُن کو ہندوستان سے کھینچ کر اس بحر و برا اور دشت وجبل میں لے گئی تھی، اُن کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم وفنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی، اور طریقۂ تربیت اور درسگاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درسگاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر رہیں، اور نصاب میں متاخرین کی شروح وحواشی کے بدلے قدما کی اصلی کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں، درسگاہیں عالیشان، رہنے کے کمرے صاف ستھرے، اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو، لیکن یہ چیز اُن کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں، سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی...... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا، کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھکر سخت رنج ہوتا تھا۔" (صفحہ)

مولٰنا کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے نظام و دستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دار العلوم کا یہ مرقّع (مسوّدہ) جس کو سیاح روم و شام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے، اُس کو نظر آئے گا کہ روم و شام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے،

مولٰنا نے اپنے سفرنامہ کے شروع میں اپنے اس سفر پر خود تبصرہ کیا ہے، جس سے بہتر تبصرہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، فرماتے ہیں:۔ "ٹرکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکانداروں تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے، اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں، ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے

کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہی، جو شخص جس حال میں ہے اسی پر قانع ہی، موجودہ حالت تو یہ ہے وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔

کالج میں خیر مقدم | کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا، اس لئے جب مولنا ہندوستان واپس آکر کالج میں پہنچے تو واپسی سفر کی مبارکباد میں متعدد جلسے منعقد ہوئے، سب سے پہلے ۱۲- نومبر ۱۸۹۲ء کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک دعوت دی گئی جس میں سرسید اور کالج کے پروفیسر بھی شریک تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی بہادر علی صاحب یم اے نے ایک مختصر تقریر میں مولنا کے دور دراز سفر سے بخیریت واپس آنے کا شکرانہ ادا کیا اور مولنا کے علوے ہمت اور سفر کی تکالیف کی ہنسی خوشی برداشت کی تعریف کی، اور ان کے اُن احسانات کا ذکر کیا جو ان کی تحقیقاتِ علمی سے قوم اور قومی کالج کے لئے متصور تھے، اور آخر میں مولنا کو "تمغۂ مجیدی" ملنے پر مبارکباد دی، ان کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو ان دنوں وہاں فورتھ ایر کلاس میں پڑھ رہے تھے، مندرجۂ ذیل نظم پڑھی،

باز وقتِ گرمیِ بزمِ سخن آید ہمی | بلبلِ گم گشتہ در صحنِ چمن آید ہمی
زینتِ ہر بزم و زیبِ انجمن آید ہمی | آں ادیب و شاعر و سخنور رین آید ہمی

واپس آئے سیرِ روم و شام و مصر و زنگ سے | آشیاں، بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیئے | تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیئے
پنجۂ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیئے | ایک فقرے سی ہیں ڈھارس بندھا کر چل دیئے
ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم | خانہ بر موجِ سمندر چوں حباب انداختم

اس کے بعد ۶- دسمبر ۱۸۹۲ء کو کالج اسٹاف کی طرف سے مولنا کو ایک شاندار ڈنر دیا گیا جس میں مولنا نے ایک ترکیب بند پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد — کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد

از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید — یا مگر بلبلِ شیراز بشیراز آمد

دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ گو — اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

رفت ہر چند بسے بے سر و ساماں اما — شکر ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد

پورہ قصیدہ کلیات میں موجود ہے۔

سفرنامہ، کلیات اور رسائل

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک

سفرنامہ اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کا تقاضا ہوا کہ سفر کی سوغات لائیے یعنی سفرنامہ لکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے دورانِ سفر میں تو مولنا کو یہ خیال تھا کہ وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیں گے چنانچہ ۲۵- مئی ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں :- "حالات دلچسپ ہیں اور سفرنامہ کے لئے بہت سامان مل جائے گا" (سرسید - ۱) لیکن واپسی کے بعد مولانا نے احباب کے اصرار کے باوجود اس خیال کو ترک کر دیا ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں :- "سفرنامہ کے لئے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہو گئی ہے لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے جس کے متعدد اسباب ہیں" (اسحاق - ۴) مولانا نے ان اسباب کی تشریح نہیں کی لیکن

ان متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب کا ذکر سفرنامہ کے شروع میں کیا ہی، یعنی یہ کہ سفرنامہ کے لئے جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں، اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہی، وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہی، ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش ہی،

لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا اس پر اب بھی پردہ پڑا ہے، واقعہ یہ ہی کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی ٹرکی کے ساتھ بڑھ رہی تھی، حالانکہ اس جنگ میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا، اور ان ہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ٹرکی کے لئے چندے کئے تھے، اور بڑا جوش پھیلا تھا، پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ٹرکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی، مگر کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی، اس کامیابی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تمام ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی گئی، جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منھ چڑھایا گیا، اسی لئے سرسید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوے، اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا، اور

اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ٹرکی کی یہ عقیدت جاتی رہے، اور اتحاد اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کمزور پڑ جائے،

مولنا کا ٹرکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان اور ٹرکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی، اور مولنا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے، جو ٹرکی گئے،

قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اپنے جوش و خروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلیونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے، اور وہاں سے "تمغہ مجیدی" کا تحفہ ہندوستان لائے اس واقعہ نے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے اربابِ بست و کشاد کو چراغ پا کر دیا، اب جب مولنا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے سیاسی مصلحت شناسوں کے حلقہ میں یہ سمجھا گیا، کہ معلوم نہیں اس سفرنامہ میں کیا کیا زہر ہو اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی کیسا پڑے،

بہرحال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہیگا کوئی زہریلی چیز نہ ہو گی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی، اور وہ لکھا گیا، ۲۶- مارچ ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں: "میں آج کل سفرنامہ لکھ رہا ہوں"۔ (سمیع ۴۳) اسی لئے یہ سفرنامہ خالص علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا، پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ٹرکی کی محبت کا نیا بیج نہیں بو دیا، اور اسی لئے انگریزوں نے مولنا نے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا جس کی تفصیل آگے کہیں آئیگی،

مولانا کو خیال تھا کہ اس ادہ کے سفرنامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی، اسی لئے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہ تھا، ۱۱ اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں:- "معلوم نہیں اس سفرنامہ سے ملک کو کہاں تک دلچسپی ہوگی، اس کا اندازہ ہوتا تو اسی حساب سے جلدیں چھپتیں" اب تک مولانا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں، مگر یہ سفرنامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شاید اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا، اس کا پہلا اڈیشن مفید عام آگرہ میں جو اس زمانہ کا اچھا مطبع تھا ۱۸۹۴ء میں چھپا، مہدی افادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں، ۲ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کو لکھتے ہیں:- "سفرنامہ میرے ہاں سے ملتا ہے، مگر میں آج سفر میں تھا، اب علی گڈہ پہنچا ہوں لیکن سردست اس کی جلدیں یہاں نہیں رہیں، آگرہ کو لکھا ہے جس وقت کتابیں آئیں گی، فوراً تعمیل ارشاد ہوگی، آپ تار وارنہ بھیجیں" (مہدی افادی-۷) یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج اور مولانا کی تصنیفات میں ھٰذا فراق بینی و بینک کا اصول جاری ہوا، اور ع من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی کی پرانی شریعت منسوخ ہوئی،

سمیع ۱۵۰

کلیات فارسی ۱۸۹۴ء ابھی اس زمانہ کو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے، جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہل ذوق کے سلسلۂ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوتی تھی، اسی لئے مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کرنے کا خیال بہت دنوں سے تھا، مگر چونکہ طبیعت میں ابھی جھجک باقی تھی اس لئے چاہا کہ سارا کلام استاد کی نظر سے گذر جائے، کالج میں جانے کے دوسرے ہی سال، ۷ر مارچ ۱۸۸۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھا:- "میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا اس واسطے اگر آپ اُسے دیکھ لیں تو بہتر ہے، حضرت موصوف نے منظور

فرمایا ہے، میرے پاس جو کلام ہے وہ میں بھیجدوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمھارے پاس ہیں، نہایت جلد مولنا کے پاس اس نشان سے بھیجدو۔ بلیا، عدالت منصفی"۔ مولنا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے، اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولنا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی اور وہ وہاں سے غائب ہو گئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابو القاسم عرشی مرحوم پر شبہہ تھا جو بعد کو حیدر آباد میں شعراء کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے تھے، اور جوانی ہی میں وفات پائی، لوگ کہتے تھے کہ وہ ان ہی نظموں کو حیدر آباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے[1]،

پھر اسی قسم کا واقعہ ۱۸۸۸ء میں پیش آیا، اور کسی نے مولانا کی بیاض کے آدھے حصہ پر ڈاکہ ڈالا، ۱۷ر جولائی ۱۸۸۸ء کو ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔ "میری بیاض کا تقریباً آدھا حصّہ چوری ہو گیا، نہایت افسوس ہے"۔ (دسیع ۲۴) مولنا نے کالج میں آکر جو قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفر روم میں جو نظمیں لکھیں اس نے فارسی کے اہلِ ذوق میں آگ سی لگا دی، اردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولنا حالی نے ڈالی ہو یا شمس العلماء آزاد نے، مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہہ مولنا شبلی نے ڈالی، اور اُس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی، مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آبحیات بن گئی،

---

[1] یہ روایت میں نے جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب (برادر نسبتی نواب سید علی حسن خان) سے سُنی جو مولنا کے پرانے دوست ہیں،

مولنا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی کے شاعر اور اس زبان کے جوہری تھے، مولنا کو لکھا کہ "وہ ان انمول موتیوں کا ہار اہلِ نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں" مولنا نے یہ سمجھ کر شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس خط کا برا مانا اور ان کو لکھا کہ "ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے" نواب صاحب نے دوبارہ لکھا کہ مقصود یہ نہیں ہے بلکہ آپ کی متفرق نظموں کے جمع اور طبع کرنے کی تحریک کرتا ہوں[1] مولنا نے ان کی اس تجویز کو پسند کیا، نواب صاحب نے ان کے کلام کا جو حصہ جمع کیا تھا ان کے پاس بھیج دیا، کچھ اخباروں سے جمع ہوا، اپنے وطن میں ایک عزیز شاگرد کو ۲۶۔ مارچ ۱۹۰۳ء کو یہ لکھا:۔ "میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لئے گیا، اور امید ہے کہ جلد تیار ہو جائے، اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا اشعار جمع کئے گئے، جس کے محرک بلکہ جامع نواب سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں مرحوم ہیں،

میاں حمدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسہ کے لئے ایک نظم لکھی تھی "آمدہ" اس کی ردیف ہے اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیج دو تو وہ بھی چھپ جائے، تمہارے ذریعہ سے اگر اس مجموعہ میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو تو اٹھا نہ رکھو، لیکن اس کے ساتھ جلدی شرط ہے کیونکہ عید تک چھپکر شائع ہو جانا مقصود ہے" (سمیع ۴۴) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سے کچھ سرمایہ نہیں نکلا، آمدہ والی نظم بھی دیوان میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی نہ مل سکی، حمدی مرحوم اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ولایت گئے تھے اسی لئے اسی زمانہ میں یہ نظم کہی گئی تھی[2]

---

[1] بروایت جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب [2] اس نظم کے دو شعر حمدی مرحوم کی تعلیم کے سلسلہ میں

معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا نے قصداً اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا، اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لئے جو ان کے انتخاب میں آئے، جیسا کہ دیوان کے حصۂ تشبیب و غزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ "چہ کنم" والی غزل کے بھی دو ہی ایک شعر لئے، اور نہ خود انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں اس میں جگہ پاسکیں جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ مدحیہ نظمیں جو صرف کالج کے خیال سے بعض امراء کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں، وہ چونکہ طبع غیور پر بار تھیں، اس لئے ان کو بقاے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا، بہرحال اس قطع و برید کے بعد ایک مختصر سا "مجموعۂ نظم شبلی" مرتب ہوا، اور منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس سے جو ان دنوں اپنی صفائی اور چھپائی کے حسن و خوبی میں ممتاز تھا، بڑے اہتمام سے چھپا اور اہلِ ذوق میں مقبول ہوا،

رسائل شبلی ۱۸۹۲ء سے لیکر ۱۹۰۸ء تک مولٰنا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے اور ملک کے مشہور رسالوں میں چھپے، یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے متعلق تھے، ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا گیا ہے، جو یورپین تعصب کی آندھی نے اُس پر ڈالا تھا، اور یا مسلمانوں کے عہدِ زریں کے مرقع کی کوئی پرانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) اوپر لکھے گئے ہیں،

خار در دیدۂ عدو شکنی | حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ در رہت باشیم | کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

عجب نہیں کہ اسی نظم کے چند اشعار کو خفیف رد و بدل کے ساتھ عطیہ فیضی بیگم کے سفرِ یورپ کے موقع پر ان کو لکھ کر بھیجے تھے جو خطوط شبلی میں موجود ہیں،

تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، دوبارہ منظرِ عام پر لائی گئی ہے،

یورپ نے تمام علمی دنیا میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انھوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتبخانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے وہاں قائم تھا جلا کر خاک کر دیا، اور دنیا گذشتہ انسانی دماغوں کے معلومات سے محروم ہو گئی، مولانا نے اس کی تردید میں ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا، اور مسلمانوں کی فتحِ مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، اس لئے یہ مسلمانوں پر سراسر افترا ہے، اور اس افترا کا بانی چھٹی صدی ہجری کا ایک عیسائی مورخ ابو الفرج ملطی ہے، اس مضمون کے ساتھ مسٹر کریل وغیرہ بعض یوروپین مستشرقوں کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے، جن میں مسلمانوں کے سر سے اس الزام کی تردید کی گئی تھی، یہ مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا، کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا، اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا،

مولانا کے اس مضمون کے بعد سے خود یورپ کے عیسائی فاضلوں نے اس الزام کی تردید میں بہت سے فاضلانہ مضامین لکھے ہیں، جن میں اکثر کے ترجمے الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڈھ، اردو حیدر آباد وغیرہ میں شائع ہو چکے، اور اب کوئی لکھا پڑھا آدمی اس الزام کو نہیں دُہراتا،

اسی سال ۱۸۹۲ء میں حیدر آباد دکن کے مشہور علمی رسالہ "حسن" میں اسلامی کتبخانوں کی تاریخ پر مولانا کا محققانہ مضمون شائع ہوا، اور معلوم ہوا کہ دنیا کے کس کس حصہ میں مسلمانوں

نے علم و فن کی کتنی دولت جمع کی تھی، رسالہ کے دستور کے مطابق مولنا کو اس مضمون پر ایک اشرفی انعام ملی،

۱۸۹۴ء میں علی گڈھ میگزین کی اڈیٹری کی ذمہ داری جو مولنا کے سر ڈالی گئی، اُس سے مجبور ہو کر بھی مولنا کو اس زمانہ میں متعدد مضامین لکھنے پڑے جن میں ایک "اسلامی حکومتیں اور شفاخانہ" والا مضمون ہے، جو جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں چھپا، اور اسلامی سلطنتوں کے تمدنی شعبوں کے سلسلہ کا ایک حلقہ بنا،

مسلمان بادشاہوں پر بڑا الزام تھا، کہ انھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ کا ظالمانہ ٹیکس لگا کر بڑی توہین کی، ہندوستان کی تاریخوں میں بھی اس کو بار بار دہرایا گیا ہے، تاکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بیٹھ جائے، مولنا نے رسالہ "الجزیہ" لکھ کر اس خوبی سے اس کی حقیقت واضح کی کہ علمی دنیا پر اس تحقیق سے حیرت چھا گئی، سر سید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا، اور خود مولنا نے اپنے قلم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس طرح مشرق و مغرب دنیا کے دونوں حصوں میں یہ آواز پھیل گئی، یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے،

۱۸۹۶ء کے شروع میں ٹرکی کے صوبہ آرمینیا میں بغاوت ہوئی، تو ترکوں نے اس کو بزور دبایا اس پر یورپ کے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ اسلام نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا پر ایسا ہی ظلم کیا ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں مسئلہ آرمینیا پر ایک سیاسی مضمون ۲۱۔ فروری ۱۸۹۶ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں چھپوایا، جس میں ترکوں کے عدل و انصاف

اور آرمینیا کے مسئلہ کی حقیقت ظاہر کی، ساتھ ہی اس عنوان پر کہ "اسلام کے قانون میں ذمی (غیر مسلم) رعایا کے کیا حقوق ہیں" ایک نہایت مفصل مضمون لکھا، جو علی گڑھ میگزین کے مارچ اور اپریل ۱۸۹۶ء کے پرچوں میں چھپا، اور شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا،

الغرض ۱۸۹۷ء تک اس قسم کے اہم مضامین کا ایک مجموعہ فراہم ہوا، اور رسائل شبلی کے نام سے ملک میں شائع ہوا، مولانا کے قلم سے یکم فروری ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا مقدمہ اس میں لگا ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے کا کیا باعث ہوا، فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اُس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے، اگرچہ اس مقصد کے لئے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا، لیکن چونکہ قوم کو حوصلہ اور غیرت دلانے کے لئے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا، کہ تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں کئے تھے، تم کو بھی اُن ہی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے" اس لئے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ ان کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ اُن پر فخر و تفاخر کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی، یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتداء ہوئی اور بعض بعض اہلِ قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے، لیکن چونکہ یہ اُن کا اصلی کام نہ تھا اس لئے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا،

اسی اثنا میں ۱۸۸۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں، اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کے ترجمے کئے، نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کئے،

یہ رسالہ اگرچہ ناتمام تھا یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چونکہ ہماری زبان مین اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہین مہیا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا، اور یونانی تراجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں،

قبولِ عام کی بنا پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم مین تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے، جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہی لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا، مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخوان فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے، خواہ مخواہ اس کو قبول ہو جاتا ہی،

اسی کا نتیجہ ہی کہ باوجود اس شور وغل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہی، تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سینکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کئے گئے، اور کئے جاتے ہیں، نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا،

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کر دیا تھا، لیکن یورپ میں جو اورنیٹل کانفرنس قائم ہی، اس کی کاروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی وعملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے، چنانچہ پہلے سال جو اس کا اجلاس ہوا، اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم ادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے، کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے کہ "مسلمانوں نے خاص علم

کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں" یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں وہ دراصل ہمارا کام ہے، اور یہ ایک بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے،"

مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے "تمدن اسلامی" کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے، اور اُن ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) اُس نے یہ مرقع تیار کیا ہے،

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے ۱۸۹۳ء

مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ المامون کے بعد ہی کیا تھا، بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا، اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی، لیکن تاریخ طبری جو اس کے لئے بہت ضروری کتاب تھی وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ دنوں کے لئے رُک جانا پڑا، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی، وہ رقم طراز ہیں:-

"المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔"

کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید اس بیان میں مولنا نے کرنی چاہی ہو، اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی، اور وہ کالج کی وہی مصلحت مبنی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سُنّی اور شیعی کا فرق پیدا ہو اُس زمانہ میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا تھا، سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ وہ شیعہ ہیں، اس لئے یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب ہو گی، یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں ہو پایا تھا، لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس لئے وہ اس مصلحت پیش پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے کر دیا جائے، چنانچہ سرسید نے اُن کو خط لکھا، ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا یہ آیا کہ "اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حیف ہو کہ اس کی سوانحعمری بھی نہ لکھی جائے"۔ اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف و تحسین بھی کی،[1]

اتفاق سے سرسید کے خطوط میں نواب عماد الملک کے نام ایک خط مِل گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا، اس سے زیادہ خود سرسید ہی کو تھا، یہ خط کافی بڑا ہے، مگر پڑھنے کے لائق ہے، یہ خط ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کا ہے

---

[1] اس کی تائید مولانا شروانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں: -"مولنا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو، انھوں نے جواب میں لکھا کہ اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہی، لہٰذا انکی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو نہ روکئے، سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے، یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا، "شروانی"

ابتدائی تمہید کے بعد ہے،

"جناب مولوی شبلی صاحب کی نسبت جو فقرہ آپ نے تحریر فرمایا تھا، وہ میں نے ان کو سنایا، ان پر چار حالتیں گذریں، جب تک میں پڑھتا رہا حیرت میں رہے اور تردد رہا کہ درحقیقت یہی الفاظ لکھے ہیں، پھر میں نے ان کو وہ خط دیا کہ اس فقرہ کو وہ خود پڑھ لیں، جب کہ انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی الفاظ ہیں تو ان کو ندامت اور افتخار اور مسرت تین حالتیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں، ندامت تو اس لئے تھی کہ وہ اپنے نزدیک اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھتے جس طرح ان کی نسبت آپ نے اپنے خیالات ظاہر فرمائے، افتخار اس لئے تھا کہ آپ جیسے شخص نے ان کی تصنیفات کی اس قدر قدر فرمائی، اور درحقیقت ان کا یہ فخر واجب نہ تھا، فلاں وہاں کی واہ واہ سے نہ ان کا دل خوش ہو سکتا اور نہ کچھ فخر ہو سکتا تھا، بلاشبہہ آپ کی قدردانی باعثِ افتخار ہو سکتی ہے، مسرت ان کو بے انتہا اس لئے ہوئی ہو کہ چونکہ وہ آپ کی نیک طبیعت اور مزاج سے واقف نہ تھے ان کو دل میں افسوس تھا کہ آپ ان کی پہلی تحریرات سے کسی قدر آزردہ خاطر ہیں، دفعتہً ان کا وہ خیال زائل ہوگیا، اور بے انتہا مسرت ان کو ہوئی، میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا، کیونکہ اس وقت جو میرے دل میں آیا اسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا، میں نے کہا تم سید حسین کو نہیں جانتے، میں نے آج تک ان کا سا نیک دل اور پاک باطن، ظاہر و باطن حاضر و غائب یکساں سچا دوست اور ہمہ تن سچائی کسی کو نہیں دیکھا، رنج و کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی پیدا نہیں کی۔ . . . . الفاروق کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا وہ سب درست ہے، مگر اس کے ساتھ فیہ ما فیہ بھی ہے، اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ ما فیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے تو بلاشبہہ نہایت عمدہ بات ہے، مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے، اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی، یہی حال ابعلی کا ہے، خلافت کی

نسبت بحیثیت انتظام ملکی کیا لکھا جاوے، اور کون لکھ سکتا ہے، میں تو ان صفات کو جو ذات نبویؐ میں جمع تھیں دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں، ایک سلطنت اور ایک قدوسیت، اوّل کی خلافت حضرت عمرؓ کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علیؓ و ائمۂ اہل بیت کو، مگر یہ کہدینا تو آسان ہی، مگر کس کو جرأت ہو کہ اس کو لکھے، حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا، حضرت ابوبکرؓ تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہی، جو ہوا سو ہوا، جو گذرا سو گذرا"

ان باتوں کے باوجود الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ دیکھکر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجۂ تام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں "سیرۃ الفاروق" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بازار میں پیش کر دی، الفاروق کے مشتاقوں کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدنیتی پر محمول کیا، اس موقع پر سرسید نے علی گڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہی جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے، "اس میں کچھ شبہ نہیں ہو کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے

یہ کہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا، جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان اجرہ الا علی اللہ، بایں ہمہ انھوں نے مثل علمای متقدمین باخدا الذین لاینظرون الی الدنیا وحطامھا بل ینظرون الی رحمۃ اللہ وبرکاتھا والی حالۃ القوم واصلاحھا، کوئی ذاتی فائدہ اُن کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا، بلکہ بالکلیہ مدرستہ العلوم کو دیدیا، اور جب اُن کی حالتِ معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی باوقعت ہو جاتی ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بہ لحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقۂ ترتیب مضامین ہیں یادگار سلف ہو اغلاق لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے نہ ہر ایک شخص کا کام ہی، اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اُس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی،

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہی کہ انکی لائف اس طرح پر لکھی جاوے جو انسانوں کے لئے باعثِ رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعثِ آفت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی و شیعہ کو بجز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو،

سب سے مقدم یہ بات ہی کہ اوّل اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے، اور سچا ہسٹورین بنکر ان کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازع فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے، اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت اور انتظامی قوت کو اور اس برکت

کو لکھے جو ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا،

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہو کہ اُس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جا سکے، یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے، جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، لائف لکھی جاوے، پس حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب کہ ان کی نسبت کوئی الزام بدنیتی کا دیا جاتا ہے، منشی سراج الدین احمد صاحب ایک نیک آدمی ہیں، قومی بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں، بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی، جو کام ان کو نہ کرنا چاہئے تھا انھوں نے کیا بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بدنیتی یا طمعِ نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اسی مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہونگی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا، اور یہ صادق آوے گا "فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ" یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بیدل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہو، اگر اہلِ ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہو گی، پس ان کو کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہو،

مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کرکے ان کی

لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اُن سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد "الغزالی" یعنی لائف امام غزالی کی لکھدیں، جو نہایت دلچسپ اور بیحد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں، لیکن اگر اس کے بعد بھی انھوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے۔"

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے باوجود مولنا اپنے عزم سے باز نہ آئے، ۱۱/ اپریل ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔" الفاروق انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا لیکن وقت کی تعیین نہیں کرسکتا" (مبشع ۳۷)

آخر اگست ۱۸۹۴ء کو مصنف نے اس کتاب کے لکھنے کا قطعی فیصلہ کرلیا، مولانا نے یہ واقعات الفاروق کے دیباچہ میں لکھے ہیں:" الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اوّل اوّل اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اوّل کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آگیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ ... چرچہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہوچکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک **الفاروق** کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا،

ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رُک گیا، اور اس کے بجائے دوسرے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، لیکن جو نگاہیں فاروق اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں اُن کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہوسکتی تھی، سوء اتفاق یہ کہ الفاروق کی طرف بیدلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ

اٹھالیا تھا، لیکن ملک کی طرف سے تقاضے کی صدائیں رہ رہ کر اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ میں مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ رکھ کر اٹھالیتا تھا، بالآخرہ ۱ راگست ۱۹۰۶ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کرلیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے اس کام کو شروع کیا، ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع وقتاً فوقتاً اب بھی سدراہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی کئی مہینے کا ناغہ پیش آگیا، لیکن چونکہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا، اس لئے کچھ نہ کچھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا،

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید   زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید

شمس العلماء کا خطاب جنوری ۱۸۹۴ء

مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا، اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرۂ روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحاد اسلامی کے مبلّغ اور سلطانِ روم کے سفیر بنکر ہندوستان آئے ہیں اس لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطانِ روم کے اس فرضی سفیر کو ممنونِ منت بنایا جائے، اس کے لئے ابتدا خود سرسید کی طرف سے ہوئی، ڈپٹی سید زین الدین صاحب (علی گڈھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے اُن ہی سے انگریزی مین ایک چھٹی لکھوا کر گورنمنٹ مین بھیجی کہ مولنا شبلی جیسے فاضل کی قدر دانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغۂ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس فرض سے غافل رہے

اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولنا کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا اعلان کیا،
مولانا کو شمس العلماء کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا،
لیکن چونکہ سر سید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا، اور سر سید
کے رفقاء میں اس خطاب کی پہلی نظیر تھی[1] اس لئے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا، اس
وقت تک یہ خطاب نا اہلوں کو نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت
بھی تھی، پھر مولانا کو جس سن و سال میں یہ خطاب ملا یعنی چھتیس سینتیس سال کی عمر میں اُن کے پیشرو
اور ہمعصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم
واقعہ بنا دیا، اور اس لئے تبریک و تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے، جن میں ملک کے اکابر نے
تقریریں کیں، معززین نے مختلف گوشوں سے مبارکباد کے تار اور خط بھیجے، اور اخباروں نے تہنیت
کے مضامین لکھے،

کالج میں اخوان الصفا اور لجنۃ الادب دو علمی مجلسیں تھیں، اور مولانا ان دونوں کے رکن رکین
تھے، اس لئے ان دونوں نے مل کر ۱۹ جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا جس میں
کالج کے تمام سربرآوردہ اکابر سر سید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ
خاں، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ (سکریٹری اخوان الصفا) اور (جسٹس) سید کرامت حسین جو اس
وقت وہاں قانون کے پروفیسر اور مجلس اخوان الصفا کے رکن اور لجنۃ الادب کے صدر تھے، شریک تھے،
حاضرین کی متفقہ خواہش سے نواب محسن الملک اس جلسہ[2] کے صدر قرار دیئے گئے، اور انھوں نے

[1] مولنا نذیر احمد صاحب کو یہ خطاب ۱۸۹۷ء میں اور مولنا حالی کو اس سے بھی بہت بعد ملا [2] اس جلسہ کی یہ پوری روداد اس زمانہ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، اسی سے ہم نے نقل کی ہے،

کھڑے ہو کر حسب ذیل تقریر کی،

"جناب سرسید و سید محمود صاحب، و حاضرین! جو خوشی اس وقت اس جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوئی اس کا اظہار مشکل ہے، صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا، خود ایک ایسی دلخوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی، پھر جبکہ وہ ایسے مقصود کے لئے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے، اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے اس پر مبارکباد دینے کے لئے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے،

صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولنا شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، میں اگرچہ بظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں، مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں، اور اس لئے میں اس وقت اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھ کر اپنے اور عزیز طالبعلموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں، اے میرے عزیزو! طالب علم کے لئے ضرور نہیں کہ وہ نو عمر اور نوجوان ہو، نہ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لئے حاضر ہوتا ہو، بلکہ طالب علم وہ ہے جسے علم کا شوق ہو، اور جو علم کا طالب ہو، پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں، بلکہ جس قدر میری عمر زیادہ ہے، اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھ کر ہوں، اس لئے میں تمہارے فرقہ میں داخل ہوں، مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعوی کو تسلیم کرو گے، اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کرو گے، اے میرے

عزیزو! مولنا شبلی صاحب صرف تمھارے ہی استاد نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف و نحو کے ان سے سیکھے، یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر سے بڑے فائدے حاصل کئے ہیں، کوئی روز ایسا نہیں ہوتا، کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو، یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو، اس لئے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بحیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالبِ علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں، اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے اُن کو دیا ہے مبارکباد دیتا ہوں، اے میرے عزیزو! اور اے میرے دوستو! درحقیقت میں نے اس مبارکباد دینے میں ذرا جلدی کی، درحقیقت مجھے اوّل اپنی گورنمنٹ کو مبارکباد دینی چاہئے، جس نے ایسے مستحق شخص کو خطاب دینے سے دراصل اس خطاب کو عزت بخشی جو ہمارے مولانا کو اس نے دیا ہے، اور اپنے امتیاز کی اس قوت کو ثابت کیا جو اس انتخاب میں اس نے ظاہر کی ہے، درحقیقت مولانا مولوی شبلی صاحب کا خطاب دینا وضع الشئی فی محلہ ہے، اس لئے سب سے پہلے چاہئے کہ میں گورنمنٹ کو مبارکباد دوں، اس کے بعد قوم اس مبارکباد کی مستحق ہے، کہ اس میں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو درحقیقت علم کے آفتاب ہیں، اور جن کو شمس العلما [illegible] مرواقعی ہے، پھر مدرستہ العلوم کو مبارکباد دینا چاہئے کہ اس میں ایسے کامل اور قابل استاد جمع ہیں، جن کو گورنمنٹ ایسے معزز خطاب کا مستحق سمجھتی ہے، اور جن کے علم کی روشنی دُور دُور پھیل رہی ہے، پس فی نفسہ گورنمنٹ اور قوم اور کالج مبارکباد کا مستحق ہے، اور مولانا کو مبارکباد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے، وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے، اور گورنمنٹ

ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے، صاحبو! جس طرح آفتاب اس بات کا محتاج نہیں ہو کہ کوئی اُسے آفتاب کہے، بلکہ آفتاب کا اقرار کرنے والا خود اس بات کو ظاہر کرتا ہو کہ وہ تیرہ چشم نہیں ہو، اور نہ اُس کی آنکھ بند ہے بلکہ اس میں بینائی کی قوت اور دیکھنے کی طاقت بے کسی قسم کے خلل اور عارضہ کے موجود ہے، اسی طرح ہمارے مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینے سے گورنمنٹ نے ثابت کر دیا کہ وہ علم و کمال کی قدر کرنے والی اور اہلِ علم کی پہچاننے والی، اور استحقاق پر لحاظ رکھنے والی ہے، صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور اُن کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہو، جن کو اُن سے ملنے کی عزت حاصل ہو وہ اُن کی ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھرے ہیں، اور جن کو ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور اُن کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، اُن کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پُر زور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہو، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحتِ بیان اور سلاستِ عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا، اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانحمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا، اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات و معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے، اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا، اور ایسے زمانہ میں جبکہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے، اور ایسے وقت میں جبکہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہو، ہمارے مولانا منجملہ ان

دو تین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی، اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا، اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا، اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا، اور جس نے مشاہیرِ روزگار کے حالاتِ زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصود بتایا، اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈالی، فللّٰہِ درُّہ وعلی اللہ اجرہ،

صاحبو! ہمارے دوست مولانا مولوی شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے، بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے، اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی اُنھوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، وہ اُن چند اعتراضوں کا دور کرنا ہے جو مذہبِ اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے، اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا، کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے، اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا، اور اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا، اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرستہ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا، ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی، اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا، اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا، اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہبِ اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی، حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے، اور خدا اس پر آفرین کرتا ہے،

میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتبخانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انھون نے نہ کیا ہوتا، اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت، اور علم پر شاہد، اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لئے کافی، اور ان کے شمس العلما ہونے کے شاہد تھے، صاحبو! ہماری قوم میں ہزاروں عالم گذرے، اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں، مگر ہم تو اس کے قائل ہیں، جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچا دے، شعر

شاہد آن نیست کہ موے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اے میرے عزیزو! اور اے میرے مدرستہ العلوم کے طالب العلمو! تم نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں، اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے، تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جبکہ تم کالج میں ہو، اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو، اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو، تمھارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمھارے دلوں کو منور کرنے کے لئے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ دو، اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے، اور پھر اُسے کام میں لانے کی کوشش کرو، تاکہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں، بلکہ ہمارے چاروں طرف سینکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے، اور اس کا سایہ تم پر پڑے ۔

نواب محسن الملک کی اس فصیح و بلیغ تقریر کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے

اپنے عربی لہجہ میں مولوی داؤد بھائی صاحب ممبر لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کا عربی قصیدہ پڑھا،

حمداً لمن جعل النجوم دراریا	اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن
والشمس نوراً للحنادس ماحیا	اور سورج کو وہ روشنی بنایا جو تاریکیوں کو مٹا دیتی ہے
اشرقت شمساً من سماء معالم	تو نشانیوں کے آسمان سے سورج ہو کر چمکا
لتمد اقمار العلاء معالیا	تا کہ بلندی کے چاندوں کو اور بلندی میں بڑھا دے
اضحی بفیضك روض علم ناضراً	تیرے فیض سے علم کا چمن شاداب ہو گیا
من بعد ان قد کان دهراً ذاویا	اس کے بعد کہ وہ ایک زمانہ تک مرجھایا تھا
لا غرو لو ادعوك روح زماننا	کوئی شبہ نہیں اگر میں تجھ کو اپنے زمانہ کی روح کہکر پکاروں
تحیی لعلم الدین عظماً بالیا	جو علم دین کی بوسیدہ ہڈی میں پھر زندگی پیدا کر رہی ہے
علامةٌ مستنبطٌ من آیة القرآن	علامہ ہے جو قرآن پاک کی آیت سے چھپا بھید
سراً خافیا ومعانیا	اور معنوں کا پتہ لگاتا ہے،
حیناً یحبّر فی العلوم رسائلا	کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے،
حیناً یشیّد للفنون مبانیا	اور کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہی،
وهو الذی شرح المهیمن صدره	یہ وہ ہی جس کے سینہ کو خدا نے کھول دیا ہے
فغدا لابناء المعارف تالیا	تو وہ اگلے اہل علم کا پیرو ہو گیا
لله درُّ مدرّسٍ تدریسه	ایسا اچھا مدرس ہی کہ اُس کا درس
سیلٌ اتی وقد تغشّی وادیا	ایک سیلاب ہی جو وادی میں چھا جاتا ہی،

سحبانُ وقتٍ لا یُشقّ غبارُہ	اپنے وقت کا سحبان جس کے گرد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للفرد الوحید مجاریا	کون فرد فرید کا مقابل ہوسکتا ہے
قسُّ الفصاحۃ لا یُنال مقامُہ	فصاحت میں قس ابن ساعدہ ہے جس کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للشمس المنیرۃ ثانیا	اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے
ان قال فی العربی شعرا فاق	اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؓ سے بڑھ جائے
حسّانا وفی العجمی فاق قاٰنیا	اور اگر فارسی میں کہے تو قاآنی سے آگے نکل جائے
قد یخلب الالباب سحر بیانہ	اس کے حسنِ بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے
اذا ما تصدّی خاطبا او شادیا	جب وہ خطیب ہو کر یا شاعر ہو کر نغمہ سرا ہو
ہو خضرم الاخبار غیر مساجل	وہ تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے،
یعطی الوری مرجانہ لآلیا	جو لوگوں کو مرجان اور موتی دیتا ہے،

اس کے بعد نذیر احمد صاحب بی اے نے عربی زبان میں حسب ذیل تقریر کی،

یا ایّہا السادۃ الکرام، یشقّ علیّ ان اقرع اذانکم بعد اذ فرغنا من تنقل الفواکہ الشہیۃ والالوان اللطیفۃ وکیف یمکن لی ان اعدّ فضائل مولانا المکرم واحصی محامدہ مالی ان اقول انہ سحبان فی الفصاحۃ

معزز حضرات! میرے لئے یہ امر تکلیف دہ ہو کہ اسکے بعد کہ ہم لوگ خوش مزہ میوں اور عمدہ ناشتوں سے پیٹ بھر چکے ہیں، آپکی سمع خراشی کریں، اور یہ کیسے ہوسکتا ہو کہ ہم مولنا کے فضائل گنائیں اور اُن کے محامد شمار کریں ہیں کیسے یہ کہوں کہ وہ فصاحت میں سحبان

وما لی ان اقول انہ قٰآنیُ فی البلاغۃ	بلاغت میں قٰآنی اور سلاست زبان اور
وما لی ان اقول انہ قاآنی فی	اور لطافتِ نظم میں قاآنی نہیں " "
سلاسۃ لسانہ ولطافۃ	" " " " " "
نظمہ، بل اُنشد ھذا الشعر	بلکہ میں متنبی کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں،
للمتنبی اذ قال	
"خذ ما تراہ ودعْ شیئاً سمعتَ بہ	"جو دیکھتے ہو اس کو قبول کرو، اور جو سنتے ہو اس کو
فی طلعۃ الشمس ما یغنیک عن زحلٌ	چھوڑ دو، آفتاب نکل آنے کے بعد زحل کی ضرورت کیا ہے"
تفخر اللجنۃ الادبیۃ بان اعظم	لجنۃ الادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب سے
ارکانھا بل بانیھا لُقب بشمس	بڑے رکن، بلکہ بانی کو شمس العلماء کا لقب دیا
العلماء وتھنئہ الآن بھذا	گیا ہے، وہ ان کو ان کے اس اعزاز پر مبارکباد دیتی
الاعزاز والاکرام، اختم کلامی	ہے، ہم ان معزز حاضرین کے شکریہ پر جنہوں نے اس
بتشکر السادۃ الذین شرّفونا	جلسہ میں شرکت کی اور تشریف لائے، اپنی تقریر
بقدومھم والذین کرّمونا	کو ختم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے
باللطف والاحسان، واِنّ اللّٰہ	والوں کی نیکی کو برباد نہیں کرتا،

لا یضیع اجر المحسنین

اس تقریر کے بعد ولایت اللہ[1] صاحب طالب علم بی، اے کلاس نے مولانا کی مدح میں ایک

---

[1] یہ صاحب سی پی کے تھے، طالب علمی سے فراغت کے بعد وہاں معزز عہدہ پر ممتاز تھے، پنشن پاکر اب یہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں، اسی سلسلہ میں ان سے دہلی میں ملا ہوں، ان کو شاعری کا ذوق اب تک ہے، میر اکبر حسین صاحب کے رنگ میں بھی اچھا کہتے ہیں، بہت سے اشعار انھوں نے سنائے، مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا ذکر کیا، اب ان کا مجموعۂ کلام اس سال شائع ہوا ہے، اس میں بھی یہ تہنیتیہ قصیدہ موجود ہے، ۱۲

اُردو نظم پڑھی، جو حسبِ ذیل ہے،

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں / درودیوار سے آثارِ مسرت ہیں عیاں

زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف / ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغِ جناں

دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے / دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں

دیکھ کر سبزہ کی ہر سمت بہارِ دلکش / فرشِ اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لحظہ گماں

جس طرف جائیے غنچے ہیں تبسّم کرتے / باغِ عالم میں جدھر دیکھئے گل ہیں خنداں

باغ ہو، دشت ہو، صحرا ہو، غرض کچھ بھی ہو / نقشۂ خلد ہی پاتا ہوں میں جاتا ہوں جہاں

دھوم صحرا میں ہی جنگل میں ہے برپا منگل / آج ویرانہ کا معدوم ہے دنیا سے نشاں

سب کے منھ سے ہیں بلند آج خوشی کے نعرے / شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں

دستِ قدرت نے گہربار جو ہونا چاہا / ابر آیا دُرِ شہوار سے بھر کر داماں

نہ[1] رہی شکل وہ دُنیا کی و ما فیہا کی / کچھ سے کچھ کر گئی اک بارشِ ابرِ باراں

دشت و صحرا ہوئے گلزار، بہار آ پہونچی / رحمتِ پاک سے سرسبز ہوا باغِ جناں

سر کے بل آگے ہی بڑھتی تھی نگاہِ پُر شوق / اک تماشہ یہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں

سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی / جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں

ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے / باعثِ غور ہے کیا، کیوں ہوئے ایسے حیراں

خیر ہے فکر یہ کیسی ہے؟ تعجب کیسا؟ / مہرباں ہوش میں آؤ، ہو تم اس وقت کہاں

[1] اتفاق سے عین جلسہ کے دن بارش ہونے لگی تھی،

جشنِ نوروز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سو — واں کے چلنے کا بھی کچھ تم نے کیا ہے ساماں

یہ صدا کان سے پہنچی جو اتر کر دل میں — ہوگیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب رازِ نہاں

دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی — ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں

لئے جاتا تھا مجھے شوق وہاں ہاتھوں ہاتھ — جا رہا تھا میں نہایت خوش و خرم شاداں

چشمِ مشتاق جسے ڈھونڈھ رہی تھی ہر سو — مجھ کو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں

خوشنما دلکش و دلچسپ تھی جس کی تعمیر — جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت و شاں

پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے بہم — ہند کے جملہ ارکین و مشیر و اعیاں

عقل و دانش کو ہوئی جن سے کہ زینت حاصل — عزت و شان کی جن سے کہ بڑھی عزت و شاں

عدل سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام — جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہندوستاں

پائی یہ نشو و نما علم و ہنر نے جن سے — ہے بجا جن کو اگر کہئے کہ ہیں ہند کی جاں

ناگہاں ایک خموشی ہوئی سب پر طاری — جبکہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں

بہرِ تعظیم کھڑے ہوگئے حضار تمام — ہوگیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں

سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے احباب — دل سے مت پوچھئے کچھ فرطِ مسرت کا بیاں

ہوئے شمس العلماء آج جنابِ شبلی — ہوگیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلاں

فخر کرتا ہے بہت جن پہ علیگڈھ کالج — بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پہ نازاں

مصر اور شام خجل ہیں عربی سن کے اگر — فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملکِ یوناں

فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے کبھی — پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں

تم کو شمس العلماء کا یہ مبارک ہو خطاب
جب تلک شمس رہے اوجِ سما پر رخشاں

پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب
یہ لقب پھولے پھلے آپکے زیرِ داماں

سبز و شاداب یہ جبتک کہ رہے باغِ علوم
شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر پہ تاباں

اس کے بعد ممتاز حسین[1] طالب العلم سکنڈ ایر کلاس اور ممبر اخوان الصفاء و لجنۃ الادب نے عربی میں ایک تقریر کی، جس کی فصاحت و بلاغت کی سب نے داد دی، پھر مولوی حمید الدین[2] صاحب ممبر اخوان الصفا و لجنۃ الادب نے اپنا یہ عربی قصیدہ پڑھا،

یا خیر من یسمو الی العلیاء
کالشمس بازغۃً بوسط سماء

اے ان سب میں بہتر جو بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں
آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہوکر

قد کنتَ قدمًا للمعالی سامیا
اورثتہ عن شیمۃ الآباء

تو پہلے سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا
تونے اپنے اسلاف سے یہ وراثت میں پایا

فلئن سموت الی المکارم والعلیٰ
فلقد نشأت بعزۃٍ قعساء

تو اگر تو عزت کے مقام اور بلندی کی طرف بڑھا تو کوئی تعجب نہیں
کیونکہ تونے عزت میں پرورش پائی ہے

لاغرو نصل السیف ان یک صارما
او یستھل البرق بالالاء

کوئی تعجب کی بات نہیں اگر تلوار کی دھار کاٹ رکھتی ہو
یا بجلی روشنی دے کر چمکے ۔ ۔

فلانتَ بالعزمات سیفٌ صارم
ولانتَ برقٌ لامعٌ بذکاء

کیونکہ تو اپنے پختہ عزم میں شمشیر برّاں ہو
اور تو ذکاوت میں برق لامع

[1] ممتاز حسین مرحوم بیرسٹر جن کے نام سے لکھنؤ میں ممتاز دار الیتامیٰ ہے جسکو مرحوم نے قائم کیا تھا۔ [2] مولنا حمید الدین صاحب مرحوم صاحب تفسیر نظام القرآن، مولنا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد جو اس وقت کالج میں زیر تعلیم تھے۔

لاذت بجانبك العلوم فانّها
لو لم تصُنها اٰذنت بفناء

علوم نے تیری پناہ چاہی کیونکہ
اگر تو اُن کو نہ بچاتا تو وہ فنا ہو چکے تھے

قد امحلت ارض العلوم واصبحت
عرصاتها کسمالق البیداء

علم و فن کی سرزمین خشک ہو گئی تھی
اور اس کے میدان صحرا بن گئے تھے

لعبت بها هوج الرياح تنوبها
من كل عاصفةٍ من النكباء

اس کے چاروں طرف سے آندھیاں اس سے کھیل رہی تھیں
اور مصیبت کا طوفان اس پر آرہا تھا

فضللت تمطرها بسحٍّ واكف
صوبِ الربيع بديمة هطلاء

تو تو ابر باراں بن کر اس میں برسا
بہار کی بارش موسلا دھار

فربت رياض العلم منك ونوّرت
مهتزّة بغصونها الخضراء

تو علم کی کیاریاں تجھ سے پروان چڑھیں اور
اُن کی سبز شاخوں میں جھوم کر شگوفے نکلے

علمتنا سبلَ الرشاد وانّما
كنا كخابط ليلةٍ ليلاء

تو نے ہم کو ہدایت کا راستہ بتایا
حالانکہ ہم ایسے تھے جیسے کوئی اندھیری رات میں بھٹک رہا ہو

كنا بمهجلة يخاف بها الردیٰ
فهديتنا لمحجةٍ بيضاء

ہم ایسے خوفناک مقام میں تھے جہاں ہلاکت کا ڈر تھا
تو تو ہم کو کھلے صاف راستہ پر لے آیا

ولنسئلنّ الله طولَ بقاءكم
في كل بكرتنا وكلّ عشاء

اور ہم اللہ سے آپ کی زندگی کی
ہر صبح اور شام دعا مانگیں گے

واهنئنكم بما اعطيتم
من خير ما وجدوا من الاسماء

اور آپ کو اس کی مبارکباد دیتے ہیں کہ آپکو انھوں نے	اپنے نزدیک سب سے بہتر لقب سے ملقب کیا
ان کان تلك الشمس شمس سمائها	فلصرت شمس العلم والعلماء
اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے	تو تو علم اور علماء کا آفتاب ہے
اذا انت شمس والعلوم سماء کم	فالشمس شمسی والسماء سمائی
جب آپ آفتاب ہیں اور علم و فن آپ کا آسمان ہے	تو آفتاب ہمارا آفتاب ہے اور آسمان ہمارا آسمان ہے

اس کے بعد خواجہ غلام الثقلین اور محمود صاحب نے اُردو میں تقریریں کیں، پھر ظفر علی خاں[1] صاحب ممبر اخوان الصفا نے فارسی میں یہ قصیدہ پڑھا، یہ قصیدہ گو ان کا ابتدائی کلام ہے مگر سیاسے کہ نکواست از بہارش پیداست،

سحرگاہاں دلم پامالِ غم بود و پریشانی	مکدر مطلعِ خاطر بُد از اندوہِ پنہانی
گہے بر بے سر و سامانیِ خود نالہ می کردم	گہے خواندم حدیثِ گردشِ ایامِ طولانی
گہے بر کردۂ خود انفعالم دست می دادی	گہے کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چو موجِ غم ز سر بگذشت گشتم عازمِ گلشن	کہ درمانِ دلِ زارم شود زانسانِ آسانی
شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت	عروسِ دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی
گل و بلبل بہم محوِ ادا و عشوہ و غمزہ	چو زلفِ مہوشاں گیسوئے سنبل در پریشانی
خرامِ نازِ کبک و رقصِ سرو و خندۂ گلہا	دلم بر بودہ شد در وجہِ نشارِ صنعِ یزدانی
دمیدہ لالۂ حمرا کنارِ جوئے کو ثر وش	ہمی شد از جمالش غرقِ خوں لعلِ بدخشانی

[1] مولانا ظفر علی خاں، اڈیٹر زمیندار لاہور،

وزید از گلستاں بادِ صبا آهسته آهسته
مشامِ جاں معطر شد ز بوئے مستِ ریحانی

گلاب و نسترن شبو و نسرین نرگس و سوسن
به هر یک عشوهٔ خاصی بداز انداز ارزانی

ز شبنم لاله داغِ خود به انداز نکو شسته
شمیم یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی

هزاراں مرغِ خوش الحاں نشسته بر سرِ اغصاں
بصورت دلربا بودند محوِ تهنیت خوانی

مهِ نو کشتیِ بهرِ نثار از نقره پر کرده
کواکب بر فلک مصروف هر سو دُر افشانی

چوں ایں نظاره را دیدم بجیبِ فکر سر بردم
که بهرِ کیست ایں آرائش و تزیینِ لاثانی

دریں اثنا مرا از هاتفِ غیبی ندا آمد
نمی دانی مگر تو اے غریقِ بحرِ حیرانی

که فخرِ قوم مولانائے شبلی را پئے علمش
خطابے شد عطا و الله ز فیضِ جودِ سلطانی

زمیں هم آسماں هم چهره افروزند بهرِ او
معطر باغِ دهر است از پئے شبلیِ نعمانی

بحمد الله که دُرِّ درجِ حکمت را پس از عمرے
ز عدلِ خسروی شد گرم بازارِ درخشانی

نه یارائے ثنائے تو قلم را نے زبانم را
قطارِ عالماں انجم میانش شمس تابانی

کنند اے کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت
بیک پا ایستاده بر جنابت پاسباں بانی

زمینِ شعر از فیضت پُر از گلهائے بوقلموں
سخن را داده سرمایه لے بحرِ سخندانی

کند پیدا مضمونِ لطیف و خوش بیکدم طے
سمند کلکِ تو هر گه شود سرگرمِ جولانی

برائے داده از فکرِ خود عرفی و صائب را
کجا هم پایه ات باشند خاقانی و قاآنی

بهاراں نغمه باشند ز گلزارِ کمالِ تو
ز بحرِ عقل و فهمت رشحهٔ ابر است نیسانی

خداوندِ کریمت لحنِ داودی عطا کرده
کنی تسخیرِ دلها چوں کنی ترتیلِ قرآنی

نوائے نغمہائے شکریں تا خیزد از گلبن | صدائے بلبل آید تا زشاخِ سروِ بستانی
ز چشم زخم دوراں در سلامت باشی و ایمن | معین و یاور و ناصر ترا تائید ربانی

اس کے ختم ہونے کے بعد لالہ بہاری لال صاحب مشتاق[1] دہلوی شاگرد مرزا غالب مرحوم نے جو مولنا حالی کے ساتھ تشریف لائے تھے، ایک ظریفانہ تقریر کی اور اپنے کو ہندو ہونے کے سبب سے "آفتاب پرست" ثابت کر کے شمس العلما مولانا شبلی کا اپنے کو قدرداں ٹھہرایا تھا سب سے آخر میں مولنا حالی نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا، جو حسب ذیل ہے، اور جس کا عنوان تھا "من الحبیب الی الحبیب" یعنی ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ"

یا وحید امن الکرام فریدا | وعزیزاً کمثل علق نفیس
اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ | اور نادر الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے
انت اولی بان تلقب شمسا | بل بان یجعلوک شمس الشموس
تو اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تجھکو آفتاب کا لقب دیا جائے | بلکہ اس بات کا کہ تجھکو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے
انت شمس الھدیٰ ولست بشمس | یعتریھا الخنوس بعد خنوس
تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں | جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے
انت طھرت ذیل دینٍ مبین | لوثتہ اللئام بالتدلیس
تو نے دین مبین کے دامن کو پاک کیا | جس کو کمینوں نے فریب دہی سے آلودہ کر دیا تھا
ثم دافعت[2] عن امامٍ تقی | کان بعد النبی خیر رئیس

حضرت عمر[3] اور مسلمانوں کی طرف کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کی نسبت کیجاتی تھی، اور مولانا شبلی نے اس کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کے رفع الزام کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

[1] لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ (مکتوبات حالی جلد اول ص ۱۶۹) [2] امام پاک سے [3]

پھر تونے اس امام پاک کی طرف سے مدافعت کی	جو پیغمبر خدا کے بعد سب سے بڑا سردار تھا
وعن الحق قد کشفت غطاءً	بعد ما اغلقوه بالتلبیس
اور تو نے حق سے پردہ اٹھایا	بعد اس کے کہ لوگوں نے اسکو دھوکے سے پردہ میں چھپا دیا تھا
سرت فی الارض برًّا وبحرا	للمعالی ولا لامر خسیس
تونے دنیا کے بحر و بر کی سیر کی	اعلیٰ مقاصد کے لئے نہ کسی ذلیل غرض کے لئے
قلدوك التزام درس قوم	فیه یرجی لهم کمال النفوس
تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی	جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے
فتقلدت والتزمت لزوما	خدمة المسلمین بالتدریس
تو تونے اس خدمت کو قبول کیا	اور درس و تدریس سے انکی خدمت کا فرض ادا کیا
قمت بالدرس والدراسة فیهم	فارغا عن ریاسة ورئیس
تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا	ریاست اور رئیسوں سے بے پرواہ ہوکر
وجعلت الکمال غایة همّ	واتخذت الکتاب خیر جلیس
اور تونے کمال کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا	اور کتاب کو عمدہ ہمنشیں بنایا
فعلی القوم لازما لك حق	کلهم من وجوههم ورؤس
پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں	سب پر تیرا لازمی حق ہے
صانك الله عن مکاره حتی	صرت کالقلب آمنا فی الخمیس
خدا تجھ کو مکروہات سے بچائے	یہانتک کہ تو اس طرح محفوظ رہے جس طرح فوج میں قلب کا حصہ

سب سے اخیر میں مولانا کھڑے ہوئے اور سب کے جواب میں یہ شکریہ آمیز تقریر فرمائی ،

اس تقریر پر اس حیثیت سے نظر رہے کہ بادۂ مدح و توصیف کے اتنے پے درپے پیالوں کے بعد بھی ان کا دماغ برجا ہے، اور اس شاہی خطاب کی وہ وہی حقیقت سمجھتے ہیں، جو اس کی حقیقت ہے؛

"آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیۂ خطاب کی تقریب میں مجھ کو ایوننگ پارٹی میں مدعو کیا ہے اور جس جوش اور خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے، میں نہایت سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حقیقت میں میرے لئے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ انجمۃ الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اُس مقدس زبان میں ہم کو اسپیچ اور لکھر دینا سکھائے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں مولوی بہادر علی صاحب ایم اے اور کیسے ایم اے، ڈبل ایم اے، داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب، مزمل اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے گر اور اس کے آنریری ممبرون میں ہمارے مخدوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی، داخل ہیں، میرے خطاب کی نسبت مبارک باد دینا، ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے،

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اُس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے جو چوتھی صدی میں قائم ہوئی تھی جس کے سکرٹیری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر آرنلڈ ہیں، اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لائق و فائق اشخاص ہیں، ایسی مجلس

کا مجھ کو مبارکباد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہی،

اے حضرات اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصول پر مبنی ہیں، اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے، نہایت قدر اور منزلت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جائے، گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا، اور یہ میرے لئے کچھ بیجا بات نہیں، بلکہ اُس زمانہ میں بھی جبکہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی، مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی بہ نسبت قومی خطاب کی زیادہ عزت کی، اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کئے ہوئے خطاب بالکل معدوم ہوگئے، اور قوم کے عطا کئے ہوئے خطابات یعنی "حجۃ الاسلام" امام غزالی کے لئے، "امام فخر الدین رازی کے لئے، "عَلَم الہدیٰ" شریف مرتضیٰ کے لئے آج بھی باقی اور قائم ہیں، پس جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں پسند کرتے ہیں، اور بجا سمجھتے ہیں، تو اس سے بڑھ کر میرے لئے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۲ر جنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۹ر جنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے، ع

اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بہ خواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا

ہوں، میرا فرض ہو کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں، جو اس نے اس خطاب کے دیئے جانے کی نسبت اختیار کی ہے،

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلابِ حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو، تمدّن کو مٹا دینا چاہتی ہے قال اللہ تعالیٰ وَاِنَّ[1] الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً وَّکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ

لیکن انگریزی حکومت نے بخلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے، قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ کو ہے وہ مخفی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی،

حضرات! اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہو، اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شبہہ نہیں کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں، اور ان کی ہمت بندھتی ہے، ہم کو گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہو کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں، اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لئے قدردانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے،

---

[1] ترجمہ:- بے شبہہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو ویران اور اسکے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں، (قرآن پاک میں ملکۂ سبا کا قول نقل ہوا ہے) "س"

تو گورنمنٹ ہماری قدردانی اور عزت افزائی کے لئے اسی طرح موجود ہی جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت، مولوی عبدالحق صاحب[1] خیرآبادی، مفتی میر عباس صاحب مرحوم، مولوی حامد حسین صاحب مرحوم اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہوسکتی تھی، جو انگریزی گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا،

حضرات! جبکہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی ہمارا یہ قومی کالج،،

اس جلسہ کے بعد، ۱ فروری روز شنبہ کو اسٹریچی ہال میں، لیڈیز، یورپین افسران، رؤسائے علی گڈھ اور طلباے کالج کا ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرکاری طور پر رسم خلعت و عطاے خطاب ادا کی گئی، اور مسٹر ہونگٹن کمشنر قسمت میرٹھ نے مولانا کو اپنے ہاتھ سے عمامہ، عبا اور تمغہ عطا کیا، سر سید نے مولانا کو الگ لیجا کر یہ خلعت پہنایا، مولانا خلعت کو زیب تن کرکے وسط ہال میں کھڑے ہوئے، اس وقت مسٹر ہونگٹن نے ان کو مخاطب کرکے ایک تقریر کی جس میں وہ تمام خیالات یکجا ہیں جو اس عطاے خطاب کے باعث، اور اس وقت مسٹر بک پرنسپل اور سرسید مرحوم کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لئے وہ آج بھی غور سے

---

[1] ان صاحبوں کو شمس العلماء کے خطاب ملے تھے، مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے نامور جانشین و فرزند، مفتی میر عباس صاحب لکھنؤ کے مشہور ادیب، اور مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤ کے مشہور اثنا عشری عالم و مجتہد، اور مولوی ناصر حسین صاحب مجتہد لکھنؤ کے والد،

پڑھے جانے کے لائق ہے۔ انھوں نے کہا: "مولوی محمد شبلی نعمانی! مجھے اس امر کی نہایت خوشی ہے کہ یہ سند اور خلعت گورنمنٹ آف انڈیا و صوبجات ہند کی طرف سے ایسے وقت میں آئے کہ مجھ کو اس مسرت اور خصوصیت حاصل کرنے کا موقع ملا، کہ میں بذات خود اس رسم میں شریک ہوں، جو اس عطیہ خطاب کی غرض سے کی گئی ہو، جس کے لئے یہ سند اور خلعت ثبوت اور علامت ہیں،

اس خطاب کی تاریخ لارڈ ڈفرن کی اس عبارت سے معلوم ہوتی ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ کیونکر ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا، ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے اس پر توجہ فرمائی تھی، کہ اب تک کوئی ایسا مناسب ذریعہ موجود نہیں جس سے ہم ان ہندو اور مسلمان اشخاص کی علمی لیاقت کی قدرشناسی کر سکیں، جو ہز مجسٹی حضور پر نور قیصرۂ ہند کی وفادار رعایا ہیں، اور نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ جشن جوبلی کی یادگار قائم رکھی جائے، پس انھوں نے ایک نئے خطاب کی تجویز کی جو ان ہندو اور مسلمان اشخاص کو عطا کئے جائیں جنھوں نے علوم مشرقی کی ترقی میں کارہائے نمایاں کئے ہوں،

ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے ہدایت فرمائی . . . . کہ یہ خطاب مسلمانوں کے لئے شمس العلماء ہوگا، یہ خطاب شخص مخاطب کے نام کے اول میں اضافہ کیا جائے گا . . . . . . خطاب شمس العلماء کے ساتھ ایک خلعت بھی عطا کی جاوے گی جس میں ایک عمامہ اور ایک عبا ہوگی، جن اشخاص کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوگا وہ دربار میں ان اشخاص سے متصل دوسرے درجہ پر بیٹھینگے جن کو نواب کا خطاب ملا ہوگا،

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی! اس رسم خلعت کے انجام دینے پر اور اس سند کے نذر کرنے کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راست رو وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے،

جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصہ میں نہیں آیا ہیں (آپکے لئے) یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو، نہ صرف اس لئے کہ اس سزاوار عظمت سے لطف حاصل کیجئے بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علوم مشرقی میں آپنے ایسے کارہائے نمایاں کئے ہیں جس سے یہ امتیاز حاصل کیا، اسی طرح اس سے بھی زیادہ نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش قوم کے واسطے کرتے رہئے، جس کے ساتھ ساتھ عروج کرنا آپ کی قوم کے لئے مقدر ہے، اور اپنے پُرزور اثر کو جو آپ کی ممتاز لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، اس معززہ امر کے استحکام اور وسعت کی طرف مائل رکھئے، جس کو آپکے پرنسپل کے دلپسند الفاظ (برٹش کی وفاداری انگلش کے ساتھ دوستی اور جوش سلف ہلپ کے بلند اور روز افزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں یہی تین باتیں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڈہ میں ایسی ہیں جنکو اس کی علامت اور اثر قدیم اور اس کی روح کہہ سکتے ہیں، اور جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا اظہار کر رہی ہیں، جس سے ایک قوی مگر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز پر ڈال سکتی ہے جو اس کے لئے باعثِ عزت اور اس کے فرمانرواؤں کے لئے باعثِ ہمدردی و امتنان ہو سکے، (اس کالج اور اس کے پیارے اور لائق ادب بانی کی نسبت) میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ یہ کالج ایسی متصل اور مستقل ترقی کے ساتھ استحکام کے مدارج حاصل کرتا جائے کہ اس کے بانی کی درخشاں زندگی کے افق پر کالج کے آئندہ حالات کے خیال سے پریشانی کا ابر نہ چھائے، اور اس کے آخری ایام مسرت کے روشن افق پر بسر ہوں، جہاں فرحت بخش امید کا جلوہ ہے اور جہاں سے کامیابی کا میدان سامنے نظر آتا ہے جہاں اُس کی آنکھیں ارضِ موعود کو دیکھ کر جس کی جانب وہ اپنی قوم کی رہبری کرتے ہیں، اس طرح پر روشن ہوں جیسا کہ قوم بنی اسرائیل کے اس بڑے فدائی کی چشم تیز بیں ہو رہی

تھی، جس نے اپنی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا تھا، کہ قوم کو کشورِ غلامی سے باہر نکالے"۔

یہ تقریر اور اس تقریب کی کارروائی اس زمانہ کے پانیر الٰہ آباد اواسط فروری ۱۸۹۴ء میں چھپی تھی، جس میں ایک دفعہ چھپ جانا اس عہد کے ہر عزت طلب کی انتہائی آرزو تھی، بقول اکبر

ع بہرِ خدا ہمیں بھی ذرا چھاپ دیجئے"

اس مسرت کے علاوہ جو ارکین و طلباے کالج نے اس خطاب کے عطا ہونے پر ظاہر کی تھی تمام ملک کی طرف سے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، اخبارات نے مضامین لکھے، اور اکثر بزرگانِ قوم نے بذریعہ خط مولٰنا کو مبارکباد دی، ان سب کے جواب میں مولانا نے حسبِ ذیل شکریہ آمیز تحریر شائع کی، جس کا حرف حرف اپنے لکھنے والے کے حوصلۂ بلند اور ہمت عالی کا شاہد ہے، اور جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پورے سیاسی ڈرامہ میں جو اسٹیجوں پر کھیلا گیا اس کی نظرِ حقیقت کی بلند سطح سے نیچے نہیں اُتری، "عطاے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارکباد کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بدرجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدردانی کا اظہار کیا، اُن کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ایاز قدرِ خود بشناس کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف اور عزت کی باعث ہیں، اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت اُن بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں اور جنہیں افتخار الدولہ فخر الملک صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں بہادر، فیروز جنگ سی، ایس، آئی نائب

ریاست ٹونک، سردار محمد حیات خاں بہادر سی، ایس، آئی، نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب، نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، مولوی سید اکبر حسین صاحب جج، حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو عطا کی جا سکتی ہو،

علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہٗ کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لئے منتہائے فخر اور سند عزت ہو، بے شبہہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت تھی جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی، اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی تھی،

تماشائے عبرت
فروری ۱۸۹۴ء

مولانا شبلی مرحوم نے "قومی مسدس" کی تمہید میں اس قومی تماشاگاہ کا ذکر ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ علی گڈہ میں ایک سالانہ نمایش ہوتی ہے جس میں ضلع کے اکثر روساء بڑے ساز و سامان سے شریک ہوتے ہیں، ان کے خیمے ڈیرے لگتے ہیں، سر سید نے ان میں سے مسلمان رئیسوں کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک قومی تماشاگاہ کی طرح ڈالی، لوگوں نے اس کو سنجیدگی کے خلاف سمجھ کر اس کی مخالفت کی، مگر سر سید نے یہ کہکر قوم کے لئے سب کچھ گوارا ہے، ۶ فروری ۱۸۹۴ء کی رات کو علی گڈہ کی نمایشگاہ میں چند خیمے کھڑے کئے، اور ایک اسٹیج ترتیب دیا، اس میں سب سے پہلے نواب حاجی اسمٰعیل خاں جو عرب اور ترکی میں رہ چکے تھے، کپتان کی وردی میں باہر آئے، اُن کے ساتھ چند سپاہی تھے، ان سے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی میں باتیں کیں، پھر سر سید صاحب آئے اور کپتان سے کچھ گفتگو کر کے ایک دلپذیر لکچر دیا، اور آخر میں حافظ کی یہ پوری غزل پڑھی،

ساقیا برخیز و در دہ جام را   خاک بر سر کن غمِ ایام را

اسکے بعد چار انگریز پروفیسر آئے، اور انھوں نے ساتھ مل کر ایک انگریزی گیت گایا پھر آغا کمال الدین سنجر طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ

اے پیروانِ دینِ خلیفہ پیمبری   فریاد از ستیزہ این چرخِ چنبری

بڑی شان سے پڑھا، اس کے بعد آغا محمد حسین نے جو مشہور سیاح تھے اور افغانستان، کوہستان مصر اور سوڈان میں کچھ دنوں رہے تھے، بدوی شیخ کی صورت میں آکر عربی گیت گایا، اس کے بعد خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل نے آکر تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی، پھر پروفیسر آرنلڈ نے آکر ایک انگریزی نظم پڑھی، ان سب کے بعد مولانا شبلی صاحب سبز عبا پہنے، اور رنگین عمامہ باندھے اسٹیج پر آئے، اور اپنا قومی مسدس جو اسی موقع کے لئے تصنیف کیا تھا پڑھا، ان کے دل میں خود قومی درد تھا، آواز دردانگیز تھی، مسدس کا مضمون بھی ویسا ہی قومی درد سے بھرا تھا، سب نے مل کر لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا اس کو ان ہی لوگوں کا دل جانتا ہے، جو اس وقت موجود تھے، یاقوت خاں طالب علم نے مولانا شبلی کا ایک اردو قصیدہ پڑھا،

بزمِ احباب ہی پرجوش ہی جلسہ کیسا   جم گیا پھر طربؔ عیش کا نقشہ کیسا

یہ عبرت کا تماشا تو گذر گیا مگر مولانا کا یہ مسدس آج بھی عبرت کا تماشا دکھا رہا ہے، (تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان، مرتبہ سید افتخار عالم صفحہ ۲۴۷ و ۲۴۸)

لاہور کا سفر ۱۸۹۵ء | "انجمن حمایت اسلام" لاہور کی مشہور انجمن ہے، اکثر اکابر اس کے سالانہ جلسوں

ملے یادِ ایام مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری،

میں شریک ہوتے رہے ہیں، مارچ ۱۹۰۵ء میں اس کے سالانہ اجلاس میں سید صاحب اور ان کے دیگر رفقاء نے شرکت کی، اسی سلسلہ میں مولانا بھی تشریف لے گئے تھے، یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ انھوں نے اس جلسہ میں کس موضوع پر تقریر کی، (مکاتیب شبلی، اضافہ طبع دوم ۴۳)

الہ آباد یونیورسٹی کا تعلق ۱۹۰۵ء

اسی سال الہ آباد یونیورسٹی نے مولانا کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس (شعبۂ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈی (شعبۂ تدریس) کا ممبر بنایا، اور وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے، مولانا ۱۵ مارچ ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"رمضان کے بعد ایک مطول یادداشت کورسوں کے متعلق تیار کروں گا"

معلوم نہیں یہ یادداشت کیا تھی اور کیسی تھی، مگر مولانا کے ایک واقف کار سوانح نگار لکھتے ہیں

"الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف، اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا، ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے، تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی، لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا، اور اسکا اخراج ملتوی ہوگیا" (صفحہ ۴۳ و ۴۴)

اس کورس کے نثر کے حصہ میں پہلے نظام الملک طوسی کے سیاست نامہ کے ۲۲۵ صفحے ہیں، پھر سو صفحوں میں ابوالفضل کی آئین اکبری کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں شعرائے اکبری کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد خالص نظم ہے، نظم میں پہلے شاہنامۂ فردوسی کے ننانوے صفحے ہیں

[1] مرتبہ محمد مہدی تاجر مہتمم صحیفہ تاریخ بھوپال شائع شدہ بشیر سیریز اٹاوہ، ۱۹۲۵ء

اس کے بعد شعرائے متاخرین میں سے قاآنی کے قصائد کے پچاس صفحے ہیں، پھر قدماء میں منوچہری کے قصائد و مسمطات و اشعار کے اکانوے صفحے ہیں،

اس کورس کی نثر میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ خاص فارسی محاورہ، دوسرے یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے، اور تیسری یہ کہ اُس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھنچ جائے، اور ایک متقدم اور ایک متاخر نثر دونوں کا نمونہ پیش نظر ہو جائے، نظم میں بھی صحیفۂ ایران یعنی شاہنامۂ فردوسی ہے، پھر غزنوی دور کے مشہور قصیدہ گو منوچہری دامغانی کا کلام ہے، جس میں ایک خاص قسم کی روانی اور انسجام ہے، اور متاخرین میں قاآنی کا نمونہ ہے، جو قاچاری دور کا سب سے بہتر قصیدہ گو تھا، اور جس میں لفظوں کی ایسی جادوگری ہے جو شاید ناموزوں طبع کو بھی موزوں بنا دے،

یہ کورس سالہا سال تک شاید ۱۹۰۳ء تک یا اس کے بعد بھی چلتا رہا، مولانا جب تک کالج میں رہے سو روپیہ سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے،

قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز ۱۸۹۶ء

مستشرقین کی کوششوں سے اس زمانہ میں یورپ کے مختلف ملکوں سے عربی زبان کی نہایت نادر اور قدیم کتابیں چھپ چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اس کو دیکھ کر مولانا کا جی بار بار چاہتا تھا کہ کاش مسلمانوں میں بھی علماء کا ایک چھوٹا سا گروہ ایسا ہوتا جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو کتبخانوں کے گوشوں سے نکال کر منظر عام پر لاتا، اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا ہوتا، اور دنیا کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا کیا ہے؟

یہ خیال ان کے دماغ میں سب سے پہلی بار ٹرکی اور مصر و شام کے سفر میں آیا جب نہایت کثرت سے اُن کی نگاہ کے سامنے سے اسلاف کے یہ نادر کارنامے گذرے، چنانچہ سفرنامہ میں جو ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا ہے، اپنی اس آرزو کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے: "میں نے کتبخانوں کے بیان میں جو تفصیل کی، وہ ایک خاص غرض سے کی، اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں، یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہنچانا اور ان کو چھاپ کر شائع کرنا ہے، ان ہی انجمنوں کی بدولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادرالوجود کتابیں چھپ گئیں جن کے دستیاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، یہی انجمنیں ہیں جنھوں نے تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری کا قلمی نسخہ بہم پہنچایا اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شائع کیں، حالانکہ مصر و روم کے علما، اس نایاب تاریخی خزانہ سے بالکل ناامید ہو چکے تھے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے تو یقین دلادیا تھا، کہ وہ دنیا سے ناپید ہو گئی، بےشبہہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہیے، بزرگانِ قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لائق مصنفین کتابوں کے انتخاب کے لئے ممبر مقرر ہوں، قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کرا کر منگائی جائیں، اور چھاپ کر شائع کی جائیں، یہ کام بظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اگر چار کرور مسلمانوں میں سے ۱۰۰ مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں، تو اس کام کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں،

حیدرآباد میں دائرۃ المعارف الدکنیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے، اور جس کے ایک معزز

ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گذارش پر توجہ کرے گی، ہم شکرگذاری کے ساتھ ان علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہی، اور ہم کو امید ہے کہ دائرۃ المعارف اور زیادہ توجہ اور اہتمام سے اس مقصد پر متوجہ ہوگی؛؛

چند سال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خیالی آرزو نے اس حد تک ترقی کی، کہ اُس کو عملی شکل دینا چاہا، چنانچہ مئی ۱۸۹۶ء کی منتھلی میں حسب ذیل تجویز کا اعلان کیا :۔

" یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی، اور ہر فن میں اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلمبند کئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہ ہیں جنھیں ایجاد و جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی، قدما کی تصنیفات جنمیں ہر جگہ اجتہاد اور ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہی عموماً متروک ہیں، خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہی، تو ہر شخص کو وہاں تک دسترس نہیں، اور اس وجہ سے گویا اُن کا عدم وجود برابر ہے،

کس قدر تعجب کی بات ہی کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمامتر دار و مدار امام محمد کی روایات اور تصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاحِ فقہ میں ظاہر الروایۃ کہتے ہیں، لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن ناموروں پر ناز ہو سکتا ہے، وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں، لیکن ان کی تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہے، قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے تمام ہندوستان

میں ایک کتاب بھی موجود نہیں، تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئیں ہی نہیں، بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں، ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگرچہ حیدرآباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائی قیام سے اس وقت تک ہوا ہے، اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں،

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے اس کے لحاظ سے اگرچہ یہ تجویز فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے، لیکن ۷ کروڑ مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شائق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں، اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں، بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دیئے جائیں،

(۱) وہ لوگ جو عـــہ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں، اور یہی لوگ ارکینِ مجلس قرار دیئے جائیں گے، اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا، اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندۂ ممبری سے زائد ہو، ان کو دی جائیں گی،

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابیں بہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی، اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی،

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمتِ معینہ پر خرید لیں گے، ان بزرگوں

کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا، اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلیو پی ایبل بھیجدیا جائے گا،

یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ سر دست جن کتابوں کا شائع کرنا پیش نظر ہے، وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لئے جو کتابیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں حسب ذیل ہیں:-

اعجاز القرآن امام باقلانی، طبقات الشعراء لابن قتیبۃ، **مناقب الشافعی** للامام الرازی

مجموعۂ رسائل فارابی، جس میں ۱۵ رسالے شامل ہیں، تلخیص المقال ابن رشد مطبوعۂ یورپ، عمدہ لابن رشیق القیروانی، تاریخ صغیر امام بخاری،

ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کی بابت ہم سے خط و کتابت فرمائینگے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے، اور یہ کہ ان کے نزدیک کتب مذکورۂ بالا میں سے اول کس کتاب کا شائع کرنا زیادہ مناسب ہے؟

مگر یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، تاہم اس کا یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ ان نادر کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئی، تاریخ صغیر امام بخاری اور رسائل فارابی تو ہندوستان ہی میں چھپے، باقی طبقات الشعراء ابن قتیبۃ، اعجاز القرآن باقلانی، عمدہ ابن رشیق قیروانی، تلخیص المقال ابن رشد وغیرہ مصر سے چھپکر نکلیں،

"دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن" نواب عماد الملک مرحوم، ملا عبد القیوم مرحوم، اور مولانا انوار اللہ خاں صاحب کی کوششوں سے سرکار نظام کی امداد سے تقریباً ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد دکن میں قائم

ہوا تھا، جس کا مقصد عربی کی قدیم و نادر کتابوں کی اشاعت تھی، مگر وہ ان دنوں زیادہ مذہبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف تھا، مولانا کی بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے اس نے ادھر توجہ کی، اور اگست ۱۹۱۴ء میں دائرہ کی طرف سے مولانا سے خواہش کی گئی کہ وہ دائرہ کے کاموں کے لئے ایک خاکہ تیار کردیں، چنانچہ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا نے ایک مفصل خاکہ بنا کر بھیجدیا، جس میں علوم قرآن کی بعض نادر کتابوں کے پتے اور خصوصیات لکھے، یہ تمام خط و کتابت مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کے بدولت معارف مئی ۱۹۳۰ء میں چھپ چکی ہے، بحمد اللہ دائرہ آج تک برابر اپنے کاموں میں پوری طرح مصروف ہے،

قدیم حنفی فقہ کی جن بنیادی کتابوں کی طرف مولانا نے توجہ دلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بھی اسی سرزمین دکن کے ایک مخلص قندھاری عالم کو توفیق بخشی، جس نے بڑی محنت اور ایثار سے حیدرآباد میں "احیاء المعارف النعمانیہ" کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے، اور اس وقت تک ہند و مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتبخانوں سے متعدد نادر کتابیں بہم پہنچا کر تحشیہ و تصحیح کے ساتھ شائع کی ہیں، جزاھم اللہ خیرا الجزاء، اس طرح جو تجویز ایک دردمند دل سے نکلی تھی، وہ دردمند دلوں کو متاثر کر گئی،

حیدرآباد کا دوسرا سفر اور عطائے وظیفہ ۱۸۹۶ء

مولانا علی گڈہ کی کشمکش سے گھبرا کر یکسوئی اختیار کرنا چاہتے تھے، مگر حالات موزوں نہ تھے، والد بزرگوار یہ بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے، اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی، لیکن خوش قسمتی سے حیدرآباد میں اس وقت نواب وقارالامراء بہادر کی وزارت تھی، اور مولوی سید علی بلگرامی کو جن سے مولانا کے خاص روابط تھے، نواب

صاحب کے یہاں خاص رسوخ حاصل تھا موصوف نے اُنکو حیدرآباد بلایا، وہ وہاں چار پانچ ہفتے جاکر رہے، نواب صاحب ممدوح کی سفارش سے اعلیٰ حضرت نظام الملک میر محبوب علی خاں نے از راہِ قدردانی سَو روپئے ماہوار کا وظیفہ ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ سے منظور فرمایا، اور یہ شرط کی کہ آیندہ سے مولانا کی تمام تصنیفات سلسلۂ آصفیہ میں شامل ہوں، اس وظیفہ کے ساتھ حسب ذیل فرمان عنایت ہوا، "مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، چار ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں، مولوی صاحب موصوف ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں، ان کی قدردانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم سے بھی بہ عطائے خطاب وتمغہ ہوئی ہے، اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں، اور معمولی درس وتدریس کو ترک کردیں، مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے، اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے، چونکہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے لہذا سرکار نے بالفعل سو روپیہ کلدار ماہوار جاری کرنے کے لئے منظوری صادر فرمائی ہے، اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کی تصنیفات کے دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جاوے گا، جو کتابیں مولوی صاحب موصوف تصنیف کریں گے وہ سرکار آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہے سو روپیہ کلدار ماہوار شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کی جاوے، ایک مثنی اس کا مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے۔"

یہ قدردانی تو سرکار کی طرف سے ہوئی، دار السلطنت کے امراء اور اکابر اور اہلِ علم نے

بھی قدر دانی میں کمی نہیں کی، چنانچہ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی مسعود علی صاحب بی اے محوی، (حال مترجم دار الترجمہ) مولوی عبد الغنی صاحب وارثی بہاری مددگار محاسب سرکار عالی، اور مولوی محمد جامع صاحب مددگار معتمد عدالت کی کوششوں سے ۱۱ ربیع الثانی کو کاسماپولٹین ہوٹل میں (جسکو اب محسن الملک کی کوٹھی کہتے ہیں) ایک کامیاب جلسہ ہوا، مولوی خدا بخش خاں مرحوم جن کی پٹنہ میں لائبریری مشہور ہے، اور جو اُن دنوں وہاں کی عدالت عالیہ یعنی ہائیکورٹ میں میر مجلس (چیف جسٹس) تھے، جلسہ کے صدر تھے،

جلسہ میں پہلے مولوی عزیز مرزا مرحوم نے ایک "سپاسنامہ" مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اس سپاسنامہ پر بعض بڑے بڑے امرا جیسے رکن الملک خان دوراں، تراب جنگ، عماد نواز جنگ، جہانگیر یار جنگ، تفضل یار جنگ، حیدر یار جنگ، حسن یار جنگ، انتظام جنگ، بعض اکابر علما جیسے سید شاہ عبد الرحیم قادری، مولوی حکیم عبد الرحمن صاحب سہارنپوری، خلف مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، مولوی وحید الدین صاحب مدرس دار العلوم، اور بعض وکلاے ہائیکورٹ جیسے محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا، سید ابو القاسم وکیل ہائی کورٹ، فدا حسین خاں وکیل ہائی کورٹ، محمد عبد الباقی صاحب ہائیکورٹ، بعض اور معززین جیسے سید محمد مہدی خان، میر نثار حسین، سید لطف علی، محمد زماں خاں،

---

[۱] یہ تفصیلی حالات آیندہ نظم کے سلسلہ میں جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے معارف کے لئے لکھ کر بھیجے تھے، اور جو معارف اکتوبر ۱۹۲۵ء میں چھپے، اسی قسم کی اطلاع منشی ظفر الملک صاحب علوی اڈیٹر الناظر نے جو اُن دنوں حیدرآباد میں تھے، اور نواب اکبر یار جنگ بہادر سابق معتمد عدالت سرکار عالی نے ہم کو بھیجی تھی،

[۲] یہ اصل سپاسنامہ اس وقت تک دار المصنفین میں موجود ہے، اور میرے پیش نظر ہے،

نصیر الزماں، سرفراز حسین وغیرہ کے دستخط ہیں، بعض صاحبوں کے دستخط پڑھے نہیں گئے، سپاسنامہ یہ ہی:

بخدمت فیضدرجت جناب فضیلت انتساب شمس العلما، مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب تمغۂ مجیدیہ دام افضالکم

عالیجناب

ہم لوگ جنھیں آپکے ہم ملت ہونے کا افتخار حاصل ہی، اس موقع پر جبکہ آپ شہرِ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف فرما ہوے ہیں، آپکے خیر مقدم کے لئے حاضر ہوے ہیں، اور ان احسانوں کو یاد کرکے جو آپنے قوم اور ملک پر اپنی عالمگیر تصنیفات کے ذریعہ سے کئے ہیں، شکرگذاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، آپ کی پُرجوش مثنوی "صبحِ اُمید" نے سب سے پہلے ایک نئے مگر دلربا انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوشخبری سنائی، اور "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوشگوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کردیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تاریکی کے زمانہ میں یہ کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانہ میں کیا کچھ نہیں کرسکتے، آپ کی مورخانہ تحقیق نے مامون الرشید کے حالات اس خوبی سے جمع کئے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت وجبروت اور دربارِ خلفار کی شان وشوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدانِ تہذیب وشایستگی میں آگے تھے، خود بخود ظاہر ہوگئے، آپنے سیرۃ النعمان میں نہ صرف ایک ایسے پیشوای مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ تھی، بلکہ یہ بھی ثابت کردیا کہ شریعتِ غراے مصطفوی جس طرح نجاتِ اُخروی کے لحاظ سے

صراطِ مستقیم ہے، اُسی طرح دنیاوی معاملات کے لئے بھی ایک عمدہ دستور العمل ہی، اور یوروپین مصنفوں کا یہ خیال کہ وہ رومن جورس پروڈنس کی ممنونِ احسان ہی، راستی سے کس قدر بعید ہے، آپنے کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اُس دھبہ سے اسلام کو دامنِ عزت کو بالکل پاک وصاف کر دیا، جو عیسوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈگبن جیسے نامور مورخ کی پُرجوش کوشش بھی اُس کو نہ مٹا سکیں، آپنے یورپین نکتہ چینوں کے مقابلہ میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی، بلکہ وہ ایک فوجی ٹیکس تھا جس کی ضرورت اس زمانہ میں بھی مسلّم ہے، اور حال میں جب ارمنی سازشوں کی بدولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہرِ الٰہی سمجھنے لگے، تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پُرزور قلم تھا کہ جس نے حقوق الذمیین کی تشریح کر کے بتا دیا کہ جیسے فیاضانہ اصول شریعتِ اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کئے گئے ہیں، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہی، آپنے درا صل تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روحِ تازہ پھونک کر ایک ایسا کام لیا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا، اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنونِ احسان رہیگا، آپنے صرف اپنے قلم اور دماغ ہی سے امتِ مرحوم کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ آپ کے علمی ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور دراز سفر اختیار کیا اور وہاں سے ایک اینیا بیش بہا تحفہ ساتھ لائے جس نے ہمارے ذخیرۂ معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہمدردی کو وسیع کر کے ٹرکی سے ہمارے رابطۂ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا، اگرچہ سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہماری سرکار عالیہ پایہ دار نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدر دانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصلی قدر دانی وہی ہے جو پبلک کی طرف سے ہو، آپ کی تصنیفات سے ہم حیدرآبادی

بھی اُسی طرح مستفیض ہوئے ہیں، جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطہ کے لوگ ہوسکتے ہیں،، اور اس
لئے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کرکے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک
اسلام اور قوم کی خدمت گذاری کے لئے زندہ و برقرار اور ہمارے لئے باعثِ افتخار ہیں۔ آمین ثم آمین، فقط

اس سپاسنامہ کے پڑھے جانے کے بعد مولانا کھڑے ہوئے، انھوں نے پہلے اس سپاسنامہ
کے جواب میں دو بندوں کا ایک یہ فارسی ترکیب[۱] بند اپنے خاص پُراثر لہجہ میں پڑھا،

اے دکن ایکہ جہاں را سر و سودا با تست — اے کہ مجموعۂ صد یاس و تمنا با تست
اے کہ صد نقش ز ہر پردہ برانگیختۂ — اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا با تست
زاہد ہستی کہ سر صدق و صفا ہست ترا — شاہد ہستی کہ دلآویزی ادا با تست
سازِ نیرنگی و صد نغمۂ رنگیں داری — لوحِ ارژنگی و صد پیکرِ زیبا با تست
یادگارِ حشمِ دیلم و سلجوق ہستی — مایۂ دولتِ بغداد و بخارا با تست
داستاں ہائے عزیزاں ہمہ از بر داری — خبر از قافلۂ یثرب و بطحا با تست
آں پراگندہ نژادِ عرب و نسلِ عجم — یعنی آں دفترِ اسلام مجزا با تست
گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است — آں ورق ہائے پراگندہ بیک جا با تست
گرچہ زاں میکدہ اکنوں اثری نیست بجائے — جرعۂ چند ازاں شیشہ و مینا با تست
گرچہ آں تازہ چمن رفت بتاراجِ خزاں — باز ہم بوئے خوشی زاں گلِ رعنا با تست

[۱] یہ ترکیب بند ہمارے پاس پورا نہ تھا اور کلیات میں بھی شامل نہ ہوسکا، مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی (حیدرآباد دکن)، کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں اس کو ہمارے پاس بھیجا،

گرمیِ صحبت آں میکدہ سر جوشِ تو ہست
مصر و غرناطہ و بغداد در آغوشِ تو ہست

اے بزرگانِ گرانپایہ والا کانِ دکن | اے ہمہ شمع فروزندۂ ایوانِ دکن
ہر سرِ موے من امروز زبانے شدہ است | بہ سپاس آوریِ منتِ خیلِ دکن
پائے تا سر ہمہ دربندِ کرم ہائے شماست | می تواں خواندم از جملہ اسیرانِ دکن
باعثے چیست چو جستمے ایں ہمہ لطاف و کرم | چہ کنم گر نہ شوم بستۂ احسانِ دکن
ہم زگیراییِ اخلاقِ دل آویز بود | کہ بود رومی و شامی ہمہ مہمانِ دکن
بوے خُلق است کہ دل می بردم ورنہ مرا | نتواند کہ فریبد گل و ریحانِ دکن
یارب آں باد کہ ایں تختگہِ دولت و دیں | سبز و خرم بود از فیضِ سلیمانِ دکن
میر محبوب علی خانِ نظامِ آصف جاہ | تاجدارِ دکن و قیصر و خاقانِ دکن
صدرِ اعظم مرتبہ نوابِ وقار الامرا | آنکہ صد پایہ فزود از شرفش شانِ دکن
واں دگر صدر نشینان و عزیزانِ وطن | کہ بود از دمِ شاں زینتِ ایوانِ دکن

ہمہ را بزمِ طرب با سر و ساماں باشد
شبلیِ خستہ ہم از حاشیہ بوساں باشد

یہ ترکیب بند لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ بہت سے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا، اور آج تک (سنہ ۱۹۲۵ء) اس کو مزے لے کر دہراتے ہیں[1]، بعض خوش وقت شاعروں نے اس کا جواب لکھا قصیدہ

[1] یہ بیان بھی ہاشمی صاحب ہی کا ہے، جنھوں نے شہر کے جلسہ کی زبانی سن کر لکھا ہوگا۔

کے بعد مولانا نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک دل آویز تقریر فرمائی جلسہ میں اہلِ علم کا کافی مجمع
تھا، اس لئے وہ بہت لطف اندوز ہوئے،

مولانا کے اس سفر سے بعض ارکان کالج کو یہ خیال ہو چکا تھا کہ وہ کالج چھوڑنا چاہتے ہیں۔
چنانچہ اس سفر کا حال سُنکر نواب محسن الملک نے مولانا شبلی کو ایک خط لکھا، یہ خط تو نہیں ملا لیکن مولانا
نے اس کا جو جواب دیا وہ مکاتیب میں داخل ہے یہ خط معاملہ پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، غالباً
نواب صاحب نے مقصدِ سفر کے بھانپنے کے لئے یہ لکھا تھا کہ "آپ شاید اپنے
نیشنل اسکول اعظم گڈھ کے چندہ کے لئے حیدرآباد گئے ہیں، مولانا ۱۵ ستمبر ۱۸۹۶ء
کو حیدرآباد سے ان کو جواب دیتے ہیں،

جنابِ من!

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی، آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں، اسکول
کے لئے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے، باہر نہیں جاتا
مجھ کو سرِدست سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی
ہے، خرچ بڑھ جاتا ہے۔ البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں متبذل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں
تو پس انداز ہو سکتا ہے، باقی وہاں کے لئے یہاں کے لوگوں سے چندہ، یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں ہے کچھ ابراہیم ادہم اور
بایزید نہیں ہوں، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل
کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی

اور بغیر اس کے کامیابی معلوم،

اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا،

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا، میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی چنانچہ اسی قدر ماہوار کا منصب مقرر ہوگیا، الفاروق کے بعد غالباً ما ضٰ یا آلہ ہو جائے، روبکار میں بھی اضافہ کا وعدہ درج کردیا گیا ہے، گو مقدار کی تعین نہیں، بس میری تنہا زندگی کو یہ بہت ہے، تاہل کا ارادہ نہیں زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ شکر ہے، اور یوں توع کاسۂ چشم حریصاں الخ...... ہاقوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کرکے دو چار کو نوکری دلوا دی جائے ان کو اس قابل بنانا چاہئے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں "

اس خط کا تیور ذرا تیکھا ہے، اس سے اندازہ ہوگا، کہ بعض ارکانِ کالج کے طرزِ عمل سے اُن کی ناراضی کس حد تک تھی،

مولانا کا یہ خیال کہ الفاروق کے بعد اُن کے منصب میں ترقی ہو جائے گی درست نہیں نکلا، آخر ۱۹۱۳ء میں نواب عماد الملک مرحوم کی سفارش سے حضور نظام میر عثمان علی خاں کے عہد میں یہ توقع پوری ہوئی، اعلیحضرت نے دو سو کا اضافہ فرما کر تین سو کر دیئے، اس کے بعد مولٰنا جیئے ہی کے دن، آخر یہ رقم دار المصنفین کے کام آئی،

مولٰنا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی

اس زمانہ میں "پین اسلامزم" کا ہوّا سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سلطان عبد الحمید خاں اس کے مرکز اور دنیاے اسلام کے ہر حصہ میں اُن کے نائب موجود ہیں، جو اس تحریک کو چلا رہے ہیں، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے

برخلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرکے اُن کو اسی طرح بغاوت پر آمادہ کرنا ہے، جس طرح یورپ کی سلطنتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو اُبھار کر بغاوت پر آمادہ کر رہی ہیں،

سفر روم سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں مولنا کی طرف سے یہ بدگمانی پھیلی کہ وہ اسی "پین اسلامزم" (اتحاد اسلامی کی تحریک) کے داعی اور سلطان عبدالحمید خاں کے سفیر بن کر ہندوستان واپس آئے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان میں ترکوں کے متعلق جو معلومات پھیلے تھے، وہ زیادہ تر عیسائی مضمون نگاروں اور یورپین اہل قلم کے پھیلائے ہوئے تھے، جن میں بڑا حصہ تعصب کی رنگ آمیزی کا تھا، اس سفرنامہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کے متعلق براہِ راست معلومات کا سرمایہ بہم پہنچایا، اور ان کے اخلاق و معاشرت اور علمی و فنی ترقیوں سے آگاہ کیا، اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود ترکی سے مربوط ہونے کے لئے تعلقات کی ایک نئی زنجیر پیدا کردی، انگریز حکام نے ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا،

اتفاق دیکھئے کہ اُسی زمانہ میں کالج میں کوئی جلسہ تھا جس میں مولانا نے اُردو کا ایک وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا

بزمِ احباب ہی پُرجوش ہی جلسا کیسا — جم گیا پھر طربِ عیش کا نقشا کیسا

اس میں ایک شعر تھا :-

نوجوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہو — اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی اُن انگریزوں کی طرف اُٹھ گئی

جو جلسہ میں بیٹھے تھے، سمجھانے والوں نے اُن کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا، اور طالبعلموں کو بغاوت کا سبق تھا، ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہوگئی، مولانا فرماتے تھے کہ اسی زمانہ میں وہ علی گڈھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے، اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہر گئے، بنگلہ کے خانساماں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا، مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اُس نے کہا کہ کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے، وہ آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے، اسی سے دیکھنے کو جی چاہا،

کالج میں مولانا کی سیاسی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی، وہ شخصی سلطنت کو مضر سمجھتے تھے، اور جمہوریت کے حامی تھے، اسی عرصہ میں کانگریس کا غلغلہ اٹھا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے، ابھی یہ آواز دبنے نہیں پائی تھی کہ ۱۸۹۳ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء کی آواز اٹھی، اور اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے، ان سب باتوں نے مل ملا کر اُن کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا کر دیا، یہی واقعہ آگے چل کر دوسرے واقعات کے ساتھ مل کر مولانا کے کالج چھوڑنے کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہوا، سید محمود کے بعد نواب محسن الملک جب سکریٹری ہوئے تو انھوں نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر مولانا کی نسبت گورنمنٹ کو جو شکوک تھے اُن کے رفع کرنے کی کوشش کی،

یہ بدگمانی اتنے دنوں تک قائم رہی کہ جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے شملہ میں جو ایک اورنٹیل کانفرنس بلائی تھی، اور جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس میں غالباً مسٹر برن چیف

سکریٹری گورنمنٹ یوپی نے جو اردو اور فارسی اچھی خاصی جانتے تھے، اُن سے پوچھا کہ انگریزی گورنمنٹ کے متعلق مسلمانوں کی رائے شرعی حیثیت سے کیا ہے؟" مولنا نے فرمایا "مسلمانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ہر ہفتہ جمعہ میں السلطان ظل اللہ فی الارض پڑھتے ہیں" برن صاحب نے کہا "اس سے مراد تو سلطان ترکی ہیں"۔

یہ واقعہ مولانا نے مجھ سے ذکر فرمایا تھا، اور کہتے تھے کہ دیکھو اب بھی یہ کانٹا ان کے دل سے نہیں نکلا،

مولنا کے ساتھ ان ہی دنوں خفیہ جاسوس بھی لگائے گئے، سلطان سے جو تمغۂ مجیدی انھیں ملا تھا، وہ نشانِ محبت بھی چوری گیا، خدا جانے یہ چوری سیاسی تھی یا اخلاقی، مگر تولہ بھر چاندی کی قیمت ہی کیا تھی؟ یہی زمانہ ہے جب سرسید کے مشورہ سے مولانا نے خلافت پر ایک مسلسل مضمون لکھنا چاہا، جس میں ترکوں کی خلافت کی مذہبی حیثیت سے انکار کیا تھا، یہ مضمون علیگڈھ میگزین میں چھپا، مگر چونکہ یہ آورد تھا، آمد نہ تھا، اس لئے وہ ناتمام ہی رہا، ۱۹۲۰ء میں جب میں رکن وفدِ خلافت کی حیثیت سے لندن گیا تھا تو پروفیسر آرنلڈ اکثر اس مضمون کو یاد دلاتے تھے، میں کہتا تھا کہ مولنا نے لکھا نہیں، لکھوایا گیا تھا، بہرحال انگریزوں کی یہ بدگمانی بڑھتی ہی رہی، یہاں تک کہ طرابلس، بلقان اور کانپور کے زمانہ میں وہ واقعہ بنکر نمودار ہوئی،

کشمکش اور اختلاف ہمارے ناظرین اس کتاب کو جس ترتیب سے پڑھتے آرہے ہیں، اس سے اُن کو پتہ لگ رہا ہوگا، کہ اب جیسے جیسے دن گذر رہا ہے، سید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط، اور وہ پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے، اور اب وہ موقع آرہا ہے کہ ان کو سرسید کے حلقہ سے علانیہ

باہر آ جانا پڑے،

اس اختلافِ حال اور کشمکش کے اسباب گو حیاتِ جاوید میں جگہ نہ پا سکے، مگر وہ تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوے، ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے، ان اسباب پر ایک نظر ڈالی جائے، اور گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، اگر ہم ان شعاعوں کو یکجا کرلیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی

سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی، کہ وہ اپنے ہمنشینوں سے آمنا و صدقنا کے سوا کوئی اختلافِ رائے برداشت نہیں کرسکتے تھے[1] اسی کا نتیجہ اُن کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی جو ان کے دلی دوست اور معاون تھے وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے فرانس چل کر ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا، اور بات اتنی تھی کہ مولوی سمیع اللہ صاحب کالج میں مسلمان بچوں کی تربیت کا کام انگریزوں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتے تھے، اور سرسید نے تعلیم و تربیت دونوں ان ہی کے سپرد کر دی تھی، کالج میں مسٹر بک پرنسپل کی ہمہ گیر حکومت، ٹرسٹیز بل کی منظوری اور سید محمود کی جانشینی کے مسئلوں میں اُن کے بڑے بڑے دوست ان سے الگ ہو گئے، اور اس اختلاف کے صلہ میں سرسید کی زبان سے وہ کچھ سنا جس کی توقع ان سے نہیں ہوسکتی تھی،

سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف گذشتہ تعلیم میں کی، رسالہ کے بیچ

[1] حیاتِ جاوید اوّل صنہ۲۹ میں مولانا حالی نے دبے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے، لکھا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈسپاٹک طبیعت کے آدمی تھے، اس خصلت کو چاہو ان کے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو، اور چاہو

اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو، بہرحال یہ خصلت اُن میں فطرةً تھی، (اوّل ص۴۹۲) ۱۲

میں تراجم کا بیان ختم کرکے ایک ریمارک کے نیچے لکھا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ عربوں نے عربی زبان میں دنیا کے علوم کا ترجمہ کرکے اپنے زمانہ میں جو ترقی کی اس قیاس پر آج عمل نہیں کیا جاسکتا،

سینٹیفک سوسائٹی علی گڈہ کے بانیوں کو عربی کے اس واقعہ سے دھوکا ہوا، اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعہ سے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دینگے، یہ خیال غلط تھا، کیونکہ ان ترجموں کے لئے لاکھوں روپیے درکار ہیں، جو خلفاے عباسیہ کے زمانہ میں ممکن تھا، اور اب غیر ممکن ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں علوم محدود تھے، اور ترقی رُک چکی تھی، جس قدر کتابیں ترجمہ کرلی گئی تھیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کرلیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی حد ہے، تیسری بات یہ کہ اس زمانہ میں عربی، اسلامی ملکوں میں حکمران زبان تھی، اور اردو حکمران زبان نہیں، اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اُس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہ ہو، آخر میں تھا: "مگر ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو سینٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے"

معلوم ہوتا ہے یہ ہلکا سا اعتراض جس کی معذرت بھی کردی گئی تھی، سرسید کو پسند نہیں آیا تھا کیونکہ مولنا حالی نے حیات جاوید میں اس سرسری سی بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی، اور حاشیہ کا ایک پورا صفحہ اس کے لئے نذر کیا، اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہے، مولنا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں، پھر دکھایا ہے کہ آجکل رعایا اپنی طاقت سے وہ کام کررہی ہے جو کل تک صرف سلاطین کرسکتے تھے، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر تاریخ میں کوئی مثال

ایسی نہیں کہ کسی غیر حکمراں زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی گئی ہو، تو ضرور نہیں کہ آیندہ بھی نہ ہو۔[1]

یقیناً مولانا حالی کا بیان صداقت پر مبنی ہے، اور جامعہ عثمانیہ کے وجود نے ہمارے ملک کے ان مخلصانہ جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اتفاق دیکھئے کہ حیدر آباد میں اردو حکمراں زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس نے خلفاے عباسیہ ہی کی طرح اردو تراجم پر روپیہ بہایا، اور اس لئے مولانا حالی اور مولانا شبلی دونوں کے شرائط کے مطابق اُس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ علوم و فنون کی ترقی کا باعث بنے، اور کیا عجیب بات ہو کہ یہ تجویز مولانا شبلی کی اس تحریر کے پینتیس برس بعد خود مولانا شبلی ہی کی تحریک سے عالم وجود میں آئی، اور اُن کے شاگرد رشید و برادر عزیز مولانا حمید الدین صاحب کے ذریعہ سے تجویز نے عمل کا پیرایہ اختیار کیا،

مگر سرسید اور مولانا شبلی کے بیانوں میں ایک ذرا فرق ہے، سرسید نے اپنی تعلیمی شہادت میں یہ تسلیم کیا ہے، کہ ہندوستان میں حکمران زبان انگریزی ہے، اس لئے ہندوستان میں انگریزی ہی کے ذریعہ تعلیم ممکن ہے، اور مولانا شبلی نے یہ نہیں کہا، بلکہ یہیں تک کہہ کر رہ گئے کہ حکمران زبان ہی کے ذریعہ قوم میں علوم و فنون کی ترقی ممکن ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم و فنون کی زبان بنانا چاہتی ہے تو اُس کو چاہئے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمران زبان بنائے، اور آج واقعات کی روشنی میں ہماری زبان حکمران زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے، اور علوم و فنون کے خزانوں سے بھر رہی ہے،

بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی، مقصود یہ ہے کہ سرسید پر تنقید کے لئے مولانا شبلی کی زبان کالج میں آنے کے چند سال بعد ہی کھل چکی تھی،

[1] حیات جاوید جلد دوم صفحہ ۴، نامی پریس کانپور، ۱۲

اس کے بعد دوسرا سبب مذہبی اختلاف ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سرسید کی صحبت میں مولانا میں جو پہلے ہی سے علومِ عقلیہ سے دلچسپی رکھتے تھے مذہبی عقل پسندی آگئی تھی، اور عقل و نقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہوگیا تھا، اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں یا غلطیاں اُن کو نظر آنے لگی تھیں، مگر یہ قطعاً غلط ہے کہ وہ معتزلی بن گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ وہ شدید حنفی تھے، اور اسی اصول پر وہ علم کلام کی طرف جھکے تو ماتریدیت پر آکر رُکے، بہرحال یہ بحث اپنے موقع پر آئیگی،

لیکن اس عقلیت پسندی کے باوجود وہ ماشاء اللہ دینیات پر عبور رکھتے تھے، اور کلام و محاوراتِ عربیہ کے پوری طرح ماہر تھے، اس لئے سید صاحب اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے اس کے لئے وہ مولانا سے جس قسم کے معلومات چاہتے تھے وہ گو اُن کے لئے مہیا کر دیتے تھے، مگر وہ خود اُن کی اس قسم کی تاویلات کو پسند[1] نہیں کرتے تھے، اسی لئے مولانا نے اُن کو آہستہ آہستہ عقل پسندی کی آزاد شاہراہ سے ہٹا کر امام غزالی، رازی، ابن سینا اور قاضی ابن رشد کی تصنیفات سے آشنا اور معتزلہ کے خیالات سے باخبر کیا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرسید کی آزاد خیالی جس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی، آخر میں حکماء و متکلمینِ اسلام کے خیالات تک محدود ہو کر رہ گئی،

ایک دفعہ مولانا فرماتے تھے کہ سید صاحب جنات کی حقیقت پر ایک رسالہ لکھ رہے تھے

---

[1] مولانا حالی اپنے مضمون "سرسید اور مذہب" مندرجہ علی گڈھ میگزین (مئی ۱۹۰۸ء) ص ۱۳۴ میں فرماتے ہیں: "مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے ایسے بھی موجود ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ایسے تاویلات بارد پر اطمینان ہوگیا، اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں"

(وہ رسالہ چھپ بھی گیا ہے) اتفاق سے اسی زمانہ میں امام باقلانی کی اعجاز القرآن آئی، ان میں جنوں کے اشعار ہیں، اور جاہلی شعراء کے ایسے اشعار ہیں جنہیں یہ بیان ہے کہ جنوں سے ہماری دوستی ہے، وہ ہمارے پاس آتے ہیں، اور ہمارے ساتھ کھاتے ہیں وغیرہ، مولانا نے سرسید سے اس کا ذکر کیا، تو بولے کہ یہ اشعار ہمارے بڑے کام کے ہیں، ہم کو دیجئے، لیکن سرسید ان اشعار کو اس کام میں لائے کہ کلام عرب میں جنوں کے معنی دہقانی صحرائی یا جنگلی انسان کے ہیں، حالانکہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا، وہ جنات کے مستقل وجود کے قائل تھے، ابن تیمیہ کے مضمون میں فرماتے ہیں: "جن کے وجود سے انکار نہیں، لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے۔"

سرسید کا بڑا کارنامہ خرق عادت کا انکار ہے، اور اسی کے لئے دور از کار تاویلوں پر سارا زور ہے، مولانا اس کے متعلق الکلام میں ایک موقع پر لکھتے ہیں:- "قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ (؟) ان کی عموماً تاویل کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کافی ہیں، جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرز اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع[1] کیا کام دے سکتی ہے؟"

[1] ملمع سازی

اسی تصادم سے بچنے کے لئے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا، کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا، سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لئے تقاضا کرتے تو ٹال جاتے،

بہت مجبور کیا تو آخر میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ (مطابق جولائی ۱۸۹۵ء) کے پرچہ میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۷ شوال ۱۳۱۳ھ کے پرچہ میں "مشاہیر معتزلہ" کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا اہتمام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بجاے شبلی کی جگہ "الاسدی"[1] اور نعمانی کی جگہ "الاعظمی" لکھا،

اسی طرح بعض فقہی مسائل کا حال تھا، سرسید عیسائیوں کی گردن مروڑ کر ماری ہوئی مرغی کو اس بنا پر حلال سمجھتے تھے، کہ اہل کتاب کے ذبح کا یہ موجودہ طریقہ ہے، اور اہل کتاب کا ذبیحہ اسلام میں حلال ہے، سرسید نے اپنے اس مسلک کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا ہی، حالانکہ گو اس میں شبہہ نہیں کہ اہل کتاب کا کھانا (طعام) اور ذبیحہ حلال ہی، مگر اس شرط کے ساتھ ہے کہ محرمات اسلام میں سے نہ ہو، اور دم گھٹ کر مرا ہوا یا دم گھوٹ کر مارا ہوا جانور قرآن پاک کی تصریح (وَالْمُنْخَنِقَةُ) کے مطابق اسی طرح حرام ہے جیسے سور جس کو سرسید بھی حرام کہتے ہیں، اور اس کا کھانا حرام بتاتے ہیں، مولانا کو سفر روم میں جہاز پر یہ موقع پیش آیا تو لکھتے ہیں:- "چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہی کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے جاتے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہی، میں نے دو تین روز تک پرند کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا، مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا، میں نے کہا ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے، بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے، چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور

---

[1] شبل کے معنی بچۂ شیر کے ہیں، اس کا ترجمہ الاسدی، اور نعمانی امام اعظم کی طرف نسبت تھی تو اس کو اعظمی کر دیا،

اس کی تصدیق کی، ذبح کرنے والا عیسائی تھا وہ ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا، صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا، اگرچہ حنفیوں کے یہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا تھا، جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے" (سفرنامہ ص۱۵)

ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے، فرمایا اس لئے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے، آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں، مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہے، اور آپ شریک نہیں ہوتے، وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے، انھیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں، اور آپ دو نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوٰتین) پڑھتے ہیں،

ایک بات سے دوسری بات پیدا ہوتی چلی گئی، سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی، جو اس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے، اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا، اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہدیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے، مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا،

سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے، اور اس لئے قبولیت کے لئے دعا مانگنے کو

فعل عبث قرار دیتے تھے، اس مسئلہ پر تہذیب الاخلاق میں اُن کے مضامین، اوران کے اور نواب محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے، اسی زمانہ میں علی گڈھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڈہ میں پوسٹ ماسٹر تھے، انھوں نے سرسید کے مضمون "الدعاو الاستجابۃ" کی تردید میں ایک دلنشین رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا، اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس پر افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں، اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہے، اُس کی حمایت کو کھڑا ہو، اس رسالہ کی قوتِ استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں، اور اس شبہہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اعظم گڈہ میں لکھا گیا، جو مولانا کا وطن تھا، اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شناسا بھی تھے[1]

ان واقعات کے ساتھ الفاروق کی تصنیف میں جو اختلافِ رائے پیدا تھا، وہ بھی سننے کے لائق ہے، ایک کے نزدیک حضرت عمر فاروقؓ صرف رسولؐ کی حکومت و سلطنت کے نمایندہ تھے اور دوسرے کے نزدیک وہ ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کے مصداق تھے، اس سلسلہ میں سرسید نے خلفاے راشدینؓ کی نسبت اپنے نجی خط اور اخباری مضمون میں جو رائے ظاہر کی، مولانا جیسے شیفتۂ اصحابؓ رسولؐ کے لئے اس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا، اسی لئے انھوں

---

[1] یہ دونوں روایتیں مولوی اقبال احمد خان سہیل ایم اے (علیگ) کی تحریر مندرجۂ الاصلاح سرائمیر سے لی گئی ہیں، جو برسوں علیگڈہ میں رہ چکے ہیں، اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین دونوں کے شاگرد تھے، اور مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کئی سال رہے تھے،

نے الفاروق پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض و اختلاف اور ناراضی کی کوئی پروا نہ کی،

مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں[1]، اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے،

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا، کہ "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں، یہانتک کہ صحابہؓ کی صف سے جا کر مل جائیں"

سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا، کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستہ سے پیچھے ہٹا دینگی جس پر وہ لیجانا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے سخت مضمون لکھا،

سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور و طریق اور وضع و قطع اختیار کریں تاکہ اُن میں حاکمانہ روح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت اُن کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا، دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی ہی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے، تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور و طریق کی نقالی میں اُن کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے، اور وہ تعلیم جو قوم کی

---

[1] یہ تصریح سرسید کی تحریروں میں ہے،

دولتمندی کی خاطر اُن کو دی گئی تھی وہ اس نقالی کی بدولت تنگدستی کا ذریعہ بنگئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد و اعانت کے قابل نہ رہے، اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے،

مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمامتر مخالف تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "افسوس ہو کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہو میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے" (مسعود۔ ۳۳)

یہ مولانا کے اخیر خطوں میں سے ہو، جس کے بارہ تیرہ دن کے بعد انھوں نے وفات پائی،

یہی سبب ہے کہ سرسید کی وفات پر اُن کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین لکھا جانا طے ہوا، اور اس سلسلہ میں سرسید اور مذہب کا عنوان مولانا شبلی کے لئے تجویز ہوا، تو انھوں نے اس سے انکار کیا، آخر لوگوں کے اصرار[1] سے مجبور ہو کر سرسید اور اردو لٹریچر" کا دوسرا عنوان لیا، اور پہلے عنوان پر مولانا حالی نے لکھا، یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڈھ میگزین کے مئی ۱۸۹۸ء کے نمبر میں شائع ہوئے ہیں، مولانا حالی کا یہ مضمون غالباً حیات جاوید کے مباحث کا خلاصہ ہے جس کو وہ اس وقت لکھ رہے تھے،

خود سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا تھا، اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے[2]، وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں کیونکہ وہ پاس رہتے تھے، مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے، چنانچہ اس بارہ میں جتنی بالواسطہ

---

[1] اس اصرار کی یہ تصریح مولانا نے خود اس مضمون کے اخیر میں کی ہو [2] حیات جاوید میں مولانا حالی نے بھی اُنکی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہو، دیباچہ صفحہ ۱۲ کانپور،

تحریکیں کی گئیں، ان کو مولنا بلطائف الحیل ٹالتے گئے، اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی (علی گڈہ) کا ایک خط مکہ معظمہ سے آیا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی صاحب آپ کی لائف لکھ رہے ہیں، مولانا کو یہ خط دکھایا گیا، مگر اس "مقدس خواب" کی تعبیر بھی صحیح نہیں نکلی، اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے، مولانا اس کو بجنسہٖ لکھتے رہے[1]، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ قرعۂ فال مولنا حالی مرحوم کے نام نکلا، اور انھوں نے ۱۸۹۳ء سے اسکو انجام دینا شروع کر دیا،

عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے، جس میں دونوں کو اختلاف تھا، سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں ہر ایسی تعلیم کے شیوع کو جو ان کو ادھر سے ہٹائے مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے، اسی لئے پنجاب میں ۱۸۸۱ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام بن رہا تھا انھوں نے اس کی اتنی مخالفت کی کہ اس کے پرزے اڑ گئے، اسی طرح ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی امتحانات کے اجرا پر ایسی ہی مخالفت کی، چنانچہ ایک زمانہ میں دیسی زبان میں تعلیم کی تحریک کر چکنے کے بعد وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے، کہ اس سے بھی ان کے خیال میں انگریزی کی تعلیم کو نقصان پہنچتا، بہر حال ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لئے دلچسپی نہ تھی، کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے،

مولنا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے جن کی ترقی کے لئے یہ جدوجہد ہو رہی ہے، سفرنامہ میں قدیم عربی تعلیم کی ابتری اور اس کی

---

[1] یہ واقعہ اقبال صاحب سہیل نے مولانا سے سُنا تھا،

ترقی و اصلاح کے سلسلہ میں مولانا ۱۸۹۲ء میں بے قابو ہو کر لکھتے ہیں :- "یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے، اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں[1]، وہ درحقیقت رنج نہیں، بلکہ استہزاء اور شماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں، اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی "قومیت"[1] قائم رکھنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے" (سفرنامہ ص)

۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا، تو وہ مولانا کی عین تمنا کے مطابق تھا، اس لئے انھوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا، بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا، کالج میں مولانا کی زندگی کا یہ رخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، شاید ۱۸۹۶ء میں جب مولانا کو حیدر آباد میں وظیفہ ملا ہے، تو فطرۃً ان کو خوشی ہوئی، کہ اب وہ کالج کے حلقہ سے آزاد ہو کر اپنے مذاق کا کام کریں گے، اسی جذبہ میں انھوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ ادب، طلب اور ردیف است تھی، اُس میں ایک مصرع یہ تھا:-

زیں بیش ندوہ و تدریسِ علومِ عرب است

یہ قصیدہ کالج کے احاطہ میں قابلِ اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے مولانا نے اسکو ضایع کر دیا[2]

[1] سرسید کی نئی تحریک میں قومیت نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اس لئے یہی الفاظ قابلِ ... ہیں"

[2] سرسید نے ۱۸۸۷ء میں اپنی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اوقاف کی آمدنی سے عربی تعلیم کے قیام کی تجویز منظور کی تھی [3] یہ پورا واقعہ و مصرعہ مولانا کی زندگی ہی میں مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم وکیل ندوۃ العلماء کی زبانی میں نے سنا تھا، مرحوم بڑے مخلص اور عملی کارکن اور خوش تقریر اور پرجوش مقرر تھے، انھوں نے اپنی جوانی میں ترک دنیا اور فقر اختیار کر لیا تھا، گرما کپڑے پہنتے تھے جنگل میں رہتے تھے اور جنگل کی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے ندوہ کا شور و غل سنکر اسکے بریلی کے جلسہ میں شریک ہوئے اور ایسے متاثر ہوئے کہ جوگ چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اور آخر ساری عمر ندوہ کی خدمت میں بسر کر دی ۱۹۳۴ء میں تھانہ میں وفات پائی، اس واقعہ کی دوسری روایت مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور سے سنی، جو اسی کی تائید میں تھی، ۱۲

اختلافات کے قصیدہ کا آخری بند سیاسی اختلاف ہی سر سیّد وہ سر سیّد جنھوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھا جو آگرہ کی نمائش میں ہندوستانیوں کی عزت کے لئے انگریزوں سے لڑ گئے، جنھوں نے متعدد دفعہ گورنمنٹ کی تجویزوں کی شدید سے شدید مخالفت کی، ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا وجود ہوا تو وہ اس کے سخت مخالف بن گئے، اور ایک سال بعد اپنی تعلیمی کانگریس قائم کی، جس کے دوسرے سالانہ اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۸۸۷ء میں اس کی مخالفت میں نہایت پُر جوش تقریر کی، اور آخر ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے مقابلہ کے لئے ایک پیٹریاٹک ایسوسی ایشن الگ بنائی جس میں تمام رئیسوں تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر کانگریس کے مقابلہ کے لئے ایک محاذ جنگ قائم کیا، پھر ۱۸۹۳ء میں مسٹر بک کیساتھ مل کر محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔

مولانا شبلی مرحوم شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر یا فطرۃً جمہوریت پسند تھے اور سر سیّد شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے، حالانکہ دوسری طرف وہ اپنے کو مذہبًا مسلمان اور نسلاً عرب ہونے کی بنا پر ریڈیکل کہتے تھے، کہیں آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، کہ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں ایک دفعہ شخصی اور جمہوری طرز سلطنت پر مباحثہ تھا، مولانا نے جمہوری طرز سلطنت کی تائید کی، اور اس پر خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے واقعات اور اصول انتخاب سے استدلال کیا تھا، یہ تقریر نہایت کامیاب ہوئی اور طلبہ مولانا کے زور بیان سے بہت متاثر ہوئے، حاضرین میں سر سید مرحوم بھی تھے، انھوں نے اسکی مخالفت کی، اور اس پر طبیعت سیر نہیں ہوئی تو مولانا کے دلائل کے رد میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۸ جون ۱۸۹۲ء کے پرچہ میں "ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت" کے عنوان سے مولانا کے سفر ترکی کے لئے روانہ

ہو جانے کے بعد چھپا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل ۱۸۹۲ء سے پہلے اُسی کے کسی قریب زمانہ میں کی ہوگی،

اس واقعہ سے دونوں کی طبیعتوں کا سیاسی اختلافِ مذاق معلوم ہوتا ہے، اسی لئے مولانا سرسید کی اُن کوششوں کو جو وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت میں کر رہے تھے پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں دونوں کی راہیں بالکل الگ رہیں، اور اگرچہ مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچہ میں قدم نہیں رکھا، مگر اخیر تک اُن کی سیاسی رائے یہی رہی،

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جو لڑائی ہوئی، اور اس میں ترکوں کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتحِ عظیم ہوئی، اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پُرجوش بنا دیا تھا، سارے ہندوستان میں اس کی خوشی منائی گئی، اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سرسید کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، اور اس جوش و مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضمون لکھے[1]، جو اتحاد اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح آکر لگے، اور انھوں نے سرسید کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کئے،

سرسید کے حلقہ میں رہ کر اتنا بڑا اختلاف کوئی معمولی جرم نہ تھا، جس کو سرسید تو بخش بھی سکتے تھے، مگر اُن کے بعض حامیوں نے اس کو کبھی نہیں بخشا، چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر جو اس زمانہ میں سرسید کی مخالفت سے تائب ہو کر اُن کے نہ صرف بڑے حامی بن چکے تھے،

[1] سرسید کے آخری مضامین" میں "یونان اور ترک" اور "سلطان اور ہندوستان کے مسلمان" کے عنوان سے یہ مضمون پڑھیے،

بلکہ وہ ان کو "مجتہدِ اعظم" ماننے لگے تھے، اور اسی لئے وہ مولانا شبلی سے ناراض رہنے لگے تھے، اور اپنے اخبار میں اُن سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس مجتہد اعظم پر ایمان لائیں، اور اسی لئے وہ ندوہ اور عربی تعلیم کے سخت مخالف ہو رہے تھے[1]، اور کانگریس سے بھی ان کو اُس زمانہ میں اسی لئے شدید اختلاف تھا، مولانا کا خیال تھا کہ سرسید کی سیاسی رائے میں جو انقلاب ہوا، وہ ان کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ کالج کے پرنسپل مسٹر بک نے اپنی زبردست شاطرانہ چال سے سرسید کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں کی دوستی ہی میں دراصل کالج کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہے، اور وہ اس کے اس سحر میں ایسے مسحور ہو گئے تھے کہ اس کے بعد اُن کی اپنی رائے فنا ہو گئی تھی، اور اب وہ جو کچھ دیکھتے تھے، مسٹر بک اور انگریز اسٹاف کی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور جو کچھ سنتے تھے وہ ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے، مولانا نے اپنے مشہور مضمون "پولیٹیکل کروٹ" میں اس تفصیل کو کس قدر دیبانہ معجزانہ ایجاز میں ادا کیا ہے، "وہ پُرزور دستِ قلم جس نے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھا تھا، اور اس وقت لکھا تھا، جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں، اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا، وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا، کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا "میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور سے فخر کر سکتے ہیں، اور یہ صرف انہی کی بدولت ہے کہ علم اور آزادی اور

[1] مثال کے طور پر مقالات شبلی جلد ہشتم میں ندوہ اور البشیر کا مضمون پڑھئے،

حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی، میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں" (دیکھو تقریر پریسیڈنٹ مسلم لیگ بمقام ناگپور)

حالات اور گرد وپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے"

اس کے بعد مولانا نے اس مضمون میں سرسید کی لکھنؤ والی اس مشہور سیاسی تقریر کی ہر دلیل کا جواب دیا ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اسی تقریر کا اثر تھا، کہ مسلمان کانگریس سے باز رہے، اور جس کو ایک خاص حلقہ میں اتنا پسند کیا گیا کہ مسٹر بک نے پوری تقریر کو تار پر ولایت بھجوایا،

سرسید نے یہ تقریر ۱۸۸۷ء میں کی تھی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا ان کی اس سیاسی پالیسی کو ابتدا ہی سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، اور ان کی رائے تھی کہ علی گڈھ کالج کو مسٹر بک کے ہاتھوں غلط نصب العین کے قالب[1] میں ڈھالا جا رہا ہے،

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک صاحب کو اپنے حالات و سوانح کے استفسار میں لکھا تھا، لکھتے ہیں: "رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا، اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں[2]"

یہ اختلاف بھی کالج سے مولانا کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ

---

[1] یہ مسٹر بک کی طرف اشارہ ہے [2] یہ پوری تفصیل مضمون "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" میں ملاحظہ فرمائیے جسکو مولانا نے ۱۹۱۱ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے موقع پر لکھا تھا [3] معارف اعظم گڈھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۹۲،

(مولانا شروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست، ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے پرانے حامی، اور اس کی جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں، مولانا کے اوراقِ حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں، اپنے قلم سے یہ ارقام فرمایا: "دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آرار کا اختلاف بھی تھا، مولوی شبلی صاحب اب جدید سیاسی تحریک کے حامی ہو چکے تھے۔"

اسی سلسلہ کی ایک نئی کڑی ندوۃ العلماء کی شرکت کا سبب بنگئی، یہ مجلس اس زور شور سے اٹھی تھی کہ حکام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائیگی، بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر لفٹنٹ گورنر تک پہنچایا، اور لفٹنٹ گورنر نے بھی مولانا کا علی گڈہ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔[1]

ندوۃ العلماء

یعنی

علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت

دلی کا خانوادہ دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی کے مطلع سے اسلام کا تک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ تھا، سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو ملا اور جو کچھ ملا اسی دروازہ سے ملا، ہندوستان میں ردِ بدعات کا ولولہ، ترجمۂ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسمٰعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبۂ جہاد

---

[1] مکاتیب شبلی بنام مولانا شروانی (۱۲)

فرقِ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہیں،

مولوی بزرگ علی مارہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ میں ایک مولوی بزرگ علی صاحب پیدا ہوئے، جوانی میں تحصیلِ علم کی، اور آخر دہلی جا کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی درسگاہوں سے بہ رہا تھا، اُس زمانہ کے علماء کے دستور کے مطابق چندروز آگرہ اور کلکتہ میں درس دینے کے بعد علی گڈھ میں جس کا پرانا نام کول تھا انگریزی حکومت میں بادلِ ناخواستہ منصفی کا عہدہ قبول کیا، مگر اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور اسی سلسلہ میں وہاں کی جامع مسجد میں بانیِ مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کو دوبارہ زندہ کیا، اور کچھ دنوں کے بعد منصفی کے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس زمانہ میں اُن علماء کا جو انگریزی تسلّط سے پیچ و تاب میں تھے ٹونک مرکز بن رہا تھا، مولانا اسمٰعیل شہید کے پراگندہ قافلہ کے مسافر بھی یہیں پناہ گزیں تھے، بہرحال نواب وزیر الدولہ مرحوم والیِ ٹونک کے اصرار پر ریاست میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا، اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی،

اُس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پاکر عیسائی حاکموں اور پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنالیں گے، علمائے اسلام اس کے مقابلہ کے لئے اٹھے، ان میں سے کئی بزرگوں کے مبارک ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہے، اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی ہیں، ردِّ نصاریٰ میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے بشارات کا قلمی نسخہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہے،

مفتی عنایت احمد مولانا بزرگ علی کے آغوش میں جو ہونہار پل کر بڑھے، ان میں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادت مند مفتی عنایت احمد صاحب تھے، مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علما سے پڑھ کر دلی گئے، اور شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا، اور وہاں سے آکر علی گڈہ کول میں مولوی بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی، اور وہیں مدرس ہوگئے، ایک سال کے بعد وہ وہیں مفتی اور منصف مقرر ہوئے، یہاں پلکھنہ ضلع علی گڈہ ایک قریہ سے ایک صاحبزادہ آکر درس میں داخل ہوئے، جن کو آگے چل کر دنیا نے استاذ العلما مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا، مفتی عنایت احمد صاحب بدل کر بریلی پہنچے تھے، کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا، اس ہنگامہ کی پاداش میں بالزام بغاوت جن علمائے اعلام کو قید جلاوطنی کی سزا دی گئی، اُن میں ایک یہ بھی تھے، چنانچہ نظر بند کرکے جزیرہ انڈمان بھیجدیئے گئے، مگر کیا عجیب بات ہو کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح بہتا رہا، چنانچہ وہاں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے صرف میں علم الصیغہ، اور سیرت میں تواریخ حبیب اللہ اور جغرافیہ میں ترجمۂ تقویم البلدان مشہور ہیں، آخر یہی تصنیفات رہائی کا ذریعہ بنیں، اور ۱۲۷۷ھ میں رہا ہوکر ہندوستان آئے، اور پھر چشمۂ فیض اُسی طرح جاری تھا،

کانپور میں علم اُس زمانہ میں کان پور نیا نیا آباد تھا، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں گنگا کے کنارے یہ انگریزی فوج کا کیمپ تھا، کیمپ کے تعلق سے تاجر اور سوداگر آکر آباد ہوئے، کیمپ سے کمپو ہوا، اور کمپو سے کان پور، مسلمانوں کی اس تبہ حالی میں کانپور کے مسلمان سوداگروں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، جنھوں نے اپنی بابرکت اور نیک کمائیوں کو دین کی نصرت میں لگایا، مفتی عنایت احمد صاحب نے کان پور میں مستقل قیام فرمایا، اور اسی سال ۱۲۷۷ھ میں مدرسۂ فیض عام جاری کیا،

دو برس کے بعد اپنی جگہ اپنے دو شاگردوں کو جن میں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے، جانشین بنا کر حج کو روانہ ہوئے، جہاز جدّہ کے قریب پہنچکر ایک پہاڑ سے ٹکرایا اور ڈوب گیا مفتی صاحب بحالتِ نماز و احرام غرق و شہید ہوئے، شاگردوں نے مدرسہ کے کام کو سنبھالا، اور مدرسہ کو بڑی رونق دی، اسی مدرسہ کا فیض تھا جو با لآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں نمایاں ہوا،

مفتی لطف اللہ صاحب | مفتی لطف اللہ صاحب، برس کانپور میں رہنے کے بعد علی گڈھ واپس آئے، اور یہاں سے اس مدرسہ میں جس کو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب نے زندہ کیا تھا، مدرس ہوئے، علی گڈھ میں درس کا فیض ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) تک ستائیس برس مسلسل جاری رہا، ہر سمت سے علم و فن کے طلبگاروں کے قافلے علی گڈھ کا رُخ کر رہے تھے، ستائیس برس کی مدت میں سیکڑوں عالم اس درسگاہ سے اٹھے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے، اس عہد کا مشکل سے کوئی نامور عالم ہوگا جس کی دستارِ کمال کا طرۂ امتیاز اس باکمال کا تلمذ نہ ہو، جن اکابر کے نام معلوم ہیں، ان میں سے چند کے نام ملاحظہ طلب ہیں، مولوی عبد الغنی صاحب (استاذ اوّل مولانا شروانی) مولوی احمد حسن صاحب کانپوری، مولوی سید محمد علی (ناظم اوّل ندوۃ العلماء) مولوی مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبد الحق صاحب حقانی مفسر تفسیر حقانی دہلی، مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، وقار نواز جنگ مولوی وحید الزمان خاں، مولوی فضل حق صاحب رامپوری، مولوی مفتی عبد اللطیف (استاذ جامعہ عثمانیہ) مولوی نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور، مولوی ماجد علی صاحب جونپوری (مشہور مدرس) مولوی پیر مہر علی صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، قاضی سعد الدین صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمان

صاحب ولایتی، مولوی لطف الرحمان صاحب بردوانی، اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں وغیرہ سیکڑوں ارباب کمال ہیں،

حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کی دو اور خصوصیتیں قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی، دوسری یہ کہ کانپور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حرف شناس ہو گئے تھے کہ تار وار پڑھ لیتے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ دار العلوم ندوہ جو بننے والا تھا اس کی صورت مثالی پہلے ہی ذات گرامی میں جمع تھی،

مولانا شاہ فضل رحماں صاحب | اس سلسلہ کا رابطۂ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا جس کا نام نامی حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا (گنج مرادآباد کانپور کے پاس ایک قصبہ ہے) یہ فیض بھی دہلی کے اسی خانوادہ سے آیا تھا، شاہ عبد العزیز صاحب اور شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے شرف تلمذ اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب مجددی سے شرف بیعت حاصل تھا، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہ ذات گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی، سنت سنیہ، فقر و غنا، نور و معرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہو گئی تھیں، مفتی صاحب کے اکثر تلامذہ گنج مرادآباد کے فیض ارادت سے سرفراز تھے،

مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے **ندوۃ العلماء** کا آفتاب طلوع ہوا،

انقلاب و حوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے، اُن سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مدارس اور مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا، مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے،

ان کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے، عام علما زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے، اور خواص تقلید و عدم تقلید، قراءتِ فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی بڑی مہریں ہو رہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہو رہا تھا،

فیض عام کا فیض یہ صورتِ حال تھی کہ حسنِ اتفاق سے اُس خوش قسمت مدرسۂ فیض عام کانپور کی چٹائی پر مدرسۂ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوسِ قدسیہ اس صورتِ حال پر غور فرما رہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا، اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے اُن کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالانکہ اُن میں سے بعض کا اس وقت عنفوانِ شباب تھا،

۱۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی،

۲۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی،

۳۔ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدرس مدرسۂ جامع العلوم کانپور،

۴۔ مولانا محمد خلیل احمد صاحب مدرس دوم مدرسہ دیوبند، بعدہٗ مدرس اعلیٰ مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور

۵۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (جو اسی سال مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے)

۶- مولانا نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتحپور (بڑے متقی اور صاحبِ کمال بزرگ تھے، میں نے زیارت کی تھی)

۷- مولانا احمد حسن کانپوری مدرس اول مدرسۂ فیض عام کانپور، (محشی مثنوی مولانا رومؒ)

۸- مولانا سید محمد علی صاحب (ناظم اول ندوۃ العلما)

۹- مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسۂ دیوبند (شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ)

۱۰- مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی،

۱۱- مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام صاحب فتحپوری (نہایت متقی و دیندار، ان کی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئیں)

۱۲- مولانا عبد الغنی خاں صاحب، مرشد آبادی،

۱۳- مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی،

۱۴- مولانا سید شاہ حافظ تجمل حسین صاحب دیسنوی (خلیفۂ حضرت شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، میرے رشتہ کے چچا تھے، ندوہ میں تعلیم کے لئے میرا آنا ان ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا)

یہ اسلامی ہندوستان کے گذشتہ دور کے وہ نامِ نامی ہیں جن پر اس دور کو پورا فخر و ناز ہے، اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کی جائے، اور آیندہ سال مدرسۂ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علما کو اس کے لئے عام دعوت دی جائے اس مجلس کا نام ندوۃ العلما قرار پایا، اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعہ سے آیندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، اور ایک صاحب اس غرض سے مقرر کئے گئے کہ وہ تمام ہندوستان کا معائنہ کرکے اگلے جلسہ

میں اپنی رپورٹ پیش کریں، مولنٰنا سید محمد علی صاحب جو مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد رشید اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب کے مرید وخلیفہ، ردِّ نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنّف اور ردِّ نصاریٰ میں "تحفۂ محمدیّہ"[1] نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے،

ندوۃ العلماء عام ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے آیندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی، علماء ہر طرف سے آ آکر شریک ہونے لگے، اس صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں ایک نام اس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم وشام ومصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور اس کے دل میں رہ رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بیخبری کا درد اٹھتا تھا جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا،

ندوہ کا پہلا اجلاس ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوّال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں اسی کانپور میں اور اسی مدرسۂ فیض عام میں ہوا، پہلے دن ۱۵ شوّال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۹۴ء کو صبح کے وقت مدرسہ کے چودہ فارغ التحصیل طالبعلموں کی دستار بندی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس جلسہ کے صدر ہوئے، صدارت کی تحریک مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات محمڈن کالج علی گڈھ (داماد مولانا محمد قاسم صاحب بانیِ مدرسہ دیوبند) اور تائید مولانا شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی نے فرمائی، مولوی بشیر الدین اڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ نے (جو ان دنوں سرسید کے مخالفوں میں تھے اور اب "البشیر" کے اڈیٹر ہیں)

---

[1] اس رسالہ کے اڈیٹر میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد حسین صاحب استھانوی تھو عزیزی مولوی سید محمد ہاشم صاحب ندوی کے پدر بزرگوار، مجھ کو بھی اپنے ساتھ دار العلوم لائے تھے،

مدرسہ کی سالانہ کارروائی پڑھ کر سنائی، اس کے بعد مولٰنا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے سورۂ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا،

ندوۃ العلماء | ندوۃ العلماء کا اجلاس اُسی دن ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہوا شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک کی، اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے تائید کی، اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان ایک معتبر و ثقہ شریکِ مجلس کی زبان سے سنئے :- "شوال ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علماء شریکِ جلسہ تھے، علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علماء بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسیٔ صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی . . . . اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا اس میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن کی بڑے شاندار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی۔" (استاذ العلماء، صـ۲۱ و ۴۳ از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، یہ تقریر آج بھی اسی طرح حقائق سے لبریز اور صورتِ حال کے لحاظ سے تازہ ہے، بعد ازیں مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا، مگر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تحریک سے یہ دستور العمل علماء کی ایک مجلس کے سپرد

ہوا عصر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا،

دوسرے دن ۱۶ شوال کی صبح کو مولانا شبلی صاحب کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری (راقم کی آنکھیں رامپور کے اتفاقی سفر میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوئیں، اُس وقت موصوف کے ہاتھ میں دیوان علی کا قلمی نسخہ تھا، اور وہ اس کو صاف کر رہے تھے) صدر نشین ہوے، سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک پُرزور تقریر کی، پھر مولانا ابراہیم صاحب آروی نے دلپذیر وعظ فرمایا،

۱۷ شوال کی رات کو مغرب کے بعد دستور العمل پر غور کرنے کے لئے جلسۂ خاص ہوا، اس جلسہ میں تیس جید علماء شریک تھے، کچھ اور اہل الراے معززین بھی تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب ایک ایک دفعہ پڑھکر سناتے تھے، اور بعد غور و بحث کے وہ منظور ہوتی تھی، اس طرح تمام دستور العمل منظور ہوا جو درج رو داد ہے،

تیسرا جلسہ ۱۷ شوال مطابق ۲۴ اپریل کی صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش اور اُن پر غور و بحث ہونا قرار پایا ہے،

پہلی تجویز، موجودہ طریقۂ تعلیم قابلِ اصلاح ہی،

دوسری تجویز، اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارسِ اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں،

تیسری تجویز اس امر میں سعی کیجائے کہ مدارسِ اسلامیہ جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں اُن کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسۂ دیوبند، مدرسۂ فیض عام کانپور، مدرسۂ احمدیہ آرہ[1] وغیرہ بہ طور دارالعلوم کے قرار دیئے جائیں، اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں، اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کارروائی ان دارالعلوموں کی نگرانی میں رہے،

[1] ہندوستان میں اہل حدیث کے نام سے تحریک مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور اُن کے شاگردوں کے ذریعہ شروع ہوئی، اس تحریک کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طبیعتوں کا جمود دور ہوا، اور جب ایک بند ٹوٹا تو اجتہاد کے دوسرے دروازے بھی کھلے، مولوی نذیر حسین کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم صاحب آروی خاص حیثیت رکھتے تھے، وہ نہایت خوشگو اور پُر درد واعظ تھے، وعظ کہتے تو خود روتے اور دوسروں کو رُلاتے، نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے، چنانچہ نئے طرز پر انجمن علما، اور عربی مدرسہ اور اس میں دارالاقامہ کی بنیاد کا خیال ان ہی کے دل میں آیا، اور ان ہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسۂ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم کیا، اور اس کے لئے جلسۂ مذاکرۂ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بہ سال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا، اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، ندوہ کے قیام کے بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ سے باہر دربھنگہ میں ہوا، اور وہاں بحث پیش آئی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ بہرحال وہ قائم رہا اور مدتوں خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا (۱۹۰۰ء میں میرے والد مرحوم مجھ کو اسی مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے مگر تقدیر کچھ اور تھی، یہ تجویز عمل میں نہ آئی) مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری المتوفی ۱۳۳۷ھ سالہا سال تک اس میں پڑھاتے رہے، مولانا عبد السلام صاحب مبارکپوری، مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری اور ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری اور بہت سے علما یہاں کے شاگرد ہیں، حافظ صاحب کے بعد مدرسہ پر زوال آیا، ابھی چند سال ہوتے ہیں کہ یہ مدرسہ آرہ سے دربھنگہ منتقل ہو گیا، اور مدرسۂ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے، مولانا ابراہیم صاحب نے سفر حجاز میں ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا،

مولانا شبلی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دفعہ مولوی ابراہیم صاحب نے اپنا مدرسہ اور خاص طور پر اپنا بورڈنگ دکھایا میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی علی گڈھ آئیے اور کالج اور اس کا بورڈنگ دیکھئے تاکہ خیال کی بلندی اور سلیقہ کی ستھرائی معلوم ہو، بہرحال عربی مدرسوں کی یہ نئی ہیئت ان ہی سے شروع ہوئی،

۱۷

چوتھی تجویز۔ مدرسۂ فیض عام[ل] کانپور چونکہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبہ کا مدرسہ ہے اور یہ تعداد کثیر عربی پڑھنے والے طلبہ اس میں موجود ہیں لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے بلکہ ان کی آسایش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہو سکتا، لہٰذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بلحاظ محبت وہمدردی ضرور ہے کہ مدرسۂ فیض عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دو سو پردیسی طلبہ رہ سکیں حسب حیثیت چندہ دیں اور مستحق ثواب ہوں،

غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں، اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج اسی وادیِ تیہ میں حیران و سرگرداں ہیں، مدرسۂ فیض عام کی جگہ مدرسۂ دار العلوم ندوہ رکھ لیجئے، صورتِ حال کیا بعینہٖ وہی نہیں،

اس کے بعد پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے پیش کی، موصوف نے اپنے رنگ میں اصلاحِ نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے کھڑے ہو کر اس تجویز کی تائید پر ایک عالمانہ بحث فرمائی، اور دکھایا کہ اسلام میں آغازِ تعلیم سے طریقۂ تعلیم کیا رہا، نصاب کیونکر بدلتا رہا، علوم معقولات کا رواج کیسے ہوا، درسِ نظامیہ کی بنیاد کیونکر پڑی، اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقائص ہیں، مثلاً معقولات کی کتابیں اس میں ضرورت سے زیادہ ہیں، منطق کی کتابوں میں متاخرین نے الٰہیات کے مسئلے مخلوط کر دیئے ہیں،

ل مدرسۂ فیض عام سے کچھ دنوں کے بعد مولانا احمد حسن صاحب نے الگ ہو کر مدرسہ جامع العلوم قائم کیا تو مدرسہ کی حالت گر گئی، مدرسہ اب بھی کسی نہ کسی حال میں ہے، اب وہ انگریزی کا اسکول ہے اور اس میں عربی کے کچھ درجے ہیں

منطق کی تعلیم کو اس سے پاک رکھنا چاہئے، کتاب کے لفظوں کی نہیں فن کی تعلیم ہونی چاہئے، ادب کی کتابیں پڑھائی جائیں، قرآن پاک اور علوم قرآن کی کتابیں داخل کی جائیں، اور طریق تعلیم میں اصلاح کی جائے،

اس تجویز کے بعد اسی سے متعلق مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنا مضمون پڑھ کر سُنایا جو شاید مولانا شروانی کی پہلی تقریر ہو، مگر اس میں وہی متانت، وہی زورِ انشا، اور وہی جدید وقدیم معلومات کا خوبصورت میل موجود ہے، جو آج بھی اُن کی تحریر کی خصوصیات ہیں،

یہ تینوں تقریریں اس سال کی رووداد میں موجود ہیں، اور پڑھنے کے قابل ہیں،

اس کے بعد بارہ علما کی ایک مجلس ترتیبِ نصاب کے لئے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے، اور مولانا نے دار العلوم کے نصاب کے بجائے دار العلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا، جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے، یہ رسالے آج بھی مل سکتے ہیں،

تیسری تجویز منظور ہوجانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ جو دستور العمل منظور ہوا ہے اس کی دفعہ ۱۱ کے مطابق اس کے جلسۂ انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب ہونا چاہئے، چنانچہ سولہ ارکان کے نام تحریک وتائید سے چُنے گئے، اور ندوۃ العلماء کا کالبد قانونی شکل میں جلوہ گر ہوگیا، اور مولانا نے ندوہ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اور ندوہ کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا،

ندوہ کا دوسرا اجلاس ندوہ کا دوسرا اجلاس جناب منشی اطہر علی[1] صاحب رئیس کاکوری وکیل لکھنؤ و مشیر

---

[1] جناب منشی محمد اطہر علی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے ارکان جن میں سب سے ممتاز منشی محمد احتشام علی

قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ کی کوششوں سے شوال ۱۳۱۲ھ مطابق اپریل ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اس اجلاس میں بھی شرکت کی، اور پہلے روز ناظم کی طرف سے ندوہ کی سالانہ روداد پڑھکر سنائی، اس کے بعد علماء کے فرائض پر ایک مبسوط تقریر فرمائی، جس میں اُن کے علمی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی فرائض سے اُن کو آگاہ کیا ہے، یہ تقریر مضامینِ اربعہ کے عنوان سے ندوہ کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ چکی ہے، یہ تقریر ایسی ہے کہ آج بھی علماء کی جماعت کے سامنے اس کے پیش کرنے کی ضرورت اسی طرح قائم ہے،

اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں اس تجویز پر بحث ہوئی کہ علومِ زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کیا، لیکن اس کے بعد مولوی منصور علی صاحب مرادآبادی نے جب یہ تجویز پیش کی کہ نصابِ درس میں علومِ جدیدہ کا اضافہ کیا جائے تو اختلاف ہوا، مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابراہیم صاحب آروی اور دوسرے اکثر علماء نے ان کے اضافہ کی تائید کی، اور مولانا فاروق صاحب اور دو اور علماء نے اس کی مخالفت کی لیکن اکثریت سے یہ تجویز منظور ہوگئی، کیا یہ عجیب اختلاف تھا کہ جس میں استاد اور شاگرد دونوں دو صف میں تھے، مدتِ تعلیم بالاتفاق دس برس قرار پائی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) صاحب رئیس کاکوری (خلف الصدق جناب منشی محمد امتیاز علی صاحب وزیر سابق بھوپال) ندوہ کے ہمیشہ سے حامی و مددگار رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان صاحبوں کو حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے نسبتِ ارادت تھی،

منشی محمد اطہر علی صاحب کے بڑے صاحبزادہ منشی محمد اظہر علی صاحب وکیل و ممبر کونسل زمانہ سے ندوہ کے ممبر ہیں، اور جناب منشی محمد احتشام علی صاحب کی دلچسپی بھی ندوہ کیساتھ اسی زمانہ سے شروع ہوئی جو اب تک بدستور قائم ہے،

۱۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کان پور میں مجلس نصاب کا جلسہ ہوا، جس میں مولنا فاروق صاحب چریا کوٹی مدرس مدرسۂ کان پور، مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رامپور، مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی، اور مولانا شبلی نعمانی نے شرکت کی، اور کئی روز کے بحث مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا، (ص۲۲ رو داد بانس بریلی)

تیسرا اجلاس | اسی سال شوال ۱۳۱۳ھ مطابق اپریل ۱۸۹۶ء میں بانس بریلی میں مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیۂ حیدرآباد دکن کی صدارت میں ندوہ کا تیسرا عظیم الشان اجلاس ہوا، مولنا نے اس کے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کے اجراء کی تجویز منظور ہوئی،

دوسرے دن ۲۷ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے عام اجلاس میں مولنا عبدالحق صاحب حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی، اور مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی، اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرماکر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، مولنا شاہ سلیمان صاحب اور دوسرے علماء نے بھی اس سے متعلق تقریریں کیں، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس (کمیٹی) قائم کی جائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کئے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے،

پٹنہ کو وفد | ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں ندوہ کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا شاہ سلیمان صاحب

پھلواروی، مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری، مولانا ابوالخیر صاحب غازی پوری اور مولانا شبلی صاحب نعمانی تھے، پٹنہ روانہ ہوا، اور مولانا حکیم عبدالباری صاحب کے مکان پر قیام ہوا، وفد کے ممبروں نے دو جلسوں میں دو تقریریں کیں، پہلا جلسہ مولانا شاہ رشید الحق صاحب کی خانقاہ عمادیہ میں شہر پٹنہ میں ہوا، اس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے مفصل اور مولانا شاہ امانت اللہ صاحب اور مولانا شبلی مرحوم نے مختصر تقریریں کیں، دوسرا جلسہ پٹنہ گورنمنٹ کالج بانکی پور میں ہوا جس میں تقریبًا چار ہزار مسلمان شریک تھے، اس میں دوسرے علماء کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت پر ایسی پُراثر اور مدلل تقریر فرمائی کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں میں اثر کر گئی، یہ وہ تقریر ہے جس سے علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان اسلام کی خدمت کے لئے باہمی اتحاد و معاونت کی راہ نکلی، اور جس کی ایک پُراثر تصویر ایک سحر نگار نقاش نے ان لفظوں میں کھینچی ہے: "علمائے ندوۃ العلماء نے شروع سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مانوس کرنے کی جو کوشش کی، اُس کا ظہور اس مقام پر ہوا، جو مسلمانوں کی روشن خیالی کا زبردست مرکز ہے، یعنی بانکی پور، گو میں خود حاضر نہ تھا، مگر میرے ایک نکتہ سنج محترم نے اُس موقع کا مرقع کھینچا تھا جب مولوی سید شرف الدین صاحب بالقابہ کے ڈرائنگ روم میں قدیم و جدید تعلیم کے قائم مقام اوّل مرتبہ ملے تھے، جاڑے کی شب تھی، علماء پہلے سے رونق افزا تھے، جب سیاہ اُودر کوٹوں سے ہال میں تاریکی پیدا ہوئی تو چونکہ ہمارے محترموں کی نگاہ کے سامنے اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا اس لئے کسی قدر منقبض ہوئے، مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا، ع

کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکی ست

[1] رودادِ ندوہ اجلاس میرٹھ ص ۳۵،
[2] مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی،

تاریک کوٹوں کے اندر عقیدتمندی اور نورِ خلوص سے روشن دل چھپے ہوئے تھے، اسی جلسہ میں اجلاس پٹنہ کی بنیاد پڑی، اس اجلاس نے خیالات قدیم و جدید کے دو دریا اسی طرح باہم ملتے دیکھے جس طرح گنگا اور سون کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے۔"

| چوتھا اجلاس | ندوہ کا چوتھا جلسہ شوال ۱۳۱۴ھ مطابق مارچ ۱۸۹۷ء میں میرٹھ میں ہوا، ۱۸ شوال مطابق ۲۰ مارچ کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے دار العلوم کی ضرورت اور مقصد پر ایک نہایت مبسوط اور اعلیٰ درجہ کی تقریر کی، جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش فی الحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھا جاتا تھا، اور ہر شخص جوش اور فرطِ انبساط سے محوِ حیرت ہو گیا تھا، مگر افسوس ہے کہ فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں کی تھی، اور بعد کو جو بھیجی وہ تلف[1] ہو گئی، |

۱۷ شوال کے جلسہ میں مولانا شبلی مرحوم نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی اس کوشش کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے نینی تال دو مہینے رہ کر اور حکام سے مل کر یہ تجویز منظور کرائی ہے، کہ ہفتہ میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لئے وقت دیا جائے، اس کا انتظام اور اس کی تعلیم کا نصاب مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے، اسی اجلاس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ایک یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان سے چند مستعد اور ذہین طلبہ کو ندوہ تکمیلِ علوم کی غرض سے مصر بھیجے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی، اور قوم سے اس کے لئے علٰحدہ چندہ کی تحریک کی جس میں ۵ روپے ماہوار ایک سو چالیس سالانہ، اور ایک ہزار دو سو روپیہ یکمشت وصول ہوئے،

| پانچواں اجلاس | ندوہ کا پانچواں اجلاس ۱۴-۱۵ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸-۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو |

---

[1] روداد میرٹھ ص ۵۰،

کان پور میں ہوا، اس کے صدر مولانا مسیح الزماں خان[1] رئیس شاہجہان پور استاد حضور نظام سابق ہوئے
اس کے پہلے اجلاس میں مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے یہ تحریک کی کہ ندوہ کا ایک وفد
لکھنؤ بھیجا جائے، جو وہاں جا کر دارالعلوم کے لئے کوئی مناسب زمین تجویز کر کے حاصل کرے، اور
بالفعل کام شروع کرنے کے لئے کوئی مکان پسند کرے، اس وفد کے لئے حسب ذیل حضرات کے
نام انتخاب کئے گئے، مولانا مسیح الزمان خان صاحب رئیس شاہجہان پور (استاد سابق حضور
نظام میر محبوب علی خاں) مولانا سید محمد [illegible] صاحب ناظم، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی،
مولوی حاجی یونس خاں صاحب رئیس وتاولی، مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری (خلف
مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری) مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ ندوہ
مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، اور
مولانا شبلی نعمانی،

دوسرے اجلاس میں مولانا شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازیپوری کی وفات پر افسوس
ظاہر کیا گیا، اس فرض کو مولانا شبلی مرحوم نے ادا کیا، فرمایا:- "مولنا میں ایسی بہت سی خصوصیتیں

---

[1] مولانا مسیح الزماں خاں صاحب اس زمانہ کے مشہور رئیس علماء میں تھے، حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے استاد اور اتالیق تھے، مولوی محمد زماں خان صاحب شہید کے بھائی اور سالار جنگ اول کے بڑے معتمد علیہ تھے، جس زمانہ میں نواب محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ حیدرآباد میں تھے مولنا ممدوح بھی تھے، اور اعلیحضرت پر بڑا اثر رکھتے تھے، آخر میں ریاست سے ان کا پنشن قرار منصب مقرر ہو گیا تھا، اور وہ اپنے وطن شاہجہان پور چلے آئے تھے، میں نے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، بالاقد، فربہ اندام، اور چہرہ پر رعب تھا، ان کے دیکھنے سے لوگوں پر اثر پڑتا تھا، ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں شاہجہاں پور میں وفات پائی،

تھیں، جن کی وجہ سے وہ تمام علمار کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے، وہ جس عظمت و شان خودداری اور پاس وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا جب وہ وعظ و تبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے، تو جس طرف اُن کا گذر ہوتا تھا ایک غلغلہ پڑ جاتا تھا، اور غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، وہ ندوۃ العلمار کے قوت بازو تھے، اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے"

اس تقریر کے یہ فقرے اس لئے میں نے نقل کئے ہیں، تاکہ اُس زمانہ کے باوضع علمار کی دنیاوی وجاہت کی بھی ایک تصویر آپ کو نظر آجائے،

اب وہ زمانہ آگیا ہے جب ندوۃ العلمار کے آوازہ نے گورنمنٹ کے کان کھڑے کردیئے ہیں، اور ارکان کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ صوبہ متحدہ کے نفٹنٹ گورنر صاحب سے مل کر اُن کے شکوک کو دور کیا جائے، چنانچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب وکیل و مشیر قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ نے آخر نومبر ۱۸۹۷ء میں الٰہ آباد جاکر نفٹنٹ گورنر سے ملاقات کی، اور ندوہ کی طرف سے ایک وفد کی حاضری کی درخواست پیش کی، لارڈ موصوف نے ایڈریس دیکھنے کے بعد وفد کی پذیرائی کا خیال ظاہر کیا، اس اجلاس میں منشی محمد اطہر علی صاحب نے اُس ایڈریس کا مسودہ پڑھ کر سنایا، اور مولانا شبلی صاحب کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ خان بہادر منشی محمد اطہر علی صاحب اور خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ واسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقہ داران اودھ اس کو لارڈ صاحب کی خدمت میں لے جاکر پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب کی تائید سے سب نے اس کو منظور کیا،

اس کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب نے یہ تحریک کی کہ مجوزہ دار العلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہوجانا چاہئے، منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید

کی، مولنا شبلی صاحب نے فرمایا کہ علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے
اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجۂ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکان
انتظامیہ ہوجائیں، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب صدر جلسہ نے تائید کی، چنانچہ حسب ذیل علماء
اور بعض ارکان نے اس کے لئے چندہ منظور کیا،

علماء

۱- مولوی مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور، ما/ ۸- مولوی مشتاق علی صاحب مدرس فیض آباد، عہ
۲- مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس تاؤلی، ما/ ۹- مولوی حکیم رونق علی صاحب ردولوی، عہ
۳- مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی، ماعہ ۱۰- مولوی محمد داؤد صاحب وکیل مرزاپور، عہ
۴- مولوی شبلی صاحب نعمانی، ما/ ۱۱- مولوی مفتی رحیم بخش صاحب مدرس امروہہ، عہ
۵- مولوی سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ، صہ/

رؤساء

۶- مولوی خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری، صہ/ ۲- خان بہادر منشی اطہر علی صاحب، ماصہ/
۷- مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازیپوری، صہ/ ۱۳- مولوی سید اشرف صاحب ماعہ
(خلف مولوی شاہ امانت اللہ صاحب) رئیس کان پور،

یہ فہرست دو غرض سے یہاں نقل کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ تک علماء میں کس قدر باحیثیت اصحاب موجود تھے، جو اس قسم کی تحریک کے لئے لبیک کو تیار تھے، اور آج ذی حیثیت لوگوں میں علم دین کی کتنی کمی آگئی ہے، دوسری غرض ان بزرگوں کے ناموں کو زندہ کرنا ہی جنھوں نے دارالعلوم کی اس عظیم الشان تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سب سے پہلے سبقت فرمائی جزاہم

اللہ تعالیٰ خیر الجزاء،

اس کے بعد پچھلے سال نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی کوشش سے انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی جو تجویز گورنمنٹ نے منظور کی تھی، اس کے بارہ میں مولٰنا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم، اور مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی نے تحریک کی کہ اس کام کو ندوہ اپنے ہاتھ میں لے منشی محمد اطہر علی صاحب نے تجویز پیش کی کہ ابھی صرف کان پور میں یہاں کے مسلمانوں کی کوشش سے اس قسم کا مقامی انتظام کیا جائے، اسی کی تائید مولوی شبلی صاحب نے فرمائی، اور کہا کہ میرا قیام اگر کانپور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور اس خدمت کو قبول کرتا، اس کے بعد مولوی عبداللطیف[1] صاحب مفتی دفتر ندوۃ العلماء سے فرمایا کہ آپ کسی قدر وقت

---

[1] مولوی مفتی عبداللطیف صاحب کا وطن سنبھل ضلع مرادآباد ہے، مولٰنا لطف اللہ صاحب کے آخری شاگردوں میں سے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے رفقائے درس میں سے ہیں، فراغت کے بعد ندوہ میں مفتی کے عہدہ پر مقرر ہوئے، پھر جب ایک سال کے بعد ندوہ نے اپنا دارالعلوم کھولا تو اس میں شوال ۱۳۱۶ھ سے مدرس ہوگئے، خاکسار نے اکثر ابتدائی اور فقہ کی کتابیں موصوف ہی سے ندوہ میں پڑھیں، غالباً ۱۹۰۳ء کے بعد یہ ندوہ کی خدمت چھوڑ کر مولانا محمد علی صاحب کے پاس مونگیر چلے گئے تھے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کئی سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مدرس رہے، واپسی کے بعد پھر مونگیر میں رہے، اور خانقاہ رحمانی میں تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دی ۱۹۱۷ء میں جب مولٰنا شروانی حیدرآباد میں صدر الصدور اور جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے مفتی صاحب کو جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں پروفیسر مقرر کیا، اور آخر مولٰنا شیر علی صاحب کے بعد وہ شعبۂ دینیات کے صدر ہوئے، اور اب چند سال ہوئے کہ انھوں نے پنشن پائی، امسال ۱۹۲۹ء میں وہ مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی جگہ پر مسلم یونیورسٹی میں علوم دینیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں، موصوف کو طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تفہیم میں کمال حاصل ہے، متعدد کتابیں اردو میں لکھی ہیں، نحو بیف (عربی قواعد) اور علم الفقہ کے چند رسالے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں لکھے، مونگیر میں رہ کر تاریخ القرآن اور سیرۃ امام ابوحنیفہ لکھی، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں جامع ترمذی کی شرح لکھ رہے تھے، جو غالباً ابھی ناتمام ہے،

تدریس میں بھی صرف کرتے ہیں، آپ اس دینی خدمت کو بالفعل قبول کر لیجئے، مولوی مفتی عبد اللطیف صاحب نے مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کیا، اور جلسہ کی کارروائیاں اختتام کو پہنچیں،

کالج سے رخصت لینے کی تجویز ۱۸۹۷ء

کئی برس سے آب وہوا کی ناموافقت اور کثرت دماغی محنت کے سبب سے مولانا کا معدہ صحیح نہیں رہا تھا؛ ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں:۔

"میں دو ایک مہینہ سے بالکل بیکار رہتا ہوں، دماغ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا، ابکی انشاء اللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کراؤں گا، میری خواہش ہو کہ تمام تعطیل اعظم گڈہ میں بسر کروں، بندول دو تین روز سے زیادہ نہ رہوں" (سمیع ۳۸)

اس سلسلۂ علالت پر مستزاد سید محمود مرحوم کا عبرتناک اخیر زمانہ کا سوء مزاج تھا، اب ان کو کالج کے جزء وکل پر پورا اختیار ہو گیا تھا، وہ جدھر نکل جاتے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ کرتے اور وقت ضائع کرتے، مولانا ان کی اس عادت سے زچ ہو گئے تھے، کیونکہ الفاروق کی تکمیل کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ملتی نہ تھی، اسی لئے مولانا نے اُن سے ایک دو دفعہ بے رخی برتی، تو اُن کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی، اور وہ بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ انھوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا، اور اُن سے بعض درجے چھین لئے، اور کبھی اُن کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسن تقریر سے اس قدر دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں[1]،

مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بک صاحب کی سیاست تھی، انھوں نے ایک مسلّمہ مسلمان

[1] حسب روایت سید سجاد حیدر صاحب یلدرم،

لیڈر" کی حیثیت حاصل کرلی تھی، اور پردہ کے پیچھے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے، مولانا اُن کی اِس طرز سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دلچسپ دلپذیر سبق پڑھانا تھا سخت ناپسند فرماتے تھے،

اُسی زمانہ میں ایک بار دیوانِ حافظ کھول کر فال دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی، خواجہ حافظ صاحب نے جواب دیا،

وقت آن است کہ بدرود کنی زندان را

مولانا نے خواجہ صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا، اور ایک سال کے لئے اس قید خانہ سے رہائی کی درخواست دی، یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء[1] سے نومبر ۱۸۹۷ء تک کی رخصت لی، اور اعظم گڈہ چلے آئے، مگر یہاں آکر ان کا جی نہ لگا، فروری ۱۸۹۷ء میں وہ پھر علی گڈہ گئے، لیکن پھر واپس آگئے اور جون، جولائی اور اگست ۱۸۹۷ء اعظم گڈہ میں گذارے، ان ہی دنوں، ۲ جون ۱۸۹۷ء کو ان کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر و منصف نے اعظم گڈہ میں وفات پائی، یہ غم مولانا کے لئے بڑا سوہانِ روح کا باعث ہوا، (سمیع ۴۰) اس حالت میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے والد ماجد کی جو اِن دنوں بیماری سے اچھے ہوئے تھے صحتیابی کی خوشی کا اور موازنۂ قومی کا جلسہ کریں، (سمیع ۴۱) اور یہ خیال بھی تھا کہ مرحوم بھائی کی یادگار میں[2] نیشنل اسکول میں کوئی عمارت بنوائیں (حمید ۳)

[1] یہ تاریخ مولوی سمیع صاحب کے ایک خط میں ملی جو درج مکاتیب نہیں ۱۵ دسمبر کو علی گڈہ سے انکو جونپور لکھتے ہیں تمہید کے بعد خط (کارڈ) یہ ہے "میں غالباً ۲۳ یا ۲۴ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڈہ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو لکھ بھیجو، میں نے سردست سال بھر کی رخصت لی ہے، والسلام "شبلی" ۵ دسمبر ۱۸۹۶ء،

[2] مکاتیب کے حاشیہ میں غلطی سے اس یادگار کو مولنا کی مرحومہ بیوی سے منسوب سمجھا گیا ہے، (حمید ۳)

اس کے بعد افسردگی کے دور کرنے کے لئے کوئی سفر کریں (سمیع ۱۴) مگر وہ کہیں نہ جاسکے، اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۵ء میں علی گڈہ واپس چلے گئے، اور یہ کوشش شروع کی کہ اُن کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے،

سرسید اور مسٹر بک اس شرط سے رخصت دینا چاہتے تھے، کہ مولانا سال میں چھ مہینے علیگڈہ میں آکر قیام کریں، مگر دفعتہً سید محمود جو ان دنوں کالج پر حاوی تھے، اس کے مخالف ہو گئے، ۹ نومبر[1] ۱۸۹۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں:- "واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں شش ماہہ قیام کروں لیکن سید محمود دفعتہً اس کے مخالف ہو گئے، اور اسی اپنی حالت میں بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں لیکن اس قسم کی ان سے اب کسی کو شکایت نہیں رہی، ہر روز یہاں کے رؤسا، ٹرسٹیز اور ارکانِ کالج اس قسم کی باتوں کے متحمل ہو گئے ہیں، میں تو اس دن سے سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، باقی ترکِ تعلق، اس کی یہ کیفیت ہو کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربہ کے لئے لی تھی، میں نے دیکھا کہ اعظم گڈہ سال بھر برابر نہیں رہ سکتا، وہاں کوئی ایسی دلچسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے، اس لئے کچھ یہاں (علی گڈہ) کچھ وہاں (اعظم گڈہ) کچھ ندوہ، اسی طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے" (حمید)

الفاروق کی تالیف ۱۸۹۴ء، ۱۸۹۵ء الفاروق کی تالیف میں اب تک جو انتظار تھا وہ مولانا کی تصریح کے مطابق یورپ میں بعض تاریخی مطبوعات کی تاخیر کے سبب تھا، خصوصاً طبری جو اب تک چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، (ہدی افادی ۵) ۱۸۹۴ء میں جب تاریخ مذکور کا حصۂ مطلوبہ تمام ہوگیا، تو مولانا نے اس کی تالیف کا عزم مصمم کرلیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۴ء سے

---

[1] مکاتیب میں ۱۸۹۰ء غلط چھپ گیا ہے،

جیساکہ الفاروق کے دیباچہ میں تصریح ہی، پورے عزم کے ساتھ الفاروق لکھنی شروع کی، بیچ بیچ میں ناغے بھی ہوتے رہے، اس کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی، ان میں سے ایک طبقات ابن سعد تھی جواب چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مگر اس زمانہ میں یہ عنقا تھی، ہندوستان میں شاید مولوی ناصر حسین مجتہد لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھی، مگر انھوں نے دینے سے انکار کیا، آخر ۱۹ جنوری ۱۸۹۶ء کو مولانا نے مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدرآبادی کو خط لکھا جن کے پاس قلمی کتابوں کا نادر ذخیرہ تھا، اور جن کی نسبت مولانا کو معلوم ہوا تھا کہ اُن کے کتبخانہ میں یہ نسخہ موجود ہی، طبقات کا نسخہ مولانا نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا، (سفرنامہ) مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ضروری اقتباس نہ لے سکے تھے، اس لئے اس کی تلاش جاری تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن کو نہ مل سکی، کیونکہ الفاروق میں اس کا کوئی حوالہ نہیں، دوسرے یہ کہ جب ابن سعد چھپ کر آئی ہے تو مولانا ندوہ میں تھے، مجھ سے فرمایا کہ "دیکھو ابن سعد میرا ہم مذاق تھا، اس نے بھی حضرت عمرؓ کا حال خوب جی کھول کر لکھا ہی"۔

کتاب کا ایک حصہ تین سال کے بعد جون ۱۸۹۷ء میں تمام ہو کر کانپور کے مطبع نامی میں دیدیا گیا، (اسحاق۔۷) باقی حصہ زیر تحریر تھا، چنانچہ ۳ جولائی ۱۸۹۷ء کو لکھتے ہیں :۔ "میں نے الفاروق مطبع نامی کانپور میں چھپنے کو دے دی، لیکن ابھی اصل کتاب میں ایک ثلث تصنیف کے لئے باقی ہی، (حمید ۳)

ایک سال کے بعد ۴ فروری ۱۸۹۸ء کو رقم فرماتے ہیں :۔" الفاروق حصہ دوم میں نے تیار کر لیا ہے، قریباً نصف چھپ بھی گیا ہے" (حمید ۴)

کالج سے الگ ہو کر جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڈہ چلے آئے اور الفاروق کا کچھ حصہ اسی اعظم گڈہ میں اسی شبلی منزل میں اسی کمرہ میں جس میں یہ تحریر اس وقت قلم سے نکل رہی ہے لکھا، اور

حصہ دوم کا آخری صفحہ کشمیر میں بیٹھ کر بخار کی حالت میں ۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو حوالۂ قلم کیا، (خاتمۂ الفاروق)

مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت یہ اخیر صفحہ تمام ہوا ہے، مصنف بخار سے بے حال ہو کر بستر پر دراز تھا،

کتاب میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ کشمیر سے واپس آکر اسی سال شبلی منزل میں جہاں وہ کبھی بیمار رہتے تھے اور کبھی اچھے ہو جاتے تھے، اور کبھی سفر کو نکل جاتے تھے، ختم کیا، اور یہیں کتاب کا مختصر مقدمہ دسمبر ۱۸۹۸ء کی کسی تاریخ میں لکھا،

۱۹ ستمبر ۱۸۹۸ء تک اس کے ۲۱۲ صفحے چھپ چکے تھے، رقمطراز ہیں:- "الفاروق کانپور مطبع نامی میں بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جس کے ۲۱۲ صفحے ہیں پورا چھپ کر تیار ہو گیا ہے، لوح طلائی اور لاجوردی چھپ رہی ہے، اور اس کا کاغذ اتنا نفیس دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں آج تک ویسا کاغذ کبھی استعمال نہیں ہوا، جو قدرداں صاحب چرمی کاغذ پر لوح چھپوانا چاہتے ہیں وہ دیکھیں گے تو اس کاغذ کو چرمی کاغذ پر ترجیح دیں گے" (مہدی افادی ۸)

مولانا نے جس حصہ کے ۲۱۲ صفحے لکھے ہیں وہ دوسرا حصہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا حصہ پہلے لکھا گیا اور چھپا، دونوں حصوں کے ہندسے الگ تھے اس لئے آگے پیچھے ہونا ممکن تھا،

بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم فروری و مارچ ۱۸۹۸ء

بھوپال میں مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب کو حضور شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ۱۳۱۵ھ میں اپنی ریاست کے تعلیمات کا افسر اعلیٰ (ڈائرکٹر) بنا دیا تھا، اس وقت بھوپال کی ریاست کو اس وجہ سے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی وفات کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، عربی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی، اور عربی کے پانچ مدرسے شہر بھوپال میں قائم تھے، مگر نتیجہ کچھ نہ تھا، نہ تعلیم کا کوئی سررشتہ تھا،

نہ قواعد تھے، نہ رجسٹر تھے، نہ کوئی کتب خانہ تھا، نہ امتحان تھا، نہ مدرسین کی حاضری تھی، نہ کوئی نصاب تھا، نہ درجہ بندی تھی، طلبہ پڑھتے اور علما پڑھاتے تھے، نہ کسی سال کوئی طالب علم فارغ ہوتا، اور نہ اس کی کوئی فکر تھی، مدرسین کو تنخواہیں اور طالب علموں کو ماہوار وظیفے ملتے تھے، اور ان کے کھانے کپڑے کا انتظام تھا، اور یہی ان مدرسوں کا حاصل تھا، طالب علم روٹیوں کے لئے پڑے رہتے اور ماہوار وظیفوں کے لئے پڑھتے تھے۔ ولایتی اور بنگالی طالب علم ایک دور ختم کرتے تو فوراً دوسرا دور شروع کر دیتے، تاکہ تعلیم سے فراغت ہی نہ ہو، جو اس "جنت" سے نکلنا پڑے، گویا یہ پڑھنے کی نوکری کرتے تھے، اور یہی حالت اس وقت ہندوستان کے ان عام مدارس کی تھی جن کو ارباب خیر نے جاری کر رکھا تھا،

نواب صاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر ۱۳۱۷ھ میں "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک تعلیمی مجلس شوریٰ قائم کی جس میں بھوپال کے علاوہ باہر کے دو ممتاز عالموں کو جو عربی مدارس کی تنظیم و اصلاح کے لئے کوشاں تھے باہر سے بلوایا، ان میں سے ایک شمس العلما مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے جنھوں نے آرہ میں نئے پروانہ پر ایک عربی درسگاہ، مدرسۂ احمدیہ کے نام سے قائم کی تھی تعلیم کے ان ماہروں کے مشورہ سے نواب صاحب نے بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا[1]،

خوش قسمتی سے نواب صاحب ممدوح کے محفوظ کاغذوں میں مولانا مرحوم کی دو یادداشتیں

---

[1] نواب صاحب مرحوم نے اس کی تفصیل اپنی خود نوشت سوانحعمری میں جو معارف ۱۹۳۶ء میں مسلسل چھپی ہے لکھی ہے، اور مارچ ۱۹۳۶ء کے نمبر میں یہ کیفیت درج ہے،

جن میں ایک، ۲ فروری اور ۲ مارچ کو، اور دوسری ۲ اپریل ۱۹۰۶ء کو لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی مل گئی ہیں،

مولانا مرحوم نظارۃ المعارف کی مجلس شوریٰ کی شرکت سے فارغ ہو کر فروری کے آخر میں علی گڈہ پہنچے، جیسا کہ، ۲ فروری کی یادداشت میں ذکر ہے، واپس آکر، ۲ فروری اور ۲ مارچ کی دو دستوں میں عام انتظامی معاملات کی ۱۳ دفعات لکھی ہیں، دوسری یادداشت جو مفصل ہے، اور جو ۲ اپریل کو مرتب کی گئی ہے، دو کاغذوں پر مشتمل ہے، ایک میں طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد ہیں، اور دوسرے میں پہلے مدرسین کی حاضری اور رخصت کا دستور العمل، اور پھر نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ ہے، اس یادداشت کو اس مقام پر اس لئے نقل کیا جاتا ہے، کہ ہندوستان کے عربی مدارس کی اصلاح کا سب سے پہلا تاریخی نقشہ نگاہوں کے سامنے آجائے،

"دستور العمل و ہدایات برائے مدرسین"

دفعہ ۱ - تمام مدرسین کو ضرور ہوگا کہ وقت معین پر مدرسہ میں آئیں،

۲ - ایک حاضری کی کتاب مدرس اوّل کے کمرہ میں موجود ہوگی، ہر مدرس مدرسہ میں آنے کے ساتھ اپنی حاضری اپنے قلم سے اس میں لکھ دیگا، اس کتاب میں تاریخ، دن، وقت، نام، اور دستخط کے خانے ہوں گے، (پنجاب میں یہ طریقہ عموماً جاری ہے)

۳ - ہر مدرس اپنے طلبہ کی حاضری لے گا، جو طالب العلم غیر حاضر ہو اس پر جرمانہ، اور دیر میں آئے تو خفیف تنبیہ کرے گا،

۴- کسی مدرس کو جائز نہ ہوگا، کہ اوقات مدرسہ میں (بجز کسی اتفاقیہ خاص ضرورت کے) مدرسہ سے باہر جائے، یا ان اوقات میں کوئی شخص اس سے ملنے آئے،

۵- مدرسین کو ایک دن کی رخصت دینے کا اختیار مدرس اعلیٰ کو ہوگا، اور اس سے زیادہ کے لئے بتوسط مدرس اعلیٰ کے سررشتۂ تعلیم کے افسر کے پاس درخواست بھیجنی ہوگی،

۶- جو مدرس کسی دن مدرسہ میں نہ آئے تو ضرور ہوگا کہ وہ رخصت کی درخواست پہلے بھیجکر منظوری حاصل کرے،

۷- تعلیم نقشۂ انضباط اوقات کے موافق دی جائے گی، اور ہر مہینہ کے اخیر میں ایک کتاب میں جو اسی غرض کے لئے تیار کی جائے گی، ہر مدرس کو یہ درج کرنا ہوگا، کہ اس مہینہ میں ہر صف کو کس قدر تعلیم دی گئی،

۸- ہر مہینہ کے اخیر میں ہر مدرس اپنے طلبہ کا امتحان لے گا، اور تاریخ امتحان ایک کتاب میں درج کریگا

۹- امتحانات نہایت احتیاط کے ساتھ بلا رعایت لئے جائیں گے،

جدول اوقات ... بنائے جائیں

نقشۂ انضباط اوقات بہ تعین مدرسین

درجہ	۱۰ سے ۱۱ تک	۱۱-۱۲	۱-۲	۲-۳	۳-۴
اول	صرف	حساب	فارسی	صرف	ادب و تحریر
دوم	فارسی	صرف	حساب	املا و تحریر	نحو
۳	نحو	منطق و ادب	تاریخ و عقائد	انشا پردازی عربی	حساب
۴	حساب	منطق و مناظرہ	فقہ	حدیث و فرائض	اوب
۵	فلسفہ و منطق	فقہ و اصول	عقائد و تاریخ	حساب	ادب
۶	منطق	حساب	فلسفہ	عروض و معانی	ادب

۱- یہ نقشہ نصاب تعلیم اور تعداد مدرسین کی مناسبت پر مبنی ہے،

ادب کا ہر روز ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے،

جمعرات کے دن صرف دو گھنٹے جو ہیں ان میں کم ضروری مضامین کو نکال دیا جائے۔

دفعہ دوم میں آپ نے لکھا ہو کہ "طلبہ کو عربی لکھنی نہیں آتی، اس کے لئے طرز تعلیم کے قواعد مقرر ہونے چاہئیں"
یہ امر قاعدہ کے نیچے نہیں آسکتا، بلکہ مدرسین کے ادبی مذاق پر موقوف ہو لیکن اس کی تدبیر سردست یہ
ہونی چاہئے کہ نقشۂ انضباط اوقات میں املا و تحریر اور ادب کا ہر روز جو ایک گھنٹہ رکھا گیا ہو اس میں ہمیشہ
اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا جائے، لیکن چونکہ مدرسین خود عمدہ عربی نہیں لکھ سکتے ہوں گے اور اس لئے
ان کی اصلاح چنداں مفید نہ ہوگی، اس لئے اس کا یہ طریقہ ہے کہ عربی کی ایک کتاب عمدہ عبارت کی
جس میں قصے ہوں، پہلے مدرس صاحب اس کا صفحہ آدھ صفحہ اردو میں بامحاورہ ترجمہ کرکے وہی ترجمہ طلبہ
کو دیں، پھر اصلاح میں اصل عبارت کے موافق اصلاح دیں، یا بالکل وہی اصل یا بتغیر یسیر، ہاں اس قدر
ضرور چاہئے کہ طلبہ کی صرفی، نحوی اور محاورہ کی غلطیوں پر ان کو مطلع کردیا کریں،

دفعہ ۳۔ کا جواب، مقدمۂ ابن خلدون وغیرہ کے مضامین کا انتخاب میں خود کرکے کل پرسوں بھیجونگا
دفعہ ۴۔ کا جواب، مختصر تاریخ ہندوستان، جہانگیری و صدیقی کے لئے قصص الہند مطبوعہ لاہور،
نہایت عمدہ اور دلچسپ کتاب ہو اس کا اسلامی حصہ خاص مولوی محمد حسین آزاد کا لکھا ہوا ہے، اور
بہت ہی دلچسپ ہو، مسائل ضروری دینیات کے لئے کیا راہِ نجات کافی نہیں؟

دفعہ ۵۔ ہاں میں نے اپنے ریمارکوں میں بعض جگہ کتابوں کے نام نہیں متعین کئے تھے، وہ اب
لکھتا ہوں، حسب ترتیب ریمارک،

درجۂ دوم۔ سفرنامہ کے بجائے ناسخ التواریخ کا وہ حصہ جو پنجاب کے فارسی مڈل کلاس میں داخل کورس
وہ کورس منگوالینا چاہئے، مخزن الفوائد کے بجائے عبدالواسع کے آسان حصے،

درجۂ چہارم، شرح وقایہ سے پہلے انتخاب جامع صغیر امام محمد، ادب کی کتاب اس درجہ میں کلیلہ ودمنہ

شعبۂ جہانگیری و صدیقی بھوپال کے دو مدرسوں کے نام ہیں،

ابن المقفع مطبوعہ مبئی،

درجۂ پنجم، شرح ہدایۃ الحکمۃ مولوی عبد الحق خیرآبادی مناسب ہے، مولانا لطف اللہ صاحب مفتی حیدرآباد نے اپنے کورس میں اسی کو منتخب کیا ہی،

ملا حسن ہرگز نہیں رکھنا چاہئے، بلکہ اس کے بجائے شرح سلم بحر العلوم مطبوعۂ دہلی رکھنا چاہئے،

(یہ ریمارک پہلے رہ گیا تھا)

ادب کی کتاب اس درجہ میں انتخاب دیوان ابو العتاہیہ مطبوعۂ بیروت رکھنا چاہئے، ہاں یہ امر خاص قابلِ لحاظ ہے کہ تمام میں حساب کی کتاب پی گھوش کے بجائے چکرورتی ارتھمیٹک رکھنی چاہئے، اب ادھر وہی متداول ہی ہمارے کالج میں اور دوسرے کالجوں میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے اور اس کو عموماً ترجیح دی جاتی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ہوگیا ہے، اور بار بار چھپ چکا ہے،

فارسی کے درجہ سے مجھ کو سخت اختلاف ہی، ایک کتاب بھی کام کی نہیں، منتخباتِ نظم و نثر تو تیار نہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی رائے دی جاسکے،

مقاماتِ حمیدی میں نے دیکھی، بلکہ پڑھی ہے، وہ طرز[1] بجز حمیدی کے پھر کسی نے اختیار نہیں کیا، اور نہ اُس طرز میں کوئی مفید مضمون ادا ہو سکتا ہے،

تحفۃ الاحرار جامی، بالکل پست درجہ کی کتاب ہی، اس سے تو مطلع الانوار خسرو کہیں اچھی ہی، اور خود جامی اس کے معترف ہیں،

حقیقت یہ ہی کہ فارسی کے تین دور ہیں، قدما، مثلاً فردوسی، عبد الواسع جبلی، منوچہری، اخیر میں انوری

---

[1] یہ فارسی میں مقاماتِ حریری کے طرز کی کتاب ہی، عبارت مقفی مسجع اور لفظی صنائع و بدائع سے بھری ہوئی ہی،

متوسطین مثلاً سعدی، سلمان ساوجی، کمال اسمٰعیل، متاخرین مثلاً نظیری، عرفی، ظہوری، طالب آملی کلیم

ان تینوں طبقے کی ایک ایک دو دو کتاب پڑھانی چاہیئے کہ طالب علم کو ایک عام بصیرت ہو، منوچہری،

سلمان، کمال اسمٰعیل وغیرہ سب چھپ گئے ہیں،

اس درجہ میں تاریخ کی کتاب نامۂ خسرواں موزوں ہے؛ جغرافیہ کی فارسی تصنیف جامِ جم ہے،

لیکن وہ بڑی کتاب ہی، اور عـــہ اس کی قیمت ہی، جغرافیہ اردو میں پڑھانا کافی ہے، تاریخ میں روضۃ

الاحباب بھی اچھی ہے، گو عبارت معمولی ہے"

سال دوم	مخزن الفوائد اگر وہی قاعدہ کی کتاب ہی جو فائق کی تصنیف ہی تو وہ نہایت معمولی درجہ کی تصنیف ہی، اور اس میں غایت درجہ کے ہندی شعراء کے اشعار بھرے ہیں، ہدایۃ النحو کی مدت تعلیم کم ہی روزانہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھانا چاہیئے،
سیوم	میں کافیہ اور شرح ملا دونوں کو ناپسند کرتا ہوں، بجاے اس کے زمخشری کی مفصل ہوتی تو اچھا تھا لیکن چونکہ مولویوں کے نزدیک
چہارم	یہ کتابیں نہایت ضروری اور معیارِ کمال ہیں، اس لئے مصلحۃً ان کو قائم رکھا جاسکتا ہے اس سال تاریخ الخلفاء کے ۲۴۰ صفحے بہت ہیں ۱۰۰ صفحے سے زیادہ نہیں ہوسکتے، رشیدیہ بے فائدہ ہی، مناظرہ کے فن کے لئے صرف اس کی اصطلاحیں اور امثلہ کافی ہیں، ایک مستقل فن بنا کر اصل مسائل سے بُعد ہو جاتا ہے، رشیدیہ کا متن کافی ہے، مراقی الفلاح کی کوئی ضرورت نہیں، شرح وقایہ سے پہلے کوئی آسان اور مختصر کتاب فقہ کی رکھنی چاہیئے،

پنجم	ادب کی کوئی کتاب اس درجہ میں نہیں، ہر شرح ہدایۃ الحکمۃ سے اگر میبذی مراد ہے، تو وہ درس میں رکھنے کے قابل نہیں، الٰہیات میبذی کے ۱۰۰ صفحے نہیں ہیں، بلکہ ساری کتاب بھی شاید اس قدر نہ ہو، اس درجہ میں بھی ادب کی کوئی کتاب نہیں ہے	ششم	اس درجہ میں فلسفۂ قدیم کی کوئی کتاب ہونی چاہیے، مثلاً شرح حکمۃ العین کا کوئی حصہ، مختصر المعانی کے بجائے مفتاح سکاکی زیادہ مناسب ہے، بشرطیکہ علما ناراض نہ ہوں، درجہ ششم یا پنجم میں امام غزالی کے رسائل اربعہ یعنی الجام العوام و منقذ من الضلال وغیرہ رکھنا مناسب ہوگا،
ششم	جب درجہ چہارم و پنجم میں کوئی کتاب ادب کی نہیں ہے، تو اس درجہ میں مقامات حریری کیونکر چل سکتی ہے،		

۹۔ اگست ۱۸۹۹ء کو مولانا نے نواب صاحب کو امیر افغانستان کے مجوزہ محکمۂ ترجمہ کی اطلاع دی، اور ساتھ اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے لکھا: "جب صحرائے افغانستان میں یہ اُپج پیدا ہوئی ہے، تو بھوپال کا مرغزار تو بڑی قابلیت رکھتا ہے"

غرض ان تنظیمات کے بعد مدارس کی حالت درست ہوئی، اور نتیجے توقع کے مطابق نکلے، چنانچہ مارچ ۱۹۰۱ء میں سرکار بھوپال کی پہلی تعلیمی رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء اردو اور انگریزی میں شائع ہوئی، اس وقت مولانا حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کے پاس مقیم تھے، رروداد کو دیکھکر مولانا نے نواب صاحب کو مبارکباد دی، اور لکھا:۔ "روداد مرسلہ میں نے دیکھی، اور نہایت مسرت ہوئی، خدا کرے، روزافزوں ترقی ہو، میں تو چاہتا ہوں کہ واپسی میں خود مدارس کو دیکھ کر ایک یادداشت لکھوں

لیکن آپ فرمائیں تو، وہ ادھی پراپنی رائے لکھ کر اخبارات کو بھیجدوں، انگریزی، وداد مولوی سید علی صاحب نے لی" (علی حسن خاں ۴م)

سرسید کی وفات مارچ ۱۸۹۸ء | مولانا بھوپال سے فروری کے اخیر میں علی گڈھ واپس آئے، یہ وقت علی گڈھ کی پالیٹکس کا بڑا نازک تھا، ان دنوں سرسید ایک طرف اپنے بیٹے کی بے ستی اور بدمزاجی سے نہایت قلبی کوفت اور اذیت میں تھے، اور دوسری طرف سید محمود کی جانشینی اور ٹرسٹیز بل کی منظوری کے سبب سے سرسید کے اچھے اچھے دوست بلکہ دست و بازواُن سے الگ ہو رہے تھے، نواب وقار الملک اور دوسرے اکابر ارکان کی طرف سے باعلان مخالفت کی تحریریں اخباروں میں جاچکی تھیں، یہاں تک کہ نیک صفات مولانا حالی بھی موافقت نہ کرسکے، کہ دفعۃً چند روز کی علالت کے بعد، ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی، اور ساری مخالفانہ کارروائیاں روک دی گئیں، بایں ہمہ اس وقت سرسید کے سانحۂ وفات کا جو اثر مولانا پر ہوا اُس کا اندازہ اس عربی خط سے ہوسکتا ہے، جو انھوں نے سانحہ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھوپال لکھا،

نمی دانم حدیث نامہ چون است	ہمیں دانم کہ عنوانش بخون است
تضعضعت ارکانُ الملّة !	قومی عمارت کے ستون ہل گئے،
اَعنی انتقل السیّد احمد خان بهادر	یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے
الیٰ جوار رحمة ربّه، وذالك یوم الاحد	جوارِ رحمت میں گئے، اور یہ سانحہ یکشنبہ
۲۷ مارچ وتفرق شملنا، انی لا اقدر	۲۷ مارچ کو پیش آیا، اور ہماری قوم کا شیرازہ

علی ان تشتغل بشیٔ الا بعد برھۃ من الزمان ۔ (شبلی نعمانی علی گڈھ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء) | بکھر گیا ہیں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کرسکتا ۔

اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کی مدح انھوں نے پہلے کئی دفعہ لکھی، اس کے مرثیہ میں ایک شعر بھی انھوں نے نہیں کہا، مگر واقعات کی روداد آپ کے سامنے ہے، اس کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا، کہ مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا، اور جھوٹی شاعری اس کی افتاد طبع نہ تھی، البتہ سرسید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون اپریل ۱۸۹۸ء کے میگزین میں ارکان کالج کے اصرار سے لکھا، جیسا کہ مضمون کے آخر میں ہے:

رخصت اور ترک تعلق مئی ۱۸۹۸ء

اب کالج سراسر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آگیا، اور سید محمود کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی، ۱۶ را پریل ۱۸۹۸ء کو لکھتے ہیں:-

"کالج کا حال کشمکش میں ہے، سردست بک صاحب نے قبضہ کرلیا ہے، سید محمود کی حالت بہت خراب ہے (حمیدیہ) مولانا نے فروری ہی میں ارادہ کرلیا تھا کہ وہ پہلی مئی سے چھ مہینہ کی رخصت لیں گے،" اس واقعہ کے بعد تو اور ضروری ہوگیا، چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے پہلے چھ مہینہ کی رخصت لی، پھر استعفا بھیجدیا، اس طرح سولہ برس کی پُر انقلاب سبق آموز اور ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڈہ کو خیرباد کہا،

اعظم گڈہ کو رجعت جون ۱۸۹۸ء

کالج سے رخصت ہوکر مولانا نے جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڈہ کا رُخ کیا، یہاں انھوں نے ۱۸۹۲ء سے پہلے (اسحاق ۳) شہر سے باہر اپنے خاندانی باغ میں ایک چھوٹا سا کچا بنگلہ بنوالیا تھا، اور جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا، اور جو اب شبلی کا مدفن اور دارالمصنفین

کا مسکن ہے، یہیں آکر قیام فرمایا،

مولانا نے یہاں بیٹھ کر سب سے پہلے تو الفاروق کے ناتمام حصہ کی تکمیل کرنی چاہی، اور اسی کے ساتھ سنہ ۱۸۸۳ء میں جس نیشنل اسکول کی بنیاد اعظم گڈھ میں ڈالی تھی جس نے ان کی برادری میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں بڑی مدد دی تھی اس کی دیکھ بھال شروع کی، عزیزوں سے اس کے لئے چندے منگوائے، اس کی تعمیر کے اضافہ کا خیال کیا، ماسٹروں اور مدرسوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی، آمد و خرچ کو برابر کرنے کی کوشش کی، ان باتوں میں کبھی کبھی ان کا دن دن بھر لگ جاتا تھا، سنہ ۹۸ء و سنہ ۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے مکاتیب (حمید الحق) میں یہ تذکرے ہیں:

کتب خانہ کی یکجائی مولانا نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو ان کی خریدی اور ہدیۃً ملی ہوئی کتابوں پر مشتمل تھا، اور جس میں اچھا خاصہ حصہ یورپ کے مطبوعات کا تھا، علی گڈھ سے منگوایا، اور جو کتابیں یہاں تھیں ان سے ملا کر کئی ہزار کتابوں کا ذاتی کتب خانہ اب یکجا کرلیا، میں سنہ ۱۹۰۷ء میں جب پہلی بار مولانا کے پاؤں کے حادثہ میں اعظم گڈھ آیا تھا تو اس کتب خانہ کو دیکھا تھا،

یہ کتب خانہ کیسا تھا اس کا حال خود مولانا ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:-

"کتابیں میرے پاس تعداد میں بہت نہیں ہیں، لیکن اکثر نایاب مطبوعات یورپ، اور بعض نایاب قلمی کتابیں ہیں، (۴۷)

اس کی قیمت کا تخمینہ بھی اس خط میں تین ہزار بتاتے ہیں،

علالت اعظم گڈھ میں سال بھر رہنا مشکل تھا، اس لئے وہ ستمبر سنہ ۹ء میں الہ آباد گئے (مہدی افادی) پھر بیمار ہو کر لکھنؤ گئے، اور گولہ گنج میں ندوہ کے مکان میں ٹھہرے، اور وہاں کے

مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب (بانی مدرسہ تکمیل الطب جھوائی ٹولہ لکھنؤ) کا علاج کرایا، ۱۹ ستمبر ۱۸۹۹ء کو وہیں تھے (مہدی افادی) کہ دسمبر ۱۸۹۹ء میں ہم اُن کو پھر علی گڈہ میں پاتے ہیں، اور عربی کی بعض نئی مطبوعہ کتابوں کے حصول پر خوش ہو رہے ہیں، (حمید ۹)

اس تمام چکر میں الفاروق کا کام ساتھ ساتھ تھا، اور مزاج کا یہ حال تھا کہ کبھی اچھا اور کبھی برا، اس لئے کسی صحت گاہ کا خیال تھا،

سفر کشمیر جولائی ۱۸۹۹ء صحت کی بحالی کے لئے کشمیر کے سفر کا خیال جیسا اوپر گذر چکا ہی مولانا کو کئی سال سے تھا، امسال جب وہ کالج کی خدمات سے سبکدوش ہو رہے تھے، اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ پورا ہو رہا تھا، چنانچہ فروری ۱۸۹۹ء میں علی گڈہ ہی سے کشمیر کا قصد تھا، (حمید ۵)

اب جب وہ جون ۱۸۹۹ء میں کالج کی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو اسی مہینہ کے آخر میں کشمیر کے سفر کو تنہا روانہ ہو گئے، اس وقت الفاروق جیسی زندۂ جاوید تصنیف زیر قلم تھی، جی چاہا ہوگا کہ وہ اسی بہارستان میں ختم ہو،

کشمیر میں قاضی خواجہ سعدالدین صاحب مرحوم جن کے خاندان میں کشمیر کا عہدۂ قضا موروثی تھا وہ علی گڈہ میں مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم سے پڑھتے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان سے مولانا کے مراسم قائم ہو گئے تھے، مولانا نے کشمیر کا قصد فرمایا تو انھوں نے میزبانی کا فرض ادا کرنا چاہا، مگر مولانا ایک ایسی محلہ میں الگ مکان لیکر رہے جو نہایت نمناک تھا، خواجہ سعدالدین صاحب نے منع بھی کیا، مگر مولانا نے اسی مقام کو پسند کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ہفتہ رہنے پائے تھے کہ نہایت سخت بیمار پڑے، الفاروق جلد دوم کا خاتمہ وہیں ۵ جولائی ۱۸۹۹ء کو قلم سے لکھا، مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت ہاتھ نے قلم رکھا ہے میں بستر پر بیہوش پڑ گیا،

کشمیر میں جتنے دن رہے، بیمار ہی رہے، تنہا گئے تھے، یہاں تک کہ ملازم بھی ساتھ نہ تھا، مگر کشمیر کے احباب نے اور خصوصیت کے ساتھ قاضی خواجہ سعد الدین صاحب اور مرزا سعد صاحب جو کشمیر کے ایک علم دوست رئیس تھے بڑی خدمت کی، اور ایک طبیب کا علاج ہوا، ایک دفعہ بخار کم ہوا، تو سمجھے کہ اچھے ہو گئے، مگر دوبارہ پھر بیمار ہوئے اور جب تک وہاں رہے بیمار ہی رہے آخر جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وطن کا رُخ کیا، ۳۱ جولائی کو وہ گھر پہنچ چکے تھے[1]، گو اب بھی علیل تھے مگر آنے کے ساتھ ہی نیشنل اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۳۱ جولائی ۱۹۰۸ء کو مولوی حمید الدین صاحب سے تعمیر کا چندہ مانگا (حمید) اور دوسروں سے تقاضے شروع کئے، مگر طبیعت کا یہ انداز تھا کہ ابھی اچھے ہیں اور ابھی بیمار، منجھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے الٰہ آباد بلا بھیجا تو ۲۲ر اگست ۱۹۰۸ء کو یہ معذرت لکھی:- "میں جانتا ہوں کہ تمہارا بار بار کا تقاضا جوشِ محبت کی وجہ سے ہے، مگر کیا کروں کیفیت یہ ہے کہ طبیعت دو چار گھنٹے بھی یکساں نہیں رہتی، بلکہ دو چار مرتبہ بہت خراب حالت ہو گئی، اور خدانخواستہ ایسی کیفیت کہیں سفر میں پیش آگئی تو جان کا خطرہ ہے، اس لئے سفر کرنا ایسی حالت میں سخت مخدوش ہے، اگر تمہیں تشخیصِ طبیعت کے لئے اس قدر اصرار ہے تو حکیم صاحب کو یہاں بھیجدو، اور بہر حال بنارس کی ریل کھلنے کا تو انتظار ہی کرنا چاہیئے"

بہر حال طبیعت سنبھلی تو ۷ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ہم اُن کو الٰہ آباد میں پاتے ہیں، اور ایسے خوش کہ بیماری کا کوئی تذکرہ ہی نہیں، الفاروق کے دل خوش کن تذکرے ہیں، (مہدی افادی) دفعۃً

[1] مکاتیب میں ۲۲ر مارچ ۱۹۰۸ء لکھ گیا ہے، مارچ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اس مہینہ علی گڈھ میں تھے، اور اچھے تھے، اور یہ تاریخ سفرِ کشمیر سے پہلے کی ہے، ۲۷ مارچ ۱۹۰۸ء کو سرسید نے وفات پائی ہے تو وہ علیگڈھ ہی میں تھے، اس لئے یہ سہو قلم ہے،

۱۹ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو لکھنؤ دفتر ندوہ میں دیکھتے ہیں، اور بیمار پاتے ہیں، جھوائی ٹولہ کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب کا علاج ہو رہا ہے، (مہدی افادی ۸) مگر پھر وہ اعظم گڈہ واپس آگئے، کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت راہ پر نہ آتی تھی، لطف یہ ہے کہ علی گڈہ کے ان کے بعض دوستوں کو ان کی اس شدید بیماری کا یقین نہیں آتا تھا، یعنی حاجی اسمٰعیل خاں مرحوم اس کو مذاق ہی سمجھتے رہے، البتہ نواب محسن الملک نے کرم کیا، اور خود اعظم گڈہ آئے، اور کئی روز رہے، اسحٰق مرحوم کو لکھتے ہیں:

"پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے، اُن کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کر سکا، گرمی کی وجہ سے بدن میں طاقت معلوم ہوتی ہے، تم آنے میں جلدی نہ کرو، میری اس قدر ضرور خواہش ہے کہ کوئی ماہر طبیب یا ڈاکٹر اعضائے رئیسہ کی تشخیص کر لیتا۔" (۸)

معلوم ہوتا ہے کہ نومبر و دسمبر ۱۸۹۸ء میں اُن کی حالت سنبھل گئی، چنانچہ وہ سفر کے قابل ہو گئے، بعض حالات کی بنا پر جن کی تفصیل نہیں ۳؍ دسمبر ۱۸۹۸ء کو وہ علی گڈہ جاتے ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، خط میں کسی بیماری کا ذکر نہیں، بلکہ طبیعت میں یہ انبساط[1] ہے کہ اس زمانہ میں جو علمی کتابیں ہاتھ آئیں اُن کی تفصیل حوالۂ قلم ہے، (۹)

الفاروق کی تکمیل اور اشاعت (جنوری ۱۸۹۹ء) | اسی حالت میں الفاروق کی آخری تکمیل و نظر ثانی اور طباعت کا کام جاری رہا، دسمبر ۱۸۹۸ء میں اعظم گڈہ میں اُس کا مقدمہ تحریر ہوا، ۸؍ جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہے، (مہدی افادی ۹) ۸؍ فروری ۱۸۹۹ء کو اُس کے مطبوعہ اوراق[2] ایک ... شوق عزیز دوست (مولانا شروانی) کے پاس اس تاکید سے بھیجے جاتے

[1] مکاتیب میں غلطی سے انبساط کی جگہ انقباض چھپا ہے۔

[2] مولانا کے مطبوعہ مسودوں کو انجمن ترقی اردو کا کاغذ سمجھا تھا جو اس وقت تک قائم بھی نہیں ہوئی تھی، یہ دراصل الفاروق کے اوراق ہیں۔

ہیں کہ ابھی کوئی اور دیکھنے نہ پائے، (شروانی۔۱) مولانا کو اس کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ تکمیل واشاعت سے پہلے اُن کی کتاب کا مسودہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ فرماتے تھے کہ سرسید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزا دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے اور میں مسکرا کر یہ جواب دیتا کہ مشاعرہ سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی"۔ مگر افسوس کہ سرسید اس غزل کو نہ پڑھ سکے اور نہ سُن سکے، کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی، ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کر چکے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "مجھ کو ایک ملاقات میں الفاروق کے ایک حصّہ کا مطبوعہ پروف اپنے ہاتھ میں لے کر اس شرط سے دکھایا کہ میں صرف اس کا حسنِ طبع دیکھوں، پڑھوں نہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

سلسلہ علالت کا اشتداد الفاروق جیسی اہم تصنیف سے فراغت کی مسرّت اُن کو ابھی ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ علالت نے اشتداد اختیار کیا، ۱۵ فروری ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو اپنا یہ حال لکھ کر بھیجتے ہیں، "اصل یہ ہے کہ میری تمام بیماریوں کا سبب معدہ کا فساد رہا، اور اب تک نہیں گیا، غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی، کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی، کبھی نفخ رہتا ہے، کبھی قبض اور اکثر تبخیر، ان اسباب سے نہ قوت آتی ہے، نہ ظاہرِ حال میں تندرستی آتی ہے، شب و روز پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، ضروری ڈاک کے لئے ایک ملازم بمشاہرہ عہ، رکھ لیا ہے۔" (شروانی۔۲)

اس عالم کے علمی مشاغل علالت کے اس تکلیف دہ سلسلہ میں بھی ان کے علمی مشاغل بدستور جاری رہتے ہیں، ۱۰ اپریل ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی سے مسٹر آرنلڈ کے لئے منوچہری کا دیوان مطبوعہ یورپ منگواتے ہیں، اور المامون کے ریویو لکھنے والے کو الفاروق پر ریویو لکھنے کا اشارہ کرتے ہیں (شروانی۔۳) ۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو ریویو تیار ہو جاتا ہے، اور معارف علی گڈھ مرتبہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم میں

اس کے بھیجنے کا مشورہ ہوتا ہے، اور اسی خط میں اپنی اُس زندگی سے جس میں بیماری کے تسلسل کی وجہ سے مخلص دوستوں سے ملنا نصیب نہ ہو تنگ آجانا ظاہر کرتے ہیں، (شروانی ۔ ۵)

علالت کا سخت دورہ مئی ۱۸۹۹ء

اس کے ایک ہی ہفتہ کے بعد بیماری کا ایک نہایت ہی سخت دورہ پڑا ہی یہاں تک کہ اپنی علالت کی شدت سے مجبور ہو کر ۱ مئی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں :۔ "اب اداے حقِ دوستی کا وقت ہی حکیم عبدالمجید خاں[1] صاحب کو میرے معالجہ کے لئے خط لکھئے، ان کا جواب آجائے تو سفر کا قصد کروں، آپ بھی دلی تک چلیں، ظنِ غالب ہے کہ نواب محسن الملک بھی چلیں گے" (۶)

ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور عارضی صحت ۱۸۹۹ء

بیماری کا حملہ اس دفعہ اتنا شدید تھا، کہ مایوس ہو کر وصیت نامہ تک لکھ دیا تھا[2] حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اسی اثنا میں کہ دلی کے سفر کا سامان ہو رہا تھا، ایک مسلمان ماہر ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن گونڈہ سے بدل کر اعظم گڈہ آئے، مولانا کے بھائی مولوی اسحاق صاحب سے اُن کے تعلقات تھے، اس سبب سے یہ سُن کر کہ مولانا بیمار ہیں وہ دیکھنے آئے، اور بہت توجہ سے علاج شروع کیا، اور یہ تشخیص کیا کہ قلب میں نہایت کمزوری آگئی ہے، اس لئے کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی، انھوں نے محنت اور جد و جہد سے علاج کا سلسلہ جاری رکھا، اور بحمداللہ کہ اُن کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا، اور دلی کا سفر سر دست ملتوی ہو گیا، (شروانی ۷) ابھی طبیعت درست ہو چلی تھی کہ ندوہ اور نادر کتابوں کی یاد آئی، ۱۱ جون کو انھیں لکھتے ہیں :۔ "خط پہنچا، مشکور کیا، ڈاکٹری علاج سے بہت

---

[1] دلی کے مشہور شریف خانی طبیب ۱۹۰۱ء میں وفات پائی [2] نواب علی حسن خاں ۔ ۳۰ ،

فائدہ ہی، ادب الکاتب ناقص خریدنے کی کیا ضرورت ہی، مصر میں کل چھپ گئی ہی مثل السائر کے حاشیہ پر،
دارالعلوم کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے ہیں، کیا قوم کو اس قدر امیدیں دلا کر دیوبند وغیرہ
سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیئے" (۸)

مولانا کی اگلی جیسی ہشاش بشاش گفتگو سے دوستوں کو خیال ہوا کہ اب وہ تندرست ہو گئے
مولانا شروانی نے یہ پوچھا تو جواب دیا "ابھی تو میں کیا صحیح ہوں، لیکن کچھ امید بندھی ہی، شاید صحیح ہو جاؤں،
آپ اس بات کے لئے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحتِ کامل دی، تو میں اپنے خالص دوستوں کو مدعو کروں گا،
جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہونگے آپکو بھی تکلیف کرنی پڑیگی ندوہ کی بیماری لاعلاج ہی"

مولانا شروانی نے آنے کا وعدہ کیا تو خوشی سے اوچھل پڑے، ۲۵ رجون کو لکھا: "کیا آپ واقعی
یہاں جلوہ فرما ہوں گے، اور کیا درحقیقت ع میرے ویرانہ میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی، نامۂ والا کو بار بار پڑھتا
ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ع سچ سچ بتا یہ حرف انہی کے قلم کے ہیں"

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی صحت کا اعلان کیا، اور ان ہی کے اصرار سے ایک جلسہ مرتب
ہوا، لوگ مدعو ہوئے، شکرانہ میں سنو روپیے مولانا نے نذر کئے،

اورنیٹل کانفرنس اٹلی کا ارادہ جولائی ۱۸۹۹ء

صحت کے بعد تبدیلِ آب وہوا کی ضرورت تھی، حسنِ اتفاق یہ کہ اسال یورپ کی اورنیٹل کانفرنس (جو مشرقی اور اسلامی علوم و فنون کی
تحقیق کرتی ہی) کا اجلاس اٹلی میں ہو رہا تھا، اور اس حسنِ اتفاق پر حسنِ اتفاق یہ کہ سفر روم والے
رفیق پروفیسر آرنلڈ اسی زمانہ میں ۲۶ رجولائی کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اُس کی شرکت کے
لئے روانہ ہو رہے تھے، انھوں نے مولانا سے بھی سفر کی تحریک کی، وہ آمادہ ہو گئے، اپنے دو
عزیز دوستوں نواب سید علی حسن خاں، اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھا،

پہلے ۵ جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھا:- "ہاں ایک اور بات ہے، اٹلی کانفرنس اٹلی میں ہے، آرنلڈ ۲۶ جولائی کو روانہ ہوں گے، مجھ کو بلاتے ہیں، ضعف کی وجہ سے رُکتا ہوں، اگر آپ کی ہمسفری کی امید ہو تو میں قوی ہو جاؤں گا، کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ اسی سیر میں ممالکِ اسلامیہ کو بھی دیکھ آئیں گے، پانچ سات سو کا خرچ ہے، آپ چاہیں تو ذرا ٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں، (۱۱)

۱۴ جولائی ۱۸۹۹ء کو نواب سید علی حسن خاں کو بھوپال لکھا، (۱) "ایک نہایت ضروری امر گذارش ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں علومِ مشرقیہ کے علما کا ایک مجمع ہے، جس کو اورنٹیل کانفرنس کہتے ہیں، یہ نہایت معزز کانفرنس ہے، اور تمام یورپ و مصر و شام کے علما جمع ہوتے ہیں، اس دفعہ اس کا اجلاس اٹلی میں ہے، ریاست حیدرآباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لئے بھیجا ہے، اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے مسٹر آرنلڈ کو، میں بھی انشاء اللہ جاؤں گا، آپ قصد کریں تو متعدد فائدے ہیں، ریاست کی ناموری، آپ کو یونیورسٹی کا فیلو بننا آسان ہوگا، آپ کے عہدۂ ڈائرکٹری کی گورنمنٹ کے نزدیک نہایت وقعت بڑھ جائے گی، واپسی کے وقت مصر و قاہرہ کی سیر، لطفِ صحبت الگ، خرچ بہت سے بہت ایک ہزار مع خرچ واپسی، جواب سے مطلع فرمائیے۔"

بعد کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے یہ تجویز پیش کی، کہ آپ بجائے ذاتی خرچ کے قومی خرچ سے جائیں، غالباً نواب صاحب کا اشارہ اس جانب ہوگا، کہ وہ خرچ کے متحمل ہوں گے، مولانا نے جواب دیا:- آپ کی یہ تجویز کہ میں قوم کے روپیے سے جاؤں، آپ کے علمی مذاق کی دلیل ہے، لیکن اس کے دو پہلو ہیں، (۱) میری مالی اعانت، تو اس کی ضرورت نہیں، اور اگر کسی قدر ہے تو اسکو حمیتِ نفس نے رفع کر دیا ہے (۲) قوم کی علمی قدردانی کا ثبوت، تو اس قدردانی کا ثبوت اور لوگوں پر بھی ہو سکتا ہے۔"

مولانا: اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو

تو یہ پہلو پیشِ نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا، اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی دریوزہ گری کے لیے یورپ گیا تھا (۴)
معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے مجبوری ظاہر کی، اور وہ خود بھی دوبارہ بیمار پڑ گئے، اور وقت نکل
گیا، مگر علم کے شوق کا اندازہ کیجئے کہ اس دیرینہ علالت کے بعد بھی دماغ اُدھر ہی مصروف ہے،
اس کا ایک اچھا اندازہ اس زمانہ کے خطوط سے ہوگا،

امیر کابل کی پیشکش، جولائی و اگست ۱۸۹۹ء

ان ہی دنوں امیر عبدالرحمان خاں والیِ کابل نے اپنے ملک کے لئے ہندوستان میں ایک محکمۂ تراجم قائم کرنا چاہا، جو ہندوستان ہی میں رہ کر ہندوستان کے
فضلاء کے قلم سے فارسی میں علوم و فنون کا سرمایہ بہم پہنچاتا، اس کے لئے اپنی حکومت کے اشارہ
سے کابل کے سفیر نے مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی سے خط و کتابت کی، ان بزرگوں
نے معلوم نہیں کیا جواب دیا، غالباً معذرت کی ہوگی، مولانا شبلی اس وقت گویا علیل ہی تھے، اس
لئے چاہا کہ یہ کام مولوی حمید الدین صاحب کے سپرد ہو، اس سلسلہ میں ۳ جولائی ۱۸۹۹ء کو انھیں یہ
خط لکھا:- "آج کل ایک بڑی ریاست بلکہ سلطنت سے ابن خلدون کے ترجمہ کا استفسار آیا تھا، دس ہزار روپیہ
نقد دیتے ہیں، میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کر دیا، (حمید ا) ۹- اگست ۱۸۹۹ء کو نواب علی حسن خاں
کو ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں:- "اسی زمانہ میں سفیر کابل مقیم شملہ نے دس ہزار روپیہ نقد کے معاوضہ پر ابن خلدون
کے ترجمہ (بحکم امیر صاحب) کے لئے مجھ کو لکھا، میں نے انکار کیا، اگرچہ صحیح ہو کر بھی میں نے انکار لکھا" (۳)

پھر شکایات کا عود اور علمی مشاغل ستمبر ۱۸۹۹ء

مولانا کا ڈاکٹری علاج اب بھی جاری رہا، پہلے کے مقابلہ میں اب بہت اچھے تھے، اور علمی و قومی مشغولیتیں بھی ساتھ ساتھ تھیں، ایک
طرف نیشنل اسکول کی مالی امداد، اس کے آمد و خرچ کے برابر کرنے کی کوشش اور ماسٹروں کے مشاہرہ
کے لئے مہاجن سے قرض لینے کے سامان میں دن گذر رہے ہیں (اسحاق ۹-۱۰-۱۱) تو دوسری طرف

علمی انہماک بھی بڑھتا جا رہا ہے، الفاروق کے بعد اب کسی تصنیف کا خاکہ بن رہا ہے، ۱۰ ر جولائی کو مولانا شروانی سے معاملے ہو رہا ہے کہ آپ کیا لکھیں، میں کیا لکھوں، یا دونوں مل کر لکھیں، چند عنوان سامنے آتے ہیں، علوم القرآن، امام غزالی کی لائف، فارسی شاعری کی تاریخ (۱۲-۱۳-۱۴-۱۶)

۱۴ ر اگست کو ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ ہوتا ہے، اور مولانا روانگی کا ارادہ کرتے ہیں کہ پھر شکایتیں عود کر آئیں، ڈاکٹر صاحب موصوف اسی اثنا میں بدل کر گونڈہ چلے گئے تھے، آخر مولانا ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان سے علاج کرانے کے لئے گونڈہ روانہ ہو گئے، وہاں سے مولانا شروانی کو اپنی دوبارہ علالت کی اطلاع دیتے ہیں، اور اب سیر الصحابہ کی تجویز پیش ہو رہی ہے، ساتھ ہی اٹلی کی اورینٹل کانفرنس کا خیال اور ندوہ (شروانی ۱۶) ایک آدھ روز کے لئے لکھنؤ آتے ہیں، وہاں کے کسی کتب فروش کے پاس بعض نادر نسخے، تصاویر، قطعات دیکھتے ہیں، تو ۱۰ ر ستمبر کو شروانی کو کس خوشی سے لکھتے ہیں:

"اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے آجکل یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر، اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک نسخہ ہے، لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں، وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدابخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کرونگا (۱۶)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی یہ برکت ہوئی کہ بالآخر یہ خزانے حبیب گنج کے کتبخانہ میں داخل ہو گئے، ان میں سے ایک گلکاری کی بابت حال میں امریکہ کے ایک مؤلف نے لکھا ہے کہ دنیا میں منصور زمانی کے ہاتھ کی گلکاری کا نمونہ صرف ایک ہے، اور وہ حبیب گنج میں ہے" یہ تھی مولانا کی نقادی، دکھانا یہ ہے کہ مسلسل علالت کے ایام میں بھی دماغ اپنی کاروبار سے خالی نہیں، ۲۰ ر ستمبر کو گونڈہ کے شفاخانہ سے لکھتے ہیں: "میں صحیح ہو چلا ہوں، اور ساتھ ہی دار العلوم کا خیال آیا، مولوی خلیل الرحمانؒ صاحب عیادت کو آئے تھے، اور اُبھارا، بہرحال میں نے

ؒ مولوی خلیل الرحمان صاحب فرزند دوم مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رکن ندوۃ العلماء ۱۲

عالم خیال میں وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں، (۱۹) مولانا اکتوبر تک گونڈہ کے شفاخانہ میں مقیم رہے، گونڈہ میں ایک لطیفہ پیش آیا، قاضی خادم حسین[۱] صاحب جو مولانا سید امیر علی صاحب شہید کی بہن کے نواسے ہیں، اور جن کے نانا وہیں گونڈہ میں وکیل تھے، وہ اس زمانہ میں وہاں طالب العلم تھے اور نوجوان تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ "میں مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کا بیحد مشتاق تھا، مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی، مولانا کے گونڈہ آنے کا حال سُنا تو عقیدتمندانہ حاضر ہوا، اور شوقِ ملاقات عرض کیا،" فرمانے لگے، اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادہ کی کرامت تھی، اور اس طرح مجھے کھینچ کر گونڈہ بلایا گیا، یہ مقصد پورا ہو گیا، اور اب میں جلد اچھا ہو جاؤں گا" واقعی وہ چند روز کے بعد اچھے ہو گئے، اور گونڈہ سے چلے آئے، بہ ظاہر ملیریا نے مولانا کے جسم سے مفارقت کی، مگر حقیقت یہ کہ اخیر اخیر تک اُن پر اس کے حملے ہوتے رہے، یہاں تک کہ وفات سے ایک سال پہلے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک عزیز شاگرد کو جو کشمیر میں تھے لکھتے ہیں:- "جموں سے ایک انجمن کا سخت تقاضا آیا ہے، اخیر مارچ میں کوئی جلسہ ہے، کشمیر کا ارادہ تو کرتا ہوں، اور کشش کے اسباب بھی ہیں، خصوصاً یہ کہ حکومت کے بڑے بڑے ارکان میرے دوست اور شاگرد ہیں، لیکن مارگزیدہ از ریسماں می ترسد، ایک دفعہ اس قدر صدمہ اٹھا چکا ہوں کہ اب تک نہیں سنبھلا" (عبدالباری ۳)

قصیدۂ کشمیریہ | مولانا کا یہ سفر کشمیر، علالت کا یہ سلسلہ، مرض کا اشتداد، پھر علاج کا ایک اتفاقی سامان اور صحت مزاج مولانا کی زندگی کے بڑے اہم واقعے ہیں، گویا وہ مر کر پھر جی اُٹھے، صحت کے

---

[۱] جناب منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کے داماد،

بعد مولانا نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا، اور اس کا نام "قصیدۂ کشمیریہ" رکھا، اس کے شروع میں کشمیر کے باغ و بہار کی آرایش ہو، اُس کے بعد اپنی بیماری کا حال ہے،

بخت بنگر کہ ازاں بزم گہ مستی و ناز — بہرہ ام ہرچہ بود درد و غم و رنج و عناست
بعد یک ہفتہ کہ آسود تن از رنج سفر — تپ بہ من تاختن آورد و بکینم برخاست
چہ تپے بود کہ فرقے نہ توانستم کرد — کایں مگر آتش سوزندہ بود یا حمّی ست
درد آں مایہ بیفشرد سراپاے مرا — کہ تواں گفت کہ یک بہرہ زاندام کاست

اس کے بعد احبابِ کشمیر کی خدمت اور تیمارداری کا بیان ہے،

گرچہ با من نہ رفیقے بُد و نے خادمکے — ایزدم یک تباہی زدہ و خوار نخواست
بہ عزیزانِ دیار آگہی آمد کہ فلاں — آمد از ہند و زرنجوری تپ شکوہ سراست
ہر یک از ہر دو اں آمد و از غم خواری — پرسش و جوی بہ سزا کرد و پےٗ چارہ نخاست
رسمِ بیگانہ نوازی بود آئینِ عرب — می تواں گفت کہ کشمیر عرب را ماناست
خاصہ آں پیشروِ جادۂ معنی یعنی — سعدِ دیں آنکہ پسیں قافیہ بیت قضاست[1]
خاصہ مخدومِ من و یارِ من و یاورِ من — میرزا اسعد کہ در شہر امیر الاُمراست
آنچہ با من ز سرِ خستہ نوازی کردہ است — ہر بنِ موے ہنوزم بہ سپاسش گویاست

اس زمانہ کے ایک خط میں جس وصیت کا ذکر ہے، اُس کی تفصیل قصیدہ میں ہے۔

چوں یقیں شد کہ مرا نوبتِ رفتن بہ رسید — بہ وصیت ورق و خامہ نمودم درخواست

[1] قاضی کے گھرانے کے تھے،

شکرِ ایزد کہ درآں حالتِ آسیمہ سری | از زباں ہرچہ برآمد ہمہ آں بد کہ سزا است
ہرچہ از سیم و درم بود نہ املاکِ قدیم | واں کتب خانہ کہ انواعِ کتب را دارا ست
زاں ہمہ بیشترے وقف نمودم کو را | صرفِ آں کار تواں کرد کہ در شرع رواست
خاصہ بر مسجدِ پارینہ کہ در خانقہ[1] است | کہ ز بیمریِ ماختہ وبے برگ ونواست
خاصہ آں مدرسہ[2] کز پئے ابنائے وطن | طرحش افگندم و امروز بہ آئین و بہا ست

اس کے بعد ڈاکٹر مصطفےٰ صاحب کی اتفاقی آمد اور اُن کے پُرشفقت علاج کا تذکرہ ہے،

آخرِ کار ز لطف و کرمِ بارِ خدا | مردے از غیب بروں آمد و کارم شدہ راست
مصطفےٰ خاں کہ اسسٹنٹ سول سرجن ہست | از رہِ لطف بہ اعظم گدہ آمد ناخواست
داشت چوں سابقۂ معرفتے با اسحاق | کہ اخِ اصغرِ من ہست و بہر پایہ سزاست
از پئے دیدنِ من آمد و بر رسمِ فرنگ | دید اعضائے دروں را کہ مرض را مبداست
رو بہ من کرد و بہ فرمود کہ از غایتِ ضعف | کارِ خود می نہ کند دل کہ رئیس الاعضاست
لیک با ایں ہمہ از کار نہ رفتہ است ہنوز | می کنم چارہ و از ایزدم امیدِ شفاست
از سرِ مہر بہ تدبیر و علاجم پرداخت | ہم بداں شیوہ کہ طرز و روشِ اہلِ صفاست
تا دو مہ رسم چنیں بود کہ ہر روز مرا | امتحاں کردے و جستے خبر از ہر کم و کاست
بارے از فضلِ خداوندِ جہاں بعد سہ ماہ | بہ شدم گرچہ ہنوزم اثرِ ضعف بجا است

اس کے بعد اپنے دوستوں کو اپنی صحت کی خود مبارکباد دی ہے،

[1] مولنٰا کے وطن بندول کے پاس خانقاہ نام چھوٹا سا گاؤں ہے [2] نیشنل اسکول اعظم گڈہ جسکا اب نام "شبلی کالج اسکول" ہے۔

مژدۂ صحت من ہاں برسانند کنوں | ہر کسے راکہ بہ من دعویِ اخلاص و وفاست
می تواں گفت بہ مہدیؔ بہ حالیؔ و عزیزؔ | "بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست"
شبلیؔ امروز بود بلبلِ بستانِ سخن | کہ از و گلکدۂ ہند پُر از صوت و نواست
بعد یک عمر کہ از بندِ غم آزاد شدہ است | ہم چناں باز بہ آہنگِ کہن نغمہ سراست

مولانا حالی کا قطعۂ تہنیت | مولانا نے یہ قصیدہ چھپوا کر دوستوں کو تقسیم کیا، معلوم نہیں کہ مہدی و عزیز نے کیا جواب دیا، مگر مولانا حالی نے اس قصیدہ پر مختصر سا مبارکباد کا قطعہ لکھ کر بھیجا، جس کو میں نے ان کے قلم سے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا، اور جو ان کے ضمیمہ کلیاتِ فارسی میں بھی چھپ گیا ہے،

للہ الحمد پس از نا خوشی و رنجِ دراز | شبلیؔ ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست
آنکہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی است | آنکہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
آنکہ گر سر کند افسانۂ فضل و ہنرش (داستان) | خامہ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم و کاست
آنکہ خوانند شر، اگر فخرِ زمانِ خود و بس | کردہ باشند عدول اہل سخن از رہِ راست
بود در علتِ او علتِ قومی مضمر | لاجرم صحتِ او بہرِ ہمہ قوم شفاست
بسکہ او روح دمیدہ است بتاریخِ سلف | ہر قدر فخر بہ ذاتش بہ کند قوم رواست
زندہ تا دیر بماناد کہ بر قدر کسے | بعد از و خدمتِ تحقیق نمی آید راست

ندوہ کی یاد نومبر و دسمبر ۱۸۹۹ء | اس دیرینہ بیماری سے صحیح ہوتے تو ندوہ کی یاد نے ستایا، گو ندوہ ہی سے ۲۸ ستمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھ چکے تھے، کہ "اگر آپ یا

لہ مہدی سے مراد نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں، اور عزیز سے مقصود خواجہ عزیز الدین لکھنوی ہیں،

اور ارکان (ندوہ) مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں، تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں، میری جو تجویزیں ہیں وہاں چلنے نہ پائیں گی، البتہ یہ ہوگا کہ گروہ بندیاں اور نزاعیں قائم ہوں، پھر لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ سوچ سمجھ کر جواب لکھئے، اور مولوی محمد علی صاحب (ناظم ندوہ) سے مشورہ کیجئے" (۱۹)

پھر ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لکھا:- "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ندوہ کی خدمت کرسکوں تو دس پندرہ روز کے لئے لکھنؤ میں آکر قیام کیجئے، میں کارروائی اور طرز عمل کا نقشہ پیش کروں گا، اس پر رائے دیجئے، اور ارکان بھی پورے غور و فکر کے ساتھ بحثیں کریں، پھر جو امر منقح قرار پائے اس پر عمل کیا جائے، اور اس کا خاکہ ڈالا جائے اس وقت جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں شریک ہونا میں قومی گناہ سمجھتا ہوں، اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی معراج خیال ہے، پھر میری کھپت وہاں کیونکر ہوسکتی ہے، تاہم حجت کیلئے لکھنؤ جانے والا ہوں" (۲۰)

گذشتہ جلسۂ انتظامیہ میں جو غالباً اگست ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا، مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا، جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا تو کفر نہیں رہا تھا، مگر علماء کا انگریزی سیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا، مولانا اس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے، انھوں نے تحریک کی، اور مولوی یونس خاں صاحب (رئیس وتاؤلی علیگڈھ) نے تائید کی، مگر اس وقت علماء کی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہوسکی، تب مولانا نے یہ فرمایا کہ "اچھا تو یہ تحریک درج روداد کرلی جائے، اب جو روداد چھپ کر آئی، تو اس تحریک کا ذکر تک نہ تھا، (شروانی ۲۱) ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا میں اور مولانا شروانی میں اس مسئلہ پر تحریری گفتگو تک نوبت پہنچی، اور لکھا کہ "مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے" (شروانی ۲۲) تفصیل آگے آئے گی،

سفر ایران کا قصد دسمبر ۱۸۹۹ء | صحت کے بعد تفریح خاطر کے لئے کسی بیرونی ملک کی سیر و سیاحت

خیال پھر آیا، اٹلی کا موقع نکل چکا تھا، ایران کا خیال آیا، ان دنوں مولوی حمید الدین صاحب مدرستہ الاسلام کراچی میں تھے، ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو انھیں لکھا کہ "بوشہر اور بصرہ جانے والے جہازات کو تھے دن جایا کرتے ہیں، سکنڈ کلاس کا کرایہ بندر عباس تک کیا ہے، قسطنطنیہ کہاں ہوتا ہے" (حمید ۱۱)

جواب کیا آیا، معلوم نہیں، مگر سفر نہ ہو سکا اور ہندوستان سے باہر نہ جا سکے، بلکہ اپنے وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے

شبلی منزل میں ۱۹۰۰ء | یہ سال انھوں نے زیادہ تر اپنے وطن اعظم گڈھ، اور اپنے بنگلہ شبلی منزل میں بسر کیا، بعض خانگی ضرورتوں نے بھی ان کو اس قیام پر مجبور کیا، پانچ برس ہوئے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، اب تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا، اور نہ ارادہ تھا، مگر اُن کے معالج ڈاکٹر مصطفیٰ خاں نے دوسرے نکاح کا مشورہ دیا، اور یہ مشورہ قبول ہوا، اور مولوی محمد سمیعؓ صاحب کی ماموں زاد بہن سے نسبت ٹھہری، عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے صاحبزادہ حامد حسن صاحب کو ناگوار گذرا، اور وہ چپکے سے لاپتہ ہو گئے، اور دربھنگہ پہنچکر باپ کو خط لکھدیا کہ "اب آپ ہم سے مایوس ہو جائے"۔ باپ کو اپنے اس یوسف کے گم جانے کا بڑا صدمہ ہوا، دو روز تک کھانا پینا چھوڑ دیا، اور روتے رہے، یہاں تک کہ نکاح کی تاریخ گذر گئی، بیٹی والوں نے اس کو بُرا مانا، مگر مولانا نے اس کی پروا نہ کی، ایک صاحب کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۰۰ء میں جو درج مکاتیب نہیں، یہ پوری کیفیت خود اپنے قلم سے لکھی ہے، "حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا، ۱۱ اپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ مجھ کو اب بھول جائیے"، اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی، کہ میں بالکل بدحواس ہو گیا، چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا، اور ہر وقت رویا کرتا تھا، اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی، لوگوں کو اصرار تھا، کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہئے، لیکن مجھ کو دل پر قابو

---

[1] یہ وہی ہیں جن کے نام کے اکثر خطوط آپ پڑھتے آئے ہیں،

نہ تھا، نہ جا سکا، ادھر مہمان وغیرہ آچکے تھے، اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی، وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڈھ ہی میں نکاح ہو جائے، میں اس پر بھی راضی نہ ہوا، البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا،

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چلدیئے، اور بالکل پتہ نہیں، اور غالباً مہینوں تک

بہرحال حامد صاحب دربھنگہ سے قصبہ بہار شریف پہنچے، وہاں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا جن کی مکتوبات مشہور ہے، مزار اور خانقاہ ہے، اس خانقاہ کے اس وقت سجادہ نشین شاہ امین احمد صاحب ایک مشہور بزرگ تھے، علاوہ فقر و تصوف کے وہ فارسی زبان کے بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے، حامد صاحب اُن کے جا کر مرید ہوئے اور گیروا کپڑے پہن کر ترکِ دنیا کیا، ایک آدھ مہینہ تک تو فقر و فاقہ سے زندگی بسر کی، پھر جب مانا تو شاہ صاحب سے والد ماجد کا نام لیا، وہ سُن کر بہت مہربان ہوئے، اور مولانا کو خط لکھ کر مطلع کیا، اور ساتھ ہی اپنی بعض فارسی مثنویاں مولانا کی خدمت میں بھیجیں، جن میں سے ایک مثنوی کا ذکر مولانا مجھ سے فرماتے تھے جو بہاء الدین آملی کی مثنوی نان و حلوا کے جواب میں لکھی تھی، شاید اُس کا نام شہد و شیر تھا، بیٹے کی اطلاع پا کر مولانا نے ایک دو معتبر آدمیوں کو بھیجا، اور شاہ صاحب نے حامد صاحب کو سمجھا بجھا کر اُن کے ساتھ کر دیا، وہ اس وقت جس حلیہ میں آئے اس کا ذکر مولانا نے ایک خط میں کیا ہے، جو ۵ مئی ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کے نام لکھا ہے:- "شفیع ماسٹر اُس کو جا کر لے آئے، لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا، وہ گیروا کرتہ اور گیروا تہمد تھا، اس نے فقر اختیار کیا، اور صرف اس وجہ سے یہاں آنے پر راضی ہوا، کہ اس کے پیر نے اطاعت والدین پر اس کو مجبور کیا، وہ پھر جانے کے لئے مضطرب ہے، اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا،

فقر عمدہ چیز ہے، لیکن وہ جوگیانہ قالب میں جانا چاہتا ہے، اور اس میں کوئی ریاکاری نہیں، صرف دماغ کی خرابی کا قصور ہے، اور اصل چیز میری قسمت"!

بہر حال حامد صاحب پھر واپس نہیں گئے یہیں رہے، مولانا نے جون ۱۹۰۰ء میں نکاح بھی کرلیا، شبلی منزل والے بنگلہ میں ایک زنانہ حصہ بھی اٹھایا، تاکہ رخصتی کے بعد وہ یہاں رہ سکیں،

درس

ان دنوں اعظم گڈہ میں رہ کر بعض شائق عزیزوں کو ادب کی بعض کتابوں کے سبق شروع کرائے، ہمارے دوست مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل نے جو بعد کو علی گڈہ سے ایم اے، ایل ایل، بی ہوئے، اور اب ماشاء اللہ ہمارے صوبہ کے ایم، ایل اے ہیں، اور فارسی واردو کے ممتاز شاعر اور کامیاب وکیل ہیں، یہیں اسی زمانہ میں اُن سے حماسہ وغیرہ کے اسباق پڑھے، اور ان کی صحبت میں رہ کر فارسی شاعری کا مذاق پیدا کیا،

الغزالی کا خاکہ

مولانا اب تاریخ کے دیکھے بھالے کوچہ سے ہٹ کر فن کلام کی طرف متوجہ تھے، اور غالباً انھوں نے اسی زمانہ میں یہیں بیٹھ کر علم کلام کا ایک خاکہ تیار کیا، جس کا ہیولیٰ جولائی ۱۸۹۹ء سے اُن کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا، (شروانی ۱۴۰ و ۱۴۱) اور علم کلام کے سلسلہ میں بھی غالباً امام غزالی کی لائف پیش نظر تھی، جس کی تحریک ۱۸۹۳ء میں سرسید نے کی تھی، اب بارگاہ فاروقی کے جلووں سے فرصت پاکر امام غزالی کا دربار سجانے کی فکر لاحق ہوئی، ۸- جون ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں: - "لوئی کی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہے کہ اگر احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ میں ہو چکا ہوتا تو ضرور یہ گمان کیا جاتا کہ ڈیکارٹ کا فلسفۂ اخلاق غزالی سے ماخوذ ہے، اور دوسری کسی کتاب میں (اسکا ذکر تم نے کیا تھا) ہے کہ کتاب مذکور کا ترجمہ فرنچ میں ہو گیا تھا، ان دونوں عبارتوں کا ترجمہ لفظ بلفظ بھیجو، بہت ضرورت ہے"،

ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں عدم شرکت

ندوہ کا چھٹا اجلاس ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء میں

شاہ جہان پور میں اور ساتواں اجلاس رجب ۱۳۱۸ھ مطابق سنہ ۱۹۰۰ء میں پٹنہ میں ہوا، ان دونوں اجلاسوں میں وہ شریک نہ تھے، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، یہ اُن کی زندگی کے نہایت سخت سال گذرے، سنہ ۱۸۹۹ء میں وہ اکثر بیمار، اور سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشان رہے،

پھر افغان دارالترجمہ جولائی سنہ ۱۹۰۱ء امیر کابل فارسی کتابوں کے لئے جو دارالترجمہ ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، کہ سفیر صاحب کابل نے بیش قرار معاوضہ پر بعض کتابوں کے ترجمہ کے لئے مولانا کو لکھا، اور مولانا نے انکار کیا، اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بعض اعزہ و احباب نے یہ دیکھ کر کہ اس بیکاری سے بہتر یہ ہے کہ اس بیگاری کو قبول کر لیا جائے، اور مولوی حمید الدین کو جو عربی اور انگریزی دونوں کے ماہر تھے اس کام میں لگایا جائے، اس بنا پر مولانا نے سفیر صاحب کو پھر اپنی رضامندی لکھ بھیجی، سفیر صاحب نے یہ معلوم کر کے کل ترجمہ اور اس کا سارا اہتمام مولانا کے سپرد کر دیا، اور اس کے لئے سردست دس ہزار کی رقم منظور کی،

اسی کے ساتھ امیر کابل نے یہ چاہا کہ کلکتہ میں وہ انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا محکمہ قائم کریں، جس میں چار انگریزی اور سولہ ہندوستانی ملازم ہوں، اور اس محکمہ کے سکریٹری مولانا ہوں' مگر انھوں نے اس سے انکار کیا، اور معاملہ انجام نہ پایا، (حمید ۱۳)

نیشنل اسکول ان دنوں نیشنل اسکول کے اہتمام و انتظام کے لئے فکر و پریشانی کا سلسلہ جاری ہے،

علی گڑھ کی مجلس دینیات اور ندوہ

علی گڑھ کالج میں دینیات کی ایک کمیٹی بنی تھی جس کے ناظم مولانا شروانی قرار دیئے گئے تھے، اس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے، ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ کو اس کی یادداشت پر رائے ظاہر فرمائی، اور مولانا شروانی کو لکھا کہ اس کے نصاب میں حدیث کا انتخاب قطعاً شامل ہونا چاہیئے (شروانی ۸۰ و ۲۴) جولائی ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ درپیش ہونے پر اس کی نسبت شروانی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی (شروانی ۲۴)

ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی بدگمانی کا زمانہ ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء

مولانا اعظم گڈہ میں ان دنوں اپنے خانگی حالات میں ایسے مصروف رہے کہ اُن کے مخلص دوستوں کو بھی ان کی اطلاع نہیں رہی،

یہ وہ زمانہ تھا کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر مکڈانلڈ صاحب تھے، ان کی نظر مسلمانوں کی طرف کچھ یوں ہی تیز تھی، اس پر یہ ندوہ کی تحریک کے اوج کا زمانہ تھا، ہماری بدقسمتی اکثر ذاتیات سے شروع ہوتی ہے، لکھنؤ میں ندوہ کے بڑے حامی منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کاکوروی تھے، جو وہاں کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ داران اودھ کے مشیر قانونی تھے، اور اُن کے حریف چودھری نصرت علی صاحب سندیلہ تھے، چودھری صاحب نے منشی صاحب کو شکست دینے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور جیسا کہ سنا جاتا ہے انھوں نے لفٹنٹ گورنر تک ندوہ کی تحریک کی سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہنچائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو چھوڑ دیا، منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ میں حجاز تشریف لے گئے، اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام

ناظم ہوے، مگر انھوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا، پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے،

مولانا شبلی مرحوم کی حالت سے بیخبری کے سبب سے اُن کے دوستوں کو اُن کے متعلق بھی تشویش تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۶ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو خط لکھا: "مدت سے شمس العلماء مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں، ندوۃ العلماء کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سُنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعہ سے کوئی بات آجتک نہیں سُنی گئی، نواب لفٹنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے"؟

مولانا کا معاملہ گو اس بدگمانی سے بہت آگے نکل چکا تھا، تاہم وہ اس وقت وطن میں یا علیل تھے یا خانگی افکار میں مبتلا،

والد کی علالت اور خانگی پریشانی
۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۱۰ء

صحت کے بعد اب وقت آیا تھا کہ مولانا آرام کریں، یا سیر و تفریح کے لئے کہیں باہر تشریف لیجائیں، مگر قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا، اسی اثنا میں اُن کے والد ماجد ایک سخت علالت میں مبتلا ہوے، جو آخر کو مرض الموت ہی ثابت ہوا، نومبر میں اُن کی حالت بہت خراب ہوئی، ۱۰ر نومبر سنہ ۱۹۱۰ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں: "استقلال و متانت کی حد ہو گئی، والد کی حالت بیم و امید کی ہو چکی ہے بلکہ بیم کا پہلو غالب ہے، تمام اطراف کے آدمی روزانہ ان کو دیکھنے کو آتے ہیں، مستورات سب آئیں، خود والد ہر وقت تم کو پوچھا کرتے ہیں" (۱۶)

مولانا برابر اُن کی تیمارداری اور دوا و علاج میں مصروف رہے، مگر محکمۂ تقدیر کا فیصلہ ٹل نہ سکا، ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۱۰ء کو انھوں نے وفات پائی، خاندان بلکہ تمام شہر میں کہرام مچ گیا، حکام

تک متاثر ہوئے، عدالتیں بند ہو گئیں، پورے ضلع نے ان کے وجود سے محرومی کا غم کیا، یہ صرف ایک کامیاب وکیل کی موت نہ تھی، بلکہ ایک فیاض، ہر دلعزیز، اور قوم کے ایک ممتاز و نامور زبردست فرد فرید کی موت تھی، بیٹے پر اس حادثہ کا جو اثر پڑا، وہ مرثیہ سے ظاہر ہے،

ہاں اے پدر نہ گویمت ایں ور زو آں مکن — زنہار عزم رہروی آں جہاں مکن
دستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بہ دہر — ما را بہ نوحہ، زمزمہ سنج فغاں مکن
کوہ غم فراق تو انم کہ برکشم — با چوں منے شکستہ و زار ایں گماں مکن
پیرانہ روئے روشن تو آفتاب بود — ایں آفتاب از نظر ما نہاں مکن

رفتی و حال قوم نہ دانی کہ چوں شدہ است — دلہا تمام از غم و از غصہ خوں شدہ است
ایوان قوم کز تو سرش چرخ سود بود — در جنبش است و کنگرہ ہاش نگوں شدہ است
آں قوم کز تو پایۂ جاہش بلند بود — زار و نژند و خستہ و خوار و زبوں شدہ است
آں صفحہائے دفتر اقبال پارہ گشت — آں کاسہائے خوان نعم واژگوں شدہ است

در شہر کیست کز غم تو دیدہ تر نہ کرد — یکدل نبودہ است کہ صد نالہ سر نہ کرد
دانستہ پاس خاطر ایشاں نہ داشتی — یا کس ترا ز حال عزیزاں خبر نہ کرد

آخری بند میں موت کے وقت کا عجیب دلدوز و پُر اثر نقشہ کھینچا ہے،

آہ آں زماں کہ درد تنش را نزار کرد — آثار مرگ بر رخ و نبض آشکار کرد
عم بزرگوار کہ آسیمہ سر دوید — حالش بدید و گریۂ بے اختیار کرد
شبلی رسید و نالہ زد و بسمل اوفتاد — اسحاق آمد و مژہ را اشکبار کرد

مستور خانہ آمد و از سینہ بر کشید — آں تیر آہ کز دلِ گردوں گذار کرد

غمزدہ بیٹے نے مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم مددگار ناظم ندوہ کو اُس زمانہ میں اپنے والد کی وفات کی خبر ایک کارڈ پر لکھ کر دی تھی، اتفاق سے ندوہ کے دفتر کے بے کار کاغذات میں وہ کارڈ مجھے مل گیا تھا، ایک ہی سطر تھی:" "دریغا کہ یتیم گشتم"۔

اس اختصار کی بلاغت پر طولِ بیان کی ہزاروں سطریں قربان!

خانگی مصائب دسمبر ۱۹۰۰ء

شیخ صاحب کی موت ایک تنہا مصیبت نہ تھی، بلکہ بہت سی مصیبتوں کا مجموعہ تھی، وہ ایک ہرے بھرے، سرسبز وشاداب خاندان کے سرپرست تھے، اُن کی سرپرستی کی محرومی سے سارے خاندان پر زوال آیا، شیخ صاحب نے پہلی بیوی (مولانا اور اُن کے بھائیوں کی والدہ) کے علاوہ غیر کفو میں جو شادی کی تھی اپنی زندگی ہی میں ۱۸۹۲ء میں اپنی جائداد کا ایک حصہ اُس بیوی کے نام ہبہ کر دیا تھا، جس سے مولانا اور اُن کے بھائیوں کو سخت اختلاف تھا، اس کی تفصیل مکاتیب کے ایک خط (اسحاق ۳) میں مذکور ہے، شیخ صاحب نے اپنی چھ سات ہزار کی آمدنی کی جائداد کے ساتھ تینتیس ہزار[1] کا قرض چھوڑا، قرض کے سوا شیخ صاحب کا بڑا کارخانہ پھیلا تھا، جس کو قائم رکھنے کے لئے ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی، سوتیلی ماں اور ان کے طرفداروں سے الگ جھگڑے کی صورت تھی،

باپ کی زندگی بھر مولانا اپنی سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی اُن کے نام سے بیزار تھے، ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے، مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی[2] میں

---

[1] شروانی، ہم حمید ۲۰ میں غلطی سے تیئیس ہزار چھپا ہے، تینتیس ہزار چاہیئے [2] اعظم گڈھ میں زمینداری کے

جہاں وہ رہتی تھیں تشریف لے گئے، ماں کے قدموں پر گرے، عمر بھر کی معافی مانگی، اور ایسی سعادتمندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں، یہ بھی مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے،

بہرحال مولانا چونکہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لئے تمام مشکلات کا بار اُن ہی کے سر پڑا، قرضخواہوں اور مہاجنوں نے ہر طرف سے آکر اُن کو گھیرا، مقدمات شروع ہوئے اور مقدمات کی پیروی چھڑی، اُسی حالت میں مولانا نے فرمایا "کاش والد ایک حبہ نہ چھوڑتے مگر یہ قرض تو نہ چھوڑ جاتے"۔ بہرحال یہ وہ صورتِ حال تھی جو ان کے مذاق کے بالکل برخلاف تھی اور ان کی پریشان دلی اور پراگندہ خاطری کے لئے بالکل کافی تھی، مگر اس ذمہ داری کو بھی جس سے عمر بھر اُن کو لگاؤ نہیں رہا، پوری طرح اٹھایا، ۵ ر دسمبر ۱۹۰۰ء کو بھائی کو الہ آباد جہاں وہ وکالت کر رہے تھے لکھا:- "دیوارہ میں اگر تقسیم کا انتظار کروگے تو اس سال کی تحصیل بھی غارت جائے گی، میری دانست میں مناسب ہو کہ ابھی سے اپنا خاص کارندہ مقرر کردو، جو اس سال کے اپنے حصہ کی تحصیل کرے، اور اسامی بٹ کے طور پر کاغذات بھی درست کرتا رہے، باقی علاقہ جات گاؤں پٹی، جگدیش پور، ڈریکی، بلریا وغیرہ ٹھیکہ دے دینا چاہیئے، مصارفِ سیر، مشاہرہ ملازماں، خرچ مقدمات، خرچ ڈیوڑھی بندوں کا ایک موازنہ (بجٹ) بنا کر مجھے بھیجدو تاکہ ماہ بہ ماہ اس کے مہیا کرنے کا بندوبست کرسکوں، (اسحٰق)

اس کے بعد ۲۰ دسمبر کے خط (۱۸) میں اسحاق مرحوم کو زمینداری کے کاغذات، مقدمات مصارف اور تمام دشواریوں کو ذکر کرکے بلایا ہے، اور آخر میں لکھتے ہیں:- "انکار کا ایک گھنگھور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵) محلہ کے مکان کو جسکو ہماری طرف زمینداری کچہری کہتے ہیں چھاؤنی کہتے ہیں، اعظم گڈھ محلہ بہادر پور میں شیخ صاحب کا ایک بڑا مکان تھا جس کو اسی لئے چھاؤنی کہتے تھے، شیخ صاحب کی دوسری بیوی اسی مکان میں رہتی تھیں، اسی لئے وہ چھاؤنی والی کہلاتی تھیں، مکاتیب (اسحاق ۳) وغیرہ میں ان کو "ا. باب چھاؤنی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے،

[۱] گھاگھرا کے کنارے مواضعات کا ایک سلسلہ ہو [۲] جو کاشت خود کی جائے،

بادل چھایا ہے، دیکھئے کیونکر چھٹتا ہے۔"

لیکن یہ گھنگھور بادل مولانا کے حسنِ نیت کی برکت سے چھٹ گیا، مولانا نے مظفر کو جو محروم و مجوب تھا اپنی جائداد میں شریک کر لیا، اور اُس کا نام بھی ورثہ کی رضامندی سے حصہ دار وں میں داخل کرا دیا، بچہ کی دادی یعنی مولانا کی سوتیلی ماں نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر یہ کیا کہ جو جائداد شیخ صاحب اُن کو ہبہ کر گئے تھے واپس کردی، یہ واپس شدہ جائداد قرضخواہوں کو دیدی گئی، اور قرض کے بڑے حصہ کے بوجھ سے وہ ہلکے ہوگئے، باقی قرض کی ادائیگی کی فکر بھی اُن کو دامنگیر ہوئی، ان ہی دنوں مسٹر آرنلڈ نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، اُن کو لاہور میں ایک خدمت پر بلوایا، جو غالباً اورنٹیل کالج لاہور میں عربی یا فارسی کی پروفیسری ہوگی، مگر انھوں نے وہاں جانے سے انکار کیا، اور اعظم گڈہ ہی میں رہے، مگر قرضخواہوں اور مقدمات کے چپراسیوں کی آمدورفت سے پریشان خاطر تھے، آخر فروری سنہ ۱۹۰۱ء کی کسی تاریخ کو ایک دن جیسا کہ مولانا خود فرماتے تھے، شہر سے نکل گئے، پہلے تو یوں ہی غازی پور کا ٹکٹ لیا، وہاں سے دفعۃً علی گڈہ چل کھڑے ہوے، علی گڈہ میں نواب محسن الملک نے حیدرآباد کا مشورہ دیا، اور وہ حیدرآباد روانہ ہوگئے، ممکن ہے کہ اس سفر کی عجلت اور حیدرآباد کے انتخاب کے مشورہ میں بعض سیاسی اسباب سے جن کا اشارہ اوپر گذر چکا برطانی ہند سے دور ہو جانے کی مصلحت بھی شامل ہو،

حیدرآباد میں قیام
فروری سنہ ۱۹۰۱ء - فروری سنہ ۱۹۰۵ء

مولانا نے فروری سنہ ۱۹۰۱ء کے آخر میں حیدرآباد کا رُخ کیا، راستہ میں بھوپال[1] پڑا، اُن کا جی چاہا کہ نواب سید علی حسن خاں کی ملاقات کے لئے وہاں ایک دو

---

[1] مکتوباتِ حالی جلد اوّل صفحہ ۱۴۱،

دن ٹھہر جائیں، مگر چونکہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ بھوپال بیمار تھیں اس لئے وہ بھوپال نہیں ٹھہرے اور سیدھے حیدرآباد چلے آئے،[1]

مولانا حیدرآباد پہنچکر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے جو اُس وقت ہوم سکریٹری تھے مہمان ہوئے، دوسرے روز جب مولوی سید علی بلگرامی کو اس کی اطلاع ملی تو وہ جاکر خود اُن کو اپنے گھر لے آئے[2] لوگوں کو خبر ہوئی تو ہر طرف سے اُن کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مارچ میں مولانا کی تقریر کے لئے ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع ہوا، وزیر عدالت جلسہ کے صدر تھے،[3] مولانا نے علم کلام پر ایک مبسوط محققانہ تقریر فرمائی، یہ تقریر گو زبانی تھی، مگر مولانا کی تقریر بھی مقالہ کی شان رکھتی تھی، ایک صاحب اس تقریر کو قلمبند کرتے گئے، اور جتنا حصہ قلمبند ہو گیا اسکی اشاعت کا خیال ہوا[4]

امور مذہبی کی نیابت | نواب مدار المہام بہادر یعنی وزیر اعظم نے نہایت احترام سے مولانا کو شرفِ نیاز بخشا، اور اُن کو حیدرآباد کے قیام کی ترغیب دی، حیدرآباد میں امور مذہبی کا محکمہ حکومت کا بہت بڑا صیغہ ہے جس کا بجٹ کئی لاکھ کا ہوتا ہے، اور جس کے ماتحت ریاست کے تمام مذہبی ادارے مساجد، منادر، آتشکدے، گرجے، گردوارے وغیرہ امکنۂ مذہبی اور اوقاف ہیں، نواب مدار المہام نے اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں اس صیغہ کی خدمت مولانا کو سپرد کرنی چاہی، لیکن مولانا نے اسکو منظور نہیں فرمایا[5]

مولانا نے اپنے خطوط میں اس بات کی تصریح نہیں کی ہے کہ امور مذہبی کا کون سا عہدہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا تھا، لیکن مولانا حالی نے اپنے ایک خط میں (مورخہ ۷ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حوالہ سے جو اُن دنوں حیدرآباد میں تھے، مولوی عبد الحق صاحب (موجودہ

---

[1] علی حسن خاں ۴ [2] سیر المصنفین صفحہ ۲۶۴ [3] سمیع ۴ [4] علی حسن خاں ۴ [5] علی حسن خاں ۴ سمیع ۴

سکریٹری انجمن ترقی اردو) کو حیدرآباد یہ لکھا ہے:۔ "شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر، عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا خوشی ہوئی، اگر آپ اُن سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہدیجئے کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملیگا، اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے[۱]"

مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مولانا نے اس عہدہ کو قبول نہیں فرمایا، شاید اس کی ایک وجہ تنخواہ کی کمی ہو، اس عہدہ کی تنخواہ چارسو روپیہ مولانا کو دی جانے والی تھی، ۷۔ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں:۔ "مجھ کو جو کچھ (جو عہدہ) دیتے ہیں، اس میں اس وقت مجھ کو ۵۰۰ روپیہ ملیں گے لیکن میں نے اس سے انکار کیا، چونکہ نواب مدار المہام اس سے زیادہ کے مجاز نہیں ہیں، اس لئے حضور میں بڑے زور کے ساتھ تحریری سفارش بھیجی ہے، اس کا جواب نہیں آیا، اور بہت کم توقع ہے کہ آئے، حضور اور مدار المہام کی ناچاقی بڑھتی جاتی ہے[۲]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔ "بڑی کامیابی ہوتی لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں، اور وزیر اعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے گھٹا دیئے ہیں، اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے، یہ صرف چند روز سے ہوا ہے[۳]"

بات یہ ہے کہ حیدرآباد کے سیاسی حالات اس وقت سخت نازک تھے، حضور نظام میر محبوب علی خاں اور مدار المہام سر وقار الامراء کے درمیان سخت چپقلش تھی، مولوی عزیز مرزا مرحوم

---

[۱] مکتوبات حالی ص۱۸۔ [۲] اسحاق ۱۹۔ [۳] سمیع ۴۷۔

اور مولوی سید علی بلگرامی مرحوم دونوں کے وہی مربی اور سرپرست تھے، اور انہی دونوں کے ذریعہ سے مولانا حیدرآباد میں توسل کے خواستگار تھے، اسی زمانہ میں سید علی حسن (نواب محسن الملک کے بھائی) کو جو نواب مدارالمہام بہادر کے سب سے بڑے رکن تھے، حضور نے دفعۃً موقوف کردیا، ان کیساتھ ایک انگریز کو بھی، مولانا لکھتے ہیں :- "حیدرآباد میں اس وقت زلزلہ آگیا ہے، تمام لوگ کانپ اٹھے ہیں، خصوصاً ہندوستانی خاص طور پر مورد عتاب ہیں" (اسحاق ۱۹)

دماغی کشمکش ان حالات میں مولانا ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے، کبھی یہ چاہتے تھے کہ یہاں کی نوکری قبول کریں، اور کبھی نوکری کی قید و بند کو سوچتے تو قناعت کی زندگی کا خیال آتا، اس حال میں ۷- اپریل ۱۹۰۱ئہ کو اپنے بھائی اسحاق مرحوم کو اپنا ارادہ بتاتے ہیں :- "اب میرا ارادہ سنو، میں نے یہ عزم کرلیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپیے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچیگا اس سے غریبانہ زندگی خاص طرح بسر ہوسکتی ہے، لکھنؤ یا علی گڈھ میں بستر ہوگا، اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ، تنہائی اور بے تعلقی میں انشاء اللہ قوم کی خدمت اچھی طرح بن آئے گی، کالج تو میری مدد کا محتاج نہیں، لیکن ندوہ کام کرنے کی جگہ ہے، اور بہت کچھ کیا جاسکتا ہے"

پھر ۱۲- اپریل ۱۹۰۱ئہ کو سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں :- "بہرحال دیکھئے کیا ہوتا ہے، بےشبہہ اگر ملازمت کرسکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع!

---

[1] حیدرآباد والا وظیفہ [2] چھاؤنی سے مقصود سوتیلی ماں ہیں، اور عالیہ مہدی مرحوم کی بیوہ کا نام ہے، اور اسکول سے نیشنل اسکول مقصود ہے، مولانا ان سب کو کچھ ماہوار دیا کرتے تھے، یہ اسی کا حساب بتا رہے ہیں،

عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لئے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں[۱]"

۱۷۔ جون ۱۹۰۱ء کو اُن ہی کو پھر لکھتے ہیں :۔ " میں یہاں آکر ایسا پھنس گیا کہ ع نہ بھاگا جائے ہی مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے، ہمت کہتی ہے ع بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است، مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے[۲]"

سلسلۂ آصفیہ اور سر رشتۂ علوم و فنون

الفاروق کے پڑھنے والوں کو سلسلۂ آصفیہ کی تھوڑی سی تاریخ معلوم ہے، مولانا شبلی مرحوم الفاروق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں : " ہمارے معزز اور محترم دوست شمس العلما مولانا سیّد علی بلگرامی جمیع القابہ کو تمام ہندوستان جانتا ہے وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زباندان ہیں، اُسی طرح بہت بڑے علم دوست، اور اشاعتِ علم و فن کے بہت بڑے مربّی اور سرپرست ہیں، اس دوسرے وصف نے اُن کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انھوں نے جناب نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک سر وقار الامرا، بہادر مدار المہام دولت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ حضور پُرنور مظفر الممالک فتح جنگ ہز ہائنس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کے سایۂ عاطفت میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے، جو سلسلۂ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو، اور وابستگانِ دولت آصفیہ کی جو تصنیفات خلعتِ قبول پائیں وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں جناب نواب صاحب ممدوح کو علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی طرف ابتداء سے جو التفات

[۱] حیدرآباد کی مشہور شاہی عمارت،
[۲] مجموعۂ
[۳] مجموعۂ
۱۳

و ترجمہ رہی ہے اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں اُس کے لحاظ سے جناب ممدوح نے اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے، اور ہمارے شمس العلماء کی کتاب "تمدنِ عرب" جس کی شہرت عالمگیر ہو چکی ہے، اس سلک کا ایک بیش بہا گوہر ہے، خاکسار کو ۱۸۹۶ء میں جناب ممدوح کی پیشگاہ سے عطیہ ماہوار کی جو سند عطا ہوئی اس میں بھی یہ درج تھا کہ خاکسار کی تمام آیندہ تصنیفات اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔"

مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید علی بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں:- مرحوم مولوی سید علی بلگرامی نے نواب سر وقار الامراء بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے (سید علی) مرحوم اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے، اور اُن کی زیرِ نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں، لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی لائق شخص اونھیں نہ ملا تھا، لہذا انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا، اور اُن کا تقرر خدمت ناظم سررشتۂ علوم و فنون پر بہ مشاہرہ چار سو ہوا، اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں، (چند ہمعصر از مولوی عبدالحق صاحب ص۱۵۲)

اس متن کی شرح نواب جیون یار جنگ بہادر کے اُس مقدمہ میں ہے جو انھوں نے تمدنِ عرب کے دوسرے اڈیشن پر ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے:- "سر وقار الامراء بہادر کے عہدِ وزارت میں ڈاکٹر سید علی کی سعی و کوشش سے حکومت نے سررشتۂ علوم و فنون کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ اُردو میں علمی کتابیں مہیا کی جائیں، اور اُن کو خاص اہتمام کے ساتھ چھپوا کر

شائع کیا جائے، اس سررشتہ کے نگراں کار ڈاکٹر سید علی مقرر ہوئے، نظامت کے لئے مولانا محمد مرتضیٰ فلسفی کا انتخاب ہوا، چار سال کے بعد ۱۹۰۱ء میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کو یہ خدمت ملی، یہ سررشتہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۴ء تک قریباً دس سال[1] قائم رہا،"

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی سید علی بلگرامی کی تحریک سے ۱۸۹۴ء میں حیدر آباد میں سررشتۂ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا، اور اس کے سب سے پہلے ناظم مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مقرر ہوئے تھے، جو اپنے کو فلسفی کہتے تھے، اور معقولات کا بڑا دعویٰ رکھتے تھے، ان کا اصل وطن نونہرہ ضلع غازی پور تھا، مولانا[2] کے حیدر آباد پہنچنے کے بعد وہ اس عہدہ سے ہٹا کر مال کے صیغہ میں بھیج دیئے گئے، اور یہ جگہ خالی ہو گئی،

سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت بہرحال جب مولانا نے امور مذہبی کی خدمت سے انکار کیا تو ۳ صفر ۱۳۱۹ھ (۲۲ - مئی ۱۹۰۱ء) کو سررشتۂ علوم و فنون کی اسی خالی شدہ نظامت کے عہدہ پر اُن کا تقرر ہوا،

---

[1] اس عرصہ میں حسب ذیل کتابیں اس کی طرف سے شائع ہوئیں، ان میں پہلی پانچ کتابوں کی ڈاکٹر سید علی نے نگرانی کی،

۱- سیاحت نامۂ موسیو ٹیورنیرا مطبوعہ آگرہ	۱۸۹۶ء	۶- الغزالی شبلی	کانپور	۱۹۰۱ء
۲- سیاحت نامہ موسیو تھیونو، " "	۱۸۹۷ء	۷- علم الکلام شبلی	علی گڈھ	۱۹۰۲ء
۳- تاریخ دکن جلد اول، " "	۱۸۹۷ء	۸- تاریخ دکن جلد سوم	آگرہ	۱۹۰۳ء
۴- تاریخ دکن جلد دوم " "	۱۹۰۰ء	۹ الکلام شبلی	کانپور	۱۹۰۴ء
۵- نظام اکبری حیدر آباد "	۱۹۰۱ء	۱۰- موازنۂ دبیر و انیس شبلی	آگرہ	۱۹۰۴ء

[2] مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نونہروی ایک وسیع النظر شیعی عالم تھے، علم کلام میں معراج العقول نام عربی میں ایک مبسوط تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں انھوں نے شائع کی، اسی زمانہ میں مولانا ابو الکلام نے اپنے الہلال میں اس پر بڑا اچھا تبصرہ کیا تھا

پہلے ۳-صفر والے فرمان میں ان کی قائم مقامی کی نصف تنخواہ دوسو روپیے مقرر ہوئی، اس کے بعد ۱۰- ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ (۲۷ جولائی ۱۹۰۱ء) کو اس عہدہ کی پوری تنخواہ چار سو روپیے ماہوار کا فرمان ہوا، بعد کو مولوی عزیز مرزا مرحوم وغیرہ کی کوشش سے پانچ سو روپیے ماہوار ہوگئے، لیکن سو روپیہ ماہوار کا گذشتہ وظیفہ جو سرکار آصفیہ سے ان کو ملا کرتا تھا بند ہوگیا، اور چونکہ یہ صیغہ مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تھا، اور وہ محکمۂ تعمیرات و معدنیات و ریلوے کے معتمد تھے، اس لئے سررشتۂ علوم وفنون کا یہ صیغہ بھی اسی محکمۂ تعمیرات و معدنیات کے ماتحت تھا، اور یہی سبب ہے کہ الکلام کے شروع میں مولوی کاظم علی صاحب قائم مقام معتمد محکمۂ تعمیرات کا مقدمہ شامل ہے،

اس عہدہ کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ مولانا نے علم کلام پر متعدد تصنیفوں کا خاکہ تیار کرلیا، ان کی زندگی کے جو پچھلے حالات آپ نے پڑھے ہیں، ان سے اندازہ ہورہا ہوگا کہ وہ تاریخ سے نکل کر علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھ رہے ہیں، اور سرسید نے ان سے "الغزالی" لکھنے کی جو فرمایش کی تھی، وہ اس کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دور نکل گئے، اور علم کلام کا ایک وسیع خاکہ اُن کے ذہن میں آگیا، چنانچہ الغزالی کے شروع میں وہ رقمطراز ہیں، "علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور اُن کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اُس کے چار حصے قرار دیئے ہیں،

۱- علم کلام کی ابتدا، اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں،

۲- علم کلام نے اثبات عقائد و ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی،

۳- ائمۂ کلام کی سوانحعمریاں،

۴- جدید علم کلام،

پہلا حصّہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا، کہ بوجوہ چند رک گیا، اور تیسرا حصّہ شروع ہو گیا، اس حصّہ میں امام غزالی کی سوانحمری شروع ہو گئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی، چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا، مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی حصّہ الگ شائع کر دیا جائے۔"

پہلے حصّہ یعنی الکلام کے شروع میں علم کلام کی تاریخ لکھنے کی وجہ لکھی ہے، اور بتایا ہے کہ اس کے لکھنے میں وہ اپنی تاریخ کی حد سے باہر نہیں نکل رہے ہیں، فرماتے ہیں:- "تاریخ کے فن میں اہل مغرب نے جو نئے نئے برگ و بار پیدا کئے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے، کہ اشخاص اور اقوام کی تاریخ سے گذر کر علوم و فنون کی تاریخ لکھتے ہیں، مثلاً فلاں علم کب پیدا ہوا، کن اسباب سے پیدا ہوا، کس طرح عہد بعہد بڑھا، کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں، اور کن وجوہ سے ہوئیں، اس قسم کی کوئی تصنیف اردو بلکہ عربی و فارسی میں بھی موجود نہ تھی، میں نے ابتدائے زمانۂ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے، چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں وہ تاریخ ہی تھیں، اس بنا پر علم کلام میرے دائرہ سے خارج تھا، علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے، دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہے، تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہے، اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔"

اس میں شک نہیں کہ مولنا نے تاریخ ہی کی تقریب سے علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھا، مگر یہ کوچہ اُن کو ایسا پسند آیا کہ وہ پھر عمر بھر اس سے نہیں نکلے، وہ کہتے تو ہیں کہ ان کے علم کلام کی کتابیں تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہیں، مگر اہلِ نظر کو معلوم ہے کہ ان کی تاریخی کتابیں بھی علم کلام ہی کے دائرہ

ہیں ہیں، اس لئے وہ علم کلام لکھنے سے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے گنہگار نہ پہلے تھے اور نہ اب ہوئے۔

اس خدمت کے قبول کرنے کے بعد ہی حیدر آباد کی اندرونی سیاسیات میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوا شخصی سلطنت میں کسی اعلیٰ مرکزی شخصیت کے ہٹنے سے اس نظام شمسی کے سارے ستاروں پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے،

مولوی سید علی بلگرامی کی حیدر آباد سے علٰحدگی اور سررشتۂ علوم وفنون کا تذبذب

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں کچھ کمزوریاں بھی تھیں یعنی انھوں نے طبیعت سیاسی پائی تھی، اس لئے اُن کے ہاں ہمیشہ جوڑ توڑ لگا رہتا تھا کبھی وہ اس میں دوسروں کو پھنساتے تھے اور کبھی وہ اس میں خود پھنس جاتے تھے، اسی قسم کا ایک موقع ۱۹۰۱ء کے آخر میں پیش آیا، نواب وقار الامراء بہادر مدار المہامی سے مستعفی ہوئے، اور اُن کی جگہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو وزارت کا قلمدان عنایت ہوا، اس کے نتیجہ میں مولوی سید علی بلگرامی بھی ستمبر ۱۹۰۱ء میں بائیس سال کی کارگذاری کے بعد ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے، مولوی صاحب کا اپنی جگہ سے ہٹنا کوئی معمولی بات نہ تھی، بیسوں اشخاص کا تعلق صرف اُن کی ذات سے تھا، اس لئے ریاست کی الجھی ہوئی سیاستوں کے سبب سے اُن کا متاثر ہونا ضرور تھا، ۲۷ اگست ۱۹۰۱ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"حیدر آباد کی پولیٹیکل زمین میں سخت بھونچال آیا، وزارت کا قبلہ مشرق سے مغرب کو بدل گیا۔ . . . . ہاں میں نے نظامت علوم وفنون قبول تو کرلی ہے لیکن اس انقلاب میں دیکھئے یہ خدمت بھی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں"[1]

پھر ۲۸ ستمبر کو لکھتے ہیں :۔ " انقلابِ حال نے تمام امیدیں خاک میں ملادیں، اب ایام گذاری ہی

[1] مکاتیب شروانی ص ۲۰

وہ بھی دیکھئے کب تک، کتاب الآلات کا چھپنا اب رہا، اسی دریا دل کے بھروسہ پر یہ کام بھی اٹھایا گیا تھا[1]

ایک مہینہ کے بعد، ۵ اکتوبر کو لکھتے ہیں :- "یہاں ہر روز ایک نیا شگوفہ کھلتا ہے، سیّد علی نکل چکے، اور لوگ نکلے جاتے ہیں، میرا بھی نفس باز پسیں ہے[2]،

۱۰- اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اپنے مخلص عزیز سمیع صاحب کو لکھتے ہیں :- "یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے، مختصر یہ کہ دنیا ادھر کی اودھر ہو گئی، مولوی سید علی صاحب وغیرہ نکلے، اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں، میں بھی دو چار روز کا مہمان ہوں[3]،

بہرحال یہ دو چار روز دو چار برس ہو گئے، سررشتۂ علوم و فنون کی ضرورت یا عدم ضرورت کے فیصلے کے لئے ایک کمیشن بٹھایا گیا[4]، اور اس کے فیصلہ تک یہ منصب بحال رہا،

ایک نظم اسی زمانہ میں مولانا نے حیدرآباد کو خطاب کرکے ایک نظم لکھنی شروع کی جس میں اس کے موجودہ خلفشار اور انقلاب کے اشارے بھی تھے، یہ نظم غالباً ضائع ہو گئی، لیکن اس کے چند شعر مکاتیب میں مولانا شروانی کے ایک خط میں ہیں[5]، مطلع تھا،

اے دکن! اے کہ بہار چمن جاں از تست

اس کے بعد کے شعر ہیں :-

چوں تواند کہ زہر پردہ برآرد صد نقش	گرنہ نیرنگی ایں گنبد گرداں از تست
ہندیاں نیز چو از حلقہ بگوشان تو اند	ہر چہ زیشاں بود آں نیز کنوں ہا از تست
ہاں تو دعوی کن و ما نیز مسلّم داریم	شبلی سحر فن و داغ غزل خواں از تست

[1] شروانی ۹۲ [2] شروانی ۳۰ [3] سمیع ۹۴ [4] سمیع ۰ [5] شروانی ۱۳۱،

سررشتہ کا نیا انتظام عام حالات کے لحاظ سے مولانا کا اضطراب بجا تھا، مگر مہاراجہ کشن پرشاد جیسے نیک سرشت اور علم دوست مدار المہام[1] سے اس سررشتہ کی ضرورت چھپی نہ تھی، اور نہ مولانا کے جوہر ایسے قدرشناس سے چھپے رہ سکتے تھے، چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی اس "سررشتہ" کے کاموں سے دلچسپی لی، اور اس کا انتظام پختہ اصول پر کرنے کی طرف مائل ہوئے، جناب نواب شہاب جنگ مختار الدولہ افتخار الملک بہادر معین المہام سرکار عالی اس کے افسر اعلیٰ اور سرپرست اور مولوی سید علی بلگرامی کی جگہ پر قائم مقام معتمد تعمیرات میر کاظم علی صاحب نگراں کار مقرر ہوئے، (مقدمہ الکلام) اور تصنیف و تالیف کا کام بدستور جاری رہا،

قیام حیدرآباد کی تصنیفات مولانا شبلی مرحوم حیدرآباد میں کل چار برس رہے، یعنی فروری ۱۹۰۱ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک، اس میں بھی ۱۹۰۱ء کے چند مہینے امیدواریوں میں گذر گئے، غالباً جولائی یا اگست ۱۹۰۱ء میں وہ سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت پر بحال ہوئے، اور فروری ۱۹۰۵ء میں اس سے الگ ہو گئے، اس بنا پر ان کی نظامت سررشتۂ مذکور کی مدت ساڑھے تین برسوں سے زیادہ نہیں، اور یہ شب و روز بھی اکثر زمانہ کے انقلابات اور سیاسی مدوجزر کے نذر ہوتے رہے، اور اطمینانِ خاطر بہت کم نصیب ہوا، اس پر یہ دیکھ کر سخت تعجب آتا ہے کہ بے اطمینانی کے ان ساڑھے تین برسوں میں انھوں نے ایسی پانچ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں ہر کتاب مستقل پانچ برس کی محنت، مطالعہ اور مراجعت کی محتاج ہو سکتی ہے، مگر تعجب اس لئے نہیں کہ جو لوگ حقیقی صاحبِ فکر مصنف ہوتے ہیں وہ کاغذ کے صفحوں پر اپنے خیالات جب بھی

[1] افسوس کہ مہاراجہ نے اسی سال ۱۹۴۰ء میں وفات پائی،

قلمبند کریں، مگر وہ خیالات اُن کے دماغوں میں سالہا سال کے مطالعہ، مراجعہ اور محنت کے بعد مخزون ہوتے رہتے ہیں، اور موقع ہاتھ آنے کے بعد وہ کاغذ کے صفحوں پر آسانی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔

الغزالی | سررشتہ میں مولانا کی سب سے پہلی کتاب الغزالی تصنیف ہوئی، جو ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء تک ختم ہو کر مطبع جا چکی تھی، جس کے معنی یہ ہوے کہ وہ چند مہینوں میں ترتیب پائی، آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کتاب کا خیال اُن کے دماغ میں کتنے دنوں سے پک رہا تھا، گذر چکا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں جب وہ الفاروق کی تصنیف کے لئے تیار ہو رہے تھے، تو سرسید نے الفاروق کے بجائے الغزالی لکھنے کی فرمایش اُن سے کی، الفاروق سے فرصت پانے کے بعد اُن کا خیال، امام غزالی کے سوانح اور فلسفہ و کلام کی طرف کلیۃً منتقل ہوا، اُن کی کتابیں دیکھتے، اُن کا فلسفہ سمجھتے، اور ان کے خیالات کو ترتیب دیتے رہے، یہی سبب ہے کہ حیدر آباد میں اُن کی تقریر سننے کے لئے جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں انھوں نے علم کلام ہی پر تقریر فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت یہی خیالات و معلومات اُن کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لئے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی،

۱۰- جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوعوں سے ایک موضوع امام غزالی کی لائف بتاتے ہیں، لکھتے ہیں:- "امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہوتا، کیونکہ موجود علم کلام کے موجد وہی ہیں" (شروانی ۱۲)

پھر ۱۶- جولائی کو انھیں لکھتے ہیں:- "امام غزالی کی لائف کا پہلا حصہ گو تفحص طلب ہے، لیکن آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے، میں تمام ماخذ عرض کروں گا، لیکن اصل چیز اُن کی کتاب تہافت الفلاسفہ کا ریویو ہے، جس پر ابن رشد نے رد لکھا ہے، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا، اور مدتوں اس میں

منہمک رہا (علی گڈھ آنے سے پہلے) باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا، وہ بھی کترا گئے، میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیئے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ، اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو لکھنا پڑے گا، اس کے سامان کے لئے میں مصر سے کتابیں نقل کرانا چاہتا ہوں، اس کا بھی ابھی سامان نہیں، فارسی کے لئے میں ابھی سے تیار ہوں۔"

اس کے بعد ۲۶ جولائی ۱۸۹۹ء کو سہ بارہ اُن ہی کو لکھتے ہیں:۔ "امام غزالی کی علمی حالت سنئے، فقہ شافعیہ کی علمی تدوین و ترتیب کی بنیاد امام الحرمین نے ڈالی، پھر امام غزالی نے تین کتابیں وسیط، بسیط و جیز لکھیں، ان کے بعد ان کتابوں کی بے انتہا شرحیں لکھی گئیں، اور بعد کی تمام تصنیفات ان ہی سے ماخوذ ہیں اور اُن ہی کی تغیر شدہ شکلیں ہیں، اصول فقہ میں نئے طریقہ کی سب سے پہلی کتاب امام صاحب نے لکھی جس کا نام منخول ہے، اور جو مدتوں میرے مطالعہ میں رہی ہے، یہ نہایت زور کی کتاب ہے اور بخلاف امام کی اور تصانیف کے عبارت اس کی دقیق ہے، اصول میں اور بھی ان کی کتابیں ہیں، مرنے سے ایک برس پہلے اسی فن میں ایک کتاب مستصفیٰ لکھی جو میری نظر سے گذر چکی ہے، تصوف میں بے شمار کتابیں ہیں جن کا استقصاء بھی مشکل ہے، علم کلام کے وہ بخیال خود موجد ہیں، اور اس میں ان کی بہت سی تصنیفیں ہیں، ان کے بعد شیخ الاشراق نے فلسفۂ اشراقی کے نام سے کتابیں لکھیں، ان میں حکمۃ الاشراق سب سے عمدہ ہے، جو میرے مطالعہ میں بہت رہی ہے، اور ان کے بعد امام رازی نے مطالب عالیہ، نہایۃ العقول، اربعین، مباحث مشرقیہ لکھیں، یہ سب کتابیں ضخیم ہیں۔ اور بجز ۲ کے سب میری نظر سے گذری ہیں، امام غزالی نے فلسفہ و منطق کو بھی صاف کر کے لکھا، اس میں ان کی یہ کتابیں ہیں، محک النظر، مقاصد الفلاسفہ، منتحل و غیرہ

عیسائیوں کے رد اور انجیل کی تحریف میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کو میں دیکھ چکا ہوں ۔۔۔
جب تک میانہ ہوں اور جب تک ان پر باکمال اہل علوم پر ریویو نہ کیا جائے، ان کی لائف لکھی گئی
ہے، ریویو کے لئے اہل فن پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، گو لکھا کم جاتا ہے مگر وہ بہت وسعت نظر اور غوض و
فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ فلسفۂ شرعیہ کے بہت سے مسائل کی نسبت اُن کا دعویٰ
یہ ہے کہ وہ مسائل ان کی ایجاد ہیں، حالانکہ متعدد تحقیقات کو میں نے بو علی سینا کی کتاب میں پایا،
لئے ان کے کہنے پر اکتفا نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر جگہ سے پتہ لگانا پڑے گا، ان مشکلات کو خیال کر کے قلم
اٹھائیے، میں بہت کچھ اس کے لئے تیار ہو چکا ہوں، تاہم ہمت نہیں پڑتی، بیسیوں صفحے لکھ کر چھوڑ دئے
ہیں، امام صاحب کی جن تصنیفات کا میں نے نام لکھا ہے گو اکثر میری نظر سے گذری ہیں لیکن
نایاب ہیں، اور مشکل سے بہم پہنچیں گی، مستعار ملنا بھی مشکل ہے"

خطوط کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ ان دنوں ان کے غور و فکر کا سب سے بڑا موضوع
یہی تھا، حیدرآباد پہنچ کر اس سلسلہ میں ان کو بعض نئی کتابیں ملیں جن میں ایک فرنچ اور دوسری
جرمن مصنف کی تھی، جن کا حوالہ انھوں نے الغزالی کے دیباچہ میں دیا ہے، اور جو غالباً مولوی سید
علی بلگرامی کے کتب خانہ میں دیکھی ہوں گی، بہرحال یہ کتاب ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو منشی محمد رحمۃ اللہ
صاحب رعد کے مطبع نامی کانپور میں چھپنے کو جا چکی تھی (حمید ۱۶) اور اگست ۱۹۰۲ء میں یہ
چھپ کر شائع ہوئی اس کا یہ پہلا اڈیشن بہت آب و تاب سے چھپا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا
اور پڑھا گیا،

علم الکلام الغزالی کے بعد علم الکلام کا نمبر آیا، علم کلام کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ بھی علی گڈھ کے قیام

ہی کے زمانہ میں اس وقت اُن کے سامنے آیا تھا جب ۱۸۹۵ء میں تہذیب الاخلاق میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے مضمون لکھا تھا، اس کے بعد بھی وہ اس پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، چنانچہ ۸۔ فروری ۱۸۹۹ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں :۔ "میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا ہے، اس فن کی کتابیں دور دور سے آرہی ہیں"

۱۸۔ مارچ ۱۹۰۲ء کو وہ ختم ہو رہی تھی (مہدی ۱۰) اور اس وقت خیال یہ تھا کہ علم الکلام اور الکلام دونوں حصے ایک ساتھ چھپیں گے، اور اسی لپیٹ میں دونوں حصے ایک ساتھ زیر تالیف تھے، اور کس بے اطمینانی میں، اس کا اندازہ حسب ذیل فقروں سے کیجئے، جو ۱۰ر مارچ ۱۹۰۲ء[1] کو لکھے گئے ہیں :۔ "میں الغزالی لکھ چکا، اور مطبع میں جا چکی، علم کلام کی تاریخ بھی ختم ہو چکی، اب جدید علم کلام پر لکھ رہا ہوں، یہ دونوں حصے ساتھ چھپیں گے، اگر یہاں اطمینان سے رہنا ہوتا تو بڑے بڑے کام انجام پاتے لیکن ہر وقت رکاب میں پاؤں ہے، جو گھڑی اُلٹی جاتی ہے اسی پر حیرت ہے، مولوی سید علی پرسوں میرے پاس تشریف لائے تھے، ۲۲ر مارچ کو ولایت جاتے ہیں، ع

دوستاں رفتند و من ہم میروم (مہدی ۱۰)

مولانا علم الکلام کی تکمیل کے وقت بیمار ہو گئے تھے، بخار اور لرزہ میں مبتلا تھے، ضعف خاص ہو گیا تھا فرماتے تھے کہ "فرش پر پڑا پڑا تکیہ کے سہارے ذرا سا سر اٹھا کر لکھا کرتا تھا" اسی حال میں علم الکلام کو فروری ۱۹۰۲ء میں جس طرح بنا تمام کیا، (حمید ۱۶) اور اسی لئے اس کتاب میں بہت

---

[1] مکاتیب میں اس خط کی تاریخ ۱۹۰۱ء غلط چھپی ہے، مولانا کی علالت اس وقت اور اس کے بعد بھی جاری رہی، دیکھئے شروانی، ۳ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۲ء اور مہدی ۱۳۔ مورخہ ۱۱ر مئی ۱۹۰۲ء (مکاتیب میں اسکی تاریخ ۱۹۰۵ء غلط چھپی ہے)

سی یکساں رہ گئیں، مثلاً فرماتے تھے کہ اس میں ماتریدیہ یعنی حنفی علم کلام کا حصہ بہت ہی مختصر ہو، اس کو بھی کھول کر بڑھا نہ سکے، کیونکہ ماتریدیہ کی تصنیفات بہت کم ہیں، اس لئے اس پر تفصیل سے لکھنا بڑی محنت کا کام تھا، غالباً ان کے ایک مکتوب کا یہ فقرہ اسی تفصیل کا اجمال ہو" میں نے علم کلام نہایت ناتمام کتاب لکھی ۔۔۔ وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہو" (حمید ۱۷)

بہرحال وہ کتاب ۱۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو صوفی محمد علی کے پریس مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی، چنانچہ اسی تاریخ کو نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں :۔" الغزالی کان پور میں چھپ رہی ہو، افسوس ہے کہ منشی رحمۃ اللہ رعد دو دن کا کام برسوں میں کرتے ہیں، چھ مہینے ہو چکے، ابھی تک ۲۷ صفحے لکھے گئے ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنی ایک تازہ تصنیف یعنی علم کلام کی تاریخ آگرہ چھپنے کے لئے آج روانہ کی ہے، یہ انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی، جدید علم کلام زیر تصنیف ہے" (مکاتیب اول بنام وقار الملک)

۱۱ مئی ۱۹۰۲ء[1] کو مہدی مرحوم کے نام لکھتے ہیں :۔" تاریخ علم کلام آگرہ چھپنے کے لئے جا چکی، رعد غزالی ہی سے عہدہ برآنہ ہو سکے، اسی لئے دوسری طرف رخ کرنا پڑا" (مہدی ۱۳)

مارچ ۱۹۰۳ء سے کچھ پہلے یہ چھپ کر شائع ہوئی، (حمید ۱۷)

الکلام | علم کلام کی تاریخ کے بعد الکلام یعنی جدید علم کلام کی باری آئی، وہ ۱۹۰۲ء میں اس کتاب کے کچھ ابواب لکھ رہے تھے، اور اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ دونوں حصے علم الکلام اور الکلام ساتھ چھپیں گے (مہدی ۱۰) لیکن علم الکلام کے علحدہ مستقل چھاپے جانے کے فیصلہ کے بعد پہلے علم الکلام پوری کر دی اور اس کے بعد الکلام کو پورا کرنا شروع کیا، جدید علم کلام پر لکھنے کے لئے ان کو

---

[1] مکاتیب شبلی میں ۱۹۰۵ء لکھ گیا ہے، جو قطعاً غلط ہو، ۱۹۰۲ء ہونا چاہئے،

انگریزی کتابوں کے فلسفیانہ معلومات کی ضرورت پیش آئی، مگر یہ مدد اُن کو حسب توقع نہ مل سکی، اس پر اپنے عزیز شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی اے کو جو فلسفۂ جدید میں پروفیسر آرنلڈ کے ممتاز شاگرد تھے ۲۲۔ فروری سنہ ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں :۔ "الغزالی ختم ہو کر مطبع میں جا چکی، شاید سیرۃ النعمان سے الگ بھگ ہو جائے، علم کلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں، وہ بھی قریب الختم ہے، اب کلام جدید کا مرحلہ ہے، کوئی انگریزی داں دوست ہوتا تو بڑا کام نکلتا جو حکمائے یورپ روح و واجب الوجود کے قائل ہیں، ان کے دلائل سے کتاب کی بہت رونق ہوتی، تم سے زیادہ کون اس مصرف کا تھا، انگریزی داں تھے، عربی داں تھے، عزیز تھے، لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچہ تیار کر دو تو [illegible] بصیرت ہو، تم کو کس کی پروا ہے، حالانکہ جو حصہ لکھ رہا ہوں اس میں مدد دینا ایک مذہبی اور بڑی نیکی ہے" (حمید ۱۶)

اسی حالت میں مصر کے ایک نئے تعلیم یافتہ فرید وجدی کے رسائل الاسلام فی عصر العلم مصنف بہت کام آئے، اور انھوں نے اُن سے فائدہ اٹھایا، جدید کلام کا مرحلہ دشوار گذار تھا، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ کسی سنجیدہ بزرگ سے بھی اس میں مشورہ مناسب تھا، چنانچہ اس کام کے لئے ان کی نظر مولانا شروانی پر پڑی، چنانچہ ۱۴۔ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کو انھوں نے ان کو لکھا :۔ "ہاں ایک بڑا ضروری امر یہ ہے کہ علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں، آپ کے پاس بھیجوں گا، اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی، آپ دیکھ کر بتا دیجئے گا کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے، کون نہیں، لیکن اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ عقائد کے مسائل ہیں کیا؟ توحید لکھ چکا ہوں، نبوت لکھ رہا ہوں، اس کے بعد صرف معاد رہ جاتا ہے، باقی کیا لکھوں، کتب کلام میں جو عقائد لکھے ہیں

وہ درحقیقت عقائد میں داخل نہیں، مثلاً حدوثِ عالم، صفاتِ باری لاعین لاغیر ہونا وغیرہ وغیرہ، اس لئے درخواست ہی کہ آپ کے نزدیک جو مسائل عقائد ضروری البحث ہوں، اُن کے عنوان لکھ بھیجئے " (شروانی ۳۷)

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شروانی نے اُن کو جواب میں کیا لکھا، مگر الکلام میں **بقیہ عقائد** کا عنوان قائم کرکے اُن عقائد کو گنا دیا ہی، جن کو مناظرانہ علم کلام نے پیدا کیا ہے، اور جن کی اصل کتاب وسنت میں نہیں، اور اس کے بعد **روحانیات یا غیر محسوسات** کا عنوان قائم کرکے اُن بقیہ عقائد کو لکھا ہے، جن کی تصریح کتاب وسنت میں موجود ہے، مگر مصنف کے خیال میں اُن کی کیفیت قرآن پاک میں مذکور نہیں، اس لئے ان کی تشریح مختلف اسلامی فرقوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے، اور اس سلسلہ میں اجمالاً ملائکہ، وحی اور واقعاتِ قیامت پر امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ کے اقتباسات درج کئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ باب بیحد مختصر، مبہم اور ناتمام ہی،

۲۱ را پریل ۱۹۰۲ء میں یہ کتاب زیر تصنیف تھی (وقار الملک) بلکہ ایک سال بعد کے بعد ۹۔ مارچ ۱۹۰۳ء میں بھی وہ ناتمام تھی، البتہ اس کا بہت حصہ لکھا جا چکا تھا، اور جو لکھا جا چکا تھا اس سے مولانا خوش تھے (حمید ۱) بہر حال اسی سال کتاب تمام ہوئی، اور ۱۹۰۴ء میں منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی سے چھپ کر شائع ہوئی،

سوانح مولانائے روم مولانا کی طبیعت کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا، اس لئے بظاہر تعجب ہوتا ہی کہ وہ مولانائے روم کے گرویدہ کس طرح ہوئے، مولانا کے ایک محرمِ اسرار نے جنھوں نے انکی سوانح مولانائے روم پر تبصرہ لکھا ہے اس راز سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے: "علامہ کی حقیقت پسند طبیعت سے

ابتداءً وہ میدان انتخاب کیا جو حقائق و واقعات کا غالباً دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے یعنی مسلمانوں کی تاریخ، اس انتخاب کے نتائج وہ گوہر شاہوار ہیں جو الفاروق، سیرۃ النعمان، اور المامون وغیرہ کے نام سے آویزۂ گوشِ روزگار ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کلام کی طرف توجہ کی، الغزالی، الکلام، علم الکلام اس کاوش کے جوہر ہیں، اس وقت تک اُن کی تصانیف میں ظاہری پہلو غالب تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ الفاروق میں حضرت عمرؓ کی دینی زندگانی اس اہتمام سے نہیں لکھی گئی جس کے وہ مستحق تھے، سلسلہ میں سلسلہ پیدا ہوتا ہے، امام غزالی کی زندگی کا آغاز ظاہری طمطراق یعنی مناظرہ اور مباحثہ سے معمور تھا، انجام باطنی عظمت و تجمل پر ہوا یعنی معرفت اور تصوف پر، یہی واقعہ ان کے سوانح نگار کو پیش آیا، علامہ شبلی نے جب الغزالی کی تالیف شروع کی تو وہ تصوف سے اس قدر بیگانہ تھے کہ امام غزالی کی زندگانی کا یہ مہتم بالشان پہلو بالکل ان کے نظر سے مخفی تھا، ایک دوست کی توجہ دلانے سے انھوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کر کے ایک باب الغزالی میں اضافہ کیا، مبارک تھا وہ وقت جب انکی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی، کیونکہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ وہ تصنیف ہے جس پر ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ آیندہ اس سے بھی بڑھ کر نتائج پیدا ہوں گے۔

مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے، لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے، یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی، کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے، مولانا شروانی کی یہ عبارت ان کی تقریظ بر سوانح مولانا روم سے لیگئی ہے، جو الندوہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں چھپی ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبصرہ نگار نے اس حسنِ تلاش کو مصنف نے

بھی تسلیم کر لیا تھا، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا کو امام غزالی کی درسگاہ تک پہنچایا، امام غزالی کی تلاش اُن کو مولانا روم کے آستانہ تک لے آئی، خود الغزالی میں بھی اس دریافت کا ایک حوالہ موجود ہے، یعنی تصوف کی حقیقت کے اظہار میں امام غزالی کے بعد مثنوی کے چند اشعار کا حوالہ آتا ہے،

میرے خیال میں اُن کے اس موضوع کے انتخاب میں حیدرآباد کے مقامی ذوق کو بھی تعلق ہی، حیدرآباد کی رگ رگ میں تصوف اور وحدۃ الوجود کے مسائل سرایت کئے ہوئے ہیں،

بہرحال ۱۹۰۴ء میں انھوں نے مثنوی پر تقریظ لکھنی شروع کی، ۱۰۔ فروری ۱۹۰۴ء کو مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔ "تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی، اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کئے، اگر خیال میں ہوں تو لکھ بھیجو" (۲۵ تمیمہ)

۲۱ اپریل ۱۹۰۴ء[1] کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں:۔ (۵) "میں آج کل مثنوی مولوی روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں، مع سوانحمری مولانا روم"

۲۔ مئی ۱۹۰۴ء کے خط بنام مہدی حسن میں ہی (۱۲) "میں مثنوی روم پر تقریظ لکھ رہا ہوں، ایک نئی کتاب ہو گی"

الکلام کے شروع میں معتمد سررشتہ کی طرف سے جو دیباچہ ہی، اس میں اعلان ہے کہ الکلام اس سلسلۂ آصفیہ کی نویں جلد ہے، اور دسویں موازنۂ دبیر وانیس اور گیارھویں سوانحمری مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ" مگر اشاعت کی ترتیب الٹ گئی، یعنی "سوانحمری مولانا روم" پہلے اور موازنہ

م ۱۹۰۶ء جون ہر میں نکلا، ۱۲

[1] غلطی سے مکاتیب میں ۱۹۰۲ء چھپا ہی جو صریحاً غلط ہی کیونکہ اسمیں انجمن ترقی اردو کا ذکر ہی جو ۱۹۰۳ء میں اور اسکے بعد کا واقعہ ہے

بعد کو چھپی،

سوانح مولوی روم اسی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں ختم ہو کر منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی، ۲۲- نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں:- "تقریظ مثنوی کمبخت رعد کے قبضۂ غصب میں ہے، دو برس ہوگئے" (مہدی)

ابھی یہ کتاب مطبع ہی میں تھی کہ مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کے لئے لکھنؤ آگئے، چنانچہ یہیں کے قیام کے زمانہ میں اگست ۱۹۰۶ء میں وہ چھپ کر آئی، (حمید ۴۳)

چار قسم کے کاغذوں پر چھپی تھی، قیمت درجۂ خاص مجلد ۳؎، درجۂ اوّل ۱؎، درجۂ دوم ۱۴؍، درجۂ سوم ۱۰؍،

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، یہ اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہے کہ ہر روز اس کی طلب کے بیسیوں خطوط آتے اور کتاب اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی،

حیدرآباد کی ادبی دلچسپیاں | مصنف کا قلم لگاتار تین چار برس فلسفہ و کلام کی پیچ در پیچ کوچہ گردیوں سے گھبرا کر خالص ادبیات کے سرسبز و شاداب میدان کا طالب ہوا، اور مثنوی مولانائے روم کی شاعری سے کسی دوسرے شاعرانہ موضوع کی طرف نکل آنے سے تصنیفی ارتقا کا حلقۂ اتصال بھی قائم رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حلقۂ اتصال کے پانے میں حیدرآباد کی سرزمین کو بھی ایک گہرا تعلق ہے،

یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت داغ کے وجود سے ع حیدرآباد آج کل گلزار ہے" ملک میں داغ اور امیر کی مقابلانہ شاعری اہلِ نظر کی گفتگو اور بحث کا مستقل موضوع بنی ہوئی تھی، مولانا مرحوم داغ کے طرفدار اور مداح تھے، داغ کے سیکڑوں اچھے شعر اُن کی زبان پر تھے، داغ سے ملتے بھی رہتے تھے، اور ان کے بعض تذکرے بھی فرماتے تھے، حیدرآباد میں ۱۹۰۱ء میں دکن کو خطاب کرکے جو فارسی نظم لکھی تھی، اس میں بھی داغ کو پوری عزت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی ہے،

ہاں تو دعویٰ کن و مانیز مسلّم داریم | شبلیِ سحر فن و داغ غزلخواں از تست

حیدرآباد میں ان کا حلقۂ ادب — اکتوبر ۱۹۰۱ئہ میں اپنے ایک خوش مذاق عزیز (سمیع مرحوم) کو حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں، ان کی ترغیب کے لئے لکھتے ہیں:۔ "داغ، شرر، سید علی بلگرامی، سید حسین یادگاران زمانہ کو دیکھنا چاہو گے تو سب ہی موجود ہیں" (سمیع ۴۹)

ان چند ممتاز اصحاب کے علاوہ حیدرآباد میں مولانا کا ایک خاص حلقۂ احباب تھا جن میں سے بعضوں کے نام معلوم ہیں، جیسے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم جنھوں نے بہت سے ادبی و تاریخی مضامین اور سیرۃ محمود گاواں اور وکرم اروسی لکھی ہے، مولوی سید عبدالغنی صاحب وارثی (استھانوی بہاری) جو عربی و انگریزی دونوں کے عالم تھے، اور یوز اسف و بلوہر، طبقات شعرانی اور تاریخ اندلس وغیرہ کے ترجمے کئے، نواب ضیا یار جنگ بہادر مفتی عدالت عالیہ، موصوف درسیات کے فاضل، اور فارسی میں شاعری کا مذاق رکھتے ہیں، اور اب تک مشق سخن جاری ہے، ان کے علی گڑھ کے بعض خوش مذاق شاگرد جیسے مولوی مسعود علی صاحب محوی، مولوی ظفر علی خاں، مولوی سید محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ،

یہ لوگ اکثر جمع ہوتے، ادبی دلچسپیاں رہتیں، شعر و شاعری کے تذکرے رہتے، اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے، اور سُنے جاتے، مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کے حال میں لکھتے ہیں:۔ "چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں (سید علی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانا کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے اشعار سناتے رہے جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے" (چند ہمعصر ص۶۹)

نواب ضیا یار جنگ بہادر خود مجھ سے مولانا شبلی کی ادبی اور شاعرانہ صحبتوں کا ذکر فرماتے تھے۔ مولوی شیخ غلام قادر گرامی مرحوم جنھوں نے ۱۹۲۳ء میں وفات پائی، فارسی کے مشہور شاعر تھے، وطن جالندھر تھا، مگر حیدرآباد میں رہتے تھے، آخر عمر میں جب وہ وطن چلے آئے تھے، مجھ سے مولانا مرحوم کی صحبتوں کا تذکرہ فرماتے تھے،

یہ صحبتیں کبھی رنگین بھی ہو جاتی تھیں، اسی قسم کی ایک رنگین صحبت میں مولانا نے وہ اردو غزل کہی تھی جس کا مقطع ہے، ع کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا،

انیس و دبیر ان ادبی محفلوں میں جس طرح داغ و امیر کے مقابلے ہوتے رہتے تھے، میر انیس اور مرزا دبیر کے باہمی مقابلہ کی گفتگوئیں بھی ہوا کرتی تھیں، مولانا میر انیس کے مداح اور ان کے محاسن کلام کے دلدادہ تھے، اور یوں بھی اقلیم سخن کے ان دونوں تاجداروں کے مقبوضات اور مفتوحات کی وسعت اور ہمہ گیری کی داستان سے ملک کی ساری ادبی محفلوں میں ہنگامہ برپا تھا، مولانا نے موازنہ کے مقدمہ میں اس تصنیف کی تقریب ان لفظوں میں کی ہے: "مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اس ارادہ کے پورے ہونے کی نوبت آئی، اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیشکش ہے، اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی میرزا دبیر سے کیا گیا ہے، اور اس مناسبت سے اس کا نام "موازنہ" ہے۔"

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو مقابل شعرا کے درمیان اس قسم کا موازنہ مشہور و معروف ہے، اس قسم کی ایک مشہور کتاب حسن بن یحییٰ آمدی المتوفی ۳۷۰ھ کی کتاب الموازنہ بین ابی تمام والبحتری ہے، جس میں آمدی نے ان دونوں ممتاز شاعروں کے کلاموں کا موازنہ کیا ہے، اور دونوں کے کلاموں کے عیب و ہنر کو ظاہر کیا ہے، یہ کتاب ۱۲۸۷ھ میں مطبع الجوائب قسطنطنیہ میں سب سے پہلی دفعہ چھپی تھی،

مولانا کے خطوط میں اُن کی تصنیفات کے موضوع، تصنیف سے سالہا سال پہلے بیان اور تذکرہ میں آتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد جا کر وہ کتاب تالیف پاتی ہے، مگر موازنہ کی نسبت اس قسم کا کوئی سابق تذکرہ ان کے خطوں میں نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھنے کا خیال خواہ پرانا ہو، مگر میرانیسؔ و دبیر کے موازنہ کا خیال بہت پرانا نہ تھا، اس موضوع کا ذکر سب سے پہلے نومبر ۱۹۰۳ء کے ایک خط میں آتا ہے: "میں نے میرانیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے، جو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا" (سمیع ۵۲)

۲۔مئی ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں:۔ "دبیر و انیس پر محاکمہ مدت ہوئی تیار ہے لیکن یہاں کچھ ایسی اُلجھنوں میں پڑ کر اب تک مطبع میں نہیں گیا، شاید عنقریب نوبت آئے، قریباً ۲۰۰ صفحے ہوگئے ہیں" (مہدی ۱۲۰)

اسی خط میں آگے چل کر "مثنوی مولوی روم پر تقریظ" لکھے جانے کی بھی اطلاع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ موازنہ، سوانح مولانا روم سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی، مگر اس کے چھپنے کی نوبت پیچھے آئی، ۲۷۔ نومبر ۱۹۰۴ء کو مولوی سید ابوالکمال صاحب دسنوی کے جواب میں لکھتے ہیں:۔ "موازنہ انیس ابھی مطبع میں نہیں گئی" (ابوالکمال ۱)

اس کے بعد مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے، اور اور کام چھڑ گئے

شعرالعجم میں بھی ہاتھ لگ گیا، مگر موازنہ کا مسودہ معتمد تعمیرات کے ملبہ میں دبا رہا، نہ وہ چھپواتے تھے اور نہ دیتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مولانا نے دوبارہ اس کو مرتب کرنا شروع کیا، مارچ ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں:۔ "تقریظ مثنوی چھپ گئی ہے، البتہ موازنہ مدتوں کے لئے رک گیا، مسودات پھر سے مرتب کرنا ہے، اور سردست اس قدر فرصت نہیں، مبیضہ حیدرآباد میں ہے اور وہاں سے ملنے کی امید نہیں" (مہدی ۱۹) بالآخر ستمبر ۱۹۰۶ء میں اس کے کچھ اجزاء درست ہو کر صوفی محمد علی کے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لئے دیدیئے گئے، ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ایک دوست کو اطلاع دیتے ہیں:۔ "موازنہ انیس نہایت عمدہ چھپ رہا ہے، مسودات کی ترتیب نے شعرالعجم میں ہرج ڈالدیا ہے، چار مہینہ سے کچھ نہیں لکھا گیا" (مہدی ۲۰) ان چار مہینوں کی تحدید سے معلوم ہوا کہ جون یا جولائی ۱۹۰۶ء سے موازنہ کی دوبارہ ترتیب شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وہ جا کر تمام ہوئی، ۵ نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ شروانی صاحب کو لکھتے ہیں:۔ "موازنہ سے بہمہ وجوہ نجات ملی، اب جس قدر وقت ملے گا شعرالعجم پر صرف ہوگا" (شروانی ۵۶)

اسی زمانہ میں مولانا نے مولانا حالی کو سوانح مولانا روم کا ایک نسخہ ہدیہ بھیجا تھا اور خط میں موازنہ کے چھپنے کی اطلاع دی تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۵۔ نومبر ۱۹۰۶ء کو اپنے گرامی نامہ میں موازنہ کے اس مسودہ کے متعلق جو حیدرآباد میں پڑا تھا یہ ارقام فرمایا[1]:۔ "موازنہ انیس و دبیر کا مسودہ میں نے میر ناظم علی صاحب معتمد تعمیرات سرکار عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا، اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا اس میں ان کو بہت غیرت دلائی تھی، کہ اب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص جو اس کے چھاپنے

---

[1] مولانا حالی کا خط بنام مولانا شبلی معارف دسمبر ۱۹۱۶ء میں چھپا ہے۔

پر آمادہ ہیں اُن کو اجازت دیدیں، اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودہ کو خود مولانا کے پاس بھجوا دیں، کیونکہ اس میں جا بجا کورے اوراق چھوڑ دیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہی، میر کاظم علی صاحب نے بہت دن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اُس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہی، لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینہ تک وہاں ٹھہرا رہا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، بفرض محال وہاں چھپتا بھی تو بالکل مسخ ہوتا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دیدیا جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو از راہِ عنایت اس کی بھی ایک جلد سکریٹری وکٹوریہ میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغۂ ویلو پی ایبل بھجوا دیجئیگا"

سررشتہ کی دوسری کتابیں | مولانا کے عہدِ نظامت میں سررشتہ کی طرف سے بعض دوسری کتابوں کے لکھوانے اور چھپوانے کا بھی اہتمام کیا گیا،

کتاب الآلات | سررشتہ میں قدم رکھنے کے ساتھ مولانا کو کتاب الآلات کے چھپوانے کا خیال آیا، لکھنؤ کے ایک کتب فروش کی دُکان سے کتاب الآلات کا جو نسخہ ستمبر ۱۸۹۹ء کو ہاتھ آیا تھا، اور جس کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے خرید فرمایا تھا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے[1] یہ کتاب عربی میکانکس پر تھی، مولانا نے جب سررشتۂ علوم وفنون کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے اس کتاب کو سررشتہ کی طرف سے چھپوانا چاہا، شروانی صاحب کو لکھا:- "کتاب الآلات سررشتۂ علوم وفنون کی طرف سے چھپوانا مقصود ہے، آپ وہ نسخہ بھیجدیجئے اور اگر اپنے نسخۂ منقولہ میں تصویریں بنوانی ہوں تو وہ بھی یہاں بہت اچھی بن سکتی ہیں"[2] (۲۵)

پھر ۲۵- مئی ۱۹۰۱ء کو لکھا :- "کتاب الآلات کی تصاویر کے لئے رشد کو لکھئے وہ انتظام کردینگے"

[1] شروانی ۱۷،
[2] مفتی رحمت اللہ رعد مالک مطبع نامی کانپور،

مگر اس کے چند ہی مہینوں کے بعد حیدرآباد کے سیاسی انقلاب کے بعد اس کتاب کے چھپوانے کا خیال جاتا رہا،

دکن کی تاریخیں

اس سررشتہ سے مولانا سے پہلے فرنچ سیاح موسیو ٹوریئر کے سفرنامۂ دکن کے دو حصے ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں اور تاریخ دکن کے دو حصے ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئے تھے، جن کا ذکر مکاتیب (حصہ ۵۰) میں بھی ہے، مولانا کے زمانۂ نظامت میں نظام اکبری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد میں، اور تاریخ دکن کی تیسری جلد آگرہ میں ۱۹۰۳ء میں چھپی،

حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی دل برداشتگی ۱۹۰۲ء - ۱۹۰۵ء

حیات شبلی کے جو پچھلے صفحے آپ کی نظر سے گذرے ہیں، اُن میں یہ چیز آپ کو ملی ہوگی کہ مولانا نے ہندوستان سے دکن کا رخ کس اضطراب اور گھبراہٹ کے عالم میں کیا تھا یعنی اپنے والد کی وفات کے بعد جن مشکلات سے اُن کو دوچار ہونا پڑا، اور قرض کا جو بوجھ ان کے سر آکر پڑا، اس نے ان کو پریشان کر دیا، اور اسی پریشانی کے عالم میں حیدرآباد چلے آئے، قدرشناسوں نے قدر کی، اور اُن کے اطمینان کے لئے ایک معقول جگہ کا انتظام کیا، مگر ابھی انتظام پوری طرح ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ سیاست کا مرکز بدل گیا، اور بے اطمینانی کے اسباب پیدا ہو گئے، اس زمانہ میں انھوں نے چاہا کہ قرض کے بوجھ سے اب بھی کسی طرح سبکدوشی ہو جائے تو ملازمت کی زنجیر کو پاؤں سے نکال دیں، ۵۔ فروری ۱۹۰۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "میں اچھا ہوں مگر پریشان ہوں، یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا ہے، میرے سررشتہ اور دائرۃ المعارف پر ایک کمیشن بیٹھی ہے، اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا، لیکن میں پہلے ہی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں. . . . .

اگر دیہات بک کر قرض ادا ہو جاتا، تو میں دو ہزار پر بھی یہاں کی، بلکہ کہیں کی ملازمت نہ کرتا، میں نے

ندوہ میں رہنے کا عزم جازم کرلیا ہے، دیکھئے یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے، مولوی سیّد علی بلگرامی ۸ر مارچ کو ولایت روانہ ہوں گے۔" (سمیع ۵۰)

دسمبر ۱۹۰۲ء میں اُن کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے ذاتی کتب خانہ کو جو اعظم گڈھ میں ہے فروخت کرکے قرض کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں، اس کتب خانہ کا قدرداں اُن کے خیال میں اُن کے دوستوں میں ایک ہی شخص تھا، اس کو خط لکھا:" ایک راز کی بات کہتا ہوں اپنے ہی تک رکھئیگا آپ کو معلوم ہے والد قبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا، اس میں سے اب چھ ہزار اور رہ گئے ہیں، اس کے مارے میں غربت کی خاک چھانتا پھرتا ہوں، اور کس کمبخت کو نوکری کی غرض ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنا کتبخانہ کل فروخت کر ڈالوں...... باقی تین ہزار کا اور کچھ سامان کروں گا، اگر یہاں (حیدرآباد میں) استقلال ہو جاتا تو میں کل سامان کر لیتا، لیکن ہر نفس نفس واپسیں ہے۔" (شروانی، ۴۸)

نواب محسن الملک کی علی گڈھ کے لئے کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی ۱۹۰۲ء

اس کشمکش میں نواب محسن الملک نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ کالج میں دوبارہ آجائیں، اس راہ میں سب سے بڑی مشکل مولانا سے گورنمنٹ کی ناراضی تھی، نواب صاحب ممدوح نے لفٹننٹ گورنر سے مل کر اس کی صفائی کرلی، اور اس کی اطلاع مولانا شبلی کو بھی دی، مولانا لکھتے ہیں:" اس ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط آیا ہے کہ وہ نواب لفٹننٹ گورنر سے ملے اور معلوم ہوا کہ لفٹننٹ صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے رفع کر دیئے، اور یہ بھی کہا کہ اب اُن کو علی گڈھ کالج اگر بلانا چاہے تو بلا سکتا ہے، محسن الملک نے مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آجاؤ، وظیفہ حیدرآباد بھی جاری ہو جائے گا، اور سو روپیے کالج سے بھی ملیں گے، لیکن میں نے منظور نہیں کیا، اور کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہو جائے

تو ندوہ میں آجاؤں" (شروانی - ۱۴۰)

قرض سے نجات اور نوکری سے سبکدوشی کی کوشش

معلوم ہو چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۰۲ء تک اُن پر چھ ہزار قرض کا بوجھ تھا مگر چند مہینوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے، اور صرف ایک ہزار رہ گیا، یکم جون ۱۹۰۳ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں:- "خدا کا شکر ہے کہ قرض ہائے کثیر میں سے اب صرف ایک ہزار اور رہ گیا ہے جس کو میں ماہوار ادا کر رہا ہوں، باقی سب ادا ہو گئے (مجموعی قرضہ (والد مرحوم) کی تعداد تیس[1] ہزار تھی" (حمید ۷۰)

اس سے ایک گونہ اُن کو اپنی پابندی کی زنجیریں ڈھیلی نظر آئیں، اور اس خیال میں کہ اُن کا سو روپیہ والا گذشتہ وظیفہ بحال ہو جائے تو وہ خود استعفا دیدیں اور زیادہ پختگی آگئی،

ندوہ کی یاد

۱۹۰۱ء میں مولانا ایک نئی ملازمت کی قید میں گرفتار ہو چکے تھے، اس لئے وہ اس سال بھی ندوہ کے سالانہ جلسہ میں جو ۲۳-۲۴-۲۵-۲۶ شعبان ۱۳۱۹ء مطابق ۵-۶-۷-۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کلکتہ میں ہوا تھا شریک نہیں ہوئے لیکن انھوں نے ایک خط کے ذریعہ سے جلسہ میں یہ اعلان کرا دیا کہ وہ عنقریب سب چھوڑ چھاڑ ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھیں گے، یہ خط جیسا کہ کلکتہ کی روداد صفحہ ۱۰ میں چھپا ہے حسب ذیل ہے:۔ "رخصت ملنے کی توقع نہیں، اس لئے شاید کلکتہ نہ پہنچ سکوں لیکن ابھی مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجئے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھوں اور اپنی تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دوں"

مولانا اپنے بیچ کے خطوں میں تو بارہا اپنی اس خواہش کا ذکر فرما چکے تھے، مگر یہ پہلا موقع

---

[1] یہاں خط میں تیئیس ہزار غلط چھپا ہے، تیس ہزار ہونا چاہئے"

سے ہے کہ انھوں نے پبلک میں اس کا برسرِ عام اعلان کیا۔

شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوہ نے ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اُس کے ابتدائی تین درجوں کے بعد چوتھا درجہ متوسط سالِ اوّل کے نام سے کھلا اور شوال ۱۳۲۰ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے دوسرے درجہ کا اور شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء میں متوسط کے تیسرے درجہ کا افتتاح ہوا[۱]، دارالعلوم کے درجے پے در پے سال بہ سال کھلتے جاتے تھے اور مولانا کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، لیکن نصاب درس کی ترتیب و ترمیم کے واسطے اب تک کوئی خاص مجلس نہ تھی، بلکہ جلسۂ انتظامیہ اس خدمت کو خود ہی اُن حضرات کے مشورہ سے جن کو تعلیم کا پورا تجربہ حاصل ہو، انجام دیتا تھا۔ ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۲ء میں اس کام کے لئے ایک خاص مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی، اور مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی جیسے تجربہ کار حضرات مقرر کئے گئے تھے، اور اس مجلس کے معتمد مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی منتخب ہوئے تھے[۲]، اس میں خاص لحاظ کے قابل بات یہ ہے کہ اس میں مولوی شبلی صاحب کا نام نہیں، اسی زمانہ میں ندوہ کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا خیال ہوا، مگر اس میں بھی مولانا سے مشورہ نہیں لیا گیا، یہ گو اتفاقی بات ہوگی، مگر مولانا کو اس سے یہ شبہہ ہوا کہ ندوہ کے کارکن میری شرکت نہیں چاہتے، اس بنا پر ۲۴ راگست ۱۹۰۲ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو انھوں نے لکھا۔ "ندوہ کی نسبت ہمیشہ میرا یہی خیال رہا اور سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا، گو واقعاتِ اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا،

---

[۱] روداد ندوہ امرتسر بابت ۱۹۰۲ء ۱۳۲۰ھ ص۳ و روداد مدراس ۱۹۰۴ء ص۲۵ [۲] روداد ندوۂ مذکورۂ امرتسر ص۳۱

یہ تو میری حالت ہے اب آپ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جس کام پر میں نے برسوں غور کیا ہے اس کے سامان بہم پہنچائے ہیں، اس کو اچھی طرح کر سکتا ہوں، اس میں بھی آپ ہاتھ لگانے نہیں دیتے، رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لئے علی گڈھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے، لیکن آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کے اور طرزِ تعلیم کو الٹ دیا، بہرحال مجھ کو کسی کے ظن اور خیال پر اعتراض نہیں لیکن جب یہ کیفیت ہے تو بے فائدہ دخل در معقولات سے کیا حاصل ہے، مجھ کو اب ندوہ سے معاف کر دیجئے مجھ سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہے تو اور بھی بہت لوگ ہیں، افسوس ہے ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہے، اگلی جلسہ کے لئے میں نے سامان کر لیا تھا لیکن ایسے مجمع میں شرکت سے کیا فائدہ جہاں سب لوگ مجھ سے بدظن ہوں۔"

اس خط کے جواب میں جناب مولانا شروانی نے غالباً یہ لکھا کہ "اگر آپ ندوہ سے الگ ہوتے ہیں، تو میں بھی ہوتا ہوں۔" ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ کی اس علٰحدگی سے ندوہ کو جو نقصان پہنچے گا اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ چند ماہ کے بعد امرتسر میں ندوہ کا اجلاس ہوگا، اس میں دارالعلوم کے نصاب کے مسئلہ کو طے کر لیجئے، اور یہ بھی لکھا کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر آئیں تو ساری مشکلیں حل ہوں۔" اس کے جواب میں ۱۰ ستمبر ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں:۔ "میں نے یہ کب کہا کہ آپ بھی ندوہ سے علٰحدہ ہوں، آپ پر ندوہ کو پورا اعتبار ہے، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور آپ کو کرنا چاہئے، میرے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں حیدرآباد چھوڑ دوں اور یہ شرط خود آپ کے اس عنایت نامہ میں بھی درج ہے، نصاب کا کام

لاہورؔ[1] سے انجام ہوسکتا ہی، اور حیدر آباد سے نہیں ہوسکتا،

میں ندوہ کا دشمن نہیں ہوں کہ اپنی علٰحدگی سے اس کے نقصان رسانی میں مدودوں، میں امرتسر آؤنگا لیکچر میں کبھی لکھ کر نہیں دے سکا، اس لئے اگر زبانی منظور ہو تو حاضر ہوں ورنہ معاف،

ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں، ان میں خود میرے ہموطن اور عزیز بھی ہیں اور جس وجہ سے خلاف ہیں اس سے بھی میں واقف ہوں لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے کیا حاصل، البتہ آپ سے تعجب ہے کہ ہر قسم کے کام کے لئے ترکِ معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں"

اس کے ایک مہینہ کے بعد ۶-۷-۸ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۹-۱۰-۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ امرت سر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا، جس میں مولانا نے اپنی خیالات کو ایک نالۂ موزوں کی شکل میں پیش کیا جو سراپا درد ہے، یہ فارسی ترکیب بند تھا، جو پہلے ہی نہایت اہتمام سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی میں چھپوا لیا گیا تھا، پہلے ہی اجلاس میں روداد کے بعد مولانا اپنا یہ ترکیب بند سنانے کو کھڑے ہوئے اس کا مطلع تھا،

انچہ با ہیچ نیرزد بجہاں آں داریم ‌ ‌ ‌ ایکہ پرسی چہ کسانیم وچہ ساماں داریم

اس ترکیب بند میں سات بند ہیں، پہلے دو بندوں میں علما، کی قناعت وفضیلت کا بیان ہی، تیسرے اور چوتھے میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر ہے، پانچویں اور چھٹے میں نئی تعلیم کے نقائص کا بیان ہی، اور ساتویں میں ندوہ کے مقاصد کی تشریح ہی، یہ ترکیب بند جس وقت جلسہ میں پڑھا گیا ہی حاضرین کی کیفیت کیا ہوئی، اس کا مختصر بیان اُس جلسہ کی روداد میں مذکور ہی،

[1] یہ اشارہ مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی رکن مجلسِ نصاب کی طرف ہی جو لاہور میں رہتے تھے،

"شیخ عبدالقادر صاحب بی اے (موجودہ سر شیخ عبدالقادر) جس وقت اپنی تقریر تمام کر چکے معزز حاضرین نے بےچینی سے شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کی طرف نگاہیں دوڑائیں، وفورِ شوق اور شدتِ انتظار کے جھرمٹ میں مولوی صاحب ممدوح اسٹیج پر تشریف لائے، اور اپنا ترکیب بند ایسے مؤثر اور درد انگیز لہجہ میں پڑھا جس کو سنتے وقت سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے، خصوصاً دو بند اوّل کے کچھ ایسے پڑھے گئے جنھوں نے علما پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دی، اور جہاں تک دریافت ہوا ہے اس کا مزہ اب تک لوگ نہیں بھولے، اس ترکیب بند پڑھنے سے پہلے مولوی صاحب نے ایک مختصر تقریر بھی کی تھی، اور درمیان میں بھی جابجا حالت اور موقع کے مناسب تقریر کرتے جاتے تھے، جس سے سامعین کو زیادہ لطف آتا تھا، اس ترکیب بند کو مولوی صاحب نے کانپور میں چھپوایا تھا جس کی سو کاپیاں اس وقت موجود تھیں، ان کو حاضرین نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا، (ص۲۰۱)

زیارت کا پہلا موقع یہ (۱۳۲۰ھ) پہلا موقع ہے کہ میرے (راقم الحروف[1]) ہوش و حواس کے کانوں نے مولانا شبلی کا آوازہ سنا، امرتسر سے جب مولانا واپس ہوئے تو لکھنؤ آکر ٹھہرے، اور میں نے سب سے پہلی دفعہ اُن کی زیارت کی، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اس وقت دارالعلوم میں مدرسِ اعلیٰ تھے، وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے، وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا شبلی) کے اس ترکیب بند کے اُن چند شعروں سے بہت خفا تھے، جن میں فلسفۂ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے بےخبری پر تعریض تھی،

تا چہ سود ست دہد آں فلسفۂ عہدِ قدیم　　　تا چہ سود ست دہد آں ہیئتِ پارینہ نہاد

---

[1] راقم الحروف شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوا تھا،

ازعناصر سہ وشصت آمدہ اینک بہ شمار   توہماں در گروِ آتش و آبستی و باد

ہم لوگ اُس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ ومنطق کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے، پھر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۶۳ عناصر کے نظریہ کی تردید فرماتے تھے اور سمجھاتے تھے، اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے،

پنجاب میں اس زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں کی وجہ سے ختمِ نبوت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، شاید اسی سبب سے مولانا نے اپنی تقریر کا موضوع "ختمِ نبوت" قرار دیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر تقریر کریں حسب دستور ندوۃ العلما کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر فرمائی جو رو داد میں مذکور ہے، اس تقریر میں جدید اور قدیم دونوں گروہوں کو مخاطب کرکے ندوہ کی ضرورت ثابت کی ہے، اور بتایا ہے کہ اب ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت ہے جو نیا علم کلام پیدا کرے، اور طلبا کو نئے علوم وفنون کی تعلیم دے،

اس تقریر میں وقت اتنا گذر گیا کہ مولانا نے چاہا کہ وہ ختمِ نبوت والی تقریر کو چھوڑ دیں، مگر حاضرین کے بیحد اصرار سے ختمِ نبوت پر تقریر شروع فرمائی، روداد میں ہے:- "شمس العلما، مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی چاہتے تھے کہ صرف اسی تقریر پر اکتفا کریں، مگر حاضرین جلسہ کے بیحد اصرار سے "ختمِ نبوت" پر تقریر شروع فرمائی جس پر دیر تک تقریر فرما رہے تھے اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ تقریر ناتمام رہے، باوجودیکہ ایک گھنٹہ صرف اسی عنوان پر تقریر فرماتے رہے، مگر تقریر کے بعض بعض حصے چھوٹ گئے، بعض مجمل طریقے پر بیان ہوئے، تاہم جس قدر بیان ہوئے وہ ایسا فاضلانہ مضمون تھا جس کے سننے کے لیے سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے، اور اس عالم خاموشی میں بھی حسنِ بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صداؤں سے تمام ہال گونج

جاتا تھا، افسوس ہے کہ اردو میں اب تک آواز نویسی کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا، اس وجہ سے ایسی دلآویز تقریریں اسی وقت تک کے لئے ہوتی ہیں جب تک ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہی، یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلمبند کی جاتی، مگر باوجود کوشش کے نہیں ہوسکی، جس قدر حصے قلمبند ہوئے وہ ایسے نامربوط ہیں، جنہیں زیادہ لطف نہیں آسکتا، مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تقریر کو مستقل رسالہ کی صورت میں قلم بند کردیں گے" (صشنا)

افسوس ہے کہ مولانا کا یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا، اور حقائق و معارف کے ایک بحرِ زخار کی موجیں پیدا ہوکر فنا ہوگئیں، اسی زمانہ میں "وکیل" امرتسر میں اس کے ناتمام خلاصے جلسہ کی روداد کے ضمن میں چھپے تھے، مگر اس وقت وہ ناتمام خلاصے بھی سامنے نہیں،

تبدیل نصاب کی کوششیں ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء

امرتسر میں علماء کی مجلسِ خاص میں نصاب کے مسئلہ پر نہایت طول طویل بحثیں ہوئیں، اور بالآخر مولانا کی جیت ہوئی، اور کثرتِ رائے سے درس نظامی میں ترمیم منظور ہوئی، اور اصولی طور سے بعض اصول طے ہوئے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی میں ہے، مگر اس پر بھی ندوہ میں وہی پرانا نصاب عملاً جاری رہا، جس پر ۲۲ جون ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ناظم مجلسِ نصاب مولانا شروانی کو لکھا: "آج ایک نقشہ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ کا آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں:۔ ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ (۴۸)

مکرمی، ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے، آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اس لئے؟ مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں اختلاف تھا، لیکن جنہیں اتفاق تھا وہ کہاں ہیں، مدرسوں کو کہئے کہ یہ کیا کر رہے ہیں! افسوس، افسوس"

پھر ان ہی کو جولائی ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں :- "میں نے مدرس اعلیٰ دار العلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے، امرتسر میں جو طے ہوا وہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا ؟ وہاں سے جواب آیا کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا، ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، آپ نے مدرسہ میں غالباً نصاب نہیں بھیجا، جس کی وجہ یہ ہو گی کہ نصاب میں کچھ اختلافات تھے لیکن بہرحال کچھ کتابیں متفق علیہ عام تھیں ان کی اطلاع تو آپ کو دینی چاہیئے تھی، یہ نہایت تعجب کی بات ہو کہ آپ کمیٹی نصاب کے ناظم اور آج تک وہی اندھیر ہے ؟

خدا کے لئے فوراً دار العلوم کو نصابِ مقررہ سے مطلع کیجئے اور تاکید کیجئے کہ اس کو درس میں رکھیں، جو کتابیں مختلف فیہ ہوں ان کو رہنے دیجئے" (۵۰)

پھر اسی زمانہ میں ان کو دوبارہ لکھتے ہیں :- "جلسۂ انتظامیہ میں یہ تو اصولاً طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے، اس سے شرحِ سلّم وغیرہ خود خارج ہوتی ہیں، اس کے علاوہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ مثلاً کتبِ ذیل کی نسبت تمام ممبروں سے پوچھئے کہ درس میں رکھی جائیں یا نہیں، شافیہ، فصول اکبری، شرح ملا، ملا حسن، میر زاہد، ملا جلال وغیرہ ،

تمہید میں یہ وجہ لکھئے کہ زمانۂ درس کا اختصار ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہر فن کی ایسی کتابیں جو تمام مسائل کو حاوی ہوں، اور اس میں دوسرے علوم کی بحثیں بیچ میں نہ آئیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جا رہا ہے"

مولانا شروانی کے اس جواب پر کہ نصاب مجوزہ پر ابھی تک ارکان کا پورا اتفاق نہیں ہوا، ۱۳ ستمبر ۱۹۰۳ء کو رقم فرماتے ہیں :- "مسلمان سود بے تکلف دیتے ہیں، لیکن لیتے نہیں، حرام

دونوں ہیں، لیکن پہلی صورت میں چونکہ نقصان ہے، اس لئے اس کے مرتکب، اور دوسری صورت میں چونکہ فائدہ ہے اس لئے اس سے مجتنب ہیں، بعینہ یہی حالت ندوہ کی ہے، اور ایک خاص حصہ کے متعلق یہ حالت آپ کی وجہ سے ہے،

ندوہ میں سیکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں، اس کی تو کچھ پرس وجو نہیں، لیکن نصاب کی نسبت آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہو کہ ایک ایک حرف پر سب کا اتفاق جب تک نہ ہوئے کچھ کیا نہیں جاسکتا،

کرمی، اس طرح کام نہیں چلتا، سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا، امرتسر میں اصولی مراتب طے ہوچکے تھے، مثلاً یہ کہ مخلوط الفن کتابیں خارج کردیجائیں گی، اس کے مطابق آپ ملا حسن، میر زاہد، حمداللہ قاضی کو فوراً خارج کرسکتے ہیں، شرح ملا وغیرہ بہ تصریح خارج ہوچکی ہیں، میں مدرسین کو لکھتا ہوں تو وہ لکھتے ہیں کہ بغیر معتمد کے حکم کے ہم کیونکر تبدیلی کریں، آپ فوراً لکھ بھیجئے کہ فلاں فلاں کتابیں موقوف اور ان کے بجائے فلاں فلاں کتابیں، اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہ ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجئے" (۵۲)

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پھر انھیں ایک مفصل خط لکھا، جس میں فرماتے ہیں:۔ "آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزل گوئی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوتا، لیکن اسی خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا جو ندوہ میں جاری ہے،

میرے محبوب! کیا آپ کا یہ کام تھا کہ سال بھر سے وہ کتابیں جو قطعاً امرتسر میں خارج کردی گئی تھیں، جاری رہیں، اور آپ مکمل نصاب کے متفق علیہ ہونے کا انتظار کرتے رہیں، خیر اب سنئے

درجۂ متوسط سال سوم میں سے ملا حسن، میر زاہد رسالہ میر زاہد، ملا جلال، قاضی مبارک، صدرا، سب خارج کر دینا چاہیئے، ان کے بجائے شرح مطالع کے بعض حصے، حمد اللہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ از خیر آبادی، رسائل ابن رشد مطبوعۂ مصر، حماسہ، اعجاز القرآن باقلانی، اور ہدایہ معاملات (بشرط گنجایش) ہونا چاہیئے،

درجۂ متوسط سال دوم میں سے میبذی (یہ سب سے زیادہ نالائق کتاب ہی) شرح عقائد نسفی، تصریح الافلاک خارج ہونی چاہیئے، موطاے امام محمد، سبعہ معلقہ، جلالین قائم رہنا چاہیئے، اور رسائل اربعہ امام غزالی، الفوز الاصغر لابن مسکویہ مطبوعۂ بیروت جو لکھنؤ میں بھی مطبع یوسفی میں مل سکتی ہی پڑھانا چاہیئے

درجۂ متوسط سال اول میں مشکوٰۃ کی ضرورت نہیں، مختصر معانی قطعاً خارج کر دینا چاہیئے، اور حسن التوسل فی صناعۃ الترسل مطبوعۂ مصر اس کے بجاے رکھنا چاہیئے، منتقی الابحر کی بھی ضرورت نہیں، دیوان ابو العتاہیہ اس میں اضافہ کرنا چاہیئے،

درجۂ ابتدائی سال سوم میں تلخیص اور دیوان علی (جو محض موضوع ہی) بالکل خارج، مشکوٰۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کا فن مستقل اخیر میں رکھا جائے گا،

درجۂ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے شافیہ، کافیہ، شرح جامی قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایۃ النحو لانا چاہیئے، اور مفصل زمخشری اضافہ کرنا چاہیئے، نیز کلیلہ دمنہ ابن المقفع مطبوعہ بمبئی،

لیکن خدا کے لئے پھر پنچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھئے گا، کوئی کتاب نئی تو کم کی جائے خواہ نہ کی جائے، لیکن کافیہ، شافیہ، شرح جامی، میر زاہد، ملا حسن، ملا جلال، قاضی یہ تو قطعاً نکلوا دیجئے، خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے ؟"

اس ساری خط و کتابت اور سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ اصلاح نصاب کے متعلق مولانا

کو مولانا مرحوم نے کن مشکلوں سے طے کیا، اور عربی تعلیم کے لئے ایک نئے راستہ کی تجویز منوانے میں ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں،

ندوہ کا انتشار

اس زمانہ میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی صاحب ندوہ کی نظامت کی خدمت کے بار سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے، کئی سال سفر حجاز میں رہے، ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں مولانا مسیح الزمان خاں صاحب شاہجہاں پوری ان کے قائم مقام ہوئے، اور ندوہ کا دفتر شاہجہاں پور کو منتقل ہوا، اور اسی سال ۱۷ر شعبان ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں دار العلوم کی معتمدی اور نگرانی جناب منشی محمد اطہر علی صاحب رئیس کاکوری کو سپرد ہوئی[1]، یہ زمانہ ندوہ کے سخت انتشار کا تھا، اور مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں جھلا جھلا کر ندوہ کے دوستوں کو سخت خط لکھتے رہے،

ندوہ کا سالانہ اجلاس مدراس میں شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۴ء

خوش قسمتی سے آئندہ سال ۱۴-۱۵-۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳-۴-۵ جنوری ۱۹۰۴ء میں ندوہ کا سب سے پہلا اجلاس مدراس میں ہوا، جس میں دوسرے عمائد کے علاوہ مولانا شبلی بھی شریک ہوئے، بلکہ اس کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۷ر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۰۴ء کی صدارت[2] بھی کی، پروگرام میں (سر) شیخ عبد القادر لاہوری کی تقریر کے بعد خود مولانا کی تقریر کا وقت تھا، اور موضوع وہی تھا، جو ان کے دل سے لگا تھا، یعنی دار العلوم

[1] روداد مدراس ۱۹۰۴ء صفحہ ۳، منشی صاحب موصوف کچھ دنوں تک دار العلوم کی نگرانی کا فرض اس طرح ادا کرتے رہے کہ باوجود رئیس ہونے کے خود دار العلوم کے صحن میں آکر رات کو آرام فرماتے تھے، ۳۰ رمضان ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۷ر نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ حج بلکہ ہجرت کے ارادہ سے حجاز کو روانہ ہوئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء کو وفات پائی، اور جوار رحمت میں جگہ پائی، ان کی وفات پر میرا ایک عربی مرثیہ میرے عربی دیوان میں ہے،

[2] روداد مدراس ۱۹۰۴ء صفحہ ،

کی ضرورت، روداد کے الفاظ یہ ہیں :۔ "اس (شیخ عبدالقادر کی) تقریر ختم ہونے پر پہلے سے کچھ زیادہ شوق اور بےچینی کے آثار جلسہ میں پیدا ہوگئے، ہر شخص کے ہاتھ میں جلسہ کا نظام تھا، اور صدر نشین کی طرف نگاہیں تھیں کیونکہ یہ وقت جلسہ کے صدر نشین مولانا شبلی نعمانی کی تقریر کا تھا، اور آپ دارالعلوم کی ضرورت پر بیان فرمانے والے تھے، مولانا ممدوح کھڑے ہوئے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس میں چند عنوانات لکھے ہوئے تھے، حسب عادت ممدوح نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں فرمائی تھی،[۱]

اسی سلسلہ میں مولانا شبلی نے یہ تحریک فرمائی کہ دارالعلوم کی تعمیر میں ایک کمرہ صرف علماء کے چندہ سے بنے، جناب ملا عبدالقیوم[۲] صاحب حیدرآبادی نے اس کی تائید کی، چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی، مولانا شبلی، مولانا مسیح الزماں خاں، مولوی ضیاءالدین صاحب، ملا عبدالقیوم صاحب مولوی عبدالقادر صاحب صوبہ دار گلبرگہ، مولوی احمد محی الدین صاحب مدراس نے سو سو روپئے مولوی عبدالرب صاحب خواہرزادۂ ملا عبدالقیوم نے ڈھائی سو، اور باقی علماء نے دس بیس پچیس کے چندے[۳] لکھوائے،

مدراس کے جلسہ سے یہ فائدہ ہوا کہ مولانا کو ناظم صاحب ندوۃ العلماء، مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم اور دوسرے ارکان سے دو بدو گفتگو کرنے کا موقع ملا، اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں، نصاب کا مرحلہ طے ہوا کہ ملا عبدالقیوم، مولوی سید عبدالحی صاحب، اور مولانا شبلی باہم

---

[۱] روداد مدراس ۱۹۰۱ء صفحہ ۹۶ [۲] جناب ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی علماء میں تھے اور سرکار نظام میں متعدد ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے، جناب مولانا مسیح الزماں خانصاحب شاہجہانپوری استاد حضور نظام کے برادر نسبتی یعنی سالے تھے، نہایت روشن خیال تھے، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی تاسیس میں ان کا ہاتھ بھی شامل تھا، اس زمانہ میں کانگریس کے بڑے حامیوں میں تھے [۳] روداد مدراس ۱۹۰۱ء صفحہ ۹۶،

مل کر بنائیں، مسودہ کی تجویز بھی مکمل ہوئی، اور مولانا کا نام اڈیٹروں میں شامل ہوا، اور یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے دفتر ہٹانے کی وجہ کیا تھی؟ مولانا شروانی کو ۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں: "مدراس میں جو کچھ ہوا وہیں کے لئے ہوا، دارالعلوم یا ندوہ کو دو چار سو بھی ہاتھ نہیں آئے، میں نے اس دفعہ مولوی مسیح الزماں صاحب وغیرہ کو الگ جلسہ میں بلا کر مختتم گفتگو کی، یعنی اگر چلانا ہے تو ٹھیک طرح سے چلائیے ورنہ کم سے کم میں الگ ہوجاتا ہوں، مولوی مسیح الزمان صاحب نے صاف کہا اور مولوی عبدالحیٔ صاحب وغیرہ نے بھی موافقت کی کہ دارالعلوم جب تک شہر لکھنؤ میں منشی اطہر علی کے زیر اثر ہے کچھ نہیں ہوسکتا، اس لئے ہم نے دارالعلوم ان کے سر مارا، باقی اشاعت اسلام کا کام شاہجہاں پور میں انجام دونگا، مولوی عبدالحیٔ صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ مولوی حبیب الرحمان صاحب سے بار بار نصاب مانگا گیا لیکن وہ نہیں بھیجتے، تمام لوگوں کو آپ سے سخت شکایت تھی، لوگ کہتے تھے کہ ویسا ہی مسودہ بھیجدینا تھا،

میری بھی رائے ہے کہ جس کام کو آپ قلت فرصت یا اور کسی وجہ سے نہ کرسکتے ہوں اس سے استعفا دینا بہتر ہے، ورنہ محض انتساب کے فخر سے کیا حاصل،

رسالہ کے لئے اب تک مولوی مسیح الزماں صاحب درخواست دینے میں پس وپیش کرتے ہیں"

پھر ۲۲ر جنوری سنہ ۱۹۰۴ء[5] کو لکھتے ہیں:- "خانۂ ملاح در چین است وکشتی در فرنگ"

میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی، آپ کا نصاب بھی یوں ہی کہیں پڑا ٹھوکریں کھاتا ہوگا، منشی صاحب[2] مہتم ہیں، نصاب اُن کے پاس کیا ہوگا، وہ کیا کرسکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا،

ابکی بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے،

۵؎ مکاتیب میں سنہ ۱۹۰۲ء غلط چھپا ہے۔ ۲؎ جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم،

مولوی عبدالحیٰ صاحب کے دو علہ قیام کی وجہ سے خزانہ لکھنؤ کے پتہ سے پہنچتا ہے نہ شاہجہاں پور کے پتہ سے،
آپ اتنا کیجئے کہ فوراً ناظم صاحب کو خط لکھ کر ہدایت کیجئے کہ نصاب منگوا کر جاری کر دیں یا فیصلہ کیلئے میرے
پاس بھیجدیں، کیونکہ جلسۂ انتظامیۂ مدراس میں یہی طے پایا تھا کہ فیصلۂ اخیر کے لئے نصاب میرے پاس بھیجدیا
جائے تاکہ ارکانِ ندوہ موجودۂ حیدر آباد سے اس کا فیصلہ کرا لیا جائے، جلدی فرمائیے، دیر کی حد
ہو چکی، ورنہ یہ سال بھی آپ کے نذر ہوگا" (شروانی)

مولانا نے اس سال یہ عزم کر لیا کہ دار العلوم میں نیا نصاب جاری کر دیا جائے اور کچھ دن
لکھنؤ رہ کر دیکھیں کہ دار العلوم میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟
چنانچہ ۵ ستمبر ۱۹۰۳ء[1] کو مولانا شروانی کو لکھا :- "ندوہ کا اب نفسِ واپسیں نظر آتا ہے، اس بنا پر بطور رحم کت
مذبوحی کے یہ ارادہ ہوتا ہے کہ ۲ مہینہ کی رخصت لیکر لکھنؤ آؤں، اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور
جاری کرا دوں، نصاب اور رسالۂ ماہانہ، اس کے سوا عام تدابیر بھی سوچی جائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کم
از کم ایک مہینہ لکھنؤ میں آکر رہیں، میں بغیر آپ کے کچھ کام نہیں کرنا چاہتا، اور نہ کر سکتا،

اگر آپ اپنے کام کا ذاتی ہرج کر کے آسکیں تو فوراً لکھئے، ورنہ ندوہ کو الوداع کہئے، میرا اس وقت آنے
میں سخت نقصان ہے، تنخواہ کی مجرائی الگ ہے، میری ملازمت کے استقلال کا مسئلہ اس وقت پیش ہے،
اس کو چھوڑنا الگ نقصان رساں ہے، زنانہ کا الگ بکھیڑا ہے، لیکن غالباً ان سب کو میں برداشت
کر سکوں گا، آپ فوراً جواب دیجئے،

میں مدتِ قیامِ لکھنؤ میں ہر روز کسی فن پر طلبہ کے سامنے لکچر بھی دونگا، قدماء کے طریقہ پر" (شروانی ۲۴)

---

[1] مکاتیب میں ۱۹۰۲ء غلط چھپا ہے،

اسی خیال سے اواخر ستمبر ۱۹۰۴ء میں وہ حیدرآباد سے لکھنؤ آئے، اور دو تین ہفتے دارالعلوم کی پرانی عمارت میں جو گولہ گنج میں واقع ہے اور اب "خاتون منزل" کے نام سے مشہور ہے، اُس کمرہ میں جو اب ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی فرودگاہ ہے قیام فرمایا، اور ۲۰ ستمبر ۱۹۰۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا: "میں ندوہ میں آگیا ہوں، میری عیادت اور مہماتِ امور کے طے کرنے کے لئے فوراً تشریف لائیے اور ہفتہ دو ہفتہ یہاں قیام کیجئے"۔

مولانا شروانی اس وقت نہ آسکے، اور تنہا مولانا مقیم رہے، یہ پہلا موقع تھا کہ خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، مولانا کے حلقہ میں بیٹھے، اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی بھی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ان دنوں ندوہ میں ٹھہرے تھے وہ بھی حاضر رہتے تھے، اور اُن ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کیا، نومبر کے آخر میں جب وہ حیدرآباد واپس گئے تو میرے ایک عزیز نے میری صلاحیت کی نسبت اُن سے دریافت کیا تو جواب میں ۲۷ نومبر ۱۹۰۴ء کو وہ فقرہ لکھا جو میرے لئے ہمیشہ طغرائے فخر ہے: "ملازمت نے مجھ کو حیدرآباد آنے پر مجبور کیا، مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہرِ قابل ہیں"۔ (عبدالحکیم)

اب مولانا نے دارالعلوم کو دیکھ بھال کر حیدرآباد سے قطعِ تعلق کر کے قیامِ ندوہ کی تجویز پر عمل کرنے کا عزم فرمالیا، مگر ابھی تصفیۂ حالات کے لئے انتظار کے چند مہینے باقی تھے،

انجمن ترقی اُردو کی نظامت
جنوری ۱۹۰۳ء

کوئی غیر قوم جب کسی دوسرے ملک پر حکومت کرتی ہے تو اس کی سلطنت کا سب سے کامیاب اصول یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد اور طبقوں

میں اختلافات پیدا کردے، ہندوستان کے مسلمان اور ہندو صدیوں کی جنگ وجدل اور لڑائی بھڑائی کے بعد وحدتِ ملکی کی ایک سطح پر آگئے تھے، جن کا باس قریب قریب ایک تھا، تمدن یکساں ہوگیا تھا، زبان ایک ہوگئی تھی، مگر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کو سرکاری دفتروں سے خارج کرکے اُردو کو اُس کی جگہ دی، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر اردو کے ساتھ ایک نئی زبان کا کالبد تیار کیا، اور اس کا نام ہندی رکھا، پہلی مسلمانوں کی، اور دوسری ہندوؤں کی زبان قرار دی، اختلاف کا یہ اثر آگے کو پھیلا، اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھاگیا،

۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ ملک میں دیسی زبان کی ایک یونیورسٹی کی تحریک کی، اُس وقت اردو سرکاری زبان تھی، اس لئے ظاہر تھا کہ دیسی یونیورسٹی کے معنی اردو یونیورسٹی کے تھے، یہ سمجھ کر بعض ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لئے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی،

اس کے بعد صوبہ بہار اور صوبہ متحدہ کے ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ سرکاری دفتروں میں ہندی رائج کی جائے، بہار میں اُن کی یہ تجویز کامیاب ہوئی، یہ دیکھ کر صوبہ متحدہ کے ہندوؤں نے ایک محضر تیار کرکے اس پر ہندوؤں کے دستخط کرانے شروع کئے، سرسید نے اردو کی حمایت کے لئے ۹ ستمبر ۱۸۶۸ء کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز کی، اس کے جواب میں ۱۸۶۸ء میں علی گڈھ میں بھاشا سمروہن سبھا بنائی گئی، جس کا

مقصد یہ تھا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی زبان اور ناگری حروف کا رواج ہو،

ہندی پسند ہندوؤں کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں، یہاں تک کہ سر انٹونی مگڈونل جو صوبہ بہار میں سولین رہ چکے تھے، اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے، وہ ہندی کی محبت صوبۂ بہار سے لے کر یہاں آئے تھے، انھوں نے ۸ اراپریل ۱۹۰۰ء کو ایک سرکاری فرمان جاری کیا جس کے رُو سے عدالتوں میں ناگری حروف کی اجازت دے دی گئی، اس اجازت سے اردو کے حامیوں میں عام بےچینی پھیل گئی، ۲۹ راپریل ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں اردو ڈیفنس سنٹرل کمیٹی بنی، اور ۱۲ رمئی ۱۹۰۰ء کو علی گڈھ میں نواب لطف علی خاں بہادر رئیس چھتاری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا، اور نواب محسن الملک نے جو اب سرسید کے بعد اُن کے قائم مقام تھے ایک مؤثر تقریر کی، اور طے پایا کہ حکومت میں ایک یادداشت بھیجی جائے،

اس کے بعد لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ۸ راگست ۱۹۰۰ء کو پرانے ورما لائبریری ہال میں ایک بڑا شاندار جلسہ ہوا جس میں مختلف مقامات سے بہ کثرت نمایندے آکر شریک ہوے، اور بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو اور عیسائی بھی شریک تھے، ان اختلافی جلسوں اور تجویزوں سے لفٹنٹ گورنر صاحب کے مزاجِ گرامی کو بڑی برہمی ہوئی، اور اردو کے بہت سے حامی معتوبِ بارگاہ ٹھہرے اور آخر اس عتاب کی تاب نہ لا کر اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کو زندہ دفن کر دیا،

آخر دسمبر ۱۹۰۲ء اور اوائل جنوری ۱۹۰۳ء میں شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس کا اجلاس ہوا، اس میں کانفرنس کے متعدد شعبے قائم ہوئے جن میں سے ایک اردو کا شعبہ بھی تھا، جس کا نام "انجمن ترقی اردو" پڑا، اس شعبہ کے حسبِ ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے،

صدر :- مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور،

نائب صدر :- شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب،

" " شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب،

" " شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالیؔ،

سکریٹری :- شمس العلماء شبلی نعمانی،

مولانا نے اجلاس کے بعد فوراً ہی حیدر آباد دکن میں بیٹھ کر ترقیِ اردو کا کام شروع کر دیا، احباب کو خطوط لکھے، دوستوں سے رکنیت کی فرمائشیں کیں، عربی، فارسی و انگریزی سے لائقِ ترجمہ کتابوں کا انتخاب کیا، مترجموں کو مقرر کیا، اخباروں کے اڈیٹروں کو انجمن کا رُکنِ اشاعت بنایا، متعدد مصنّفوں نے اپنی کتابیں انجمن کو بھیجیں اور بعض نے تکمیل کے بعد بھیجنے کا وعدہ کیا، اس زمانہ میں انجمن کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ میں چھپتی تھی، اور ملک میں اردو کے متعلق اس قدر جوش پیدا ہو گیا تھا کہ اخبار ہندوستانی لکھنؤ نے جس کے اڈیٹر گنگا پرشاد ورما تھے یہ شکایت چھاپی کہ انجمن نے اردو کے کام میں ہندو جماعت کو علٰحدہ رکھا، اس پر سکریٹری (مولانا شبلی مرحوم) نے اخباروں میں یہ تحریر شائع کی کہ" یہ واقعہ کے خلاف ہے، انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا وہ ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا، اور ایک ایسی کتاب

پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی، یعنی کتاب "پیغمبرانِ ہند" [لہ] جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ، اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں۔"

اس تحریر کا اثر یہ ہوا کہ بعض ہندو بزرگوں نے بھی انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی، اور اس کی ممبری قبول کی۔

اس زمانہ میں فلسفہ اور سائنس کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم تھیں، اس لئے ان علوم کی ابتدائی اور سہل کتابیں ترجمہ کے لئے انتخاب کی گئیں، مگر افسوس ہو کہ لائق مترجم نہ مل سکے، چنانچہ ۱۳۔ اگست ۱۹۰۳ء کو مولانا شبلی نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔" یہ مہینہ [لہ] مشتہرہ کتابوں کے ترجمہ کے امتحان کا مہینہ تھا جو کچھ ظہور میں آیا اس سے قومی مسائل کے متعلق مہتم بالشان نتیجے حاصل ہوئے ہیں، جس وقت انجمن کی تجاویز ملک میں شائع ہوئی تھیں تو اطرافِ ہند سے اس قدر درخواستیں آئی تھیں کہ گمان ہوتا تھا کہ ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے، لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو ہر طرف سناٹا تھا، کتاب النباتات اور طبقات الارض کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، کتاب الروح کا صرف ایک ترجمہ اور سوکرسستم کے تین ترجمے آئے، آپ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ مترجمیں انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بجز ایک کے تمام ترجمے ناقص اور ابتر ہیں، کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڈہ سائنس اور عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا۔۔۔۔۔۔؟"

انجمن کا پہلا سال بہت کامیاب رہا، کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی تھیں کہ ان کے خریدار کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی، اور دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو اس شعبہ کی رپورٹ علحدہ چھاپی اور شائع کی گئی، مولانا کی یہ رپورٹ بڑی دلچسپ اور

لہ یہ کتاب انجمن کی طرف سے "رہنمایانِ ہند" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ لہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۳

پڑھنے کے لائق ہیں، انجمن کا دوسرا سال بھی کامیاب رہا، اس کے ارکان میں معتدبہ اضافہ ہوا، مصنفین و مؤلفین کو معاوضہ ادا کرنے کے لئے کچھ رقم چندہ کے طور پر جمع ہوئی، نصابِ تعلیم اردو کی طرف بھی انجمن نے توجہ کی، اس وقت حسبِ ذیل ترجمے یا تالیفات زیرِ قلم تھے،

۱- ترجمۂ "ایجوکیشن" ہربرٹ اسپنسر،
۲- ترجمۂ کان فلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس از ڈریپر،
۳- ترجمہ ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل،
۴- ترجمہ میکس مولر لکچرز،
۵- کتاب الہیات،
۶- نامۂ دانشوراں،
۷- معارف ابن قتیبہ،
۸- رہنمایانِ ہند،
۹- القمر،
۱۰- تاریخ تمدّن یعنی بکلز ہسٹری آف سویلزیشن،
۱۱- سوانحعمری امیر خسرو دہلوی،
۱۲- قدیم فارسی،
۱۳- سوانحعمری میر انیس،
۱۴- طریقہ حکومتِ انگریزی،

مولانا گو افکار میں مبتلا تھے، اس پر بھی انجمن کا کام نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہا، ۱۱ اپریل ۱۹۰۳ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو جو اس زمانہ میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے وہ لکھتے ہیں :- "اردو سکشن کی [illegible] زور شور سے شروع کرتا ہوں"۔(۱۸)

پھر ۱ مئی ۱۹۰۳ء کو لکھتے ہیں :- "انجمن ترقی اردو کی کاپی بھیجتا ہوں، ارکانِ اعانت اور خریداروں کے نام بھیجنے چاہئیں" (۱۹)

مولانا حمید الدین صاحب نے کراچی سے انجمن کے ممبروں کے نام لکھکر بھیجے، (حمید ۲۰) پھر ۷،

جون ۱۹۰۳ء کو اُنھیں لکھا :- "اردو نے اب تک جو کام کیا وہ علی گڈھ گزٹ میں اس ہفتہ چھپے گا، اس میں دیکھنا، تم بتاؤ کہ عربی زبان سے کونسی کتابیں ترجمہ کے قابل ہیں" (حمید ۲۱)

۱۱۔مئی ۱۹۰۳ء کو ممتاز انشاپرداز مہدی صاحب افادی کو جو یوپی میں نائب تحصیلدار تھے، یہ لکھ کر بھیجا :- "اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار کا موقع ہے، دستور العمل ارسال ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے" (مہدی ۱۱)

۲۲۔جون ۱۹۰۳ء کو صوبہ بہار میں اردو کے لائق ادیب و شاعر مولوی ریاض حسن خاں صاحب خیال کو لکھا کہ انجمن کے لئے ارکانِ اعانت بنائیں، اور ساتھ ہی فارسی تذکرہ علماء کی ایک مشہور جدید کتاب "نامہ دانشوران" کے ترجمہ کے لئے اُن کا انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں اُنکو لکھا گیا "آپ کا نام ارکانِ اعانت کی فہرست میں درج کیا گیا، اور مستقل خریداروں کے رجسٹر میں بھی درج کیا گیا آپ کے خط کے آنے سے پہلے دو جگہ سے اطلاع آئی، ایک اور صاحب نے نامہ دانشوران کا ترجمہ شروع کر دیا ہے، لیکن ابھی دفتر میں نمونہ نہیں آیا، اطلاعاً عرض ہے، نامہ دانشوراں کے ترجمہ میں بعض بعض جگہ ابہام و تفصیل کے لئے اور کتابوں کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا، غالباً آپ نے خود اس کا اندازہ کیا ہوگا، کتاب مذکور مدت تک میرے استعمال میں رہی، لیکن اس وقت پیشِ نظر نہیں، اس لئے صفحات کی تعداد محض تخمینی لکھدی گئی، اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے" (۲)

اسی صوبہ بہار میں مولوی ابوالکمال دسنوی کو ۲۰ نومبر ۱۹۰۴ء کو اطلاع دیتے ہیں :-

"کتبِ مشتہرہ میں سے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب چھپ گئی، اور عنقریب شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں" (۱)

یوپی میں اپنے عزیز مولوی محمد سمیع صاحب کو جو جونپور میں محافظ دفتر تھے لکھا، انھوں نے

انجمن کے ممبر اور مستقل خریدار بنائے، ۷ر نومبر ۱۹۰۳ء کو حیدر آباد سے انھیں مطلع کیا " قواعد انجمن ترقی اُردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی ہو کہ خریداران مستقل ارکانِ اعانت قرار دیئے گئے، تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کردو، انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں " (ضمیمہ ۵۲)

جدید علوم کے ترجمہ میں اصطلاحات کی دقت تھی، اس کے لئے بالفعل یہ کیا گیا کہ اصطلاحات کو الگ چھپوا کر مترجمین کی خدمت میں بھیجا گیا، ۱۲ر جنوری ۱۹۰۴ء کو مولوی ریاض حسن خاں خیال کو لکھتے ہیں :- " کیمسٹری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں، بلکہ صرف اصلی الفاظ چھپوا لئے گئے ہیں کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیجدی جائیں " (۴)

اسی ضمن میں شعرای اُردو کے تذکروں کی اشاعت کی تجویز بھی تھی، اپنے دوستوں میں سے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا " انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کے مصنفہ تذکرۃ الشعرا چھپوانا چاہتا ہوں کیا آپکے کتبخانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہو " (علی حسن خاں ۵) یہ تجویز مولوی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں زیر عمل آئی،

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک اور کام یہ کرانا چاہا کہ اس وقت تک اردو زبان میں کتابوں کا سرمایہ جتنا فراہم ہو چکا ہے اُس کی ایک مبسوط فہرست تیار کرلیجائے، اس کام کے لئے پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کا انتخاب کیا جو اُس زمانہ میں حیدر آباد ہی میں تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو شروع کردیا، مگر وہ ختم ۱۹۲۲ء میں ہوا، اور " الفہرست " کے نام سے شائع ہوئی، پروفیسر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں :- " ۱۹۰۳ء[1] میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک

---

[1] اصل کتاب میں ۱۹۱۳ء غلط چھپ گیا ہی،

تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست اُن کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں تاکہ آیندہ ان سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں، اور اردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے،

مولوی شبلی صاحب مرحوم کے ایما سے راقم نے اس کام کو شروع کیا، اور اسی سال اس کا ایک حصہ تیار بھی کر لیا تھا جس کا ذکر مولانا ممدوح نے رپورٹ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں کیا تھا، تھوڑے دن کے بعد مولوی شبلی صاحب حیدر آباد سے چلے گئے، اور انجمن نے اس کام کی طرف توجہ نہ کی "

انجمن کا کام شروع تو بڑے جوش و خروش سے کیا گیا، انتہا یہ ہے کہ دفتر میں کوئی دوسرا مددگار بھی نہ تھا، پھر بھی سارا کام مع خط و کتابت کے خود ہی انجام دیتے تھے، ۱۳ر جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- " میں اردو کے قصہ میں بہت عدیم الفرصت ہو گیا ہوں، جو وقت بچتا ہے بالکل خط و کتابت میں صرف ہو جاتا ہے " (حمید ۲۲) لیکن ایک ہی دو سال کے بعد ۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا کے پر دار العلوم ندوہ کی خدمت کا قدیم ذوق اتنا غالب آگیا کہ آخر انجمن کو دوسروں کے حوالہ کر کے خود ندوہ کے آستانہ پر آکر بیٹھ گئے،

حیدر آباد سے استعفا اوپر کے صفحوں میں یہ بیان آچکا ہے کہ وہ ندوہ کی مستقل خدمت کے لئے کس طرح تیار ہو رہے تھے، اور اب دار العلوم دیکھ کر اور طلبہ سے مل جل کر اپنے عزم کو عمل میں لانے کے لئے سعی کر رہے تھے، اور چاہتے تھے کہ سابقہ منصب بحال ہو کر سر رشتہ علوم و فنون کی نظامت سے استعفا منظور ہو جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء کے آخر یا ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں استعفا پیش کر دیا، مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی کو ۴ر جنوری ۱۹۰۵ء[1] کو لکھتے ہیں :- " عزیزی خط بھیجا ہے،

[1] مولانا نے غلطی سے خط کے آخر میں تاریخ ۴ جنوری ۱۹۰۴ء لکھدی ہے، نئے سال کے شروع میں اکثر نادانستہ قلم سے پچھلا سال نکل جاتا ہے، یہی غلطی اس خط کے سنہ میں ہے، واقعات کا تقاضا یہی ہے کہ یہ جنوری ۱۹۰۵ء ہو، ۱۲

چونکہ استعفا دیدیا، اور مدارالمہام کے ہاں سے منظور بھی ہوگیا، صرف اعلیٰ حضرت کی منظوری باقی ہے، اس لئے جلد یہاں سے روانگی کا قصد ہے، لیکن ابھی متعین نہیں کہ کہاں جاؤں گا، میری صحت کے لئے ضروری ہے کہ چار پانچ مہینہ تک صرف سیر و تفریح کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا کہ میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا، اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھئے خدا کب موقع لاتا ہے (ضیاء الحسن)

شروع فروری ۱۹۰۵ء میں وہ حیدرآباد سے مستعفی ہوکر پہلے وطن چلے آئے۔ ۵ فروری ۱۹۰۵ء کو اعظم گڈھ سے مولوی سمیع صاحب کو لکھا: "میں مستعفی ہوکر وطن آگیا، اگرچہ مدارالمہام کو میرے قیام پر اصرار تھا، لیکن میں نے ملازمت کے جوئے کو اتارنا ہی مناسب سمجھا" (سمیع ۴۲)

ملازمت سے علیحدگی کے بعد سو روپئے ماہوار کا اگلا منصب بحال ہوگیا۔

بھوپال کی تحریک مولانا کے استعفے کی خبر جب بھوپال پہنچی تو ہز ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے نواب محسن الملک کے ذریعہ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مولانا بھوپال آجائیں، نواب صاحب نے حسب ذیل خط مولانا کے نام لکھ کر بھیجا: "مولانا! ہز ہائینس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ "مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے۔ فرمائیے کیا جواب دیا جائے آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ الندوہ کب نکلے گا، آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضرات علماء کا کیا حال ہے، مدد دیں گے یا فرنٹ ہوجائیں گے" (مہدی)

لیکن مولانا اپنے عزم پر قائم رہے۔

طلبائے دارالعلوم کی خوشی مولانا کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بیحد خوشی ہوئی، اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا، طلبہ نے جلسے کئے، تقریریں کیں نظمیں لکھی گئیں خاکسار

نے بھی طلبہ کی ایک انجمن مین اپنی خوشی و مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا، جو زندگی میں فارسی کا پہلا کلام ہے اور آخری بھی، بطور یادگار ذیل میں اسکو جگہ دے کر اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کرنا چاہتا ہوں،

شبلی نعمانی

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلبابِ ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغِ طورِ ایمانی

مئے کز جرعہ اش رونق فزاید لفظ و معنی را
دہد تیغ زباں را جوہرِ تیغِ صفاہانی

مپرس افسانہ دارا و اسکندر کہ می بافند
مپرس از دفترِ پارینِ حکمت ہائے یونانی

خرد گم کردہ راہست اندریں راہی کہ می پویم
فلاطونی دریں کشور نباشد جز بہ نادانی

فسوں سازیِ چشمِ نرگسین دل رانمی بازد
کہ مسحورم بہ سحرِ کلکِ جادوئے سخندانی

نہ دارم گوش بر ایں نغمہ سنجیہائے داؤدی
کہ گوشم ہست بر آوازِ مرغِ باغِ یزدانی

فدائے آں حدیثِ روح پرور باد ہر جانے
کہ جانِ نو دمد در مردہ دل چوں آبِ حیوانی

خدیو کشورِ معنی کہ فرمانش برد دلہا
چہ دلہا سکہ بر جاں زد چہ بر قاصی چہ بر دانی

بیا اے قصہ خوانِ جاہِ افریدون و کیخسرو
بہ بیں اینجا کہ درویشے کند در فقر سلطانی

نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیمے نہ اورنگے
نمی دارد بدستش ہیچ اسبابِ جہانبانی

دنا قش سجدہ گاہِ قصر و ایوانِ شہنشاہی
بساطش بوسہ گاہِ دانش آموزانِ یونانی

کہن دستارِ او بالاتر از اکلیلِ سلطانی ‏— حصیرِ کلبہ اش بہتر ز اورنگِ سلیمانی
عصائے موسوی کلکش ید بیضاست قرطاسش ‏— سطورِ صفحہ اش چوں جعد بر رخسارِ نورانی
صریرِ خامہ اش نغمہ سرائے گلشنِ حکمت ‏— مدادش از پئے چشمِ ورق کحلِ صفاہانی
سخن گوید لبش یا گوہرِ شہوار می بارد ‏— چنیں گوہر نہ زنہار آفریدست ابرِ نیسانی
گراں تر چند اوراقش بود از گنجِ قارونی ‏— نمی ارزد بیک حرفش ہمہ سامانِ سامانی
سنانِ خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش ‏— زبانگِ طبلِ صیتش پُر، فضائے کونِ امکانی
دلش آرامگاہے موجِ دریائے معانی را ‏— ہویدا فکرِ حلِّ معضلات، از خطِّ پیشانی
ضمیرش چوں کند غواصیِ جیحونِ مشکلہا ‏— برآرد دستِ فکرش صد دُرِ ناسفتۂ نورانی
کفش باشد تہی از درہم و دینار و اما نش ‏— پُر از دُرِّ عمانی و پُر از لعلِ بدخشانی
خجل از حسنِ نثرش لعبتانِ حجلۂ گردوں ‏— عرق از دُرِّ نظمش بر جبینِ ابرِ نیسانی
دلش نتواں کشیدن منتِ اربابِ نعمت را ‏— کہ نشتر می خورد از ہمتش اقبالِ سلطانی
بیانش ابرِ باران است، می بخشد چو می بارد ‏— ببوم شور سر سبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم، باعجازِ قلم، جانِ دگر بخشد ‏— بحکمِ قم باذنِ العلم آں تن راکہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ نامش حی و قیوم است ‏— بماند زندۂ جاوید ایں شبلیِ نعمانی
نوشتم چوں مدیحِ حضرة الاستاد و برخواندم ‏— ندا آمد مرا از پردۂ ناموسِ ربانی

دریں فصلِ ممدوحت ز مدحِ تو ہویدا شد
بہ پیشِ مور سر نہ نہی کہ ہمنامِ سلیمانی

دارالعلوم کی معتمدی

۱۹۰۵ء۔ ۱۹۱۳ء

مولانا کا نام دارالعلوم کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلی دفعہ ۱۶ ذیحجہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۶

۱۹۰۳ء کو بمقام شاہجہانپور مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری نے جلسۂ انتظامیہ مین

کیا، اور ارکان نے بالاتفاق منظور کیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ

لکھنؤ آکر قیام کرین، مگر وہ اُن دنون نہ آسکے تو ۱۰ شعبان ۱۳۲۱ھ کو منشی محمد اطہر علی صاحب کو دا

کا عارضی معتمد و نگران مقرر کیا گیا، اب جب مولانا تشریف لے آئے تو ۱۵ صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل

کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوے، یہ قانونی کارروائی تھی، ورنہ مولانا اس سے چند ماہ پہلے ۱۹۰۵ء کے شرو

مین دارالعلوم مین تشریف لے آئے تھے، اور گولہ گنج مین پرانے دارالعلوم کی اُس عمارت مین جو

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، خاتون منزل کے نام سے موسوم ہے اس کی سب سے بالائی منزل پر جو مر

ایک کمرہ تھا اور جو پہلے طلبہ کا دارالمطالعہ تھا قیام فرمایا تھا،

جدید نصاب کا اجراء دارالعلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم مین اص

لاح تھا، قدیم نصاب تعلیم مین جو خرابیان تھین مولانا نے اُن پر الندوہ مین بارہا مضامین لکھے

ندوہ کی تقریرون مین اُن کو برملا ظاہر کیا، لیکن ان خرابیون کو اختصار کے ساتھ انھون نے رو

دارالعلوم بابت ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء و ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء و ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء مین لکھدیا ہے، مولانا کے خیال کے مطابق قدیم

نصاب مین حسبِ ذیل خرابیان تھین،

(۱) جو علوم مقصود اصلی ہین اُن کی بہت کم کتابین درس مین ہین، اور جو علوم بالواسطہ مقصود
ن مین کثرت سی کتابین پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً نحو وصرف کی غرض علم ادب اور عربیت کی
ہی لیکن جس قدر وقت نحو وصرف پر صرف کیا جاتا ہی خود علم ادب پر نہین کیا جاتا اسی طرح
ن کا حال ہے،

(۲) منطق وفلسفہ کی کتابین اس کثرت سے درس میں ہین کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول
ن تمام علوم کی مجموعی کتابین بھی مل کر تعداد مین اُن کے برابر نہین ہوسکتین،

(۳) اکثر کتابین اس قسم کی ہین جنمین خلط مبحث ہی مثلاً حمد اللہ، میرزاہد، ملا حسن، قاضی وغیرہ
ہ کے فن مین ہین، لیکن اس میں فلسفہ کے مسائل نہایت کثرت سے بھر دیئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ
ہ کہ طالب العلم اصل فن سے محروم رہتا ہی، ان کتابون کو پڑھ کر فلسفہ آجائے تو آجائے، لیکن
منطق نہین آسکتی،

(۴) فن تفسیر اس قدر عظیم الشان اور مہتم بالشان فن ہے لیکن اس کی صرف دو کتابین
ی جاتی ہین جلالین اور بیضاوی، جلالین کے اختصار کا یہ حال ہی کہ اس کے الفاظ
داد قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہے، اور بیضاوی کے ۳۰ پاروں میں سے صرف ڈھائی
ے درس مین ہین،

(۵) علم عقائد سب سے زیادہ مہتم بالشان علم ہی لیکن اس مین صرف شرح عقائد نسفی پڑھائی
ہے، جو بالکل معمولی درجہ کی کتاب ہی شرح مواقف مین صرف امور عامہ کی بحث درس
ہی جس کو عقائد سے کوئی تعلق نہین ہی،

(۶) اکثر کتابین جو درس مین ہین ان مین مسائل کو اس طرح صاف اور منقح نہین لکھا ہو کہ اصلی مسائل ذہن نشین ہو جائین، ردّ وقدح، اعتراض وجواب، احتمالات اور تعلیلات سے مسائل کو مغلق اور پراگندہ کر دیا ہے جس سے طالب علم گویا ایک جال مین پھنس کر رہ جاتا ہی،

(۷) علومِ جدیدہ کی کوئی کتاب درس مین داخل نہین،

(۸) انگریزی زبان درس مین داخل نہین،

ان وجوہ کی بنا پر ندوہ نے ابتدا ہی سے اصلاحِ نصاب پر توجہ کی، اور تمام علماے ہندوستان سے مشورہ اور استصواب کیا گیا، چنانچہ ۱۲ مختلف نصاب پیش ہوے جو چھاپ کر شائع کئے گئے، لیکن یہ تمام نصاب باہم نہایت مختلف تھے، رجب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں بمقام امرتسر ایک جلسہ ہوا جس مین اکابر علما شریک تھے، اس جلسہ مین چند اصولی مراتب طے ہوے، پھر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء بمقام مدراس ایک جلسہ ہوا، جس مین یہ طے ہوا کہ اصولِ طے شدہ کے موافق ملا عبد القیوم صاحب حیدرآبادی، مولوی سید عبد الحیٔ صاحب اور علامہ شبلی نعمانی باہم مل کر ایک نصاب بنائین، چنانچہ وہ نصاب بنایا گیا جس مین جزءِ غالب مولانا کی ترمیمات کا تھا، اس نصاب مین حسبِ ذیل خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا تھا،

(۱) ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن باقلانی اور نقد الشعر درس مین داخل کی گئین،

(۲) تفسیر بیضاوی کے ۱۵ پارے درس مین داخل کئے گئے، مصر مین اس زمانہ مین ایک نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی جس کا نام الصراط المستقیم ہی، اس مین قرآن مجید کی صرف وہ

آیتین جمع کرکے اُن کی مختصر تفسیر لکھی ہو جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہین، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہوجاتے ہین، یہ کتاب بھی درس مین داخل کیگئی،

(۳) عقائد مین پہلے ابن رشد کی کشف الادلہ اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھین لیکن اب اس کے بجائے امام رازی کی معالم فی اصول الدین رکھی گئی،

(۴) فلسفہ مین ہدیۂ سعیدیہ، شرح حکمۃ العین اور شرح حکمۃ الاشراق داخل کی گئین، اس اخیر کتاب مین اشراقیون کا فلسفہ ہو جس کے متعلق درسِ قدیم مین کوئی کتاب داخل نہ تھی،

(۵) اسرار شریعت مین حجۃ اللہ البالغہ نصاب مین رکھی گئی،

(۶) فلسفۂ جدیدہ مین دروس الاولیہ رکھی گئی، اس مین سائنس کے جدید مسائل ہین اور بیروت مین چھپی ہے،

(۷) انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی،

نصابِ قدیم مین کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگون کو اس قدر شاق تھا کہ گو یہ نصاب ۱۹۰۷ء مین منظور ہوچکا تھا لیکن اس پر عمل نہین ہوتا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابین پڑھاتے تھے یہان تک کہ مولانا نے حیدرآباد سے آکر ندوہ مین قیام کیا، اور جبریہ حکم دیا جب جاکر اسکی تعلیم جاری ہوئی، اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابین پڑھایا کرتے تھے جس کو بڑی سختی سے روکا گیا،

تعلیم انگریزی

ایسے علما، جو موجودہ زمانہ مین اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکین، غیر ملکون مین بلکہ خود اپنے ملک مین بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض کو ادا کرسکین، معترضینِ اسلام کے جوابات دے سکین، اور نئے تعلیم یافتون کی تشفی کرسکین، بغیر اس کے ممکن نہین کہ وہ انگریزی زبان

سے تھوڑی واقفیت رکھیں، اس خیال کی بناء پر مولانا نے دارالعلوم کے نصاب مین انگریزی کے
داخل کئے جانے پر بہت زور دیا، علماء اس بدعت کے لئے کسی طرح آمادہ نہین ہوسکتے تھے،
انتہا یہ ہے کہ ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین مولانا نے جب یہ تحریک پیش کی تو مولانا شروانی جیسے
روشنضمیر روشنخیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ڈر سے اس بحث سے اعراض فرمایا، آج
یہ باتین عجیب معلوم ہونگی، مگر ۱۸۹۹ء کا حال سنیئے، ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہین:
"جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک مین نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج
تحریر کیجائے، البتہ اس پر بحث نہیں ہوسکی لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی مین میری تحریک لکھی بھی نہ جائے،
مولوی عبدالحئی صاحب آپ کی اجازت کے طلبگار ہین، کوئی وجہ نہین کہ آپ اجازت نہ دین" (شروانی [۲۱])
اس کے جواب مین مولانا شروانی نے شاید یہ لکھا کہ یہ واقعہ مجھے یاد نہین آتا، اس پر انکو لکھتے ہین:
"بات تو کچھ نہین لیکن مولوی عبدالحئی صاحب کی بہانہ جوئی اور آپکے خارق العادت بھولنے پر تعجب آتا ہے،
یہ امر معمولی حیثیت سے نہین بلکہ ردوکد کے ساتھ ظہور مین آیا تھا، جب مین نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو
نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص محرک نہین،
میں نے کہا کہ میں ہوں اور میرا نام لکھا جائے، مولوی محمد یونس خاں نے کہا میں تائید کرتا ہوں،
البتہ آپ کی خاطر سے میں نے پھر اس پر بحث نہیں کی، اب بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ میں نے
نائب ناظم سے کہا یا نہیں کہ میرے نام سے یہ تحریک لکھی جائے، اگر میں نے کہا تو انھوں نے لکھی یا نہیں؟ نہیں
لکھی تو کیوں؟ اور لکھی تو اس کے درج کارروائی کرنے سے کیون انکار ہے، صدر انجمن کو یہ حق البتہ ہے کہ کسی
تحریک کو پیش کئے جانے سے روکدے، یہ حق نہیں کہ یہ بھی کارروائی مین درج نہ ہونے دے، کہ فلاں شخص

نے اس کو پیش کرنا چاہا تھا یا پیش کیا،

جلسہ کے بعد میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں، آپ نے کہا تمہاری بدنامی کے ڈر سے، باوجود ان تمام باتوں کے اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیریؔ کا یہ مصرع سمجھ میں آگیا ع

ع آنکہ نسیاں آورد خاصیتِ یادِ من است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے" (شروانی ۲۲)

شوال ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء کے جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز دوبارہ پیش ہو کر منظور ہوئی، یہ تجویز اگرچہ بہت سے ارکان کی موجودگی میں منظور ہوئی تھی، لیکن بعض معزز ارکان نے سخت مخالفت کی کہ اگر مدرسہ میں انگریزی پڑھائی گئی تو ہم اس مدرسہ کو توڑ دینگے، بلکہ ایک صاحب نے جو ندوہ پر ایک جائداد وقف کرنے والے تھے اس کی وجہ سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا[1]، یہ ردوکد ۱۹۰۱ء تک جاری رہی، ۲۵ مئی ۱۹۰۱ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھتے ہیں:" ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جنکو میں اپنا امام کہتا ہوں، ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے اُن کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کو تجویز پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب العلموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں" (شروانی)

بہرحال مولانا اور دوسرے ارکان جو ایمانداری سے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اپنے ارادہ پر قائم رہے، آخر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں دار العلوم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ایک انگریزی کا ماسٹر مقرر ہو گیا، اور کچھ طالب علموں نے "اے بی سی ڈی" پڑھنی شروع کی مگر

[1] روداد دار العلوم بابتہ ۱۳۲۵ھ و ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ مرتبہ مولانا شبلی مرحوم ص۸،

یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی، سالہاسال کے بعد بھی کوئی پرائمری سے آگے نہیں بڑھا، ۱۹۰۵ء
میں جب مولانا معتمد ہوے تو اُن کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) کے ایک جلسہ میں ہر لڑکے کے لئے
انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اور اس کی نگرانی کے لئے مولوی سید ظہور احمد صاحب[1] وکیل
لکھنؤ مجلس دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے، لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ
تھا، اس لئے تعلیم کا نقص جاری رہا، ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد ندوۃ
کی دنیاوی تعلیم کے لئے منظور کی تو انگریزی اسٹاف ضرورت کے مطابق مقرر ہوا، اور انگریزی
تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی،

انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علمون مین میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہو جائے، اس کا
یہ اثر ہوا کہ دارالعلوم کے کئی لڑکون نے انگریزی پڑھ کر مفید علمی اور مذہبی خدمت انجام دی، ن
کے اجلاس دہلی مین سید محمد اور عبدالمجید نامی دو طالب علمون نے جب ایک مذہبی موضوع
انگریزی مین تقریرین کین تو ایک عالم کی زبان سے انگریزی تقریر سنکر لوگوں کو اچنبھا ہو گیا، ا
سر شیخ عبدالقادر نے جو جلسہ میں موجود تھے ان کی تعریف کی، اس سلسلہ مین سب سے پہلا نام
مولوی ضیاء الحسن علوی کا لینا چاہئے، جنھون نے یہان سے نکل کر میٹرک کیا اور پھر علی گڈھ
جاکر ایم اے کیا، اور اسی کے بدولت ۱۹۱۶ء میں ہمارے صوبہ مین وہ عربی مدرسوں کے پہلے
انسپکٹر مقرر ہوے، اور جنھون نے عربی مدرسون کی اصلاح و ترقی سے متعلق بہت سی اچھی خدمتین انجام د

---

[1] افسوس کہ سید صاحب موصوف نے ۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں حرکت قلب بند ہو جانے سے دفعۃً انتقال کیا، وطن الہ آباد کا ب
تھا، اقامت لکھنؤ میں تھی، کامیاب وکیل تھے، ایک زمانہ تک مسلم لیگ کے سکریٹری رہے تھے، مرنج و مرنجان، خاموش اور نیک
طینت بزرگ تھے، لکھنؤ کے اکثر قومی کاموں میں شریک رہتے تھے، دارالعلوم اور ندوہ کے رکن کی حیثیت سے وہ اخیر تک
اسکی خدمت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے،

میری معمولی انگریزی تعلیم ندوہ ہی کی رہین منت ہے، اسی کا فیض ہے کہ مین سنہ ۱۹۱۰ء مین انگریزی اسکولون کی ریڈرون سے صیغۂ اغلاطِ تاریخی کی رپورٹ پیش کرسکا، ارض القرآن لکھ سکا، اور یورپین مواد سے اپنی تصنیفات مین فائدہ اٹھاسکا، اور سنہ ۱۹۲۰ء مین یورپ مین جاکر کچھ کام کرسکا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اسی کی بنا پر جدید فلسفہ کی متعدد کتابین ترجمہ کین، اور عقل ونقل پر سورت کی ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کے اجلاس مین وہ رسالہ لکھ کر پیش کیا جو اہلِ عقل ونقل ونو کے لئے یکسان مرکزِ توجہ ہے، پھر معجزات کے امکان اور وقوع پر وہ بسوط رسالہ لکھا جو سیرۃ النبی کے حصۂ سوم کا ایک جزو ہے، اور یورپ کے مشہور فلسفیون ہیوم اور برکلے کی تصنیفات کو اردو مین منتقل کیا اور دارالترجمہ حیدرآباد کے لئے جدید نفسیات واخلاقیات کی ضخیم کتابین اُردو مین ترجمہ کین، اور جامعۂ عثمانیہ مین فلسفۂ جدیدہ کے پروفیسر ہوسکے،

مولوی زین العابدین ندوی نے اتنی ہی انگریزی پر یہ ہمت کی کہ وہ امریکہ تک پہنچے، اور سات آٹھ برس وہان رہ کر تبلیغ اسلام کا کام کیا، اور مولوی احمد اللہ صاحب ندوی نے اتنی ہی انگریزی کے سہارے سنہ ۱۹۲۰ء مین لندن تک گئے، اور وہان لوگون کو اردو پڑھا کر چند ماہ گذارے،

پروفیسر مظفر الدین ندوی نے یہان سے نکل کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی، اور اس وقت سے انگریزی مین علمی اور مذہبی مضامین لکھ رہے ہین، اور بعض تصنیفات انگریزی مین لکھ کر شائع کین، اور نطشے کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی،

مولوی حاجی معین الدین[۱] ندوی ہین جن کی انگریزی تعلیم اس مدرسہ سے آگے نہین بڑھی،

---

[۱] آہ کہ حاجی صاحب نے ۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۴۱ء مین پٹنہ مین جہان وہ مدرسہ شمس الہدیٰ مین صدرالمدرسین تھے، وفات پائی،

پھر بھی انھون نے انگریزی مین اورینٹل لائبریری پٹنہ کی فہرست کی کئی جلدیں ترتیب دین، اور آب
اسی کام کو مولوی مسعود عالم ندوی کر رہے ہین جنکی انگریزی تعلیم مدرسہ سے نکلنے کے بعد میٹرک تک
ہی، ندوہ کے اکثر عالم بقدر ضرورت انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی اخبار، تار، اور دوسرے
معمولی کاروبار مین دوسروں کے محتاج نہیں رہتے،

مولانا کا خیال تھا جس کو انھوں نے اپنی ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء و ۱۹۰۹ء کی رؤداد میں خود
ظاہر کیا ہے کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خالص انگریزی تعلیم کے لئے انگریزی کا ایک درجۂ
تکمیل کھولا جائے، چنانچہ فرماتے ہیں:- "اور جب وہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھینگے
تو زباندانی مین قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکین گے، اور اس وقت انگریزی میں تبلیغِ اسلام کی خدمت انجام
دے سکیں گے" مگر یہ درجہ اب تک قائم نہ ہوسکا، اور نہ یہ اُمیّد پوری ہوئی، ورنہ اُس سے اور
بھی فوائد ہوتے،

بہرحال مولانا کی جس تحریک کی اتنی پُرزور مخالفت ہوئی وہ بھی بے اثر نہ رہی، آخر بڑے
بڑے عربی مدرسون کو اس کے آگے جھکنا پڑا اور دیکھا دیکھی ان کے مدرسون اور طالب علمون
کو مجبورًا اس زبان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اور آج اسکی مثالین اکثر عربی مدرسون مین
موجود ہین، اور یہ بدعت عام ہو چکی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگون نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی اس سے اُن کا منشا محض
کسی غیر اسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا، بلکہ وہ اُن اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان
کے ساتھ ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالبعلموں مین سرایت کرین گے، اور سچ یہ ہے کہ اُنکا

یہ خطرہ بیجا بھی نہ تھا، اور جو لوگ علماء کے لئے اس زمانہ مین اس کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے ان کے سامنے وہ بیسیون اسلامی مصلحتین تھین جو عربی خوان طلبہ کے انگریزی سیکھ لینے سے اُن کو پوری ہوتی نظر آتی تھین، ان کا خیال تھا کہ

زبان گر بہر حق جوئی چہ عبرانی چہ سریانی

مگر سوال یہی ہے کہ "بہر حق" ہو،

ہندی اور سنسکرت کی تعلیم مولانا نے اپنی معتمدی کے زمانہ مین ۱۹۰۸ء مین ایک تیسرا کام یہ کیا کہ دار العلوم مین ہندی اور سنسکرت کا ایک درجہ قائم کیا تاکہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ ان زبانوں کو سیکھ کر آریوں کا مقابلہ کرسکیں، جن کا اس زمانہ مین بڑا زور تھا، اور ہر جگہ وہ اسلام پر جا و بیجا اعتراض کرتے رہتے تھے، مولانا نے اس کے لئے پہلے اپنے چند عزیزوں اور دوستون کو لکھ کر چند وظیفون کا سامان کیا، اور پھر ایک پنڈت کو نوکر رکھ کر چند طالب علموں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دلائی، اس درجہ مین محمد حسین ساکن اعظم گڈہ اور سید امداد حسین ہوشیارپوری دو طالب علم اچھے تیار ہو گئے تھے، مگر مولانا کے بعد ہی یہ شعبہ ٹوٹ گیا، اور اس سے کچھ کام نہین لیا جاسکا، حالانکہ ہندوستان مین ہمارے علماء کو اگر کچھ تبلیغی کام کرنا ہے تو اس تجویز کی تعمیل سے چارہ نہیں،

نئی عربی آجکل تمام اسلامی ملکون مین جو عربی بولی جاتی ہے وہ ہماری قدیم عربی سے بالکل الگ ہے، اس کے علاوہ جو قدیم ادبی زبان لکھی جاتی ہے اس مین زمانہ کی ضرورت سے ہزارون نئی چیزون کے لئے نئے عربی الفاظ بن گئے ہین، جن کے جانے بغیر کوئی شخص عربی اخبار، رسالے اور نئی عربی کتابین نہین سمجھ سکتا، مولانا جب مصر و شام کے سفر سے واپس آئے تو انھون نے

ان الفاظ کا ایک نہایت ہی مختصر فرہنگ لکھا جو اُن کے سفرنامہ کے آخر مین لگا ہوا ہی، خاکسار کو چونکہ بچپن سے ادب کا شوق تھا، اس لئے دار العلوم مین اُس زمانہ کے جو عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آتے تھے اُن کو پڑھا اور اُن کے معنی حل کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے مین نے طالب علمی مین ایک بڑے امتحان مین کامیابی حاصل کی، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء مین جب مولانا شاہ سلیمان صاحب دار العلوم مین مقیم تھے، نواب محسن الملک مرحوم دار العلوم دیکھنے کو آئے، مین نے ان کی شان مین ایک عربی قصیدہ پڑھا جس کو سنکر انھون نے فرمایا مین دار العلوم کی عربی دانی کا قائل اُس وقت تک نہین ہون گا جب تک یہ نہ جان لون کہ یہان کے طالب علم عربی اخبار سمجھ سکتے ہین؟ چنانچہ المؤید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوایا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کرکے پڑھنے کو کہا گیا، مین نے جب اس کو صحیح پڑھ کر اس کا صحیح مطلب بتا دیا تو نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اس کو دار العلوم کا خاص امتیاز سمجھا،

اس کامیابی نے مجھے جدید عربی کے سمجھنے اور اس کے مشکلات کے حل کرنے کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ کر دیا، پھر جب مولانا ۱۹۰۵ء مین ندوہ مین آکر مقیم ہوے تو اُن کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے جن کو مین بالالتزام پڑھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جدید عربی زبان مین لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی،

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۰۸ء مین جب گورنمنٹ نے ندوہ کی امداد منظور کی تو ایک جگہ اس مین جدید عربی کی تعلیم کے لئے بھی مقرر کی گئی، اور اُس کے لئے میرا انتخاب کیا، اس کے بعد انھون نے اس کی تکمیل کے لئے مجھے مصر بھی بھیجنا چاہا[1]، مگر اس زمانہ کے مصری سیاسیات کے

[1] تفصیل کے لئے دیکھو مکاتیب سلیمان (۲۹) اور الندوہ ۱۹۰۸ء

کے سبب سے گورنمنٹ نے اجازت نہین دی، بہرحال جدید عربی زبان کی ایک خاص کرسی ہوجانے
کے سبب سے دارالعلوم ہمارے ملک مین سب سے پہلی عربی درسگاہ تھی جس نے اس کو اپنی تعلیم مین
ایک مناسب جگہ دی، اور دارالعلوم کے طلبہ نے جدید عربی زبان کے بولنے اور سمجھنے مین پوری
شہرت حاصل کی، جو بحمداللہ کہ آج تک قائم ہے،

جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کو عام کرنے کے لئے مولانا کی تجویز کے مطابق مین نے
دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو دارالعلوم اور بہت سے دوسرے
مدرسوں میں بہت دنوں تک پڑھائے گئے، اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائے جاتے ہیں،
پھر ۱۹۱۰ء مین ندوہ کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری
ترتیب دی جائے، اور یہ کام خاکسار کے سپرد کیا گیا جس کو میں نے دو برس میں پورا کرکے
۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ مین جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری اڈیٹر المنار تھے پیش کیا اور
لغاتِ جدیدہ کے نام سے وہ چھپ کر شائع ہوا، اور جس نے عربی مدارس میں نئی عربی زبان
کی دقتون کے حل کرنے مین بڑی مدد دی،

یہ سب مولانا کا فیض تھا،

ہونہار طلبہ کی تربیت | مولانا نے دارالعلوم مین قدم رکھنے کے ساتھ چند ہونہار طالب علمون
کو اپنے گرد جمع کر لیا، ان مین سب سے پہلا نام ہمارے مخلص دوست مولانا ضیاء الحسن صاحب
علوی کاکوروی (رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) کا ہے، مولانا کے پاس مصر و شام کے عربی
رسائل اور جدید تالیفات آتی رہتی تھین، وہ انھوں نے ہم لوگوں کے حوالہ کیا، اور ان میں سے

بعض مضامین کی تلخیص اور ترجمہ کی ہدایت کی، چنانچہ مولوی ضیاء الحسن کو مصر کا فلسفیانہ رسالہ "المقتطف" دیا، جس میں سے انھوں نے عمر اور صحت کی تدابیر کے مضمون کا ترجمہ کیا، جو دسمبر ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں چھپا، مجھے جرجی زیدان کی کتاب "اللغۃ العربیہ" حوالہ کی اور اسکی تلخیص کی ہدایت فرمائی جس کی تعمیل ہوئی، یہ مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں نکلا، اور پسند خاطر ہوا،

ہماری جماعت کے ایک اور رکن مولوی جواد علی خاں عالی تھے، ان کا مذاقِ طبع خالص ادبیانہ تھا اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ چل سکے، اور بعد کو خانعالی کے نام سے الناظر میں مضمون لکھتے رہے،

۱۹۰۶ء میں اس جماعت میں ایک اور رکن کا اضافہ ہوا، یہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی تھے، جن کو تحریر و انشا کا فطری مذاق تھا، اُن کے پہلے ہی مضمون تناسخ کو مولانا نے بیحد پسند کیا، اور پانچ روپیے انعام دیا، اور اصلاح کے بغیر مختصر تمہید کے ساتھ مئی ۱۹۰۶ء کے ندوہ میں شائع کیا،

تقریر کی مشق | علمی مضامین پر طلبہ کی تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص طور سے توجہ کی، اونچے درجہ کے اکثر مستعد طلبہ کو باری باری سے اپنے پاس بلواتے تھے، اُن کے لئے ایک ہفتہ پہلے موضوع مقرر کر کے اس پر مطالعہ کے لئے کتابیں بتاتے تھے، طالب علم اس تیاری کے بعد مولانا کے کمرہ میں جا کر مقررہ موضوع پر تقریر کرتے تھے، مولانا موقع بہ موقع اس میں اصلاح دیتے تھے، طرزِ تقریر بتاتے تھے، طریقۂ تعبیر سمجھاتے تھے، اور مضمون کو عام فہم بنانے کی طرف خاص طور سے تاکید کرتے تھے، اس درس میں جن طلبہ نے خاص طور سے وقتاً فوقتاً حصہ لیا اُن کے کچھ نام

یاد آگئے ہین،

۱- مولوی عبدالباری بہاری مرحوم ،

۲- مولوی ضیاءالحسن صاحب علوی (ایم اے)

۳- سید سلیمان ،

۴- مولوی مسعود علی صاحب ندوی،

۵- مولوی عبدالسلام صاحب ثانی (ایم اے، ال ال بی اعظم گڈہ)

۶- مولوی محمد حسن صاحب، اعظم گڈہ ،

۷- مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب دیسنوی بہاری ،

۸- خواجہ عبدالواجد صاحب کانپوری (ایم اے)

ان مین سے مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے اپریل ۱۹۰۸ء مین بنارس کے جلسۂ ندوہ مین جب کامیاب تقریر کی ہو تو مولانا نے خوش ہو کر اپنی عبا اُن کو اوڑھا دی تھی ،

لائق مدرسین کی فراہمی اچھی تعلیم کے لئے اچھے مدرسین کا مہیا کرنا ضروری ہے، مولانا کے پیش نظر جس قسم کی تعلیم تھی، اس کیلئے معیار کے مطابق اساتذہ مشکل سے ہاتھ آسکتے تھے، تاہم انھون نے کوشش کو جاری رکھی اور جہان کہیں گئے اپنے معیار کے مطابق اشخاص کو تلاش کرتے رہے، انگریزی کے لئے قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے (گورکھپور) کو مقرر کیا، جو اب سالہا سال سے جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ مین کام کر رہے ہین، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے ڈھاکہ چلے جانے کے بعد فلسفہ اور عقلیات کے لئے مولانا شیر علی صاحب کو لائے جو مولانا ہدایت اللہ خانصاحب رامپوری

کے ارشد تلامذہ مین تھے، ان سے مولانا کی ملاقات بمبئی یا حیدر آباد مین ہوئی، اور ایک ہی دو ملاقاتون مین ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے، مولانا شیر علی صاحب مدرسہ مین کئی سال رہے علما مین ایسے فیاض، شریف اخلاق اور باوقار کم لوگ دیکھنے مین آئے، اُن کی صحت اچھی نہین رہتی تھی، مولانا ہی کے زمانہ مین حیدر آباد چلے گئے جو اُن کا وطن ہو چکا تھا، مولانا[1] نے مجوزہ جامعہ علوم مشرقیہ حیدر آباد دکن مین اُن کی سفارش کی تھی، جامعہ کھلنے کے بعد وہ وہان کے شعبۂ دینیات کے صدر ہوگئے، اب چند سال ہوتا ہے کہ انھون نے وفات پائی، ان کے مدرسہ مین آنے پر مولانا نے شروانی صاحب کو جو خط لکھا تھا اس مین فرماتے ہین :- "دار العلوم کا رنگ بدل آیا، بڑا رونا تعلیم کا تھا..... (مولانا شیر علی صاحب) جن کو مین نے زبردستی حیدر آباد سے بلایا ہے ایسے شخص ہین کہ دو ہی چار دن مین طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سمجھے کہ تعلیم اور فن دانی اسکو کہتے ہیں، (۷۷)

اُن کے چلے جانے کے بعد ۱۹۱۱ئہ مین شمس العلما مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی کو جو اورینٹل کالج لاہور سے پنشن پاکر علحدہ ہو چکے تھے مدرسہ مین لائے، مفتی صاحب مولانا کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس لئے اُن کی ذہانت اور طباعی کے قائل تھے، مفتی صاحب کئی سال دار العلوم مین مدرس اعلیٰ رہے، مولانا کی علحدگی بلکہ وفات کے بعد وہ بھی علحدہ ہوگئے،

ادب کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸ئہ مین مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کو دوبارہ دار العلوم مین آنے کی زحمت دی، وہ تشریف بھی لائے مگر اتفاق دیکھئے کہ وہ یہان سے اپنا ضروری سامان لانے کے لئے غازی پور گئے جہان ان کا قیام تھا، وہین بیمار پڑے اور وفات پا گئے، اس جگہ کے لئے اب مولانا کی نظر شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی پر پڑی جو مولانا فضل حق

[1] مکتوبات جلد ۱ص ۶۶۶۲۶۷

خیرآبادی کے شاگرد تھے، اور مدرسۂ عالیہ رامپور میں عمر بھر رہے تھے، مگر ان دنون نواب صاحب رامپور نے اُن کو مدرسہ سے الگ کردیا تھا، تو موقع پاکر مولانا اُن کو دارالعلوم میں لے آئے، وہ معقولات اور ادبیات مین بڑے ماہر تھے اور حافظ ایسا قوی پایا تھا کہ جو کچھ دیکھا یا پڑھا تھا وہ نوکِ زبان تھا" لیکن وہ مدرسہ مین بہت کم ٹھہرے، نواب صاحب کی ناخوشی دور ہوگئی، تو وہ رامپور واپس چلے گئے،

شیخ حسین صاحب عرب محدث یمنی جو نواب صدیق حسن خان مرحوم کے اور اس عہد کے بہت سے علما، کے شیخ الحدیث تھے، اُن کے صاحبزادہ شیخ محمد صاحب عرب ادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور نظم ونثر قلم برداشتہ لکھتے تھے، ان کو بھوپال سے بلوایا، وہ ایک زمانہ تک یہاں درس دیتے رہے، بعد کو بھوپال گئے اور وہیں وفات پائی،

مولانا محمد شبلی صاحب جیراجپوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے شاگرد تھے، اور چشمۂ رحمت غازی پور مین پڑھاتے تھے، مولانا ایک دفعہ غازی پور گئے اور اُن کو پڑھاتے دیکھا تو پسند فرمایا اور ان کو اپنے ساتھ دارالعلوم لے آئے اور یہاں فقہ کی تعلیم اُن کے سپرد فرمائی جس کو وہ اب تک پڑھا رہے ہین، اور اب تک مدرسہ اُن سے فیض اٹھا رہا ہے،

درجۂ اعلیٰ اور درجۂ تکمیل مولانا کی تشریف آوری تک ندوہ مین چھ سال تک تعلیم پہنچ چکی تھی، یعنی تین سال ابتدائی کے اور تین سال متوسط کے، اب دو سال درجۂ اعلیٰ کے کھلے، یعنی معمولی عربی تعلیم ۸ سال مین پوری ہوگئی، ان آٹھ سالون کی تعلیم کے بعد مولانا نے ارکان کی منظوری سے ۱۹۰۹ء مین تکمیل کا درجہ کھولا، اور حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم مین مولانا کے

زمانۂ معتمدی کا یہ اہم کارنامہ ہے، اس درجہ سے مقصد یہ تھا کہ طلبہ کسی ایک فن کو لیکر دو برس تک خاص اُس فن کی تعلیم حاصل کرسکین، اور اُس مین کمال پیدا کرین، اس وقت تک تمام ہندوستان مین طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ ایک نصاب معین جس مین تمام علوم و فنون اوسط درجہ تک پڑھائے جاتے ہین سب پڑھتے ہین، اور مولوی کی سند حاصل کرلیتے ہین، لیکن اس کے بعد کوئی شخص کسی ایک خاص فن کو لے کر اس کی تحصیل اس طرح نہین کرتا کہ اس فن کا کامل بن جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان مین ایک شخص بھی کسی ایک فن کا کامل نہین پیدا ہوتا، اتفاق سے مدت کے درس و تدریس اور مہارت کے بعد کوئی شخص کسی فن مین ممتاز ہوجائے تو یہ ایک شاذ واقعہ ہے، اس بنا پر دارالعلوم ندوہ کی تجویز مین ابتدا ہی سے تکمیل کا درجہ رکھا گیا تھا لیکن آمدنی کی کمی سے اس کا انتظام نہین ہوسکا تھا،

جلسۂ انتظامیہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۹ء مین یہ طے پایا کہ سردست علم کلام اور علم ادب کا درجۂ تکمیل کھول دیا جائے، اور ایک کمیٹی منتخب ہو جو اس درجہ کا نصاب تعلیم مقرر کرے، چنانچہ کمیٹی مذکور نے نصاب تجویز کرکے تمام ہندوستان کے علماء کے پاس بھیجا، اکثر علماء نے رائیں بھیجین مجلس دارالعلوم منعقدہ ۳۰ جون ۱۹۰۹ء مین ان تمام آراء کے اشتمال اور اقتباس سے حسب ذیل نصاب مقرر کیا گیا،

علم کلام

شرح مقاصد علامہ تفتازانی، تہافۃ امام غزالی و ابن رشد،

کتاب الصفات امام بیہقی، برائے مطالعہ رسائل اربعہ امام غزالی، برائے مطالعہ

علم کلام

بحث عصمت انبیاء از ملل و نحل علامہ ابن حزم، برائے مطالعہ کتب آریہ مثلاً ستیارتھ پرکاش

تلخیص المقال و کشف الادلۃ ابن رشد، و اظہار الحق، برائے مطالعہ

حدیقۂ فکریہ، برائے مطالعہ کتاب الروح ابن القیم ر

علم ادب

دیوان امرء القیس و نابغۂ ذبیانی و علقمۂ الفحل موازنۂ ابی تمام و بحتری،

و عروۃ بن الورد و فرزدق، عقد الفرید ابن عبد ربہ، برائے مطالعہ

کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری، مشق نظم و نثر،

اسرار البلاغۃ عبد القاہر جرجانی،

اس کے بعد دوسرے علوم کی تکمیل کے نصاب بھی مقرر کر کے شائع کئے گئے، اور بعض بعض میں طلبہ داخل کئے گئے، تکمیلِ ادب مین خواجہ عبد الواجد صاحب کانپوری، مفتی محمد یوسف صاحب بیتیاوی مرحوم مدرس دار العلوم، مولوی عبد السلام صاحب (مصنف دار المصنفین) مولوی قمر الدین صاحب مرحوم اعظم گڈہ، علم کلام مین مولوی شبلی صاحب اعظم گڈہ حال صدر المدرسین مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور تفسیر مین مولوی مسعود علی صاحب ندوی حال مہتمم دار المصنفین اعظم گڈہ داخل ہوے،

تکمیلِ ادب مین جو طلبہ داخل کئے گئے اُن کو عربی ادب کی نظم و نثر کے علاوہ عربی مین برجستہ تقریر و تحریر کی مشق بھی کرائی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ندوہ کے طلبہ نے عربی تعلیم کے اس

بڑے نقص کو کہ عربی طالب العلم لکھ پڑھ نہین سکتے اور نہ بول سکتے ہیں دور کر دیا، اور ساری ہندوستان
مین بلکہ ممالکِ اسلامیہ میں بھی ان کی ادبیت و عربیت کا سکہ بیٹھ گیا جسکی بارہا شہادتین مل چکی ہیں
علم کلام کا درجہ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں جب کھولا جانے لگا تو مولانا نے شوالی ۱۳۲۶ھ مطابق
نومبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ مین اپنی تجویز کو ان الفاظ مین ظاہر کیا :- دس برس کے بعد اب وقت آیا کہ
ندوہ کی تعلیم کا جو اصلی مقصد تھا یعنی خاص فنون مین کامل الفن اشخاص پیدا کرنا، اس کی طرف توجہ کی جائے،
یہ حیرت کی بات ہو کہ ایک عام نصابِ تعلیم جو دو سو برس ہوئے قائم کیا گیا اس کے ساتھ یہ کسی کو خیال نہ
آیا کہ خاص خاص فن کے بالغ العلوم ہونے کا بھی نصاب بنایا جائے اور ان کی جداگانہ تعلیم دی جائے
جیسا کہ انگریزی میں ایم اے، اور ال ڈی کی تعلیم ہو، حالانکہ علوم کی ترقی کی اصلی تدبیر یہی ہے، اس بنا پر
دار العلوم ندوہ مین اس سال یہ شاخ کھول دی گئی اور ابتدا علم کلام سے کی گئی، کیونکہ ہر حیثیت سے یہی
علم آج سب سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے، علم کلام مین قدما کی تمام کتابین اور جدید تصنیفات، اور
فلسفۂ حال کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے، البتہ یہ افسوس ہو کہ عربی زبان میں ابھی تک فلسفۂ حال کی
معمولی کتابین ترجمہ ہوئی ہیں :

۱۹۱۲ء مین تفسیر کا درجۂ تکمیل کھولا گیا جس مین تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، کشاف، کتاب
الناسخ والمنسوخ للنحاس، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اعجاز القرآن باقلانی تفسیرات
احمدیہ ملا جیون وغیرہ کتابین داخلِ درس کی گئیں، اسی طرح فقہ و اصولِ فقہ کا ایک درجہ
قائم ہوا جس مین تحریر ابن ہمام مسلم الثبوت ملا محب اللہ، معانی الآثار امام طحاوی، بدایۃ المجتہد
قاضی ابن رشد وغیرہ کتابین پڑھائی جانے لگین،

ندوہ کے درجہ تکمیل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے ایسے بڑے بڑے مدارس میں جہاں سرمایہ ممکن ہے اس کی تقلید کی گئی اور اختصاصی کامل الفن علماء کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اور ان میں کتابیں بھی زیادہ وہی رکھی گئیں جو ندوہ میں رکھی گئی تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جامعۂ نظامیہ حیدرآباد دکن، جامعۂ عباسیہ بہاولپور، مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ کے نام ہم کو یاد آگئے، اور بھی بعض پرانے طرز کے عربی مدارس میں بھی یہ تجویز دوسری شکل میں پیش ہوتی رہتی ہے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں بھی اس تجویز پر عمل ہوا، اور تفسیر کا درجہ اب کھولا گیا ہے، غرض من سنّ سنۃ حسنۃ کی بنا پر امتِ اسلامیہ اور علومِ عربیہ کو اگر اس سے فائدے پہنچے یا آیندہ پہنچیں تو امید ہے کہ مجوزِ اول بھی اس کے ثواب سے انشاء اللہ تعالیٰ بہرہ مند ہوگا،

علوم جدیدہ کی تعلیم دارالعلوم کی ایک اور بڑی غرض یہ تھی کہ قدیم منطق و فلسفہ کا بیکار حصہ نکال کر اس کی جگہ سائنس اور فلسفہ و ریاضیات کے نئے علوم داخل کئے جائیں، اس میں اصلی دقت یہ تھی کہ ہمارے قدیم علماء ان علوم کو نہیں جانتے تھے، اور نئے تعلیم یافتہ ان کو عربی یا اُردو اصطلاحوں میں نہ سمجھا سکتے تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے، اس پر بھی جدید طبیعیات میں بیروت کی ایک عربی کتاب الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ اور جدید ہیئت میں قسطنطنیہ کی چھپی ہوئی ہیئت جدیدہ کے ایک فارسی رسالہ کو نصاب میں داخل کیا، اور کوشش کی کہ اس نئے فن میں جو ایک دو علماء انگریزی پڑھے ہوئے ہیں ان سے کام لیں، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب بی اے کو بہ اصرار ان کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا، اور چند طلبہ کو ان سے الدروس الاولیہ کے کچھ اسباق پڑھوائے، مگر اس رواروی میں کتاب پوری نہ ہو سکی، پروفیسر مرزا

[1] مکاتیب شبلی، حمید ۲۸-۲۹، ۳۱-۳۲، ۳۷-۳۹

ہادی صاحب رسوا بی اے (پروفیسر عربی ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ) سے (جو عربی میں عالم ہونے کے ساتھ جدید فلسفہ و ریاضیات مین بھی ماہر تھے، اور بعد کو جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ مین فلسفہ کے مترجم ہوگئے تھے) درخواست کی کہ وہ مدرسہ آکر بعض طلبہ کو جدید ہیئت کا یہ رسالہ پڑھا دین، چنانچہ انھون نے آکر چند سبق پڑھائے، مگر یہ بھارے کا کام چند دنون سے زیادہ چل نہ سکا،

بہرحال اتنی ہی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ خاکسار نے ۱۹۰۶ء کے جلسۂ دستار بندی مین علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کر سکا، اور الندوہ مین تکوینِ ارض اور مسلمان اور علم ہیئت پر چند نمبر لکھے، اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے حواسِ خمسۂ باطنی پر الندوہ مین ایک مضمون لکھا،

۱۹۰۸ء مین جب مولانا حمید الدین صاحب مدرستہ العلوم کراچی سے علی گڈہ کالج مین عربی لکچرر ہوکر آگئے تو مولانا نے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ مین یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب العلم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڈہ کالج دروس الاولیہ اور ہیئتِ جدیدہ پڑھنے کے لئے بھیجا جائے، جہان وہ آلات کا مشاہدہ بھی کر سکے گا، مولانا حمید الدین صاحب کو لکھتے ہین :- "مجلس انتظامیہ ندوہ نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ ایک طالب العلم کو وظیفہ دے کر مولوی حمید الدین کے پاس بھیجا جائے کہ وہ اسکو دروس الاولیہ اور ہیئتِ جدیدہ پڑھائین، اور ممکن ہو تو وہان آلات سے اس کو تجربہ بھی سکھلایا جائے، اس لئے ایک طالب العلم تمھارے پاس بھیجا جائے گا، تم اس کی صورتِ قیام اور تعلیم و تجربہ سے مطلع کرو، اگر تم اپنے مکان مین جگہ دو تو وظیفہ اس مین محسوب کر سکتے ہو" (حمید ۴۳)

اس تجویز پر عمل بھی ہوا، مگر مولوی حمید الدین صاحب فوراً ہی علی گڈہ سے الٰہ آباد یونیورسٹی

مین چلے آئے، اس لئے تجویز کامیاب نہ ہوسکی،

قرآنِ پاک کا درس مولانا کی یہ کوشش اُن کی متعدد تحریرون سے ظاہر ہے کہ وہ نصاب مین قرآن پاک اور علوم القرآن کو درس مین مستقل طور سے داخل کرنا چاہتے تھے، اسی لئے امام باقلانی کی اعجاز القرآن جب مصر سے چھپ کر آئی تو اس کو فوراً درس مین داخل کر دیا، اور قرآنِ پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخلِ نصاب کیا اور ۱۹۰۶ء مین قرآنِ پاک کے عالمانہ درس کے لئے خود وقت نکالا اور درس شروع کیا، اس مین مدرسہ کے اکثر طلبہ اور بعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے، اس مین ہر مسئلہ پر پوری پوری بحث ہوتی تھی، ۱۹ اپریل ۱۹۰۶ء مین مجھے بنارس سے لکھتے ہین:۔ "مین اکر تفسیر کا مستقل درس دون گا" (سلیمان- ۴۰) یہ اُسی درس کی طرف اشارہ ہے، چند ماہ کے بعد برسات مین حسب دستور مولانا جب بمبئی گئے تو یہ کام دار العلوم کے مدرسِ اعلیٰ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے سپرد کر گئے، میرے استفسار کے جواب مین ۲ راگست ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہین:۔ "قرآن کا درس ہو، لیکن تحقیق کے ساتھ ہو، سرسری بیکار ہے" یہ سلسلہ اس طرح آگے نہ چل سکا، آخر اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب مصنفِ نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل مین آکر مدرسہ کے لڑکون کو قرآن پڑھا دین[1]، چنانچہ وہ دو سال تک اپنی تعطیل مین آکر قرآنِ پاک کا درس دیتے رہے،

رفیق مولوی ضیاء الحسن علوی اور مجھے خاص طور سے مولانا نے قرآنِ پاک کے اصول بلاغت پر اسباق بھی پڑھاتے رہے، اور املا بھی کراتے رہے، مولوی ضیاء الحسن صاحب نے اس درس کے ان ہی معلومات کو ایک سلسلہ مضمون مین لکھا جو الندوہ مین چھپا، اور لوگون نے اسکی تعریف کی،

[1] مکاتیب حمید ۳۰، ۳۹

اور دستار بندی کے جلسہ مین ۱۹۰۶ء مین انھون نے قرآنِ پاک کی بلاغت پر بھرے جلسہ مین تقریر کی تھی،

بہرحال دار العلوم کی خصوصیات مین یہ چیز اب تک باقی ہے، اور قرآنِ پاک کا درس وہاں الحمد للہ کہ اب بھی جاری ہو، اور اسکی تقلید بھی ہوتی جارہی ہو،

انقلابِ زمانہ! زمانہ کے اتنے پے در پے انقلابات کے بعد آخر اُن علماے کرام کو بھی جنکو شروع مین قدیم نصابِ عربی کی اصلاح کی تجویزوں سے اختلاف تھا، مولانا کا ہمنوا ہونا پڑا، جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲-۳-۴ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ میں جناب مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند کی تائید سے یہ تجویز ہمارے سامنے ہو،

"جمعیۃ العلماء کا یہ اجلاس مدارسِ عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب مین دورِ حاضر کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہو اور مدارسِ عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہو کہ وہ ماہرینِ تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی مشورات اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علماے ہند اربابِ علم سے راے لیکر اپنی صوابدید کے مطابق حتی الوسع جلد کوئی مؤثر عملی اقدام کرے۔"

لیجئے وہی چیز جو کبھی موردِ اعتراض تھی، اتنے دنون میں جا کر موردِ تحسین بنی، و للہ الحمد،

ندوہ کا کتب خانہ تعلیمی مرکزوں کے لئے کتبخانوں کے وجود سے چارہ نہین، اس لئے دار العلوم کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ کا خیال بھی پہلے سے قائم تھا، اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ ندوہ جب کانپور میں تھا، اسی وقت سے ایک دار الافتاء کی شاخ بھی قائم تھی، اور اس کے لئے فقہ

کی کچھ کتابیں دفتر میں یکجا تھیں، اس کے بعد دارالعلوم کے قیام کے بعد ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس جب شاہجہاں پور میں ہوا تو وہاں کے ایک صاحب علم رئیس ڈپٹی مولوی عبدالرافع خاں صاحب نے اپنا موروثی کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں ندوہ کو عنایت فرمایا، اس کے بعد ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں ندوہ کے اجلاسِ پٹنہ میں مولوی عبدالغنی وارثی بہاری (مددگار صدر محاسب سرکارِ نظام) نے اپنی کتابیں جو زیادہ تر تاریخ اور محاضرات پر مشتمل تھیں ندوہ کے نذر کردیں، اسی زمانہ میں کچھ اور صاحبوں نے اپنے بزرگوں کے علمی سرمایوں کو جو اُن کے قابل نہیں رہے تھے یا وہ اب اُن کے قابل نہیں رہے تھے، ندوہ کے حوالہ کردیا،

مولانا شبلی مرحوم کی آمد سے پہلے ندوہ کے کتب خانہ کا سرمایہ اسی قدر تھا، مولانا کو کتابوں سے جو شغف تھا وہ بیان کا محتاج نہیں، وہ ۱۹۰۵ء میں جب ندوہ آکر بیٹھے تو دوسرے صیغوں کے علاوہ اس صیغہ کی طرف بھی توجہ فرمائی، سب سے پہلے اپنے کتبخانہ کو جو اعظم گڈھ میں پڑا تھا اور جس کو کبھی تین ہزار روپیے میں بہ ضرورت علحدہ کرنا چاہتے تھے، لکھنؤ میں منتقل کرالیا، اور ۱۹۰۷ء میں اس کو ندوہ پر وقف کیا، اس کتب خانہ میں تاریخ وادب کا بڑا سرمایہ تھا، اور مصر وشام و قسطنطنیہ کے مطبوعات کے علاوہ یورپ کے بعض نادر مطبوعات بھی تھے،

مولانا کی تحریک سے مولانا کے بعض دوستوں نے بھی توجہ فرمائی، جون ۱۹۰۷ء میں نواب سکندر نواز جنگ حافظ احمد رضا خان صاحب سکندر منزل پٹنہ (سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن) نے اپنی کتابیں نذر کیں، ان کتابوں کو پٹنہ سے لانے کا کام خاکسار کے سپرد ہوا جس کو بخوشی انجام دیا، اسی سال شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر حیدرآباد دکن، اور حکیم علی احمد صاحب

نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں، مارچ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ سے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ نے بھی اپنی کتابیں بھیجیں[1]، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نواسہ سید مرتضیٰ صاحب نے اسی سال اپنے حصہ کی کتابیں ندوہ کے حوالہ کر دیں، نواب عماد جنگ بہادر (حیدرآباد) کا کتبخانہ جس میں مطبوعات یورپ کا اچھا ذخیرہ تھا، اسی زمانہ میں ندوہ میں آیا، ۱۹۱۱ء میں امیٹھی سے مولوی یوسف علی صاحب مرحوم کا کتب خانہ جس میں متعدد نایاب قلمی کتابیں تھیں ندوہ میں شامل ہوا (الندوہ جولائی ۱۹۱۰ء) اسی سال نواب علی حسن خاں صاحب خلف الصدق نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتابیں ندوہ کے نذر کیں، اُن کی ہمشیرہ مرحومہ صفیہ بیگم کے حصہ کی کتابیں اس سے دو ایک سال پہلے ندوہ کے کتب خانہ میں داخل ہو چکی تھیں، دلی سے نواب احمد سعید خاں بہادر خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم کی کتابیں آئیں، یہ وہی کتب خانہ تھا جس کی مدد سے الیٹ نے تاریخ ہند لکھی تھی، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اپنا کتب خانہ جس میں انگریزی اور عربی کتابوں کا بڑا سرمایہ تھا، مارچ ۱۹۱۱ء میں ندوہ کے حوالہ کیا، مولانا نے اُن کو لانے کے لئے مجھے حیدرآباد بھیجا[2]، یہ میرا حیدرآباد کا پہلا سفر اور نواب عماد الملک سے میری ملاقات کا پہلا ذریعہ تھا، میں ایک مہینہ کے قریب مولوی عبد الغنی صاحب وارثی (مددگار صدر محاسب سرکار عالی) کے یہاں مقیم رہا اور روزانہ نواب صاحب کے یہاں جا کر نواب صاحب کے ساتھ مل کر کتابیں الگ کرتا رہا، نواب صاحب مرحوم اپنے ہاتھ سے کتابیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کرتے جاتے تھے اور میں رکھتا جاتا تھا،

---

[1] مکتوبات بنام شروانی (۳)، [2] مکتوبات بنام ابو الکلام آزاد (۲۶)

اگر نواب صاحب مرحوم اپنی زندگی میں یہ نہ کر جاتے تو عجب نہیں کہ اُن کے بعد اُن کی کتابوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو اُن کے بھائی مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی کتابوں کا ہوا،

عطیات کے علاوہ نئی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، مختلف مدوں سے وہ کتب خانہ کے لئے روپیہ الگ رکھتے تھے، جب کوئی نئی کتاب چھپتی اور اس کا نام مصری رسالوں اور فہرستوں میں پڑھتے تو مجھے ان کے منگوانے کی ہدایت[1] فرماتے، اور وہ منگوائی جاتی، اس طرح سنہ ۱۹۰۹ء تک کتبخانہ میں جو سرمایہ فراہم ہوا تھا اس کی تعداد ۶۲۸۲[2] تھی، اور سنہ ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ سے الگ ہوے ہیں یہ تعداد دونی ہوگئی تھی یعنی ۱۲۱۰۵[3]، اور اب یہ تعداد کتنی ہوگئی ہے،

الندوہ

سنہ ۱۹۰۴ء ۱۳۲۲ھ - سنہ ۱۹۱۲ء ۱۳۳۱ھ

الندوہ کا ذکر اس سے پہلے آجانا چاہیئے تھا، کیونکہ اُس کا آغاز سنہ ۱۹۰۴ء میں ہو چکا تھا، ن چونکہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی غرض طلباے دارالعلوم کی ذہنی تربیت تھی، لئے اسی سلسلہ میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا جاتا ہے،

مولانا کو الندوہ یعنی ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک علمی رسالہ کی اشاعت کا خیال نا سنہ ۱۹۰۲ء میں آیا، اس قسم کے علمی رسالوں کا تجربہ، ارکان میں مولانا سے زیادہ کسی اور کو

[1] مکتوبات سلیمان ۲۶ [2] روداد دارالعلوم مرتبہ مولانا شبلی بابتہ سنہ ۰۸-۱۹۰۹ء ص ۱۵ [3] رپورٹ ندوۃ العلماء مرتبہ مولوی خلیل الرحمان صاحب رنپوری، جو ۳ اپریل سنہ ۱۹۱۵ء کے جلسہ عام میں پیش ہوئی ص ۱۶، حسب تصریح مولانا شروانی،

نہ تھا، لیکن جب ندوہ کی طرف سے یہ رسالہ نکالنا طے ہوا تو ارکان نے صرف مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو اس کا اڈیٹر بنایا، مولانا کو ارکان کی اس فروگذاشت پر تعجب ہوا، ۲۴ راگست ۱۹۰۲ء کو مولانا شروانی کو شکایت لکھی :۔ "رسالۂ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں، اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپنے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لئے علی گڈہ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پا جائے" (شروانی ۱۔۴) یہی شکایت ۶ ستمبر ۱۹۰۲ء کے ایک خط میں دوبارہ ظاہر کی گئی ہے (ر ر ۳۲)

مولانا شروانی اس کوشش میں تھے کہ اپنی ذمہ داری میں وہ مولانا شبلی کو بھی شریک کر لیں، اور اس کے لئے وہ ارکان سے خط و کتابت کر رہے تھے، اس کی نسبت ۸ نومبر ۱۹۰۲ء کو مولانا شبلی نے انھیں لکھا :۔ "رسالہ کے اڈیٹروں میں مولوی محمد علی صاحب (ناظم) غالباً میرا نام پسند نہ کریں، پھر آپ ہمان را با فضولی چہ کار کیوں کرتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ میں رسالہ کے لئے موجودہ حالت میں تیار بھی نہیں، ندوہ نے اپنی تجویزوں کے جو نمونے دکھائے یعنی دار العلوم و دار الافتاء وغیرہ وغیرہ، کیا رسالہ بھی ایسے ہی نمونہ پر نکالنا مقصود ہے؟ مجھ کو تو ایسے ہی سامان نظر آتے ہیں، علماء میں کون صاحب لکھنے کے قابل ہیں؟ اور نہیں تو کیا ندوہ کا رسالہ بھی نیچریوں کی مدد سے نکلیگا؟ اور وحید الدین[1] و مولوی عبد العلی و مرتضیٰ سے دریوزہ گری کیجئے گا، ایک آپ کیا کیا کریں گے" (شروانی ۴۵)

اس کمی کو دوسرے ارکان نے بھی محسوس کیا، چنانچہ ۱۷ رشعبان ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) کے

---

[1] مولوی وحید الدین سلیم معارف علی گڈہ سے نکالتے تھے، اور مولوی عبد العلی صاحب اور مولوی مرتضیٰ صاحب جو اس زمانہ کے مولوی فاضل تھے اس میں مضامین لکھا کرتے تھے،

جلسۂ انتظامیہ میں مولوی عبدالحئی صاحب وکیل چندوسی کی تحریک اور منشی محمد اطہر علی صاحب کی تائید سے مولانا الندوہ کے اڈیٹر قرار دیئے گئے،

۱۹۰۳ء کے آخر ہی میں مولانا نے رسالہ کا ایک خاکہ (مسودہ) بنا کر دفتر میں لکھنؤ بھیجا، مگر وہ یوں پڑا رہا، شاہجہاں پور میں ناظم صاحب کے پاس بھیجا نہیں گیا، ۳-۴-۵ جنوری ۱۹۰۴ء کو ندوہ کا اجلاس جب مدراس میں ہوا تو ناظم صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس مسودہ کی خبر بھی نہیں ہوئی، آخر مدراس ہی میں ۵ اشوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۰۴ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازیپوری کی تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے یہ طے ہوا کہ ایک مہینہ کے اندر رسالہ کی درخواست ناظم صاحب کی طرف سے گذر جائے اور رسالہ کی نگرانی و تصحیح وغیرہ دفتر نظامت سے کی جائے، اس پر بھی دو ہفتے گذر گئے تو ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء کو شروانی صاحب کو لکھا:
"میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، دفتر میں پڑا رہا، ناظم صاحب نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:- "ناظم حال رسالہ ندوہ کی درخواست دیتے ہوئے بہت ہچکتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں، مشکل یہ ہے کہ ناظم کے سوا اور کوئی شخص درخواست نہیں دے سکتا، ورنہ میں سو دفعہ درخواست دے چکتا"[1]

بہر حال یہ مشکل یوں حل ہوئی کہ مددگار ناظم مولانا سید عبدالحئی صاحب نے اپنے نام سے درخواست دی اور وہ منظور ہوئی،

اس وقت ندوہ کا دفتر سخت انتشار کی حالت میں تھا، ندوہ کے قائم مقام ناظم مولانا

---

[1] مکاتیب اول - شروانی ۳۵-

مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور تھے، اس لئے مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار
ناظم، ندوہ کا آدھا دفتر لے کر شاہجہاں پور چلے گئے تھے اور آدھا دفتر لکھنؤ میں تھا، بہر حال اسی
انتشار کی حالت میں ۱۹۰۴ء کے اواخر میں الندوہ کی اشاعت کے سامان اس طرح مکمل
ہوئے کہ مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار ناظم کے قیام شاہجہانپور کے سبب سے شاہجہاں پور
اُس کا مقام اشاعت ہوا، رسالہ کے دو اڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا حبیب الرحمان خاں
شروانی جو علی گڈھ میں تھے، اور دوسرے مولانا شبلی جن کا قیام اُن دنوں حیدرآباد میں تھا، اُس کی
چھپائی کا انتظام آگرہ میں صوفی محمد علی خاں کے مطبع مفید عام میں ہوا، اور اُس کا مقصد جیسا کہ اُس کی
لوح پر لکھا ہوا تھا "علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول" اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ
قرار پایا، ضخامت ۲ جز یعنی ۳۲ صفحے ٹھہری، اور اس شان سے اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولیٰ
۱۳۲۲ھ میں اُس کا پہلا نمبر منظر عام پر آیا،

پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید
علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضمون شائع ہوئے
جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد
علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل، منطق، عقائد اور
فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا
وہ اُن ہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، منطق و فلسفہ کی بعض درسی
کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا، غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا یہ علماء

کے مشاغل تھے، حالانکہ زمانہ کا رُخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور اُن کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو، اور اُن کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ پڑ گئے ہوں لیکن انھوں نے اس کو پڑھا، اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے اُن کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے، اور جو اُس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے،

الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بہت پڑا، اور نام نہیں لوں گا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرزِ نگارش، اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری، اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا،

خود دارالعلوم کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت کے مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی، اور اس طرح اہلِ علم کی بھری محفل میں اُن کو زبان کشائی کی جرأت ہوئی، چند ہی نمبروں کے بعد اہلِ نظر کی نگاہیں الندوہ کی اس افادی حیثیت پر پڑیں، الندوہ میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب العلم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اُس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا: "سب سے زیادہ

اس بات کی خوشی ہو کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہو، فبارک اللہ فیہا و فی طلبتہا و فی تعلیمہا مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہو کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی۔

اس سلسلہ میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی ایم اے (انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) مولوی عبد السلام صاحب ندوی رفیق دار المصنفین، مولوی خواجہ عبد الواجد صاحب ندوی ایم اے کا نپوری اور دوسرے طلبہ قابلِ ذکر ہیں، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، مولوی عبد الرحمٰن نگرامی مرحوم، مولوی قمر الدین ندوی مرحوم وغیرہ بھی اس کے دوسرے دور کی یادگار ہیں،

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے اُن میں سے قابلِ ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے:- علوم القرآن، فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا، علم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ کتابیں مسائلِ فقہیہ پر ضروریاتِ زمانہ کا اثر، موبدانِ مجوس، ذوالنون مصری، فارسی شاعری اور عرفی شیرازی مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبد العزیز پر ریویو، جمہرۃ البلاغہ، سوانح امام بخاری اور اُن کی تصنیفات، المرأۃ المسلمہ پر ریویو،

ان میں گیارہواں مضمون مولانا شروانی کا، پندرہواں دراصل مولانا حمید الدین فراہی کا، سولہواں سید سلیمان بہاری کا اور سترہواں مولانا ابو الکلام کا ہے، باقی سب اپنے وجود میں مولانا کے قلم کے رہینِ منت ہیں،

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ،

ان کے علاوہ جو مضامین نکلے اُن میں اعجاز القرآن، مسئلہ ارتقار اور حکماے اسلام، عربی زبان کی خصوصیات، مسئلہ تناسخ، شیخ الاشراق سہروردی، مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ، جرجی زیدان کے تمدنِ اسلام پر ریویو، الاحتساب فی الاسلام، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر وغیرہ بیسیوں مضامین ہیں، جو آج بھی ہماری زبان میں معلومات کا سرمایہ اور تحقیقات کا خزانہ ہیں،

الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہی کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوے اور جن کے کارنامون سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُر شور ہے، ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبد اللہ العمادی کا ہے، جو جونپور کے ایک گاؤن کے رہنے والے اور ادب میں مولانا عبد العلی آسی مدراسی لکھنوی کے شاگرد ہیں، اور اُس زمانہ میں عربی رسالہ البیان لکھنؤ کے اڈیٹر تھے، وہ فارسی و عربی ادبیات و تاریخ سے فطری مناسبت رکھتے تھے، اور مولنا سے لکھنؤ میں اکثر ملتے رہتے تھے، مولنا نے جب ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آکر قیام کیا اور الندوہ کا دفتر شاہجہان پور سے لکھنؤ آیا، تو رسالہ مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا، جہان سے البیان نکلتا تھا، جون ۱۹۰۵ء سے مولانا عمادی کو الندوہ کی ادارت سپرد ہوئی، اس سلسلہ میں ان کے مضامین اعجاز القرآن اور علم مناظر وغیرہ نکلے، موصوف یہاں سے نکل کر وکیل امرتسر، زمیندار لاہور اور الہلال کلکتہ میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اور اب وہ سالہا سال سے دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں عربی کے مترجم اور وہاں کے علمی حلقوں کے رکنِ رکین ہیں،

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر

رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا، مولانا شبلی مرحوم اُن کو اپنے ساتھ ندوہ لائے، اور ایک زمانہ تک اُن کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، وہ اُن کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے، اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انھوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کئے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا، اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا، اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا،

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے، یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا، اور ہر طرف مولانا شبلی سے اُن کی نسبت استفسار ہونے لگا، اسی قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:۔ "آزاد کو تو آپ نے مخزن[1] وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے، معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔" (مہدی ۱۹)

الندوہ میں اُن کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا، اور اخباروں اور رسالوں

---

[1] رسالہ مخزن لاہور سے (سر) شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے نکالتے تھے۔ مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون اسی میں نکلے تھے، خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے،

سے اُن کی مانگ شروع ہوگئی آخرکار وہ ۱۹۰۶ء میں "وکیل" امرتسر میں چلے گئے، اور قریباً دو سال وہاں رہے ہوں گے اسی اثنا میں اُن کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب آہ کا عراق میں جہاں وہ سیر و سیاحت کے لئے گئے ہوئے تھے انتقال ہوا اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیرالدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزارہا مرید تھے وفات پائی، رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا، اب انھوں نے امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا، اور ہدایت و ارشادِ خلق میں مصروف ہوئے، آخر ۱۹۱۲ء میں انھوں نے "الہلال" نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا، اور اُس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی جس صحبت کا فیض ہو وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے،

۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھدیا، جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا، اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا، (سلیمان ۲۲) اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر اُن کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کر دیا گیا، اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا،

اس کے بعد یہ عزت ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کو حاصل ہوئی انھوں نے اپنا پہلا مضمون تناسخ پر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا جس کو دیکھکر مولانا بیحد خوش ہوئے اور اس کو الندوہ مئی ۱۹۰۶ء میں اپنی پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ بہت شوق سے چھاپا، اور یہ خوشخبری

اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اپنے ایک خط میں مہدی افادی کو جو ادب اردو کے دلدادہ تھے ان نقطوں میں پہنچائی :- "ہمارے یہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے، جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا" (مہدی ۲۷)

پھر ۱۳ ار دسمبر ۱۹۰۶ء کو انھیں لکھا :- "عبدالسلام نہایت ہونہار ہے، وہ پورا مصنف ہو سکتا ہے اور ہوگا انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے، ندوہ اس قسم کے جواہر کا چمکانے والا ہے" (مہدی ۲۹)

بالآخر زمانہ نے اس پیشین گوئی کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا،

مولوی عبدالسلام صاحب نے اس اثنا میں شیخ الاشراق سہروردی اور امام مسلم وغیرہ پر مضامین لکھے اور آخر ۱۹۰۹ء میں جب وہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو الندوہ کی ادارت ان کے حوالہ کر دی گئی جس کو انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بخوبی انجام دیا، اس کے بعد یہ خدمت اگست ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی، جس کو مین نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اسی پر اُس الندوہ کا خاتمہ ہوا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی تھے، ندوہ کے اختلافات نے اس کا خاتمہ کیا تھا، ندوہ کے دوسرے فریق نے یہ امانت دارالعلوم ندوہ کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کے سپرد کی، جو دارالعلوم کے چند منتہی لڑکوں کی مدد سے اس کو چند مہینے چلاتے رہے، بعد ازین مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی نے اس کی ادارت کا بوجھ اٹھایا، اور آخر ۱۹۱۶ء میں وہ بظاہر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا، مگر اب ۲۲ سال کے بعد میں نے بعض ندوی عزیزوں کو اس کی ادارت دے کر جنوری ۱۹۴۰ء سے دوبارہ نکالنے کا اہتمام کیا ہے، وکلا ھم بید اللہ تعالیٰ،

الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا،

۲۔ جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا،

۳۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا،

۴۔ عربی خوان طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا،

۵۔ اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا،

۶۔ قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاحِ نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اپنے مضمون میں الندوہ کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کی ہے "مولانا کا اہم کام الندوہ تھا جس نے مسلمانوں کے لئے بہت سا محققانہ تاریخی سامان فراہم کر دیا، اور اس کے سلسلہ میں مولانا نے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔"

بھوپال کی ماہانہ امداد | اب تک جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کی اُن خدمات کا تذکرہ تھا جو انھوں نے دارالعلوم کی علمی و تعلیمی ترقیوں کے لئے کیں، لیکن ابھی اُن کی ان خدمتوں کا تذکرہ باقی ہے جو دارالعلوم کی مالی ترقی اور اس کی تعمیر کے سلسلہ میں انھوں نے فرمائیں، اب تک دارالعلوم کی مستقل آمدنی نہ تھی، سالانہ جلسوں اور سفراء کے دوروں سے جو چندہ وصول ہوتا تھا وہ مدرسہ پر خرچ ہوتا تھا، ریاست حیدرآباد نے نواب وقارالامراء کے عہدِ وزارت میں نواب وقار نواز جنگ مولوی وحیدالزماں خاں صاحب کی کوشش سے غالباً ۱۸۹۶ء میں پچاس روپیہ ماہوار دفتر

ندوۃ العلماء کے لئے اور پچاس مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ کے لئے مقرر کیا تھا جس کو انھوں نے بکمال ایثار ندوہ کو منتقل کر دیا تھا، یہ سو روپیے ماہوار مجلس ندوۃ العلماء کے ماہانہ مصارف میں کام آتے تھے،

البتہ ۱۹۰۲ء میں جب ندوہ کا اجلاس پہلی دفعہ امرتسر میں ہوا تو نواب محمد بہاول خاں عباسی فرمانروائے بہاولپور کے سمع مبارک تک ندوہ کی آواز پہنچی، اور انھوں نے اس کی امداد کی طرف توجہ فرمائی[1]، پھر ۱۹۰۴ء میں تین سو سالانہ مدرسہ کے غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لئے مقرر فرمائے[2]، دارالعلوم کے لئے یہ پہلی مستقل امداد تھی،

اوائل ۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کے انتظامات کی باگ مولانا نے اپنے ہاتھ میں لی تو ادھر بھی توجہ فرمائی، اور یہ طے ہوا کہ مختلف مقامات میں وفود روانہ کئے جائیں، اور قوم کے رئیسوں کو ندوہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولوی غلام محمد صاحب شملوی کو بھوپال و احمد آباد کی طرف روانہ کیا گیا، بھوپال پہنچکر ندوہ کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس کام کے لئے خود مولانا کو تکلیف دی جائے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں مولانا خود بھوپال تشریف لے گئے، سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے مولانا کو ملاقات کا موقع بخشا، مولانا اس ملاقات سے بیحد متاثر ہوئے، اور اپنے یہ تاثرات ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو قلمبند کر کے الندوہ (اکتوبر ۱۹۰۵ء) میں چھپوائے، اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار عالیہ نے نومبر ۱۹۰۵ء میں مولانا کی موجودگی ہی میں پچاس روپیے ماہوار کی امداد جاری فرمائی، مولانا نے تار کے ذریعہ سے جب یہ خبر دارالعلوم میں بھیجی تو ہر طرف عید کی سی خوشی چھا گئی،

[1] روداد امرتسر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲۵
[2] روداد مدراس ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰۵،

اجلاسِ بنارس ۱۹۰۶ء اور پہلی علمی نمائش

مولانا کی معتمدی سے پہلے ندوہ کے بڑے بڑے دس شاندار جلسے بڑے بڑے شہروں میں بلا انقطاع ہو چکے تھے، پچھلا دسواں جلسہ شروع جنوری ۱۹۰۴ء میں مدراس میں ہوا تھا، اس کے بعد باقی ۱۹۰۴ء اور پورا ۱۹۰۵ء جلسوں سے خالی گیا، مولانا دھوم دھام کے جلسوں کے قائل نہ تھے بلکہ اس کے ذریعہ سے کچھ کام چاہتے تھے، سرکارِ عالیہ کی فیاضی سے جب امید کی پہلی شعاع نظر آچکی تو جلسۂ سالانہ کی فکر ہوئی، اس کے لئے اضلاعِ مشرقی کے دو شہر گورکھپور اور بنارس نے پیشقدمی کی، مگر کامیابی بنارس کو ہوئی اور مارچ ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوہ کے گیارہویں اجلاس کا اعلان ہوا، اس اجلاس میں دو باتیں خاص ذکر کے قابل ہیں، ایک علمی نمائش کا انتظام، جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی نسخے، تصاویر، آلاتِ ہیئت وغیرہ اسلامی علمی یادگاروں کی نمائش کی گئی تھی، اور اس غرض سے دور دور سے قلمی کتابیں اور نادر یادگاریں منگوا کر فراہم کی گئی تھیں، دوسری چیز فارسی شاعری اور بعض دوسرے علوم عہد بعہد کے دواوین اور تصانیف اس طور سے ترتیب کے ساتھ رکھی گئی تھیں کہ بیک نظر اس فن کی ترقی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا، اس نمائش پر تبصرہ کے عنوان سے مولانا نے ایک نہایت عالمانہ اور محققانہ تقریر فرمائی جس میں ان یادگاروں کی اہمیت اور ان علوم کی تاریخی ترقی پر روشنی پڑتی تھی،

علمی حیثیت سے یہ جلسہ بہت کامیاب ہوا[1]، اس علمی نمائش کی روداد خود مولانا کے قلم سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے[2]، جس میں اس کی خصوصیات پوری تفصیل سے مذکور ہیں،

اسی جلسہ میں مولانا نے پہلی دفعہ طلبہ سے مجمعِ عام میں تقریریں کرائیں اور ان کو پیش کر کے آخر

---

[1] اس نمائش کی تفصیل کے لئے دیکھئے الندوہ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۰۶ء [2] مقالاتِ شبلی جلد ہفتم،

میں یہ شعر پڑھا

من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم | لختے بردار ز دل گذرد ہر کہ ز پیشم

اس جلسہ میں خاکسار نے اور مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے تقریریں کیں، مولوی صاحب مرحوم کی تقریر سب کو بے انتہا پسند آئی، مولانا کا قاعدہ تھا کہ جلسوں میں لڑکوں کو پیش کرکے خود اٹھ جاتے تھے کہ لڑکے مرعوب نہ ہوں، مولوی عبدالباری صاحب کی کامیاب تقریر کی خبر سنی تو خوشی میں خود آئے اور اپنی عبا اُن کو پہنائی، افسوس کہ انھوں نے عین شباب میں انتقال کیا،

بنارس میں ہنگامی قیام اور شعرالعجم

بنارس کے اجلاس اور علمی نمایش میں فارسی ادب کا پوراسٹ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے کتب خانہ سے منگوایا تھا، یہ ذوق اس وقت اس کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ فارسی شاعری کی تاریخ یعنی شعرالعجم کی تالیف میں مصروف ہیں جلسہ کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے ایک دو مہینہ بنارس ہی میں قیام کیا، شہر کے کنارہ پر ایک بنگلہ لے لیا تھا، اُسی میں رہتے تھے، اور شعرائے عجم کی باتوں سے جی بہلاتے تھے؛ نمایش کی روداد بھی وہیں سے لکھ کر بھیجی، اور اس کے متعلق ہدایات مجھے بنارس سے بھیجتے رہے، جن کا ذکر مکاتیب میں میرے نام کے ابتدائی خطوط میں ہے، ۱۹ر اپریل ۱۹۰۶ء کو مجھے ارقام فرمایا :- "مجھ کو آنے میں ذرا دیر ہوگی، اب انگریزی پر زیادہ توجہ کرو، میں آکر تفسیر کا مستقل درس دوں گا" (سلیمان ۳۰)

میں نے جلد واپسی کی تمنا ظاہر کی تو ۲۰ر اپریل ۱۹۰۶ء کو ارشاد ہوا "بھائی ابھی دو مہینہ

تو شستا نے دو، ابھی وہاں نہ بلاؤ، یہاں بھی میں سب سے الگ رہتا ہوں، ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا ہے، وہیں رہتا ہوں، لیکن لوگوں کو پتہ نہیں دیتا کہ یہاں بھی رات دن کی بک بک نہ رہے" (سلیمان۔۷)

اسی زمانہ میں مجھے سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لکھنے کی ہدایت فرمائی، اور احادیث و مسانید کی طرف توجہ دلائی، (سلیمان۔۷)

واپسی اور قرآن پاک کا درس

کچھ دنوں کے بعد واپس آکر حسب وعدہ قرآنِ پاک کا درس شروع فرمایا، جس میں اوّل تمام طلبہ نے شرکت کی، اور سب نے بقدر استعداد فیض پایا، لیکن آخر میں صرف دو طالب علم رہ گئے، خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب، مولانا گرمی اور لُو تو برداشت کر لیتے تھے مگر برسات کا حبس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اس زمانہ میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا اُن کو پسند تھی، چنانچہ قرآنِ پاک کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرسِ اوّل دارالعلوم کے سپرد کر کے بمبئی کا سفر کیا،

بمبئی اور دستۂ گل کا پس منظر

میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفرِ بمبئی پہلا تھا، اور یہی "دستۂ گل" کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا، "دستۂ گل" کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں، "نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نورا" مولانا کو انیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا، ۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔ "۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، اپالو یہاں عجیب سیرگاہ ہے، اور چوپاٹی اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے "کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را" اس غزل کا ایک شعر ہے،

ہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ بے پروا | گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را

(مہدی ۲۶)

یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے اُن کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا، اور قیاس کیا کہ فرمایا کہ اس میں چشم ساقی کی مستی بھی آمیز ہے، خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع

اندکے نیز بکام دلِ خود بیں باشم | روزگارے چو دم از دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوئے | سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود | شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
آں شدائے دوست کہ آراستمے پیکرِ فن | نقشِ زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام
آں شدائے دوست کہ در ندوہ بہ بینی با نرم | کہ دم از صحبتِ آں دشمنِ ایماں زدہ ام

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہی، وہ غلطی سے اس "دشمنِ ایماں" کی تلاش مبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڈھ میں تھا، یعنی کہ وہ علی گڈہ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے،

یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں، اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں، معاصر شعراء نے جوابی غزلیں لکھیں، جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز و اسرار سمجھے، اور مولانا سے دست بیعت ہونے اور اُن کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں، جو بدگمان تھے وہ اس وصفِ عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے، حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ، بلکہ صرف مبئی کی خوش سوادی اور حسنِ منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا، "خطوطِ شبلی" کے اوراق میں یہ سامان نہیں، اُن کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۹۰۸ء سے شروع ہوئی ہے، غزل کے منتخب اشعار ہم ذوق دوستوں اور عزیزوں کو لکھ کر بھیجے تھے، ۵ رنومبر ۱۹۰۶ء کو مولانا شروانی کو یہ غزل بھیجی،

گرچہ من مردِ ہوسناکی و رندی نیستم | این چنیں ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود

۱۴ نومبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ سے بمبئی کی ایک غزل کے دو شعر لکھ کر بھیجے، دوسرا شعر ہے،

من فدائے بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال　　　　بہ من آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

مولانا اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "میں نے تو ایک خیالی بات لکھ دی، لکھنؤ کے ایک صاحب کے سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے "اس کالج کے پروفیسر یہیں مل سکتے ہیں"۔ (شروانی، ۵) یہ میرے سامنے کی بات ہے، لکھنؤ کے جن صاحب کا اشارہ اس میں ہے، اُن کا نام تو یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ وہ "زہرِ عشق" کے مصنف مرزا شوق کے نواسہ تھے،

فروری ۱۹۰۸ء میں جب مدہوش اور دوش والی پہلی غزل کہی ہے،

ساقیِ مست چو سوئے منِ مدہوش آید　　　　ساغر از کف بنہد میکدہ بر دوش آید

ایں غزل اوّل فیضِ اثرِ بمبئی است　　　　باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید

باش تا شبلیِ آزاد بہ زیبا صنمے　　　　از درِ صومعہ تا میکدہ ہم دوش آید

تو مولانا شروانی کی فرمایش سے ان کو بھیجی، آخر میں لکھا۔ "افسوس یہ ہے کہ ہم صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالمِ بے عمل ہیں"۔ (شروانی ۶۹)

بمبئی میں ندوہ کی تحریک | بمبئی کے اس قیام کا ایک محرک یہ بھی تھا، کہ یہاں کے دولتمند سیٹھوں کو ندوہ کی امداد کی طرف مائل کیا جائے، مگر وہاں بدعات کا جوزور تھا، اور علمائے واعظین نے اس کی مٹی جس طرح خراب کی تھی اس سے اُن کو ہمت نہیں پڑتی تھی، ۲۳ راکتوبر ۱۹۰۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں :- "بمبئی میں اس دفعہ صرف مُنفج پر اکتفا کیا گیا، وہاں شدت سے یہ خیال پھیلا ہے کہ ندوہ کفر ہے"۔ (حمید ۳۶)

افسوس کہ یہ کفر اب تک نہیں ٹوٹا، مولانا نے جس منفِج کی طرف اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ انجمن اسلام ہال میں ندوہ کے اغراض و مقاصد پر ایک تقریر کی،

بڑودہ کا سفر اور مضامینِ عالمگیر

بمبئی کے اس سفر میں ایک عظیم الشان کام کی بنیاد پڑی، محمد علی مرحوم (اڈیٹر کامریڈ) جو مولانا کے علی گڈہ کے شاگرد بھی تھے، اس زمانہ میں بڑودہ میں نوکر تھے، ان کے اصرار پر وہ بڑودہ گئے اور ان ہی کے مکان پر قیام کیا، اسی زمانۂ قیام میں انھوں نے مولانا سے یہ تحریک کی کہ وہ عالمگیر کے الزامات کی تحقیق و جواب میں مفصل مضمون لکھیں، مولانا نے اس کو منظور کیا، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر واپسی کے بعد، دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا، اور اسی مہینہ کے الندوہ میں شائع ہوا، سوا برس کے بعد ۶ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۸ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا، اور نہایت مقبول ہوا، محمد علی مرحوم اس سلسلۂ مضمون کا انگریزی میں[1] ترجمہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ جون ۱۹۰۸ء سے کام بھی شروع کر دینا چاہتے تھے، (عبد القادر ۳) مگر اپنے ضروری مشاغل کی وجہ سے اخیر تک نہ کر سکے، آخر یہ سعادت ہمارے دوست ڈاکٹر سید محمود کے حصہ میں آئی جنھوں نے مولانا کی اجازت سے ۱۹۱۰ء میں لندن میں جب وہ ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے کام کر رہے تھے، اس کا خلاصہ ترجمہ یا اقتباس شائع کیا، (ابو الکلام ۱۲)

اس سفر کی ایک بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ محمد علی مرحوم نے یہیں اُن سے سیرۃ نبوی کی تالیف اور پروفیسر مارگولیوتھ کے جواب لکھنے پر آمادہ کیا، (خطوط محمد علی ص ۵۹)

ڈھاکہ کا سفر

دسمبر کے آخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں تھا، مولانا بھی تشریف لیگئے،

[1] محترمی محمد علی مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھے لکھکر بھیجا تھا، خطوط محمد علی شائع کردہ مکتبۂ جامعہ ملیہ کے ص ۵۹ میں خط کا یہ مضمون ملے گا،

۲۲ر دسمبر کو مرزا شجاعت علی بیگ سفیر ایران کی صدارت میں "تاریخ اور اسلام" پر لکچر دیا، مولانا جلد واپس آنا چاہتے تھے، مگر خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ نے روکا کہ ندوہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے[1]، چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء کی شروع تاریخوں میں احسن منزل میں جو نواب صاحب کی کوٹھی ہے ایک جلسہ ترتیب پایا، جس میں مولانا نے اور جناب شاہ سلیمان صاحب نے ندوہ کے مقاصد پر تقریریں کیں، جناب نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مارچ ۱۹۰۶ء میں خود لکھنؤ تشریف لائیں گے، اور دار العلوم کا ملاحظہ کریں گے، مگر افسوس کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوا[2]،

مظفر پور کا سفر مظفر پور میں خان بہادر دیوان مولا بخش مرحوم سی ایس آئی کا ایک پرانا خاندان ہے، جس کا سلسلۂ نسب حضرت امام محمد ملقب بہ تاج فقیہ (فاتح منیر صوبہ بہار) تک منتہی ہوتا ہے، دیوان مولی بخش غدر کے گرد و پیش زمانہ میں کانپور میں سررشتہ دار تھے، شیخ ناسخ، مولوی غلام امام شہید اور قاضی صادق خاں اختر وغیرہ معاصر شعراء سے اُن کا دوستانہ تھا، ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی،

اس خاندان[3] میں علم و دولت کی توام صفتیں موجود ہیں، اس خاندان کے جانشین مولانا کے زمانہ میں مولوی اعجاز حسن خاں اور مولوی ریاض حسن خاں خیال تھے، اعجاز حسن خاں صاحب کا چار برس ہوئے کہ ۱۳۵۹ھ میں انتقال ہو گیا، اور مولوی ریاض حسن خاں بحمد اللہ کہ اب تک ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ دونوں صاحب مولانا کے خاص دوستوں میں تھے، ڈھاکہ جاتے ہوئے دونوں صاحبوں کا اصرار تھا کہ مولانا مظفر پور تشریف لائیں، یہ وعدہ ڈھاکہ سے واپسی میں

---

[1] مکاتیب ریاض حسن ۹ [2] الندوہ فروری ۱۹۰۶ء [3] اس خاندان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے معارف مئی ۱۹۴۱ء

پورا ہوا، اس سفر کا حال مولانا نے الندوہ میں خود اپنے قلم سے لکھا ہے:۔ "مولوی ریاض حسن رئیس مظفر پور ہمارے قدیم مخلص عنایت فرما اور قومی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں، جنوری (۱۹۰۷ء) میں ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے ہم کو مظفر پور ٹھہرنے کا موقع ملا، مسٹر محبوب حسن صاحب بیرسٹرایٹ لا، جو مولوی ریاض حسن صاحب کے چچا ہیں، ان کے دولت خانہ پر قیام ہوا، بیرسٹر صاحب باوجود تعلیم جدید، اور سفر ولایت کے عقائد مذہبی اور شعائرِ اسلام میں اس قدر سخت ہیں کہ ہم کو اُن پر ملاّے متعصب ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا، یہاں اور جن تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی سب اسی رنگ میں نظر آئے، چونکہ اس سفر میں مجھ کو ندوہ کی تقریب بھی پیشِ نظر تھی، اس لئے مولوی ریاض حسن صاحب اور ان کے بھائی اعجاز حسن صاحب نے جلسہ کا اہتمام کیا، کثرت سے لوگ شریک ہوئے، میں نے اسلام کی حقیقت اور اس کے ضمن میں ندوہ کی ضرورت پر ایک مفصل تقریر کی، تقریر کے بعد چندہ ہوا، اور پانچسو سے زیادہ نقد جمع ہوگیا، مسٹر محبوب حسن صاحب، مولوی ریاض حسن صاحب نے سوسو کی رقمیں عنایت کیں، ایک وکیل نے کوئی تعیین نہیں کی، لیکن ان کی عام قدیمی عادت کی بنا پر لوگوں نے قیاس بلکہ یقین کیا کہ وہ بھی ایک معتد بہ رقم عنایت فرمائیں گے، چندہ کی پوری تفصیل علحدہ شائع ہوگی، یہ تمام رقم سرمایۂ محفوظ کی مد میں جمع ہوئی"۔

اس سفر سے واپسی کے بعد دارالعلوم کے جلسۂ عطائے سند کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

مارچ ۱۹۰۷ء
جلسۂ عطائے سند

دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گذر چکے تھے مگر ابھی تک اُس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے نہیں ہوا تھا، اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۷ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہِ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسۂ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب

فاضل ہوشیارپوری[1] مرحوم نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی، جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی،

مولانا نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں محبی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم اے رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر، اور راقم نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر[2] کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور سامعین کو آئینۂ حیرت بنا دیا، عین راقم کی تقریر کے اثناء میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سیّد عبدالحیٔ صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ "تم کر سکتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا، اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے، اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ "اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو"؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا، تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفعِ بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں

---

[1] مرحوم نور محل ضلع جالندھر کے باشندہ تھے، ندوہ کے قدیم ہمدرد وارکان میں تھے [2] یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے بے اختیار نوکِ قلم پر آگیا، اگر ناظرین کو اس سے خودستائی کی بو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں،

تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے،

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، اور جلسہ میں موجود تھے، انھوں نے موضوع یہ مقرر کیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے، ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پہ باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا،

مولانا نے خود اس واقعہ کی اطلاع اپنے دوست مولانا شروانی کو ان لفظوں میں دی،

"آپ کے نہ آنے کا سخت صدمہ ہوا، آپ ارکان اصلی ندوہ ہیں، آپ کی عدم شرکت کا دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے، اور لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں، بہرحال متعدد میں یہی تھا، اگرچہ شاہ سلیمان صاحب وغیرہ نہیں آئے، لیکن جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی زبان میں لکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محوِ حیرت تھا، اور آخر لوگوں نے نعرہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی" (شروانی ص ۵۰)

یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا،

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے روداد جلسۂ دستار بندی ۱۹۰۶ء ص ۵۶،

اس جلسہ میں مولانا نے دارالعلوم کے مقاصد پر ایک مدلل تقریر فرمائی، اور ساتھ ہی اپنے امرت سروالے فارسی قصیدہ ع مانہ آنیم کہ اورنگ سلیمان داریم" کو اس دردناک ترنم سے پڑھا کہ دل ہل گئے، اسی سماں میں مولانا نے لکھنؤ کے تعلیم یافتہ گروہ کی طرف خطاب کرکے ان کو ندوہ کی امداد پر آمادہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم، مولوی نسیم صاحب ایڈوکیٹ مولوی ظہور احمد صاحب وکیل وغیرہ نے ندوہ کی امداد کا وعدہ کیا، اور یہ لوگ ندوہ کے ارکان میں داخل ہوئے، ان کی ذات سے ندوہ کو بہت فائدہ پہنچا، آخر الذکر دونوں صاحب آجتک ہمدرد ارکانِ انتظامیہ ہیں، سرگرمِ خدمت ہیں، مولانا شروانی کے نام اسی خط میں مولانا انکو لکھتے ہیں:

"مجمع نہایت کثرت سے ہوا، اور بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ بیرسٹر اور تمام ایجوکیٹڈ نے کہا کہ ہم لوگوں کو اب عملاً ندوہ میں شرکت کرنی چاہیئے، لہذا آیندہ اتوار کو ایک خاص جلسہ رفاہِ عام میں ہو جس میں ہم ایجوکیٹڈ لوگ اور اربابِ ندوہ جمع ہوں، اور مشورہ و غور کیا جائے کہ ندوہ کو کیونکر ترقی دینی چاہیئے، اور کس طرح اس کو ہم لوگ اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں۔"

اسی جلسہ میں ایک رات کو مولانا نے "اسلام اور بے تعصبی" پر ایسی دلآویز تقریر فرمائی کہ در و دیوار رقص میں تھے، علمائے معاصرین بہت کم ایک دوسرے کو داد دیتے ہیں، لیکن اس جلسہ کے بعد مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرسِ اعلیٰ دارالعلوم جو خود ایک عالم جید ہیں، فرماتے تھے "اس تقریر کو سنکر جی چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پھوڑ لوں کیونکہ جو مولوی شبلی نے پڑھا وہی میں نے بھی پڑھا پھر وہ کیوں ایسی تقریر کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتا۔"

پاؤں کا حادثہ

۱۷ مئی سنہ ۱۹۰۷ء

ان دنون مختلف جلسون کی شرکت اور آمدورفت کی وجہ سے شعرالعجم کی تصنیف مین بہت کچھ خلل آگیا تھا، اس لئے مولانا نے چاہا کہ وطن (اعظم گڈہ) جاکر چند مہینے بہ اطمینان رہین اور اس کمی کو پورا کرین، چنانچہ اعظم گڈہ پہنچنے کے چند روز بعد ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۷ء کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع نواب علی حسن خان کو دی، (۵) اُسی زمانہ مین اعظم گڈہ مین ایک اسلامی انجمن کا بھی جلسہ تھا، اس مین بھی شرکت مقصود تھی، بہرحال مارچ کے آخر مین اعظم گڈہ آئے اور حسب معمول شبلی منزل مین قیام فرمایا،

اس زمانہ مین شعرالعجم جلد اوّل کے اوراق زیر تصنیف تھے، سترہ مئی سنہ ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ میز سے اُٹھ کر ہال[1] مین تشریف لے گئے، جو ان دنون زنانخانہ مین شامل تھا، یہان تخت بچھے تھے، یہین مولانا ایک پاؤن لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے، اس بنگلہ مین باغ بھی تھا جس مین پھلیان لگی تھیں، اور کوے آکر اُن کو نقصان پہنچاتے تھے، مولانا کے اکلوتے صاحبزادہ حامد حسن صاحب اُن کے اڑانے کے لئے بندوق مین چھرّون کے کارتوس بھر کر رکھے تھے اور اسی کو ہال ہی مین چھوڑ گئے تھے، مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی

[1] اسی ہال مین اب دارالمصنفین کا کتب خانہ ہے،

مقابل میں اُن کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں، اُن کو یہ کہہ کر دی کہ "یہ عورتوں سے تو اُٹھ بھی نہیں سکتی" اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہوگئی، جسکا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا، گھر میں کہرام برپا ہوگیا، لیکن مولانا کو کچھ احساس نہیں ہوا، اتنا معلوم ہوا کہ پاؤں میں جھٹکا لگا، وہ دوسروں سے پوچھتے تھے، کیا ہوا خیر ہے؟

اب حادثہ کی تفصیل خود مولانا کی زبان سے سُنیے، ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

حادثہ کی تفصیل مولانا کی زبان سے ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں آیا تھا، اور ارادہ تھا کہ مہینے دو مہینے یہاں قیام کروں گا، شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے، اور شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا، سترہویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اُٹھ کر زنانہ کمرہ میں گیا، اندر تخت بچھے ہوئے تھے، میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا، تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی، میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دیدی، اتفاق سے گھوڑا گر گیا، بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی، بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا، کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا اس لئے ٹخنہ کی ہڈی بالکل چور ہوگئی، اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، جس وقت ضرب لگی، مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اُس وقت میں نے گھبرا کر کہا کہ یہ کیا ہوا؟ آواز سُنکر باہر سے بعض آدمی اندر آگئے، اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، اور پاؤں جوتے میں تھے، ایک عزیز نے آکر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی، میں نے پاؤں اوپر اٹھا لیا، اور نوکروں سے کہا اس پر پانی ڈالو، پانی جب ڈالا جاتا

تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا، قریبًا پاؤ گھنٹہ تک میں پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا، جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب تکیہ لاکر میرا پاؤں اس پر رکھدو، آدمی نے روکر کہا کہ کیا چیز ہے جو رکھی جائے گی، مجھ کو اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتداء میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی، اور جو کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کئے ہیں وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں،

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا، نوکر اور ماما وغیرہ تھیں، یہ لوگ سخت زار و قطار روتے تھے، اور میں ان کو منع کرتا تھا، قریبًا ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا، اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا، اور بہت بیقراری کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہو گئی، میں نے نوکروں سے کہا اس کے منہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکاؤ، اس سے اُسکو ہوش آگیا

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی جنید، سول سرجن اور اسسٹنٹ سول سرجن کو ساتھ لے کر آئے، بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں جس سے خون رُک جائے، بہرحال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دیئے، جس سے خون رُک گیا، اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالیئے، ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں، غرض بیہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل جرّاحی شروع کیا گیا، چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں اس لئے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی، (اور ہرزہ گردی کی سزا دی گئی) عملِ جرّاحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا، اور زخموں

کے ٹانکے اور رگوں کی کھچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی، آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے، تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی، بہت چلا پھرا دوڑا، دھوپا، ملا، جُلا آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا ع

"گر نستانی بستم می رسد"

خدائے بے نیاز کا شکر گذار، احباب واعزہ کا منت پذیر ہوں، بچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا، ورنہ انشاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی، والسلام

دسویں دن ٹانکے کھولے گئے، ایک ٹانکے میں مواد آگیا، اس وجہ سے سوزش اور ٹپک کی سخت تکلیف ہے، ۱۳ مئی ۱۹۱۰ء تک یہ حالت ہے۔"

احباب اور معتقدین کا اضطراب

جس وقت یہ خبر ندوہ پہنچی ہے، طلبہ میں سراسیمگی پھیل گئی، تار سے خیریت منگوائی، اخبارات کی مختصر اطلاع نے احباب اور معتقدین میں عجیب پریشانی پیدا کی مخصوص احباب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مولانا سید عبدالحئی صاحب، نواب سید علی حسن خاں، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور مولوی اعجاز حسن خاں صاحب اور دوسرے احباب فوراً عیادت کو آئے، طلبہ میں سب سے پہلے خاکسار اور ہم درس مولوی جواد علی خاں ۲۴ مئی کو اعظم گڈھ پہنچے، ہم دونوں دو روز یہاں ٹھہرے، یہیں بیٹھ کر خاکسار نے اخبارات کو حادثہ کی مفصل

اطلاع بھیجی، دریافتِ حال کے لئے احباب اور معتقدین کے خطوط اور تار برابر آ رہے تھے، ۲۵ر مئی کو مولانا نے خاکسار کو بٹھا کر حادثہ کی پوری تفصیلات لکھوائیں، یعنی وہ بولتے جاتے تھے اور خاکسار لکھتا جاتا تھا، اور یہی خط چھپوا کر دوستوں کی خدمت میں بھجوایا، اور یہ وہی خط ہے جو ابھی اُوپر نقل ہوا،

گو اس خط میں حادثہ کی پوری تفصیل موجود ہے، مگر راقم نے مولانا کی زبان سے جو بعض ایسے واقعے سُنے جو اس خط میں نہیں اور جن کو یہاں سے واپس جا کر الندوہ میں لکھا وہ اس موقع پر اضافہ کے قابل ہے،

مولانا اس دن شعر العجم میں فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ لکھ رہے تھے اور اس کو اتفاق کہئے یا فالِ بد کہ اس تبصرہ کو اس شعر پر ختم کیا تھا[1]

یلاں را سر و سینہ و پا و دست　　　　بریدہ و دریدہ و شکستہ و بہ بست

اور اس کے بعد ہی زنانخانہ میں تشریف لے گئے، اور یہ حادثہ پیش آیا، مولانا کو اس وقت پورا احساس نہیں تھا کہ کیا ہوا، جس وقت سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن آئے ہیں، تو مسکرا کر فرمایا کہ اگر پاؤں جُڑ جائے تو خیر، ورنہ سرے سے الگ کر دیا جائے،

ڈاکٹر نے جب عملِ جراحی کے لئے بیہوشی کی دوا پلائی ہے تو اس وقت ایک نادر واقعہ پیش آیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز دماغوں کی قوت اور حواس کی جمعیت بھی ممتاز ہوتی ہے،

---

[1] اپریل ۱۹۰۶ء (یہ نمبر تاخیر کے ساتھ شائع ہوا تھا، اسی لئے مئی کا واقعہ اپریل کے پرچہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے) [2] شعر العجم جلد اول، صفحہ ۱۶۰ میں زیر مثال صنائع و بدائع یہ شعر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس حادثہ کے وقت یہی صفحہ زیر قلم تھا، مولانا نے اس واقعہ کو شعر العجم جلد اوّل کے مقدمہ میں صفحہ ۳ پر خود بھی ذکر فرمایا ہے،

قاعدہ ہے کہ بیہوشی کی دوا پلا کر مریض کو گننے کو کہا جاتا ہی، عموماً لوگ پچاس سے ساٹھ تک گنتے ہوئے بیہوش ہو جاتے ہین، مگر مولانا نے اس ضعف اور ناقابلِ برداشت صدمہ پر بھی ستانوے تک گنا، اور اس کے بعد بیہوش ہوے،

ٹانکے دیتے وقت دو ٹانکوں کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ اگر گرمی کی وجہ سے کچھ مادۂ فاسد جمع ہو جائے گا تو اس راہ سے نکال دیا جائے گا، مگر الحمد للہ کہ زخم رو بہ صحت تھا، اور مادۂ فاسد نہین جمع ہوا، صرف ان ہی دو ٹانکوں کی جگہ مین کچھ مواد آگیا تھا،

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دو ہفتہ مین زخم خشک ہو جائے گا، مگر افسوس کہ تیسرے ہفتہ تک زخم مندمل نہیں ہوا، مواد آتا رہا، اور زخم میں درد، ٹیک اور ٹیس ایسی تھی جس سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور بے چینی تھی[1]، ۶ جون کو ایک خط مین مولانا شروانی کو لکھتے ہین:- "زخم کی حالت دس بارہ دن تک اچھی تھی، لیکن بعد کو ریم آنے لگی، اور اب تک آتی ہے، اسسٹنٹ سرجن روزانہ آتا ہے اور دن مین دو بار زخم دھویا جاتا ہے، لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں، تکلیف گو سخت ہی لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روؤن، فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ (۶۲)

مولانا تین مہینے اپنے وطن مین بسترِ علالت پر پڑے رہی، اسی سبب سے مضمون عالمگیر کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ چند ماہ رکا رہا، لیکن شعر العجم کی تصنیف باوجود درد اور تکلیف کے تین چار ہفتون کے بعد شروع ہو گئی[2]،

راقم نے جولائی میں لکھنؤ تشریف لانے کی خواہش کی، تو ۲۲ جولائی کو اپنے قلم سے جواب لکھا،

---

[1] الندوہ اپریل ۱۹۰۷ء [2] مقدمۂ شعر العجم حصۂ اوّل صفحہ ۲،

کہ وہاں حسبِ دستورِ سابق کوٹھے پر میں رہوں تو پھر اُترنا چڑھنا مشکل ہوگا۔ (سلیمان ۱۵)

ان ہی دنوں ۱۳ر جولائی ۱۹۰۶ء کی اطلاع ہے: کہ نواب محسن الملک نے علی گڈہ سے لکھا کہ وہ یہاں آجائیں یہاں کے ڈاکٹر مفت علاج کریں گے، مگر وہ وہاں نہیں گئے اور بمبئی کا قصد کیا، (سلیمان ۱۶) اس سخت تکلیف کی حالت مین بھی مولانا شروانی سے قلمی نسخوں پر دلچسپ خط وکتابت ہورہی ہے، (شروانی ۶۳)

اگست کے شروع میں مولانا لکھنؤ آئے، ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے جو مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری کے داماد تھے، اور لکھنؤ میں شاہی اسپتال مین ڈاکٹر تھے ایک مرہم بنا کردیا، مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، اسی زمانہ مین مولانا نے مولوی حمیدالدین صاحب کو جس خط مین اپنے یہ حالات لکھے ہیں اسی میں ان کو ندوہ آکر طلبہ کو قرآن پاک کا درس، اور سائنس میں دروس الاولیہ پڑھانے کی خواہش کی، (حمید ۳۹) جس کو مولوی صاحب نے منظور کیا،

مولانا نے اس کے بعد بمبئی کا سفر کیا، اور وہان لکڑی کا ایک مصنوعی پاؤں بنواکر استعمال کیا، یہ پاؤں اچھا نہیں بنا یعنی بھاری تھا، بمبئی سے حیدرآباد کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلہ مین وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسرالملک بہادر نے جو اُن دنون سپہ سالارِ عساکر آصفی تھے، سرکاری کارخانہ سے اپنے زیرِ اہتمام ایک دوسرا پاؤن بنواکر پیش کیا جو زیادہ آرام دہ اور ہلکا تھا،

حادثہ کی شاعرانہ تعلیل

حادثہ جو ہونا تھا ہوگیا، مگر بقول مولانا شروانی "علمی آدمیون کی ہر بات علمی ہوتی ہے" اس حادثہ نے علم ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کردیا، مولانا حالی مرحوم، نواب سید علی حسن خاں مرحوم، خواجہ عزیزالدین مرحوم اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، مولوی

عبد السلام صاحب اور خاکسار نے متعدد رباعیاں کہیں، جن مین اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں، مولانا نے یہ تمام رباعیاں راقم کو عنایت فرمائیں، اور راقم نے مناسب سمجھا کہ دوسرے غمزدون کو بھی حسنِ تعلیل کے اس تسلّی نامہ مین شریک کرے، اس لئے اُن کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ مین شائع کر دیا گیا،

(مولٰنا حالی)

شبلی کہ گزند پاش پر دل شکن است | با خستگیش خجستگی مقترن است
چندانکہ بکاہند فزاید نہ عجب | "کار استنِ چمن زپیراستن است"[1]

(نواب سید علی حسن خاں مرحوم)

شبلی! ترے قوم پر بہت احساں ہیں | باتیں تری، دردِ قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر | اس ایک قدم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

(خواجہ عزیز الدین مرحوم)

اے پایۂ تو بلند تر از افلاک | پایت چو بریدہ شد، چہ ہستی غمناک؟
زیرِ قدمت بلندی و پستی ہست | پائے بفلک داری و پائے برخاک

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے اس حادثہ پر متعدد رباعیاں لکھیں اور خوب خوب توجیہیں کیں،

---

[1] مولانا حالی کا چوتھا مصرع عنصری کی رباعی کا ٹکڑا ہے، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمود نے بدمستی میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، جب سلطان کو ہوش آیا تو اس کی خوبصورت زلفوں کے کٹ جانے سے نہایت غمگین ہوا، اس پر دربار کے شاعروں نے شاعرانہ حسنِ تعلیل سے سلطان کا دل بہلانا چاہا، اسی سلسلہ میں عنصری نے یہ رباعی کہی، کہتے ہیں کہ اس کے سنتے ہی سلطان خوش ہوگیا، اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا،

اے ذاتِ تو در علم و عمل گشتہ علم | ولے مفتخر از وجودِ پاکت عالم
یک پائے تو چوں شد بعدم دانستم | داری دو جہاں ہمسر و ہا زیر قدم

اے آنکہ تو اہلِ قوم را الجائی | حق داد ترا بہ ملکِ فن دارائی
چوں نیست کسے ہمسرِ تو در پایہ | پس پائے تراہمی سزد یکتائی

صد حیف ہوا شکستہ پائے شبلی | اب سلسلۂ سفر بھی مفقود ہوا
مشتاقِ زیارت جو ہو خود آئے یہاں | رہبر جو تھا اب کعبۂ مقصود ہوا

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا | ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخرِ شہادت ملنا | اک پاؤں کو اس سے بھی سرافراز کیا

اُن کی ایک رباعی الندوہ میں نہیں، خاکسار کے نام خط ۱۶ میں ہے، لکھتے ہیں :- ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا، کہتے ہیں :-

کیا اس سے بھی ہو گی کوئی ساعت منحوس | زخمی ہوا جبکہ پائے شبلی افسوس
اک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا آقبل | تھا اہلِ فنا کو اشتیاقِ پابوس

خود مولانا نے بھی اس حادثہ پر کئی نظمیں کہیں،

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہو دشوار | اس پر بھی خدا کا شکر ہو احساں ہو
یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جب منزل تک | یاں سے سفرِ عدم بس اب آساں ہو

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے | آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی | گو پاؤں کٹے قدم برجا تھے

مقبول نہیں ہے بے نوائی میری | آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی | ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

حالت از گردشِ ایام اگر گشت بتر | صبر فرما کہ ازیں نیز بتر می بایست
شبلیِ نامہ سیہ را بجزاے عملش | پا برید ند و صد افسوس کہ سر می بایست

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے ان نظموں کے جواب میں عرض کیا،

کیجئے نہ غم شکستِ پا مولنٰنا! | اس میں بھی تھی حکمتِ خداے دانا
تھی اہلِ عدم کو آرزوے پابوس | اک پاؤں وہاں بھی چاہئے تھا جانا

اور مولانا کے پہلے قطعہ کے جواب میں یہ قطعہ لکھکر پیش کیا،

شکستہ پائی تو تھی سرنوشت میں حضرت! | نہ ہاتھ آئیگا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہی منزل نہ جا سکینگے حضور | چلے گا قوم کا کام آپکے نہ چلنے سے

ہمارے دوست مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے بھی جن کی سخن سنجی مسلّم ہے ایک رباعی لکھکر پیش کی تھی جس کا اخیر مصرع یاد ہے،

"ہمّت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے"

خاکسار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا، جس کو ادباً یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا، اسی مہینہ میں موازنۂ انیس و دبیر شائع ہوئی تھی، اسی کو پیشِ نظر رکھ کر کہا تھا،

تنقیدِ مراثی کے صلہ میں اُستاد | دربارِ حسینیؓ نے سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی | اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

اعظم گڈہ سے چلتے وقت معذرت کے چند عربی شعر کہکر چپکے سے مولانا کے سرہانے رکھ کر اُلٹے پاؤں واپس پھرا، مولانا ہر چند پکارتے رہے مگر میں شرم سے سامنے نہ جا سکا، اس نظم میں دیر سے پہنچنے پر عفوِ تقصیر کی درخواست تھی، مطلع تھا،

دع اغترفُ منك بحرَ الفضلِ والحِکما	واقتبسُ منك شمسَ العِلمِ والعُلما
مجھے اے فضل و حکمت کے سمندر چلو بھر بھر کے پانی پینے دے	اور اے علم اور عالموں کے آفتاب مجھے اپنے سے روشنی حاصل کرنے دے

دوسرا عربی قصیدہ صحت کی خوشی میں کہا، مگر اس کو بھی پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے چند اشعار الندوہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے ایک مضمون میں جسکا عنوان "علمائے سلف اور کتب بینی" ہے، چھاپ دیئے کہ وہ نظرِ اشرف سے گذر جائیں، ع گفتہ آید در حدیثِ دیگراں،

عاد الربیعُ لروضی بعد مَا ذھبا	وعمّر اللہ ربعی بعد ما خربا
میرے چمن میں بہار جا کر پھر آگئی	اور خدا نے میری گھر کو ویرانی کے بعد پھر آباد کر دیا
وازینتِ الارض خضرًا بعد ما یبست	وَالبرق عاد سناہ بعد ما احتجبا
زمین خشک ہو کر پھر سرسبز ہو گئی	اور بجلی کی چمک چھپ کر پھر نکلی
وفجّر العلم عینًا بعد ما نضبا	وَاشرقَ الفضل شمسًا بعد مَا غربا
اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا	اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب کر پھر نکل آیا
یا من سماحتُہ عمّتْ بصائرنا	اعطیتَ ما فاق ابھی الدّر والذھبا
اے وہ جسکی بخشش ہماری بصیرتوں کو چھائے ہے	تو نے جو دیا وہ زر و جواہر سے بھی بڑھ کر ہے
اذا مرضتَ فکلّ النّاسِ قد مرضُوا	والعلمُ والفضلُ نالا مثلھم نَصبا

جب تو بیمار ہوا تو سب لوگ بیمار ہو گئے   اور علم و فضل نے بھی اُن ہی کی طرح تکلیف اُٹھائی

واذ برئتَ فكلُّ النّاس قد برؤُا   والعلمُ والفضلُ ماسا مثلهم طربا

اور جب تو اچھا ہوا تو سب لوگ اچھے ہو گئے   اور علم و فضل بھی خوشی سے جھومنے لگے

ما رِجلك انفصلتْ الا لهمّتها   عن ارضنا بعدتْ تستصغرُ الرُبا

تیرا پاؤں جدا نہیں ہوا، بلکہ اپنی ہمّت کی بلندی سے منزلوں کو چھوٹا سمجھ کر ہماری زمین سے دور ہو گیا

رجلٌ بها جُزتَ كم من سبسبٍ وقرًى   في الفضل مرتغبًا للعلمِ مُطّلبا

وہ پاؤں جس سے تو نے کتنے صحرا اور آبادیاں طے کیں   فضل کی خواہش اور علم کی تلاش میں

بِها وطئتَ بلادَ الترك مغتربًا   وَاجْتزْتَ مصر وبيتَ القدسِ والعربا

وہ پاؤں جس سے تو نے ترکوں کے ملک کا سفر کیا   اور مصر و بیت القدس اور عرب کو قطع کیا

لها تخرُّ جباهُ العلمِ ساجدةً   اذ كعبُها كعبةٌ للعلمِ [illegible]

وہ پاؤں جس کے سامنے علم کی پیشانیاں جھکتی ہیں   کیونکہ اس کا کعب (ٹخنہ) بے شبہ علم کا کعبہ ہے

نِلتَ العلىٰ وسبقتَ القومَ قاطبةً   وان همُ شاركوك سيّدي لقبا

تو نے بلندی کا درجہ پایا اور سب سے آگے بڑھ گیا   اگرچہ وہ سب لقب شمس العلما میں تیرے برابر ہیں

كلُّ النجوم وان قيلت لها شهب   لكنّما الشمس فاقتْ هٰذهِ الشُّهبا

سارے ستاروں کو اگرچہ روشن کہتے ہیں   لیکن آفتاب ان تمام روشن اجرام میں سب سے بڑھ کر ہے

اذا اسبكرَّ عليك الليلُ حالكُه   مضىٰ وانتَ تراعي الصُّحفَ والكُتبا

جب تجھ پر تاریک رات دراز ہونے لگتی ہے   تو تو کتابوں اور صحیفوں کو دیکھتے ہوئے انکو گذار دیتا ہے

جادت یمینک بالاسفارِ من قلمٍ　　　بہ غدتی دُرّۃً ماکان مختلبا

تیرے ہاتھ نے تصنیفات کی سخاوت ایک ایسے قلم سے کی ہے　　　جس سے کوڑی بھی رتبہ پاکر موتی بن گئے

ان تمام نظموں میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کی فارسی مثنوی ہے، جس میں مولانا نے بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ ۴۳ برس کے بعد ان کے خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی بھی اُن کے صاحبزادہ مولوی محمد مبین صاحب کیفی سے ہاتھ آئی، اور اس وقت یہ تبرک دارالمصنفین کے کتب خانہ میں ہے، مثنوی اسی زمانہ میں الندوہ میں بھی چھپ چکی ہے، فرماتے ہیں:

اے دل افروز شمع علم و ہنر　　　نور چشم جہان و جانِ پدر

پدرِ انتساب علم و کمال　　　از نسب ناہماے عز و جلال

بر تو از آسماں گزند مباد　　　جورِ دہرِ ستم پسند مباد

چشم زخمِ زمانہ دور از تو　　　باد ہر بزم پُر ز نور از تو

من شنیدم کہ اندریں پرکار　　　گشتی از دستِ روزگار رفگار

آفتِ ناگہاں رسید بہ پائے　　　پائے آں رہروِ جہاں پیمائے

بہ خدائے کز وست صبر و بلا　　　کہ نیارم شنیدنش اصلا

بودہ ام در تعب ز روزے چند　　　من در اینجا بہ حاجتے پابند

کہ بہ من گفت رہروِ عاجل　　　کاے ز احبابِ این و آں غافل

تیرے از چرخِ خود پسند رسید　　　شبلی ات را بہ پا گزند رسید

این خبر چوں بگوشِ من بہ رسید | تابِ بشنفتنش ز من بہ رمید
آوخ آں پائے راہ پیمائے | بسوئے طیبہ گام فرسائے
ہم رہِ مصر و شام و روم بُرید | حیف از ساقِ خود جدا گردید
دل بجوش آمدم بہ نوحہ گری | یاد چوں آید از تو رہ سپری
رہ نوردی برائے کسبِ ہنر | نہ پئے اندخارِ بدرۂ زر
(جمع کیسہ)
گرچہ پائے تو دید بیش گزند | صبرِ تو نیز پایہ داشت بلند
گرچہ شد خوں از و رواں بزمیں | لیک چینت نگشتہ گرد جبیں
گرچہ پایت ز ساق گشتہ جدا | لیک صبرت چو کوہ پا برجا
اے خداوند واہبِ اعمار | دائمش بر رہِ سعادت دار

حکایات و لطائف اس حادثہ کے بعد مولانا اپنے مصنوعی پاؤں پر عجیب عجیب دل خوش کن فقرے کہکر دل بہلاتے تھے، مارچ ۱۹۱۰ء میں جب مشرقی یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے ان کے لئے لکڑی کا ہلکا سا جو پاؤں بنوایا تھا، کارخانہ سے اس کو لینے کے لئے مولانا اور نواب افسر الملک بہادر خود گئے، نواب صاحب پاؤں ہاتھ میں لئے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا،

"پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے"

حسنِ اتفاق سے اسی روز نواب صاحب کو "سر" کا خطاب ملا تھا، مولانا نے کہا کہ "آپ نے مجھ کو پاؤں دیا، تو خدا نے آپ کو سر دیا۔"

۱۱ر مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو ایک خط میں اپنے پاؤں بننے کی خبر دیتے ہیں تو لکھتے ہیں:- "پاؤں بن گیا، آمد تو نہیں آورد ہے، رفتہ رفتہ شاید ترقی ہو" (۱۵)

میر اکبر حسین صاحب (رجج) سے اُن کے تعلقات علی گڈھ کے ابتدائی زمانہ سے تھے، میر صاحب قافیوں کے استاد تھے، الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا نے کہا کہ میر صاحب! میں آپ کی تلاشِ قافیہ کا جب قائل ہوں جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں، میر صاحب نے ہنس کر فرمایا" دیکھئے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں"۔ بات ہنسی میں ختم ہو گئی، ایک دو روز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ر نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ اُن کے پاس بھیجا، جس میں لکھا تھا:-

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی ۔۔۔ ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

مل جائے یہاں جو دال دَلیا ۔۔۔ سمجھو تم اُسے پُلاؤ قلیا

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا،

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال ۔۔۔ لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں ۔۔۔ حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا ۔۔۔ اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی ۔۔۔ جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

ایک دن فرمایا کہ بھائی میں استدلالی (متکلم) تھا، مولانا روم چھ سو برس پہلے کہہ گئے تھے کہ میرا پاؤں کٹے گا، اور لکڑی کا پاؤں بنے گا،

پاے استدلالیاں چوبیں بود　　　　پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود

ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں ساتھ تھا، فرمانے لگے "میاں: پہلے گفتار و کردار نقلی تھا، اب رفتار بھی نقلی ہے"۔

ایک دفعہ کا لطیفہ میں بھول نہیں سکتا ہوں اور مولانا ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تھے، مولانا مجھے ساتھ لے کر کھانے کے ایک ریسٹران میں گئے، کھانے کے اثنا میں خانساماں سے فرمایا کہ "پون لاؤ" مجھے تعجب ہوا کہ پاؤں تو مولانا لگائے ہیں، یہ پھر پاؤں کیسا مانگتے ہیں، مڑ کر دیکھا تو خانساماں پاؤ روٹی کے ٹکڑے لا رہا ہے، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کو پؤن کہتے ہیں، (پاؤ روٹی کی اصل یہی ہے، پؤن پرتگالی میں روٹی کو کہتے ہیں)

مولانا شروانی فرماتے ہیں:۔ "ایک بار علی گڈھ کالج میں لکچر دینے، وقت مقررہ کے بعد تشریف لائے، تو عذر تاخیر بیان فرما کر کہا: "یہ عذر عذر لنگ نہ خیال فرمایا جائے"۔

اس طرح اس حادثہ نے ادب میں خاصہ لطیف اضافہ کر دیا تھا،

مسجد کانپور کے واقعہ کے سلسلہ میں مولانا نے ایک قطعہ میں اس کو میڈی کو ٹریجیڈی بنا دیا ہے، مسلمان قیدیوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں،

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہی دشوار　　　　ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں

پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہی صدمہ　　　　یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

صحت کے بعد بمبئی و حیدرآباد کا سفر

اوپر یہ گذر چکا ہے کہ جولائی ۱۹۰۷ء کے آخر تک وہ اعظم گڈھ رہے، اگست کے شروع میں وہ لکھنؤ آئے، لکھنؤ سے بمبئی گئے، اور بمبئی سے حیدرآباد پہنچے

جہاں مشرقی یونیورسٹی کی کمیٹی تھی جس کی تفصیل آگے آئے گی، وہ ان سفروں میں ابھی اودھ بہ مگر
اس وقت ندوہ سے سرکاری تعلقات کی بات چیت چھڑی ہوئی تھی، اس لئے وہ
لکھنؤ واپس آگئے،

ندوہ کے سرکاری تعلقات کا آغاز

۱۹۰۸ء ندوہ کی تاریخ اور مولانا کی معتمدی کے زمانہ کا نہایت اہم سال ہے، اسی سال ندوۃ العلماء کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو سیاسی
بدگمانیاں تھیں وہ دور ہوئیں، اگرچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب لکھنؤ، نواب محسن الملک بہادر
اور جسٹس سید شرف الدین صاحب پٹنہ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کے لئے پوری کوشش
کی، مگر اس مین کامیابی کا وقت مولانا شبلی مرحوم کی معتمدی کے زمانہ مین آیا، اور اس کی صورت
بھی نئی پیدا ہوئی، ریاست پٹیالہ گو پنجاب مین ہے، مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ مین ریاست مذکور
نے جو فوجی خدمتیں انجام دیں ان کے صلہ مین ریاست مذکور کو اودھ میں بھی ایک اچھا خاصہ
علاقہ ملا ہے، اس زمانہ میں ریاست مذکور کے فارن منسٹر کرنل عبدالمجید خاں ایک با اثر با
رسوخ اور حکومت انگریزی کے مستند وفادار تھے، اور ریاست کے تعلقات کی بناء پر حکام
اودھ سے بھی کافی راہ و رسم رکھتے تھے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی کوششوں سے کرنل
صاحب موصوف کو ندوہ سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور مولانا سے ملاقات کا اتفاق ہوا، اس
ملاقات نے خلوص کا درجہ حاصل کیا، کرنل صاحب جب لکھنؤ آئے تو حکام سے مل کر ندوہ
کے باب میں ان کے خیالات کے پلٹنے مین کامیاب ہوئے، (مکاتیب شروانی ..)

سرکاری امداد

اسی اثنا میں منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹرایٹ لا رئیس گدیہ دبارہ بنکی

اودھ) جن کو ندوہ سے شروع ہی سے دلچسپی تھی[1]، ۸ر جنوری ۱۹۰۸ء کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف (لکھنؤ) میں حکومت کو دارالعلوم ندوہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی، اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد ۱۲ر جنوری ۱۹۰۸ء کو ڈیلا فوس صاحب ڈائرکٹر کی طرف سے منشی صاحب موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا کہ کیا ندوہ باقاعدہ گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد کی درخواست بھیج سکتا ہے؟ اس وقت مولانا لکھنؤ میں نہ تھے، میں نے اس مراسلہ کی اطلاع دی، مجھے لکھا[2] "پراونشل آفس کے جواب میں ندوہ کی طرف سے یہ کیوں نہ لکھا جائے کہ ہم دونوں طرح کی مدد چاہتے ہیں، مالی بھی اور اعزازی بھی، خیر اس کے متعلق قدوائی صاحب کو لکھوں گا" (سلیمان ۱۷)

اس سلسلہ میں طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۸ء کو گورنمنٹ نے بلا شرط پانچسو روپیہ ماہوار کی امداد منظور کرنے کی اطلاع[3] دی اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسہ کے

---

[1] منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹر ایٹ لا گدیہ ضلع بارہ بنکی اودھ کے مسلمان تعلقہ داروں میں تھے، ان کو ندوہ اور قومی کاموں سے شروع ہی سے دلچسپی تھی، وہ ۱۹۰۱ء کے قریب زمانہ میں تھوڑی سی انگریزی تعلیم کے بعد لندن چلے گئے تھے، اور وہاں بیرسٹری حاصل کی اور ساتھ انگریزی تحریر و تصنیف کی مشق بہم پہنچائی، اور "اتحاد اسلام" کی عالمگیر تحریک میں شامل ہو گئے، ۱۹۰۵ء کے قریب وہ انگلینڈ سے واپس آئے اور بدستور ندوہ اور دوسرے قومی کاموں میں دلچسپی لی، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران میں وہ لندن ہی میں تھے اور تقریباً ۱۹۲۰ء تک رہے، ۱۹۲۰ء کے شروع میں واپس آئے، ترکوں سے اور تحریکِ خلافت سے ان کو بیحد عقیدت تھی، وہ ایک طرف مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم کے ذریعہ سے قوم کو اور دوسری طرف ہز ہائینس آغا خاں کے ذریعہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کے معاملات کو سدھارنے اور مختلف تحریکوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے، ترکی اور یورپ کے بہت سے مشاہیر سے ان کے تعلقات تھے، ووکنگ کی مسجد میں بھی اسی زمانہ میں چند سال رہے تھے اور اسلام کے متعلق بہت سے مضامین اور کتابیں لکھیں، انکی آخری کتاب "اسلام اور بالشوازم" ہے، وہ قلب کے مریض تھے، آخر اسی بیماری میں ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۲ء میں وفات پائی

[2] اس خط پر غالباً جنوری ۱۹۰۸ء کا ہے مولانا کے قلم سے غلطی سے ۱۹۰۷ء نکل گیا ہے، ابتدائے سنہ میں اکثر یہ غلطی نادانستہ ہو جاتی ہے

[3] مدرسہ کو یہ امداد ۱۹۲۰ء کے

نصاب اور اصول میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کریگا، اور اس امداد کا روپیہ ادب عربی اور انگریزی و ریاضی وغیرہ مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم مین خرچ ہوگا،

غیر مذہبی علوم کے لئے اس نئی امداد حاصل ہونے پر انگریزی اور ریاضی کا اسٹاف بڑھایا گیا اور عربی علم ادب میں جدید عربی کی تعلیم کے لئے خاکسار جدید عربی کا معلّم (ماڈرن عربک پروفیسر) مقرر کیا گیا، اور بعض اضافے اور ترقیان ہوئیں،

قومی امدادیں اب مدرسہ کے مذہبی علوم کی تعلیم کی ترقی و توسیع کے لئے مزید کوشش کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اس غرض سے مولانا نے پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بہار کے بعض شہروں کا دورہ کیا اور معتدبہ امدادین حاصل کیں، صوبہ سرحد کے دورہ میں مولانا کے ساتھ جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواری بھی شریک تھے،

وظائف سنسکرت اور ہندی پڑھنے کے لئے جو طلبہ تیار ہوئے تھے، اُن کے لئے وظیفوں کا الگ انتظام کیا، اور ہمیشہ اپنے دوستون سے وظائف کی مدمین اعانت کی درخواست کرتے رہتے تھے،

سرمایۂ محفوظ ابھی تک ندوہ میں کوئی مستقل محفوظ سرمایہ نہ تھا، بلکہ یہ قاعدہ تھا کہ جو آتا تھا وہ خرچ کر دیا جاتا تھا، مولانا نے ۱۹۰۵ء ۱۳۲۲ھ میں یہ تحریک کی کہ بنک میں ریزرو فنڈ کے نام سے ندوہ کا الگ حساب کھولا جائے، پھر ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسہ مین یہ تحریک پیش ہو کر منظور ہوئی اور اس کے لئے بارہ ہزار کے چندہ کا اعلان ہوا، مگر اس میں سے وصول کم ہوا، ۱۹۰۷ء کی روداد[1] میں اس مد کی تعداد پانچہزار کے قریب ہی خیال آتا ہے کہ مولانا کے آخر زمانہ میں اس مدمین پندرہ ہزار کے قریب جمع ہوگیا تھا،

[1] روداد جلسہ دستار بندی ۱۹۰۷ء،

تعمیر کی فکر — مدرسہ اب تک گولہ گنج کی ایک گلی میں ایک پرانے قسم کے مکان میں تھا، جو پہلے ایک ہندو رئیس کا تھا اور ندوہ نے نو ہزار روپیہ میں اس کو خریدا تھا، اسی میں ایک ہال ناظم شیخ بہاؤالدین صاحب وزیر جوناگڈھ کی ایک ہزار روپیے کی فیاضی سے بن گیا تھا، کچھ ادھر ادھر کمرے حسب ضرورت بنوائے گئے تھے، مولانا کی نظر میں قسطنطنیہ کے دارالعلوم اور علیگڈھ کا مدرسۃ العلوم تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ یہ مذہبی درسگاہ ہماری دنیاوی درسگاہوں سے ظاہری حیثیت میں بھی کسی طرح کم نہ ہو، ۱۹۰۶ء میں مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں:۔ "ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو ابھرنے نہیں دیتی، اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اب ادھر توجہ کرنی پڑی، اسی بنا پر کلکتہ کا سفر بھی ہے۔ ایک معقول شاہی عمارت بہت ارزاں لکھنؤ میں مل رہی ہے، خیال ہے کہ اسی کو لے لیا جائے" (۸)

لیکن یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اسی دھن میں ۱۹۰۸ء میں ایک اپیل لکھوا کر چھپوائی، جس میں مدرسہ کی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار کیا تھا، اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایسے پچاس بزرگ جو ایک ایک ہزار دیسکیں ہمت کریں، یہ اپیل مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم ریاست بھاولپور میں لے کر گئے، تو حاتمۂ دوران جدۂ ماجدہ اعلیحضرت نواب صاحب بھاولپور نے فرمایا: پچاس شخصوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، یہ پوری رقم میرے نج کے خزانہ سے دے دی جائے،

یہ خبر تار کے ذریعہ سے جب مولانا کو پہنچی ہے تو اُن کی خوشی کا عجیب عالم تھا، اس دن تمام مدرسہ میں طلبہ و اساتذہ خوشی و مسرت سے بغلگیر ہو رہے تھے، اور اسی خوشی میں انھوں نے

یہ کیا کہ۔ ا بجے دن کے کھانے کا جو دسترخوان بچھا تھا وہ سارا کھانا فقرار کو تقسیم کر دیا، مولانا شروانی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی طرف سے مزید رقم کا وعدہ بھی تھا، مگر بعض معاصرین نے بیگم صاحبہ کو یہ خبر پہنچا کر پریشان کر دیا کہ "ندوۃ العلمار کے دارالعلوم میں (نعوذ باللہ) الحاد و لامذہبی کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں روپیہ دینا معصیت ہے" اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحبہ نے مولوی سر رحیم بخش صاحب مرحوم پریسیڈنٹ کونسل ریاست (جن کی تحریک سے رقم بالا ملی تھی) بلا کر کہا، "سائیں جی روپیہ کس کو دلوا دیا" ایک مولوی صاحب نے رفع الزام کی کوشش کی تاہم شوقِ امداد سرد ہو گیا، مزید رقم نہ مل سکی[1]، اور عمارت آج تک ناتمام ہے،

مدرسہ کے لئے عطائے زمین ۱۹۰۰ء

سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو زمین کی تلاش ہوئی، لکھنؤ میں سب سے بہتر اور سب سے موزوں تر وہ قطعۂ آراضی ہے جو دریائے گومتی کے پار آہنی پل کے دائیں جانب واقع ہے، زمین کا منظر یہ ہے کہ ایک طرف نہایت قریب دریا ہے، پشت اور پہلو میں اُس وقت کیننگ کالج کا اور اب لکھنؤ یونیورسٹی کا بورڈنگ، اور صنعتی اسکول کی پُرشان عمارتیں ہیں، شمال کی طرف دور تک کھلا ہوا میدان ہے، یہ قطعہ پختہ ۳۲ بیگھہ ہے چنانچہ اس زمین کیلئے گورنمنٹ میں درخواست کیگئی، اگرچہ اس حلقہ کی زمین میونسپلٹی کے قاعدہ کے رُو سے سات روپیہ بیگہہ سالانہ پر ملتی ہے، اور اسی لئے زمینِ مطلوبہ کا سالانہ لگان ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا، لیکن جناب مسٹر جاپلنگ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ کی اور کرنل عبد المجید خاں مرحوم وزیر پٹیالہ کی پُرزور زبانی تحریک پر

---

[1] مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خود مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم نے ان سے بمقام بہاولپور بیان کیا تھا، ۵ع خاں نے مارچ ۱۹۱۶ء میں بہاولپور ایک سلسلہ میں جا کر ارکانِ ریاست سے اس عمارت کی تکمیل کی تحریک کی، چنانچہ ہز ہائینس نے پندرہ ہزار کی رقم منظور فرمائی، مگر موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ رقم اب تک نہ مل سکی،

دار العلوم ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد

عمارت دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

P P. C Azamgarh.
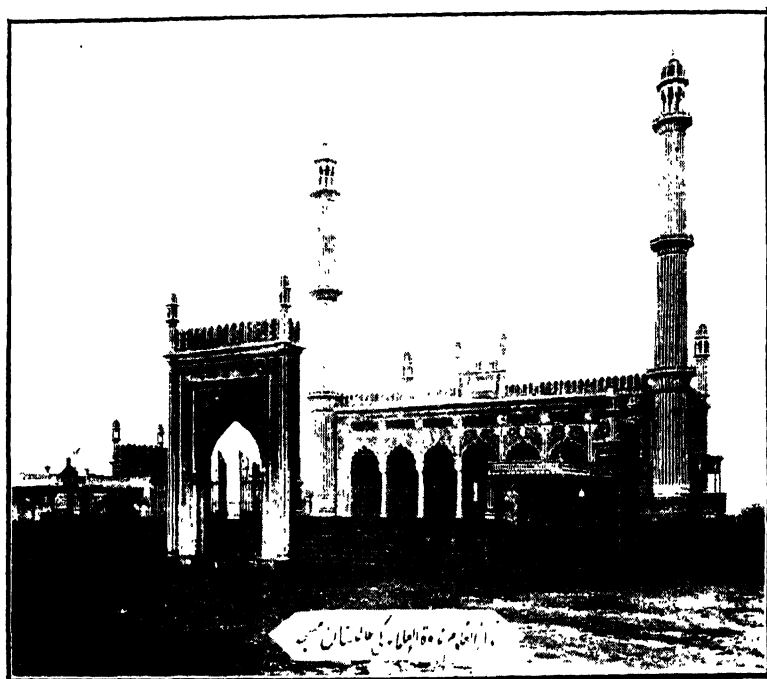
جناب کمشنر صاحب نے اس کے دیئے جانے کی سفارش کی، اور ہز آنر ہیوٹ صاحب لفٹننٹ گورنر نے اس کو منظور کیا، اور صرف ما سالانہ لگان مقرر کیا،

جلسۂ سنگ بنیاد ۱۹۰۸ء

ان تیاریوں کے بعد نومبر ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم کے سنگ بنیاد اور ندوہ کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، ندوہ اودھ کے دارالسلطنت میں واقع ہے اسکے چاروں طرف مسلمان رؤسا اور تعلقہ دار ہیں، جن کی معمولی نگاہِ التفات بھی ندوہ کو مالامال کرسکتی تھی، مگران لوگوں کو یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ ندوہ سے بدگمان ہے، اب جب کرنل عبدالمجید خاں مرحوم کی کوششوں سے ان بدگمانیوں کا پردہ چاک ہوا اور گورنمنٹ نے بیش از بیش نظرِ توجہ کی تو اس زمانہ کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا ظاہری سنگِ بنیاد یوپی کے گورنر سرجان پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں، تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو، مولانا مرحوم نے اس جلسہ کا حال خود اپنے قلمِ مسرت رقم سے لکھا ہے، اس لئے ہم اس کو یہاں اُن ہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں :-

"بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس — خوابِ خوشی دیدم و دیگر مپرس

تشنگی بود، خمارم ہنوز — دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دلفریبیاں بارہا دیکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گذرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پُراثر جلسے بھی ہم کو متاثر کرچکے ہیں، لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا، وہ ان سب سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرت انگیز تھا،

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علما، عیسائی فرمانروا کے سامنے ولی شکرگذاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درسگاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش، اور کجکلاہ سب جمع تھے ع

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر ممالکِ متحدہ نے منظور فرمایا کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلما کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے۔ یہ تقریب ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی، چونکہ ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی ان ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا، اس لئے دو طرفہ کشش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان اُمنڈ آیا، افسوس یہ ہے کہ یہ کوئی تعطیل کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید منتظمینِ جلسہ انتظامِ مہمانداری میں ہمت ہار جاتے، معزز شرکاے جلسہ میں علما میں سے مولوی مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی، مولوی شاہ ابو الخیر صاحب غازی پوری، مولانا ذاکر حسین صاحب، مولوی ابن حسن صاحب مجتہد العصر، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولوی نظام الدین صاحب جھجری، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب استاد حضور نظام، (مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی) اور اربابِ وجاہت میں سے جناب آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، جناب سر راجہ صاحب جہانگیر آباد، نواب وقار الملک، کرنل عبد المجید خاں فارن منسٹر پٹیالہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، شیخ عبد القادر بیرسٹر، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب

رئیس علی گڈھ، خان بہادر سید جعفر حسین صاحب مولوی محمد حسین صاحب مقیم رئیس بمبئی، بابو نظام الدین رئیس امرتسر، حاجی شمس الدین صاحب سکریٹری حمایت اسلام لاہور، مرزا ظفر اللہ خانصاحب سب جج جالندھر، شیخ سلطان احمد رئیس ہوشیار پور، خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر، راجہ نوشاد علی خاں صاحب صفی الدولہ نواب علی حسن خاں لکھنؤ، حافظ نذر الرحمان صاحب رئیس عظیم آباد جلسہ میں شریک تھے،

تین بجے سے ذرا پہلے تمام لوگ با اسلوب بیٹھ گئے۔ اور ارکان انتظامیہ ندوہ ہز آنر کے استقبال کے لئے لب فرش دورویہ صف باندھ کر کھڑے ہوئے۔ کمشنر صاحب لکھنؤ نے سکریٹری دار العلوم (شبلی نعمانی) کو لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا، اور پھر سکریٹری موصوف نے تمام ارکان انتظامیہ کا ایک ایک کرکے لفٹنٹ گورنر سے تعارف کرایا، اوّل دار العلوم کے قاری نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ہز آنر سے ایڈریس پڑھنے کی اجازت طلب کی، مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی نے ایڈریس پڑھا، ہز آنر نے نہایت خوش لہجگی اور صفائی سے ایڈریس کا جواب دیا، مولوی خلیل الرحمن صاحب نے عربی ایڈریس جو ساٹن پر چھپا ہوا تھا، زریں کارچوبی خریطہ میں رکھکر پیش کیا، ہز آنر نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر اڈیکانگ کے حوالہ کیا، پھر سنگِ بنیاد نصب کرنے کے لئے تشریف لے گئے، اور مولوی شاہ ابوالخیر صاحب، کرنل عبد المجید خاں صاحب، آنریبل راجہ صاحب محمود آباد نواب وقار الملک، حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس کان پور، نواب علی حسن خاں صاحب رئیس بھوپال، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، منشی اظہر علی صاحب بی اے وکیل لکھنؤ، حکیم عبد العزیز صاحب، حکیم عبد الولی صاحب، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل، اور مولوی [illegible] شروانی ان کے ساتھ گئے

سنگِ بنیاد کے نصب کرنے کے وقت دوبارہ قاری صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت کی، واپسی کے وقت ارکانِ انتظامیہ نے موٹر کار تک مشایعت کی، اور یہ دلفریب تماشہ ختم ہوگیا"

عجیب حسنِ اتفاق ہی، ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم لکھنؤ کا **فرنگی محل** تھا، جو درس نظامیہ کا بانی ہے، اور جس کے دامنِ فیض سے مولانا بحرالعلوم، ملا محمد اللہ، ملا حسن وغیرہ تعلیم پاکر نکلے یہ فرنگی محل اس لئے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی، اور اس لئے محل اس کی طرف منسوب ہوگیا تھا، شاہ عالمگیر کی سند میں یہ نام درج ہی، اس جدید دارالعلوم کی بنیاد ہنر آنر لفٹنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہلِ فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب نے اس موقع پر اس حسنِ اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں:۔

رکھی بنائے ندوہ ہز آنر نے آکے خود ۔۔۔ سچ پوچھئے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

لکھنؤ کی سرزمین میں مدرسہ کے نام سے یہ سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی تھی، اس واقعہ کو سامنے رکھ کر مولانا نے قرآن پاک کی ایک آیت سے جس میں خانہ کعبہ کو سب سے پہلا گھر فرمایا گیا ہے، یہ قطعہ تاریخ موزون فرمایا،

ملت ایں مدرسۂ تازہ چو بنیاد نہاد ۔۔۔ کہ در و خلق ز ہر ناحیتے مجتمع است

قدسیاں از سرِ الہام بہ شبلی گفتند ۔۔۔ سال و تاریخ بنا اوّل بیتٍ وضع است

سنہ ۱۳۲۵ھ

سنگِ بنیاد کی رسم بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی، تمام معزز رؤسا، حکامِ ضلع اور علماء و فضلا شریکِ جلسہ تھے، اس موقع پر ارکانِ ندوہ کی طرف سے جناب ہز آنر کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، وہ گو پڑھا انگریزی زبان میں گیا، جس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی

شبلی ہوسٹل، بڑے طلبہ کا دارالاقامہ

چھوٹے طلبہ کا دارالاقامہ
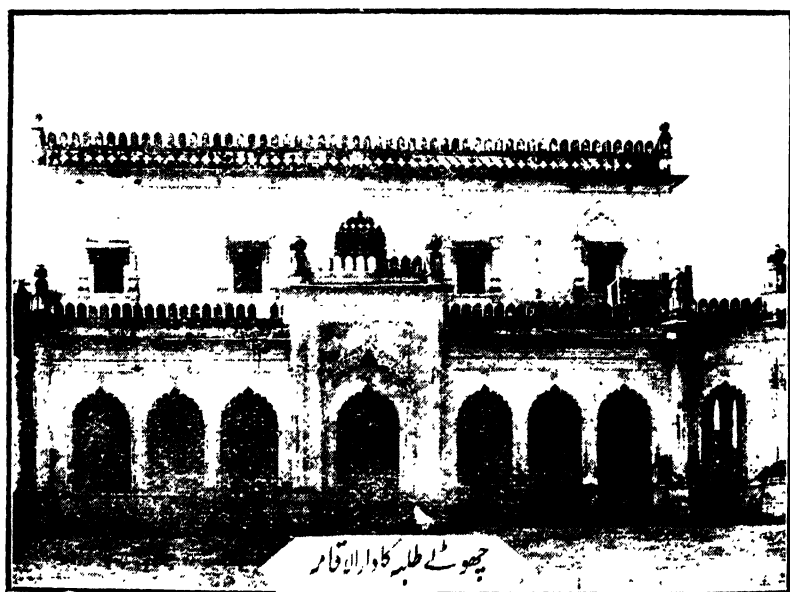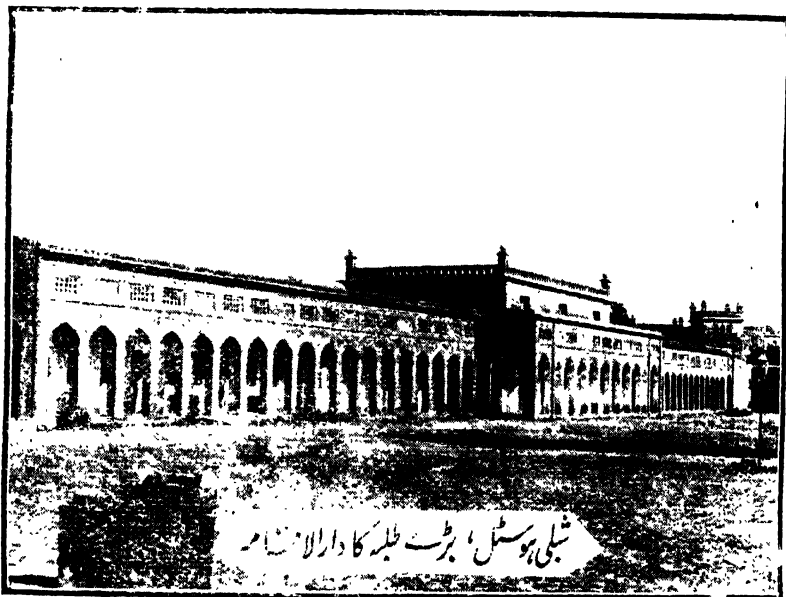
شامل تھا، مگر اصل سپاسنامہ عربی زبان میں تھا،

لطیفہ:۔ اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، لفٹنٹ گورنر کے انتظار میں ندوہ کے ارکان دو رویہ کھڑے تھے، پروگرام یہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر مولانا کا تعارف گورنر صاحب سے اور مولانا ارکان کا تعارف گورنر صاحب سے کرینگے، ابھی وہ نہیں آچکے تھے، اور ارکان انتظار میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، مولانا شروانی نے مولانا سے فرمایا کہ جس ترتیب سے ہم لوگ کھڑے ہیں اسی ترتیب سے ہمارے نام لکھ کر سامنے رکھ لیجئے، علی گڈھ میں ایک ایسا موقع آیا تو نواب وقارالملک نام بھول گئے، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ اب آپ لوگوں کے نام میں بھول جاؤں گا، اتفاق دیکھئے کہ جب گورنر آئے اور مولانا نے ایک ایک کے سامنے جاکر تعارف شروع کیا تو شاہ سلیمان صاحب کے پاس آکر اُن کا نام بھول گئے، شاہ صاحب نے خود اپنا نام بتایا، اس پر بعد کو بڑی ہنسی ہوئی،

ندوہ کا جلسۂ سالانہ ۱۹۰۸ء

جلسۂ سنگِ بنیاد کے دوسرے دن ۲۹ و ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا، پہلے جلسہ کے صدر جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ہوئے، اُن کی تقریر صدارت کے بعد مولانا نے اپنا وہ نوتصنیف فارسی قصیدہ جو اسی جلسہ کے لئے لکھا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کا مطلع ہے:۔

اے کہ نیرنگِ سراپردۂ عالم دیدی | جاہِ کیخسرو و فرِ حشمِ جم دیدی

قصیدہ کیا تھا تاثیر کا ایک اُمنڈتا ہوا سیلاب تھا، جو دلوں کے ساحل سے جاکر ٹکراتا تھا، آہ و بکا اور شور و تحسین کے نعروں کے درمیان وہ ختم ہوا، اس کے بعد گورنر کے عطاے زمین

اور رئیسہ عالیہ بہاولپور کے شاہانہ عطیہ کے شکریہ کی تجویزیں منظور ہوئیں، اور پہلا اجلاس ختم ہوا،
ظہر کے بعد دوسرا اجلاس ہوا، جس میں حاضرین کے اصرار سے مولانا نے اپنا قصیدہ دوبارہ پڑھا،
قصیدہ کی کاپیاں جو ندوہ کی طرف سے چھپوائی گئی تھیں لوگوں نے ایک ایک روپیہ
میں ہاتھوں ہاتھ لیں، اور جناب نواب سید محمد علی حسن خاں بہادر نے تیس روپے میں ایک
کاپی خرید فرمائی، اس کے بعد جناب سیٹھ محمد حسن مقبہ رئیس بمبئی نے جو خود بھی عربی جانتے تھے
طلبہ کا امتحان لیا، اور اردو کی ایک ایسی عبارت ترجمہ کے لئے دی جو جدید قانونی اور
تمدنی الفاظ سے بھری ہوئی تھی، چار طالب علموں نے اسی وقت نہایت فصیح و بلیغ عربی
میں ترجمہ کر دیا، اس کے بعد ایک طالب علم نے عربی میں نہایت شستہ رفتہ تقریر کی،
جس پر تمام حاضرین نے تحسین و آفرین کی، مولانا نے وقت کی موزونیت کو سمجھ کر دار العلوم
کی خصوصیات پر ایسی مؤثر تقریر فرمائی کہ لوگوں نے تعلیم اور تعمیر کے لئے چندے لکھوانے
شروع کر دیئے،

اس جلسہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڈھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خاں،
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے کسی جلسہ
میں شریک نہیں ہوئے تھے شریک اجلاس ہوئے، رات کو ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب
نے بطلیموسی اور فیثا غورثی نظام فلکی پر مبسوط لکچر دیا، اور تمام علمی تجربات دکھائے، اور
اس کے بعد پروفیسر شرف الدین مراد نے طبیعیات و برقیات کے بعض مسائل پر میجک
لینٹرن کے ذریعہ سے تقریر کی جس سے علماء کو جدید سائنس کی بعض تحقیقات کا علم ہوا،

دوسرے دن ندوہ کا تیسرا اجلاس ہوا، اس کے صدر شمس العلما مولانا ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری ہوئے، اس جلسہ مین سب سے پہلے مولوی عبدالودود صاحب ندوی نے جو انجمن تقویۃ الایمان ٹونک (راجپوتانہ) کی طرف سے آئے تھے، آریہ، مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی جو کوشش وہاں کر رہے تھے اس کی تفصیلات بیان کیں، اس کے بعد مولانا نے دارالاقامہ کے لئے ہندوستان کے ہر شہر سے ایک ایک کمرہ بنانے کی تجویز پیش کی، اور اس تجویز کو پیش کرتے وقت دین و دنیا کے تعلقات پر ایک جامع تقریر فرمائی، اصل تجویز کی تائید مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے کی، اور اسی وقت چند کمروں کے لئے لوگوں نے چندے لکھوائے، اس کے بعد منتظمین کے شکریہ پر جلسہ ختم ہوا، اور لوگ یہ کہہ کر رخصت ہوئے،

"خواب خوشی دیدم[1] و دیگر میرس"

وقف علی الاولاد کی کارروائی کا آغاز بھی ندوہ کے اسی اجلاس سے ہوا، اور مولانا کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ علماء سے اس بارہ میں فتوے طلب کئے جائیں،

دارالاقامہ کا خیال | دارالعلوم کی عمارت جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی، مولانا اس کے لئے ایک دارالاقامہ کی تعمیر کی تحریک کو جس کی تجویز جلسہ مین منظور ہو چکی تھی آگے بڑھا رہے تھے، ایک کمرہ کا تخمینہ سات سات سو روپیہ قرار دے کر احباب سے اور دوسرے دردمندوں سے ایک ایک کمرہ کا چندہ وصول کرنا شروع کر دیا، دلی اور لکھنؤ کے اجلاسوں میں بہت

---

[1] منقول از روداد دوازدہم اجلاس دہلی سنہ ۱۹۰۰ء صفحہ ۵۵ و ۵۶،

اہلِ خیر نے ایک ایک کمرہ کی تعمیر کا وعدہ کیا، اور بہت سے لوگوں نے اپنے وعدے پورے بھی کئے، ان میں پہلا نام تو خود مولانا کا ہے، دوسرا حکیم عبدالولی صاحب مرحوم جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا ہے، ان کے علاوہ شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور نواب رستم علی خاں صاحب رئیس کرنال کے نام ہیں، نواب مزمل اللہ خاں نے لکھا کہ وہ مولانا کی تصنیفات کی یادگار میں ایک کمرہ بنوائیں گے، لیکن مولانا نے اُن کے اس چندہ کو دارالمصنفین کی تعمیر کے لئے مخصوص کرنے کی تجویز اُن کے سامنے پیش کی۔[1]

بیگم صاحبۂ جنجیرہ (بمبئی) نے جن کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانہ سے تھے، جولائی ۱۹۰۹ء میں ایک کمرہ کے لئے ایک ہزار روپیہ بھیجا، اُس کے شکریہ میں مولانا نے یہ قطعہ اُن کو لکھ کر بھیجا۔

مشغولِ کار بِ مدرسہ بودم کہ ناگہاں ۔۔۔ دیدم کہ نامہ ہا زِ ہر سو ہم رسیدہ است

زاں جملہ ہست نامۂ بے نقش و بے سواد ۔۔۔ کز بارگاہِ حضرتِ بیگم رسیدہ است

از جائے جستم و بگرفتم بدستِ شوق ۔۔۔ گویا کہ خستہ ایست بہ مرہم رسیدہ است

بر سر نہادم و بہ ادب بوسہ دادمش ۔۔۔ مانند تشنہ کہ بہ زمزم رسیدہ است

ہر از سرش گرفتم و از جا در آمدم ۔۔۔ چوں دیدم این کہ کاغذ زرہم رسیدہ است

نازم کہ ایں عطیۂ[2] فیضِ امیرہ ایست ۔۔۔ کآوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

---

[1] بحوالۂ الندوہ [2] اس شعر میں نازلی بیگم، عطیہ بیگم اور امیرہ بیگم کی طرف اشارہ ہے، جو اس خاندان کی محترم خواتین ہیں،

بھوپال کی امداد میں اضافہ ۱۹۰۹ء

سرکاری امداد سے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے موازنہ میں جو عدم توازن پیدا ہوگیا تھا، اس کے دور کرنے کے لئے مولانا پوری کوشش میں مصروف تھے، کبھی دورہ کرتے تھے، کبھی حیدرآباد کا خیال کرتے تھے، (سلیمان ۲۳)

منشی محمد امین صاحب بھوپال کو ۷ فروری ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں: "آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دو سو ہے، گورنمنٹ نے پانچ سو دیئے، اس لئے اب خالص مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلہ میں بہت کم قیمت رہ جاتا ہے، ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو، ریاست حیدرآباد سے پانچسو کا وعدہ ہو چکا تھا، لیکن اس حالت میں کہ ریاست پر کئی کروڑ کا بار پڑ گیا جو کئی سال تک قائم رہیگا زبان نہیں کھل سکتی۔" (۳) آخر کامیابی کی بجلی بھی اُسی افق سے چمکی جدھر سے امید کی پہلی شعاع نظر آئی تھی، یہ وہی نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کا دست کرم تھا، سرکار عالیہ نے اس ضرورت کو سننے کے ساتھ اپنے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد کو پنجگونہ کر دیا یعنی از خود دو سو روپیئے ماہوار کا اضافہ کرکے ڈھائی سو کر دیا، یہ وہ احسانِ عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خوددار شاعر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گذاری کو ایک قصیدہ کی صورت میں ظاہر فرمائیں، چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدحیہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

خسرو کشور بھوپال بما آں کردہ است — انچہ با دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است

ناشکر گذاری ہوگی اگر اس سلسلہ میں منشی محمد امین صاحب زبیری لٹریری سکریٹری سرکار عالیہ و مہتمم صیغۂ تاریخِ بھوپال کا نام نہ لیا جائے، جن کی سعیِ خیر سے یہ کام انجام پایا تھا، مولانا نے منشی صاحب کے ایک خط میں خود اس کا اقرار کیا ہے، لکھتے ہیں: "واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور نہ ندوہ کو ریاست سے

ہ الندوہ ستمبر ۱۹۰۹ء

جو فوائد پہنچ رہے ہیں اُسکے سنگ بنیاد آپ ہیں"۔ (امین۔ ز)

ریاست رامپور کی امداد ۱۹۱۰ء دوسرے سال ایک اور اسلامی ریاست نے امداد کا ہاتھ بڑھایا، ہز ہائینس نواب حامد علی خاں صاحب فرمانروائے رام پور سے مولانا کے روابط بہت پرانے تھے، مگر ان کی تجدید غالباً جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے توسط سے اب ہوئی، اور شاید اُن ہی کی سفارش سے ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب ممدوح نے پانچسو روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی، جو مولانا کی معتمدی تک برابر ملتی رہی،

درسگاہ کی تعمیر کا کام سنگِ بنیاد کے بعد دار العلوم کی مجوزہ عمارت کا نقشہ خان بہادر میر جعفر حسین صاحب انجینیر (لکھنؤ) نے جو علی گڈھ تحریک کے علمبرداروں میں تھے نہایت محنت سے تیار کیا، اور ۲ مئی ۱۹۰۹ء کو جلسۂ انتظامیہ نے شکریہ کے ساتھ اُس کو منظور کیا، یہ نقشہ اس قدر خوبصورت، موزوں اور جامع حیثیات تھا کہ سب نے بے ساختہ داد دی، بیچ کا کمرہ اتنا وسیع کہ ایک ہزار کرسیوں کی گنجائش ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ ۱۳ کمرے، ارکان کی طرف سے تعمیر کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کے سکریٹری منشی محمد احتشام علی صاحب رئیسِ کاکوری مقرر ہوئے منشی صاحب موصوف کی نگرانی میں سید ہادی صاحب اوورسیر (لکھنو) نے اُسی کے بعد عمارت بنوانی شروع کی، اور ۱۹۱۳ء تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا،

تفسیر کے کمرہ کی بنیاد مدرسہ کی زمین کا یہ منظر مولانا کی بہترین امیدوں کا گہوارہ تھا، وہ اس گہوارہ کو دیکھنے اکثر تشریف لے جاتے تھے، ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو مولوی ابو الکلام صاحب کو لکھتے ہیں:۔[1]

"دار العلوم کی تعمیر شروع ہو گئی، عجب مست اور فرحت انگیز موقع ہے، روز دیکھنے کو جی چاہتا ہے، سینہ

[1] الندوہ اپریل ۱۹۰۹ء

کے لحاظ سے مدرسۃ العلوم کو اس سے کوئی نسبت نہیں"۔ (۳)

۱۰ ارجنوری ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں :۔ " عمارت اب اس حالت تک پہنچ گئی ہے کہ نہایت تفریح ہوتی ہے، اور جی چاہتا ہے کہ وہیں رہا کیجئے۔ حالانکہ صرف کمر کمر تک دیواریں آئی ہیں، تم دیکھ کر لطف اٹھاؤ گے"۔ (حمید، ۴)

جب دیواریں تھوڑی اور بلند ہوئیں اور کمروں کے نشان ظاہر ہوئے تو فروری ۱۹۱۰ء میں فرط جوش میں ایک دن تمام طلبہ اور اساتذہ کو لے کر اس زمین پر گئے اور فرمایا " مدرسہ کی ظاہری بنیاد تو ایک حاکم وقت نے رکھی، اب آؤ مدرسہ کی حقیقی بنیاد ہم رکھیں، اس پُر اثر منظر کی تصویر خود مولانا کے قلم نے کھینچی ہے، مناسب ہوگا کہ وہ اس موقع پر آپ کی نظر سے بھی گذر جائے :۔ " ارباب دولت کو تو ندوۃ العلما کی عظمت و شان کا تماشا اُس وقت نظر آیا ہوگا جب ہز آنر نے دار العلوم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا، لیکن جو لوگ مذہبی خلوص کے دلدادہ ہیں، ان کے دل اس رسم کی ادائیگی کی خبر سن کر ہل جائیں گے جو اسلامی سال نو کے آغاز اور مقدس دن (جمعہ) کو ادا ہوئی، یکم محرم ۱۳۲۸ھ روز جمعہ کو تمام طلباے دار العلوم اس مقام پر جہاں دار العلوم کی جدید عمارت تعمیر ہو رہی ہے اس قدیم مذہبی خدمت کو انجام دینے کے لئے جمع ہوئے جو اُن کا آبائی شعار ہے، دار العلوم کی تمام عمارت اگرچہ بجائے خود ایک علمی اور مذہبی عمارت ہے، لیکن اسلامی علوم میں علم تفسیر تمام علوم دینیہ کا سرتاج ہے، اس لئے جو کمرہ خاص فن تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا ہے طلباے دار العلوم ندوہ نے اس کے پاس جا کر تمام مزدوروں کو ہٹا دیا، اور خود اپنے ہاتھ سے چونہ، گارا، اینٹیں لا کر ڈھیر کرنی شروع کیں، معمار کام بناتے جاتے اور لڑکے اُن کو مصالحہ دیتے جاتے تھے، وہ حالت خاص اثر رکھتی تھی، جب مصالحہ گھٹتا تھا، اور کم حیثیت معمار

معزز خاندانی لڑکوں کو تحکم کے لہجہ میں ڈانٹتے تھے، کہ مصالحہ پورا نہیں پہنچتا، جلد کام کرو، خاکسار شبلی بھی اس رسم میں شریک تھا، اور اینٹ اٹھا اٹھا کر معماروں کو دیتا تھا، جب یہ رسم ادا ہو چکی تو میں نے دار العلوم کے مقاصد و اغراض کے متعلق ایک تقریر کی، جس کی ابتدا دعا سے ہوئی اور دعا پر ختم ہوئی، تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ اے خدا! یہ چند ناتواں، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سخت سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لئے جاتا ہے جس کے ساتھ انکی مذہبی حالت، مذہبی (علوم[1]) مذہبی شعائر سب اس طوفان کی زد میں ہیں، اے خدا! ان چند ناتواں بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جو کسی طرح اُن کے چہرے پر نہیں کھلتا، تو ہی ہے جو اُن کی آبرو رہ جائے،

یہ ایک ایسی شاندار رسم تھی، یہ ایک ایسا موثر منظر تھا، جہاں دار العلوم کے تمام مقاصد و اغراض محسوس صورت میں نظر آتے تھے، طلبہ کو نظر آتا تھا کہ اُن کی زندگی کا آخری مقصد کیا ہے، وہ جس شاہ راہ پر جا رہے ہیں، اس کی انتہائی منزل کہاں ہے، ان کو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب کا روحانی اثر کس قدر قوی ہے، ان کو محسوس ہوتا تھا کہ کون سا پُر زور ہاتھ اُن کو ڈھکیل رہا ہے؟

دار التفسیر کی یہ بنیاد تعمیر اور اس موقع پر اُن کی یہ ولولہ انگیز تقریر اُن کے اصلی جذبات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ کن امیدوں کے ساتھ ندوہ اور دار العلوم کی خدمت میں لگے ہوئے تھے، اس عمارت کی ہر اینٹ اُن کی امید و آرزو کی ایک لوح تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بھری ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے، کبھی دوسروں کو لے جاتے،

اسی ناتمکمل عمارت میں سنہ ۱۹۱۰ء میں ہز ہائینس سر آغا خاں کی آمد پر ایک نہایت شاندار

[1] اصل میں زبانیں ہے، مراد علوم ہیں

جلسہ کیا اور ۱۹۱۲ء میں جب اُس کا ہال پورا ہو چکا تھا، سید رشید رضا کی آمد پہ ندوہ کا عظیم الشان سالانہ جلسہ پھر اُسی میں منعقد کیا، تاکہ عام مسلمان امید کے اس نخلستان کو دیکھ لیں،

یہ افسوس کی بات ہے کہ سلسلۂ تعمیر میں مولانا اور منشی صاحب میں ایک اختلاف پیدا ہوا جو بڑھتا ہی گیا، مولانا یہ چاہتے تھے کہ جتنا سرمایہ ہمارے پاس ہے اسی کی حیثیت سے تعمیر کو مکمل کر دیا جائے، اور منشی صاحب موصوف جو بڑی مستعدی اور محنت سے عمارت کے بنوانے میں مصروف تھے اُن کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ مدرسہ بنے تو نقشہ کے مطابق ہر حیثیت سے مکمل بنے، کام تین چار برس تک جاری رہا، بالآخر وہ پچاس ہزار ختم ہو گئے، مدرسہ کا پہلا مکان شاید نو دس ہزار میں بکا، وہ بھی خرچ ہوا، مستقل فنڈ بھی تمام ہو گیا، ندوہ کے قبضہ میں ایک آدھ کرایہ کا سکونتی مکان تھا، وہ بھی بک گیا، مگر تعمیر تکمیل کو نہیں پہنچی، ۲۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "یہ مکان بک گیا اب بھی دیکھیے عمارت پوری ہوتی ہے یا نہیں، نواب غلام احمد[1] مدراس سے آئے تھے، ان کو عمارت دکھائی ان کے اندازۂ تخیل سے باہر تھی، بہت خوش ہوئے"۔

افسوس کہ مولانا کی زندگی میں ان کے خوابِ تمنا کی تعبیر نہیں نکلی، آخر اسی ناتمام عمارت میں مولانا کی علٰحدگی کے بعد اور وفات سے پہلے ۱۹۱۴ء میں دار العلوم اٹھ کر چلا آیا،

مدرسہ میں سر آغا خاں کی آمد اور ۵۰۰ سالانہ کی امداد ۱۹۱۰ء

اس زمانہ میں مسلم لیگ، اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں کے سبب سے ہز ہائینس سر آغا خاں ہندوستانی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے، اخیر جنوری ۱۹۱۰ء

---

[1] نواب غلام احمد خاں کلامی مدراس کے ایک پرانے قومی خادم ہیں، اب بوڑھے ہو چکے ہیں، پھر بھی ریاست میسور کی اسمبلی میں غیر برہمنوں کے لیڈر ہیں، ندوہ کے قدیم بہی خواہ اور معین و مددگار ہیں،

میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں جسمیں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے، مولانا کی ملاقات سرآغاخاں سے ہوئی، موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کئے، اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں جس کو انھوں نے منظور کیا، چنانچہ ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو وہ لکھنؤ آئے اور ۲ فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو دارالعلوم کی جدید عمارت کے زیر تعمیر ہال میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا، ہال کو دارالعلوم کے ایک ممتاز طالب علم نے جن کے حسنِ اہتمام وانتظام کو اب ایک دنیا مانتی ہے، مگر اس وقت تک صرف مولانا ہی مانتے تھے یعنی مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے نہایت خوبی سے سجایا تھا، تقریباً پانچ سو چیدہ اصحاب کا مجمع تھا جن میں آنریبل راجہ علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد، آنریبل راجہ تصدق رسول خاں تعلقدار جہانگیر آباد، راجہ شعبان علی خاں، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے،

ہز ہائینس ٹھیک ۱۲ بجے تشریف لائے، طلبہ نے جن کی دورویہ قطاریں سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھیں، "مرحبا، مرحبا" کا زور غلغلہ بلند کیا، ہز ہائینس ہال میں تشریف لا کر صدر میں بیٹھے پہلے دارالعلوم کے ایک طالب علم نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر مولانا نے فارسی میں اڈریس پڑھا، جو الندوہ میں اور مقالاتِ شبلی کے سلسلہ میں چھپا ہوا ہے، چونکہ ہز ہائینس کا اصل مقصد طلبہ کے خیالات ومعلومات کا اندازہ کرنا تھا، اس لئے جناب ممدوح نے طلبہ کو بلا کر ان کو تقریر کا موقع دیا، اور بعض طلبہ کے لئے خود تقریر کا موضوع متعین کر دیا، طلبہ نے نہایت شستہ اور فصیح عربی میں تقریریں کیں، خاکسار کی تقریر کا موضوع تھا "علما کو جدید فلسفہ

سیکھنا کیوں ضروری ہے؟" یہ عربی تقریر لکھنؤ کے عربی رسالہ "البیان" میں چھپی ہے، آخر میں ہز ہائینس
نے کھڑے ہوکر نہایت فصیح فارسی میں برجستہ تقریر کی جس میں دارالعلوم کے مقاصد اور تعلیم کی تعریف
کی، اور فرمایا کہ ندوہ کی تعلیم کے سلسلے تمام ہندوستان میں پھیلنے چاہئیں، تاکہ مذہبی گروہ میں یہ روشنخیالی
پیدا ہو جائے، یہ بھی فرمایا کہ طلبہ کو جدید تعلیم کی تکمیل کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا چاہئے،
اور جس طرح یہودی اور عیسائی پیشوایانِ مذہب علومِ جدیدہ کو مذہب کی حمایت کے لئے سیکھتے ہیں
علمائے اسلام کو بھی اسی طرح سیکھنا چاہئے تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اپنا مذہبی اثر ڈال سکیں اور ان کی
رہبری کرسکیں، آخر میں فرمایا کہ میں ہمیشہ ندوہ کا معین و مؤید رہوں گا، اور پانچ سو سالانہ کی امداد منظور کی
آخر میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے ہز ہائینس کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور
فرمایا کہ ہم کو ہز ہائینس جیسے لوگ درکار ہیں، جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا سکیں، اسی پر
جلسہ کا خاتمہ ہوا، [1]

اجلاسِ دہلی ۱۹۱۰ء ندوہ کے سالانہ اجلاس گو امرتسر سے لیکر کلکتہ اور مدراس تک بڑے بڑے شہروں
میں ہو چکے تھے، مگر ہنوز ہندوستان کا پایۂ تخت اس شرف سے محروم تھا، مولانا نے وقف علی الاولاد
کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے اجلاسِ دہلی میں شرکت کے لئے جو سفر کیا اسی سفر میں جنوری ۱۹۱۰ء
میں دہلی میں جناب حکیم اجمل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہیں یہ طے پایا کہ ندوہ کا آئندہ
سالانہ جلسہ دہلی میں ہو، اور اس کے لئے ۱۴-۱۵-۱۶ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۶-۲۷-۲۸
مارچ ۱۹۱۰ء کی تاریخیں مقرر کی گئیں اور تیاریاں شروع ہوئیں،

---

[1] الندوہ مارچ ۱۹۱۰ء مطابق ربیع الاول ۱۳۲۸ھ۔

اس جلسہ میں مخالفین نے ایک ہنگامہ یہ برپا کیا کہ مولانا نے اس جلسہ کے سلسلہ میں الندوۃ کے ایک شذرہ میں لکھدیا تھا کہ "اس جلسہ میں شاید مولانا حالیؔ اور مولانا نذیر احمد صاحب بھی علما کے پہلو بہ پہلو شریک ہوں، اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ جدید تعلیم کے امیرِ العسکر قدیم جماعت کے علماء کی صف میں دوش بدوش نظر آئیں" (الندوہ ص۳ فروری سنہ ۱۹۱۰ء) اُن دنوں مولوی نذیر احمد صاحب نے "اُمہات الامۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کی زبان نہایت سوقیانہ تھی، جس کو پڑھکر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی، اور اس لئے ان کے خلاف دہلی میں خاصی شورش برپا تھی، ندوہ میں اُن کی شرکت کی خبر نے خود ندوہ کے اجلاس کو موردِ اعتراض بنا دیا، ارکانِ ندوہ نے بلکہ درحقیقت حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مولوی نذیر احمد صاحب اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ کتاب کے نسخے ان لوگوں کے سپرد کردیئے جائیں، اور آیندہ اسکی اشاعت بند کردی جائے، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ نسخے فریقِ مخالف کے پاس بھیجدیئے لیکن مولانا نذیر احمد صاحب نے خود اس بات پر اصرار کیا کہ یہ کتابیں فریقِ مخالف کے قبضہ میں بھی نہ رہیں، بلکہ جلا کر ناپید کردی جائیں، شاید مولوی صاحب کو اس کا خطرہ ہو کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کی کتاب سے کوئی دوسرا نفع اٹھائے، بہرحال اُن کی اس پر اصرار خواہش کے مطابق کتاب کے موجودہ نسخوں کو ایک مجمع میں جس میں ندوہ کے ارکان بھی تھے نذرِ آتش کردیا گیا، اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقیِ اردو نے اپنے مقدمۂ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف "بواسطہ یا بلا واسطہ" بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کرکے ایک تاریخی جرم کیا ہے، حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے، مولانا شروانی صاحب نے

جو شریکِ جلسہ تھے، مقدمۂ مقدماتِ عبدالحق (ص۵) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھدی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت مین کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں،

بہرحال یہ جلسہ جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے زیر اثر اوران ہی کی صدارت میں بہت دھوم دھام سے عربک کالج کے میدان میں ہوا، دور دور سے مہمان آئے تھے حسب دستور طلبہ امتحان کے لئے پیش ہوے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور مولوی قمرالدین مرحوم سے حاضرین نے یہ خواہش کی کہ "اربابِ دہلی نے ندوہ کا یہ اجلاس جس خوش اسلوبی اور فیاضی سے کیا ہے اُس کا حال عربی میں لکھ کر پیش کریں، ان دونوں نے چند منٹ کے اندر بہترین فصیح عربی میں اس واقعہ کو قلمبند کرکے پیش کردیا، اس کے بعد ندوہ کے درجۂ تکمیلِ ادب کے طالب علم مولوی خواجہ عبدالواحد صاحب ندوی (جو بعد کو "الہلال" کلکتہ میں شریکِ ادارت ہوے اوراب ایم اے ہوکر کانپور میں پروفیسر کالج ہیں) نے عربی میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک ایسی برجستہ تقریر کی کہ علما، جو اس قسم کی تقریروں کے خاص مخاطب تھے اُن کی یہ حالت تھی کہ وجد میں آکر جھومتے تھے، اور اُن کی زبان سے بیساختہ تحسین آمیز کلمات بلند ہوتے تھے[1]، شیخ عبدالحق صاحب حقی بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڈہ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک اہلِ زبان اور معلمِ ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں، انھوں نے عربی کی ایک فصیح وبلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبہ کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ طلبہ کی عربی تحریر و تقریر نے جاہلیتِ عرب کے سوقِ عکاظ کا سماں پیدا کردیا جسکو میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا[2]

[1] روداد دہلی ص۱۲۹
[2] الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء مضمون نوشتہ مولانا ابوالکلام دہلوی

مولانا نے اس زمانہ میں تبلیغ اور ردِ آریہ کے خیال سے "بھاشا" کی تعلیم کا ایک درجہ ندوہ میں کھولا تھا، سید امداد حسین صاحب ہوشیارپوری طالب علم ندوہ نے اعیانِ بھاولپور کی خواہش پر ہندی بھاشا میں ایسی عمدہ تقریر کی کہ لوگوں کو شبہہ ہو گیا کہ یہ کوئی نومسلم ہندو ہے، لڑکا نہایت گورا چٹا اور بلند قامت تھا، بدگمانی کرنے والوں نے سمجھا کہ یہ کوئی کشمیری برہمن ہے، چنانچہ اس خیال کے ازالہ کے لئے اُس سے قرآنِ پاک پڑھنے کی فرمایش کی گئی، اتفاق یہ کہ اُس کی آواز بھی اچھی تھی، اُس نے ایک خاص پُردرد لہجہ میں سورۂ رحمان کی تلاوت شروع کی تو سماں بندھ گیا، اور اُس پر انعامات کی بارش شروع ہو گئی،

چند طالب علم انگریزی میں تقریر کرنے کے لئے بھی تیار تھے، مگر مولانا کو خیال ہوا کہ شاید عربی خواں طلبہ کی زبان سے لوگ انگریزی تقریر پسند نہیں کریں گے، اس لئے انھوں نے اس بارہ میں حاضرین کی رائے دریافت کی، لوگوں نے شوق کے ساتھ اجازت دی، اس پر سید محمد صاحب خواجہ بی اے ہو چکے ہیں، اور عبدالمجید نے جو دار العلوم کے منتہی طالب علم تھے محاسنِ اسلام پر انگریزی میں تقریریں کیں، ان تقریروں میں اگرچہ صحتِ مخارج اور انشا پردازی کے لحاظ سے بہت کچھ خامیاں تھیں جن کو ریمارک کرتے وقت شیخ (سر) عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے ظاہر کر دیا، تاہم جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ یہ صرف ایک سال کی باقاعدہ تعلیم کا نتیجہ ہے تو انھوں نے اس تعلیم کے مستقبل کی نسبت اپنا اطمینان ظاہر فرمایا،

طلبہ کی ان تقریروں اور تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ ہر طرف سے چندہ کی بارش ہونے لگی اور اس جلسہ کے متعلق یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ یہاں جو کچھ کامیابی ہوئی وہ تمام تر طلبہ کی لیاقت کا نتیجہ

مولنا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پُر زور تقریر کی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے،

اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز مجلس اشاعتِ اسلام کا قیام تھا، اور جس کے لئے یہ زمانہ نہایت موزوں تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اسی اجلاس میں دوسرے دن میں نے ایک کتبخانۂ اعظم کی تجویز پر تقریر کی، اور دارالمصنفین کا خاکہ پہلی دفعہ پیش کیا گیا، دوسری تجویز قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کے متعلق پیش ہو کر منظور ہوئی، اور تیسری تجویز انگریزی کورس کی اُن غلطیوں کی اصلاح کے متعلق منظور ہوئی جن سے اسلام اور تاریخِ اسلام کے متعلق بدگمانی پھیلتی ہے، اس صیغہ کا نام صیغہ تصحیحِ تاریخِ اسلام رکھا گیا، اور خاکسار اُس کا سکریٹری منتخب کیا گیا، ایک اور تجویز جدید عربی کے لغت کی ترتیب کی منظور ہوئی، اور یہ کام بھی خاکسار کے سپرد ہوا،

حکیم صاحب مرحوم کی دلپذیر تقریر پر اس تاریخی اجلاس کا خاتمہ ہوا،

ندوہ کا اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء سید رشید رضا مصری کی صدارت

۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا وہ عظیم الشان اجلاس ہوا جس کو معنوی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا سب سے کامیاب اجلاس کہا جا سکتا ہے،

ان دنوں مولانا جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا جواب عربی میں لکھ رہے تھے اور اس کے کچھ اجزا، سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس مصر بھیجے، جس سے مابین خط وکتابت کی تازہ تقریب پیدا ہو گئی، سید موصوف اس زمانہ میں مصر میں "دارالدعوۃ والارشاد" کے نام سے جدید طرز کا ایک مذہبی مدرسہ قائم کر رہے تھے، اس سلسلہ میں بھی دونوں میں خط وکتابت ہو رہی تھی، ادھر ندوہ کے مجوزہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی جس میں تبلیغ کے مسئلہ پر پوری بحث ہونے والی تھی، ان گوناگوں مناسبتوں سے مولانا نے سید موصوف سے تحریک کی کہ وہ ہندوستان آکر ندوہ کے

اس اجلاس کی صدارت کریں، موصوف نے اس کو قبول کیا، یہ دو اسلامی ملکوں کی مذہبی، تعلیمی وتبلیغی کوششوں کا سب سے پہلا اتحاد تھا، جس کی خبر ہندوستان میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا، اس وقت لارڈ کرومر مصر میں برطانی سفیر تھے، سید موصوف نے اُن سے خاص طور سے اجازت لے کر ہندوستان کا سفر کیا، جس کے معنی یہ تھے کہ برٹش گورنمنٹ کو اُن کی آمد پر کوئی اعتراض نہ تھا،

سید موصوف نے ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا، بمبئی کے اکابر اور عرب تجار نے خیر مقدم کیا، بمبئی سے وہ دلّی، دلّی سے لاہور، اور لاہور سے لکھنؤ آئے، مولوی عبد الحق صاحب حقی بغدادی پروفیسر عربی علیگڈھ کالج سفر میں اُن کے ہمرکاب تھے، لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علماء، طلبہ اور رؤسا، غرض ہر طبقہ کے اصحاب تھے، استقبال کے لئے کھڑا تھا، نو بجے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسٹیشن اہلاً وسہلاً مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا، راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی اُن کی سواری کے لئے بھیجی تھی، اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے، لیکن مسلمانوں کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیئے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے سید ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم کی کوٹھی پر لائے، جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا،

۶ اپریل ندوہ کے اجلاس کی تاریخ تھی، قرآن پاک کی تلاوت اور استقبالیہ کے خطبۂ صدارت کے بعد مولانا نے سید رشید رضا کی صدارت کی تحریک کی، اور اُن کی مذہبی وتعلیمی وتبلیغی کوششوں کو بہ تفصیل بیان کیا، سب نے بہ یک آواز تائید کی، سید صاحب نے صدارت کی کرسی کو زینت بخشی،

اورعربی زبان میں ایک نہایت دل آویز و فصیح تقریر ارشاد فرمائی جو اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی تعلیمی ومذہبی ضرورتوں پر نہایت مدلل اور مؤثر تبصرہ تھا، سید صاحب کا انداز بیان ایسا دلچسپ اور مؤثر تھا کہ سماں بندھ گیا تھا، جو لوگ عربی نہیں بھی جانتے تھے وہ بھی اُن کی ڈھائی گھنٹہ کی عربی تقریر کو نہایت سکون سے سنتے رہے،

اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادرالکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کردیتے تھے،

تہنیت و تعزیت کی رسمی تجویزوں کے بعد مولانا نے یہ تجویز پیش کی کہ "حکومت ہند سے درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کو نمازِ جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی تعطیل دی جائے جس کے نہ ہونے سے بہت سی مسلمان ایک بہت بڑے مذہبی فرض سے محروم رہ جاتے ہیں" اس کی تائید مرزا سمیع اللہ بیگ وکیل لکھنؤ (حال نواب مرزا یار جنگ سابق وزیر عدالت حیدرآباد دکن) اور مرزا محمود صاحب قادیانی (موجودہ مرزا بشیر الدین محمود امام قادیان) نے کی، اس کی منظوری کے بعد دلی کی تجویز کے مطابق قرآنِ پاک کے انگریزی ترجمہ کی کارروائی کی رپورٹ سنائی، جس میں یہ مژدہ سنایا کہ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جن سے زیادہ بڑا انگریزی کا کوئی مسلمان ادیب موجود نہیں، قرآنِ پاک کے ترجمہ میں ہمہ تن مصروف ہیں،

تیسرے جلسہ میں خاکسار نے صیغۂ تصحیحِ اغلاطِ تاریخی کی رپورٹ سنائی، اور انگریزی کورس

کی اُن غلطیوں کے اقتباسات پیش کئے جن میں اسلام، پیغمبر اسلام علیہ السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزامات لگائے گئے تھے، مسلمان ان غلط بیانیوں کو سُن کر تڑپ اُٹھے، پھر یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے اس باب میں جو مراسلتیں ہوئی تھیں وہ پیش کیں، اور آیندہ طریق کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا،

اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم دارالعلوم کی ضرورت پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور آغاز اس شعر سے کیا،

ندانم ایں کہ سر رشتہ از کجا بند است　　　که آه من بکشیدن نمی شود آخر

پھر فرمایا:۔" حضرات! میں اس موضوع پر تقریر کے لئے صرف آج نہیں کھڑا ہوں، بلکہ کئی کو کئی بار کہہ چکا ہوں، لیکن یا تو لوگوں کے پہلو میں دل نہیں، یا میری زبان میں اثر نہیں، اس لئے مجھے غالب کا شعر پڑھنا پڑتا ہے،

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور"

اس کے بعد موصوف نے وہ زہرہ گداز تقریر فرمائی جو اس طرز سے اس موضوع پر انھوں نے کبھی نہیں کی، اور بتایا کہ مسلمان صرف مذہب ہے، اس لئے جو کچھ کرنا ہے اسی راستہ سے کرنا ہے، اور جو آواز بھی اُن کی اصلاح کے لئے اٹھائی جائے وہ اسی راستہ سے اٹھائی جائے، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ "مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے، مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے، کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قوم کے نام سے نہیں اسلام کے نام سے جاگتی ہے، اس نام سے اس کو پکارو، پھر دیکھو کہ اس کی بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے"

اسی تقریر کے دوران میں صیغۂ تصحیح اغلاط کی مذکورۂ بالا رپوٹ کی طرف اشارہ کر کے خاکسار کی حقیر

ذات کی نسبت ایک ایسا فقرہ فرمایا جو اس کے لئے ہمیشہ سرمایہ سعادت رہیگا،

اس تقریر کے بعد تعمیر کے چندہ کی تحریک ہوئی، مولانا نے خود اپنی طرف سے پانچ سو کا اور سید رشید رضا کی آمد کی مسرت میں سو روپیہ کا اعلان کیا، ساتھ ہی جناب منشی محمد احتشام علی صاحب، صفی الدولہ نواب علی حسن خاں صاحب، رضی الدولہ نواب سید نور الحسن خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور خان بہادر میر جعفر حسین صاحب وغیرہ نے پانچ پانچ سو کے وعدے کئے، خود صدر مجلس علامہ سید رشید رضا نے بھی سو روپئے پیش کئے،

اس کارروائی کے بعد مولانا پھر کھڑے ہوئے اور وقف علی الاولاد کی جو کارروائی اب تک ہو چکی تھی اس کی تفصیلی روداد پڑھ کر سنائی، چوتھے اجلاس میں خاکسار نے دلی کی تجویز کی تعمیل میں جدید عربی الفاظ کا ایک لغت پیش کیا، جلسہ نے میری اس محنت و کاوش کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد مولانا ابو الکلام صاحب نے خطیبوں اور اماموں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت پر ایک مؤثر تقریر فرمائی، تاجپوشی کی خوشی میں ملک معظم نے ہندوستان کو تعلیم کے لئے جو پچاس لاکھ روپئے عنایت فرمائے تھے، پانچویں اجلاس میں مولانا شروانی نے تجویز پیش کی کہ اس رقم سے عربی مدارس کو بھی مناسب حصہ ملنا چاہئے، اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم اشاعت و حفاظتِ اسلام کے موضوع پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اور ایسی دل ہلا دینے والی تقریر کی کہ خود بھی رو رہے تھے اور دوسروں کو بھی رُلا رہے تھے، یہ تقریر آج بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اس کی تاثیر کا امتحان کیا جا سکتا ہے، مولانا نے اس میں تفصیل سے آریوں کے حملوں، مسلمانوں کی غفلت، اور خاندانی نومسلموں کے ارتداد کے واقعات کے ضمن میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ واقعات

بیان کئے جن سے ایمان تازہ ہوتا تھا،

مولانا کی تقریریں ندوہ میں بارہا ہوئی تھیں، مگر اُن تقریروں کا محلِ ورود ہمیشہ دماغ رہا، مگر اس دفعہ موصوف نے ندوہ کے اجلاس میں تین دفعہ تقریریں کیں، تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی اور دل ہی کی گہرائیوں میں پیوست ہوئی جاتی تھی، اس انقلاب کا راز اُن دنوں سیرۃ نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا، جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڈہ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا، جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے، مولانا کی تقریر کے بعد خواجہ کمال الدین صاحب لاہور اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی مرحوم نے تائیدی تقریریں کیں، اور رات کو اُن ڈھائی سو مسلمانوں نے اپنے نام لکھوائے جو اسلام کی حفاظت و اشاعت کے لئے سر بکف نکلیں گے،

چھٹے اجلاس پر اس سالانہ جلسہ کا خاتمہ ہوا، اس آخری جلسہ میں حسبِ دستور ندوہ کے دو چھوٹے کمسن بچوں، عبدالرحمن نگرامی اور معین الدین (بارہ بنکی) نے اسلام کے فضائل و کمالات پر تقریریں کیں جن کو سُن کر لوگ دنگ رہ گئے، بعض طلبہ نے عربی میں تقریریں کیں، خیال تھا کہ اس دفعہ جبکہ صدر اجلاس ایک صاحب زبان ادیب اور قادر الکلام خطیب ہیں، طلبہ مرعوب ہو جائیں گے، مگر انھوں نے اس برجستگی اور بے خوفی سے تقریریں کیں کہ خود صاحب صدر نے اُن کی عربیت کی داد دی، آخر میں مولانا شروانی نے منتظمینِ جلسہ کا اور سید ممتاز حسین بیرسٹر سکریٹری مجلسِ استقبالیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، پھر سید رشید رضا صاحب صدر انجمن اجلاس کھڑے ہوئے، اور اس جوش کے ساتھ اپنی اختتامی تقریر کی کہ زبان کی ناآشنائی کے

باوجود تمام جلسہ سراپا اثر تھا، آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں صدر اجلاس کا شکریہ ادا کیا جس کا عربی ترجمہ مولانا کے ارشاد کے مطابق خاکسار نے کرکے سنایا جس وقت میری زبان سے آپ نے شدائد سفر کا ذکر کیا اور تحیت کے آخری الفاظ ادا کئے وہ بے قابو ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے جوش محبت نے ان کی آواز میں رقت پیدا کردی تھی اپنے شدائد سفر کے مقابلہ میں حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدائد اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تکالیف کا ذکر زبان پر لائے، اس اثر سے سارا جلسہ ماتم کدہ بن گیا تھا، اور دیر تک وہ حالت رہی جس کے دیکھنے کے لئے سیل و نہار کی آنکھیں ترستی رہیں گی،

اسی پر اس سال کے جلسہ کا خاتمہ ہوا، اور مولانا شبلی کے زیر اہتمام ندوہ کے جلسوں کا بھی اسی جلسہ پر خاتمہ ہوا، اور ندوہ کے متعلق یہ پیشین گوئی جو ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو انھوں نے کی تھی حرف بحرف پوری ہوئی، "ندوہ کی بساط پر یہ آخری بازی ہے جس پر اسکی موت و حیات کا مدار ہے۔" (شبرانی)

بعض دوسرے تعلیمی خدمات

ریاست حیدرآباد کی تعلیمی خودمختاری ۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۴ء

ریاست حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ کے قیام نے ملک میں ایک مفید تعلیمی انقلاب کا وجود پیدا کیا، اس کی تدریجی تاریخ نہایت دلچسپ ہے، یہاں مشرقی تعلیم کے لئے ایک دار العلوم قائم تھا جس کے تعلیم یافتہ بہت سے سرکاری عہدوں پر وقتاً فوقتاً ممتاز ہوتے رہے، لیکن اس دار العلوم کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم کے امتحانات کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس دار العلوم میں بھی اُسی کی

تقلید کی جاتی تھی، اور اسی کے مطابق اس دار العلوم کے طلبہ بھی وہاں مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے امتحانات دیتے تھے، غالباً ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ دوسرے ممالک کی درسگاہوں کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتی، اس وقت اس دار العلوم میں سات سو طالب علم زیر تعلیم تھے، جن کے لئے مجبوراً ریاست کو ایک خاص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لئے ایک نئے مستقل نظام کی ضرورت پیش آئی، اس وقت نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی وہاں تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائرکٹر تھے، انھوں نے سرکار عالی میں یہ تجویز پیش کی کہ دار العلوم کے لئے ایک مناسب نصاب تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آئے، جس کے لئے مولانا شبلی اور بعض دیگر ماہرین کے خدمات حاصل کئے جائیں، سرکار کی منظوری کے بعد نواب صاحب موصوف نے مولانا کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا، جس کا خلاصہ یہ تھا:- "چونکہ دار العلوم کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہو گیا ہے، اس کے عربی و فارسی نصابِ تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ایک رکن آپ ہیں، نصابِ تعلیم زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا جائے تاکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پاکر امتحان میں کامیابی حاصل کریں وہ سرکاری خدمات کے ادا کرنے کے قابل ہوں،

ترمیم نصاب میں چند امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے،

(۱) ضروریاتِ زمانہ اور حکومت کی خدمات کی ضروریات کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے موجودہ نصاب میں اصلاح،

(۲) تکمیل تحصیلِ علومِ مشرقیہ،

ندوہ کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورنٹیل تعلیم ناقص ہے، بہت سے علوم جن سے فضیلت کی تکمیل ہوتی ہے اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مولوی فاضل سے بالاتر اول مرتبہ دو جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہوسکے، اگرچہ سلسلۂ نظامیہ کی پابندی ضرور نہیں، مگر تحصیل تکمیل کے لئے بہت کچھ اضافۂ کتب درسیہ کی ضرورت ہے"

یہ مراسلہ مئی یا جون ۱۹۰۷ء میں مولانا کی خدمت میں اُس وقت پہنچا جب وہ پاؤں کے حادثہ کے سبب سے صاحبِ فراش تھے، اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم ہوم سکریٹری حیدرآباد نے ۳ ماہ الٰہی ۱۳۱۷ف کو نشان (۱۲۲۳) کے مراسلہ کے ذریعہ سے مولٰنا کو پھر حیدرآباد آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ جون ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد گئے، اور وہاں چند روز قیام کرکے ایک نصاب تیار کیا، اور اس کو ایک یادداشت کے ساتھ پیش کیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ نصاب میں ترمیم و اصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے؟ اور ترمیم و اصلاح کے اہماتِ امور کیا ہیں؟

مولانا جس جامع الحیثیات تعلیم گاہ کا خواب ہمیشہ سے دیکھا کرتے تھے، اور جس کی تعبیر کے لئے ندوہ کی در و دیوار سے ٹکرایا کرتے تھے اُن کے خیال میں اس کے لئے یہ بہترین موقع ہاتھ آیا، حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی جس کا خزانہ معمور تھا اور جس کو تعلیم کے اُس وسیع پروگرام کا بوجھ اٹھانے میں جو مولانا کے متخیلہ میں تھا کسی قسم کا تأمل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے انھوں نے جی کھول کر اپنے پورے حوصلہ کے مطابق اپنے تعلیمی پروگرام کو پھیلا کر ایک یادداشت تیار کی، اس یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ

بقول مولانا حسب ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نصاب میں ترمیم و اصلاح کی گئی،

(۱) دار العلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا اُس کا مقصد صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا، جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں لیکن اب جبکہ دار العلوم خود مختار اور آزاد ہوگیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہوگئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، بلکہ شرعی خدمات بھی انجام دے سکیں، علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں کمال رکھتے ہوں، اُن کو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت حاصل ہو، وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں، اور علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی واقف ہوں، تاکہ جدید تعلیمیافتہ گروہ پر بھی اُن کا اثر پڑ سکے،

(۲) اس وقت جو جدید تعلیم ہندوستان میں جاری ہے، اس میں ہماری مذہبی ضروریات اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے، نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہوسکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائلِ اخلاق کا علم ہوسکتا ہے، اس لئے بی اے یا ایم اے ہونے کے بعد بھی ان چیزوں کے متعلق ایک شخص کی حیثیت ایک عامی آدمی سے زیادہ نہیں ہوسکتی بااین ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا، کیونکہ یونیورسٹی کا موجودہ نصاب اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے،

لیکن چونکہ ریاست حیدرآباد ایک وسیع ریاست ہے اور اس وقت تک اُس نے سرکاری نوکریوں کے لئے یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لئے

وہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا سلسلۂ تعلیم بھی قائم کرسکتی ہے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو، اور جس کے تعلیمیافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں،

ان دونوں مقاصد کو پیشِ نظر رکھکر مولانا نے ایک اصلاحی نصابِ تعلیم تیار کیا، جس کے اصول یہ تھے :-

(۱) تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس مین رکھی جائیں، جنمین تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقہ سے بیان کئے گئے ہوں، اس بناپر وہ کتابیں جو معمّا و پہیلیاں کے طور پر نہایت مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں، نصابِ درس سے خارج کردی گئیں،

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جنمیں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کردیئے گئے تھے اور اس خلطِ مبحث کی وجہ سے طالب العلم اصل فن کے مسائل سے دور پڑجاتا تھا، اس لئے یہ تمام کتابیں خارج کردی گئیں، اور اصلاحی نصاب میں اس قسم کی کتابیں رکھی گئیں جنمیں اسی فن کے خالص مسائل بالاستیعاب مذکور ہوں،

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصّہ بہت کم تھا، اس لئے اصلاحی نصاب میں قرآنِ مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا،

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصّہ بہت کم تھا، اس لئے ادب کا حصہ بہت بڑھادیا گیا،

(۵) اس نصاب میں انشاپردازی کی مشق کے لئے خاص گھنٹے مقرر کیے گئے کیونکہ

عربی خوانوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ صحیح عربی کی چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتے،

(۶) قدیم نصاب میں عقائد و کلام کی صرف ایک معمولی درجہ کی کتاب داخل تھی، حالانکہ یہ نہایت اہم فن ہے، اس لئے اس نصاب میں اس فن کی متعدد و بلند پایہ کتابیں داخل کی گئیں،

(۷) قدیم نصاب میں تاریخِ اسلام اور تاریخِ عام کی ایک کتاب بھی داخل نہ تھی، اس کے موجودہ نصاب میں فن تاریخ کی کتابیں بھی داخل کی گئیں،

(۸) علومِ جدیدہ کی بعض کتابیں بھی جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں نصاب میں شامل کی گئیں،

(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لنگویج کے لازمی قرار دی گئی،

(۱۰) نصابِ سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدتِ تعلیم ۱۹ برس تھی، لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لئے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی،

(۱۱) نصابِ مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی، اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دار العلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائیگا، اور اس مدت میں اردو، ابتدائی فارسی، حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی،

اس درجہ کے بعد منشی اور عالم کی دو الگ شاخیں شروع ہوں گی، اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے، منشی کے ۲ سال اور منشی عالم کے دو سال، اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا، منشی فاضل تک طالب علم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائے گی،

عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے،

عالم اس کی مدتِ تعلیم آٹھ برس رکھی گئی، یہ درجہ بی، اے کے برابر ہے، اس میں تمام علومِ متداولہ عربی، بعض علومِ جدیدہ، اور انگریزی زباندانی انٹرنس کے درجہ تک آجائیگی،

فاضل اس کی مدتِ تعلیم دو برس ہے، اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی، اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا، اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ، عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے، تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ پیدا ہو، اور ایسے علما پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم میں اضافہ کرسکیں اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں اُن ہی کی زبان و خیالات میں اسلامی عقائد و مسائل پر تقریر کرسکیں،

دار العلوم کے نصابِ تعلیم کی یہ اصلاح درحقیقت وہ پہلا قدم تھا جو جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے لئے اٹھایا گیا، اور مولانا کی یادداشت وہ پہلی اینٹ ہو جس سے بعد کو عظیم الشان جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا نے حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خیال پیش کیا، اور طعنہ دیا کہ جو لوگ غلام ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں وہ اس آزاد حیدرآباد میں خود ایک آزاد یونیورسٹی کی بنیاد کیوں نہیں رکھتے، چنانچہ یادداشت[1] مذکور کے شروع میں فرماتے ہیں:-

"معلوم نہیں مسلمانوں میں کونسی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی، کہ زمانہ کے سیکڑوں ہزاروں

[1] یہ یادداشت الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں اور مقالات شبلی حصہ سوم (تعلیمی) ص۱۵۲ میں چھپی ہے،

انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ
جدید تعلیمیافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہو، اور در حقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیئے تھا،
بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے ایک عام راستہ پر پڑ گیا ہے، اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں،
جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور وغل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجوں کی نوکریاں اور ڈگریاں و دگر
ہیچ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں، اور اسی لئے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے
ہیں، کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ
بہم نہیں پہنچتا کہ یونیورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونیورسٹی بن سکتی ہو وہاں کیا ہو رہا ہو،
حیدرآباد میں عنان تعلیم ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے، جو ہندوستان میں یونیورسٹی بنانے
کے محرک اور جان دادہ ہیں، یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے، حیدرآباد میں ایک
منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے،
حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی
گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیونکہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیمیافتہ
دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں، لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہو کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم
کی اصلاح و ترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لئے وہاں ایک دار العلوم ہے، پنجاب
یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل
اور منشی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کئے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک
اسی کی تقلید کی گئی، اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا، جب تک تو دیہ یونیورسٹی نے یہ قاعدہ

نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے۔"

دو سہ بار بہ باتو گفتم کہ مرا بہ ہیچ بستاں — نہ شد اتفاق شاید کہ بہ ایں بہا گرانم

مولانا کی اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ (ستمبر ۱۹۰۸ء) میں قرار پایا، لیکن چونکہ عین اُسی زمانہ میں ندوہ کی ایک خاص ضرورت سے مولانا کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لئے وہ اجلاس ملتوی ہوگیا، اس کے بعد مولانا ۲۳ر جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد گئے، اور ایک کمیٹی میں اُن کا مرتبہ نصاب پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت و تعلیمات، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، مولانا انوار اللہ خاں صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبد الحلیم صاحب شرر، مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، اس اجلاس میں کچھ امور باقی رہ گئے تھے، اس لئے ۱۷ر فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے، اور جس میں نواب عماد الملک بہادر (سابق ناظم تعلیمات) اور ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیماتِ حال بھی شریک تھے، اور غور و فکر کے بعد کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ مرتبہ نصاب منظور کیا گیا،

مولانا نے یہ پوری تفصیل "حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی" کے عنوان سے الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں لکھی ہے، اُس کے آخر میں فرماتے ہیں:- "یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہے،

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق　　　　ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

مولانا کا خیال تھا کہ ایک سال میں جدید نظام کے مطابق اس درسگاہ کا کام شروع ہوجائیگا،[1] (سلیمان ۲۳) لیکن ایک سال کیا اس میں پانچ چھ سال لگ گئے، ۱۹۱۳ء میں جب مولانا دوبارہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدر آباد گئے، تو ابھی تک اس کے سوا اس کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی کہ سرکاری امتحانات کا انتظام ہوگیا تھا،

بعض صاحب شروع سے یہ چاہتے تھے، کہ مولانا حیدر آباد میں رہ کر اپنی اس اسکیم کو خود ہی چلائیں، مگر انھوں نے اس سے معذرت چاہی، ۳ رجولائی ۱۹۱۰ء کو مہدی صاحب کو لکھتے ہیں:

"سرکار نظامِ علومِ مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے، اس کے نصاب وغیرہ کے لئے مجھے بلایا ہے، چند روز یہاں قیام رہیگا، یونیورسٹی کی نظامت مجھے دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے، لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں" (مہدی، ۷۴)

۹ راگست ۱۹۱۰ء کو پھر لکھتے ہیں:- "یہاں (حیدر آباد میں) مجھ کو بہت دیر ہوتی جاتی ہے، اور میں گھبراتا جاتا ہوں، ایک دن کا کام یہاں مہینوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کے لئے سب سامان مہیا ہیں، لیکن آدمی نہیں، اور آدمی ہو تو سازشوں کی وجہ سے کچھ نہیں کرسکتا، میں ملازمت تو کسی طرح نہ کرونگا، البتہ اگر سامان اچھے ہوئے تو برس دو برس رہ کر کام چلا دونگا، کہ آیندہ چلتا رہے" (مہدی ۷۸)

---

[1] حضرۃ الاستاذ نے اسی زمانہ میں اس کے جدید اسٹاف میں میرا نام بھی داخل کرا دیا تھا (سلیمان ۲۳) چنانچہ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں اما لطیفی صاحب نے مجھے انٹرویو کے لئے بلایا، میں پونہ سے جاکر ان سے ملا، انھوں نے انٹرویو کے بعد میری تقرری کی ابتدائی کارروائی کے لئے کچھ کاغذات بھی میرے پاس بھیجے، مگر میں نے دار المصنفین کے خیال سے اس کارروائی کو آگے نہیں بڑھایا،

۱۹۱۴ء میں جب کام کا آغاز ہو رہا تھا مولانا کی جگہ پر نواب عماد الملک اور دوسرے قدر دانوں کے اصرار سے جون ۱۹۱۴ء میں (سلیمان ۱۷) مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی اے کا انتخاب اس دار العلوم کی صدارت (پرنسپلی) کے لئے عمل میں آیا، حالانکہ خود مولانا اُن کی آزاد مذہبی و علمی خدمت کے خواہاں تھے، مگر مجوزہ درسگاہ کی کامیابی کے خیال سے وہ نیم راضی سے ہو گئے، (حمید ۶۵، ۶۶، ۶۷) اس وقت ڈاکٹر لطیفی حیدرآباد میں تعلیمات کے ناظم تھے، اور اکبر حیدری صاحب صیغۂ مال کے اعلیٰ عہدہ دار،

مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درسگاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درسگاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں، یہ بالکل نیا خیال تھا، اس لئے انھوں نے بڑی ہی مشکل سے ارکانِ حکومت کو اس کے لئے راضی کیا، اب لطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب ناظمِ تعلیمات ہوئے، اُن کے زمانہ میں زمانہ نے نئی کروٹ لی یعنی ایک مشرقی یونیورسٹی کے بجائے اُس نے اردو کی ایک ایسی مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا جس میں دینیات کی حیثیت ثانوی ہو گئی، اور علومِ مشرقیہ اس کا ایک صیغہ ہو کر رہ گئے، بعض وجوہ سے مولانا حمید الدین صاحب دل برداشتہ ہو کر ۱۹۱۷ء میں استعفا دے کر چلے آئے، اور عثمانیہ یونیورسٹی موجودہ صورت میں بنکر نمودار ہوئی، جو گو وہ نہیں بنی جس کے بنانے کا خیال کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی اُس نے وجود میں آکر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اور اس کے دینیات اور علومِ مشرقیہ کا صیغہ اپنی تعلیم، طرزِ تعلیم، اساتذہ اور انگریزی و علومِ جدیدہ کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشہ کا اچھا خاصہ خاکہ ہے،

مشرقی بنگال و آسام میں اصلاح مدارس کی تجویز ۱۹۱۰ء

سنہ ۱۹۱۰ء میں بنگال گورنمنٹ نے مشرقی بنگال اور آسام کے عربی مدرسوں کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوے تھے، اس کا پہلا جلسہ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو، اور دوسرا ۱۱، ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کو ہونے والا تھا، مولانا کے کاغذوں میں اس کے متعلق سرکاری مراسلہ تو ملتا ہے، لیکن اس کے لئے سفر اور اُس میں مولانا کے کاموں کی نوعیت کا حال مجھے نہیں معلوم ہوسکا،

مراسلۂ مذکور ۲۳ فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو ڈھاکہ سے بھیجا گیا ہے،

مشرقی کمیٹی شملہ سنہ ۱۹۱۱ء

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے علوم مشرقیہ کی ترقی و اصلاح کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس کمیٹی کا اجلاس اسی مہینہ میں شملہ میں ہوا، ہندوستانی ممبروں کے علاوہ علی گڈھ کالج کے جرمن عالم ڈاکٹر یوسف ہارویز اور مسٹر برن چیف سکریٹری صوبہ متحدہ جو فارسی اور اردو کے عالم تھے، اور بعض دوسرے انگریز ممبر بھی تھے، جلسہ سے واپس آکر مولانا نے اگست سنہ ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں "ہوا کا رخ دوسری طرف" اور "مشرقی کانفرنس" کی دوہری سرخیوں کے نیچے اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد اور نتائج کی تفصیل کی ہے،

شروع میں سرسید اور اُن کے دوستوں کو مشرقی تعلیم کی ترقی سے جن وجوہ سے اختلاف تھا، اُن کا جواب دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اب ہوا کا رُخ پلٹ رہا ہے، یعنی گورنمنٹ اب مشرقی تعلیم کی سرپرستی کے لئے آمادہ ہو رہی ہے، اس کے بعد اس کمیٹی کے حسب ذیل اغراض لکھے ہیں:-

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا،

(۲) علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا، اور جدید طریقۂ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا،

(۳) اعلیٰ طریق پر قدیم قلمی کتبخانوں کی فہرست سازی (کیٹلوگنگ) کی تعلیم دینا،

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لئے بیش قرار وظائف مقرر کرنا،

(۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا، اور اُن کے لئے امتحانات مقرر کرنا،

(۶) علمی مشرقی تعلیم یافتوں کے لئے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ، اور قدیم کتب خانوں میں ترتیبِ فہرست کے لئے عہدے قائم کرنا،

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا،

(۸) (انگریز) افسروں کی زباندانی کا امتحان لینا،

(۹) کلکتہ میں اغراضِ بالا کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا،

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا اس کے متعلق مولانا نے اپنے مضمون میں حسبِ ذیل نتائج کی توقع کی:

۱۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی پسند کریں گے،

۲۔ جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی اُن کو کچھ ماہوار امداد دے گی،

۳۔ کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درسگاہ قائم ہوگی، مدارسِ عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اُس درسگاہ میں تعلیم حاصل کریں گے،

(۴) اس درسگاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیئے جائیں گے،

(۵) اس درسگاہ سے سند لینے کے بعد اُن کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی،

(۶) مدارسِ عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی، اور جن کے تعلیمیافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے اُن کو کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکیگی،

مولانا نے اس کمیٹی کی سفارشوں سے جن نتائج کی توقع دلائی تھی وہ سب کی سب تو پوری نہیں ہوئیں، مگر اُن سے حسبِ ذیل نتیجے ضرور برآمد ہوے،

۱- سرکاری خرچ پر مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی اور انگریزی پڑھے ہوے، طلبہ کا بھیجا جانا اگرچہ اس کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۹۰۸ء میں اعلان بھی کردیا تھا، اور بیش قرار وظیفہ بھی مقرر کردیا تھا، اور اس کے مطابق سب سے پہلے بہار سے ڈاکٹر عظیم الدین ۱۹۰۹ء میں یورپ بھیجے گئے اور ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر منصور[1] علیگڈھ سے گئے، اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۱۹۱۲ء میں بھیجے گئے اور پنجاب سے مولوی محمد شفیع صاحب (موجودہ پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) گئے، اور اب بھی طلبہ جا رہے ہیں،

۲- اُن لوگوں کو اُن کی کامیاب واپسی پر کالجوں میں مشرقی علوم کی پروفیسری بیش قرار

[1] افسوس ہے کہ ڈاکٹر منصور نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو انتقال کیا، شاہجہانپور وطن اور ۱۸۸۵ء سالِ ولادت ہے، علیگڈہ کالج میں ڈاکٹر ہارویز کے خاص شاگرد تھے، ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کے وظیفہ سے یورپ گئے اور برلن میں ڈاکٹر سخاؤ کی نگرانی میں عربی جغرافیہ نویسوں پر اپنا مقالہ تیار کیا اور ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، اسی اثناء میں یورپ کی بڑی جنگ شروع ہوگئی، اور چار سال تک ممالک یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے رہے، ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ زیادہ تر برلن میں رہے، اسی زمانہ میں حدیث کی فہرست بنانے کا جو کام وہاں ہو رہا تھا مستشرق وینسنک کے ساتھ مل کر اس کو انجام دیا، ۱۹۳۱ء میں وہ ہندوستان واپس آئے، قرآن پاک کا وہ جرمن ترجمہ جو مولوی صدرالدین صاحب احمدی کے نام سے چھپا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان ہی کا کیا ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں وہ علی گڈہ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر ہوے اور یہیں وفات پائی،

تنخواہوں پر دی گئی، اور اب تک دی جا رہی ہے،

۳۔ یوپی، بہار اور بنگال میں ایک ایک عربی دان گریجویٹ کو مدارسِ عربیہ کی انسپکٹری کا یا علومِ اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کی سپرنٹنڈنٹی کا عہدہ دیا گیا، اور عربی مدرسوں کی نگرانی کا کام انکے سپرد ہوا، چنانچہ یوپی میں ۱۹۱۶ء میں مولانا کے شاگرد خاص مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو ندوہ کے فاضل اور علی گڈہ کے ایم اے تھے انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے،

۴۔ بعض بعض صوبوں میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی طرح سرکاری امداد سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا، جیسے بہار میں مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ،

۵۔ مختلف عربی مدرسوں کے لئے حسبِ مرتبہ یا حسبِ ضرورت ماہانہ امدادیں ایڈ کے طور پر منظور ہوئیں،

۶۔ کلکتہ امپیریل لائبریری میں فن کتب خانہ کی تعلیم کے لئے ایک درجہ کھولا گیا،

۷۔ کلکتہ کے بجائے ڈھاکہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کی ایک بڑی درسگاہ کھولی گئی،

۸۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے لئے بعض ماہرینِ علومِ مشرقیہ کا تقرر ہوا جن میں سے ہمارے صوبہ میں پہلا نام ظفر حسن صاحب کا ہے، جو علی گڈہ کے ایم اے اور ہارونیر صاحب کی نگرانی میں آثار کے پڑھنے کی تعلیم پائے ہوئے تھے،

مولانا نے اس کمیٹی میں ندوہ کو بھی روشناس کیا، اور اس کے بعض مقاصد کی تشریح کی، شروانی صاحب کو ۲۰؍ جولائی ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں:۔ "مشرقی کانفرنس سے اچھے نتائج کی امیدیں ہیں، میں نے ندوہ کو وہاں زیادہ روشناس کیا اور بعض کارروائیوں میں وہ شامل کر لیا گیا" (شروانی ۔ ۹۲)

مولانا زبانی فرماتے تھے کہ انھوں نے اس میں شمس العلماء کے خطاب کی بے قدری کا حال بھی بیان کیا، اور اس کا سبب یہ بتایا کہ اس کے عطا کرنے میں استحقاق اور قابلیت پر نہیں، بلکہ سرکاری سفارشوں پر نظر رکھی جاتی ہے،

مولانا کے اس سفر شملہ کے بعض ادبی پہلو بھی ہیں، اثنائے قیام میں شملہ کے علم دوست وادب نواز دوستوں نے اپنے حلقہ میں لیا، جنمیں سے اخگر مرادآبادی اور مولوی محمد عمر صاحب نعمانی کے نام معلوم ہیں، مولوی صاحب نے بھی الندوہ (سلسلۂ جدید) کے دوسرے پرچہ مورخہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں اس ملاقات کے بعض ادبی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اس سفر میں کرنل عبد المجید خاں پٹیالہ کے مہمان تھے، اور اُس کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے جو اب شیخ ریاض الدین صاحب خلف شیخ شہاب الدین مرحوم کی ملکیت ہے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی وجہ سے شملہ ندوہ سے ہمیشہ سے روشناس تھا، مگر مولانا کے اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کو وہاں مزید مقبولیت حاصل ہوئی،

ڈھاکہ یونیورسٹی جولائی سنہ ۱۹۱۲ء

لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کی تقسیم نے جس طرح ہندو بنگالیوں میں گورنمنٹ کی طرف سے غم و غصہ کا طوفان برپا کر دیا تھا، اُسی طرح سنہ ۱۹۱۰ء میں تاجپوشی کے موقع پر اُس کی تنسیخ نے مسلمانوں میں ہیجان برپا کر دیا، یہاں تک کہ نواب وقار الملک جیسے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی نے ایک سخت مضمون لکھ کر گورنمنٹ کے اس فعل کو ناعاقبت اندیشی ٹھہرایا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لئے جو مرہم تجویز کیا، اُس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں اُن لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار

کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اس سب کمیٹی میں داخل ہوئے جو اسلامک اسٹڈیز کے لئے بنی تھی،

ڈھاکہ یونیورسٹی حقیقت میں اس خواب کی تعبیر ہے جو شملہ مشرقی کانفرنس میں دیکھا یا دکھایا گیا تھا، چونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور مدرسۂ عالیہ کے اصول پر سرکاری عربی مدرسوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہے، اس لئے ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک ایسا نظام قرار دیا جانا تجویز ہوا جس میں عربی علوم اور اسلامی دینیات کے ساتھ جدید علوم اور اعلیٰ انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے،

۵ اگست ۱۹۱۲ء کو اس کمیٹی کی تاریخ تھی، اور اسی زمانہ میں بنگلور میں مدراس کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا، اور دونوں جگہوں سے طلبی تھی، مولانا اس زمانہ میں بمبئی میں تھے، راقم بھی ہمرکاب تھا، تو بنگلور کانفرنس کی شرکت کے لئے ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو مجھے روانہ فرمایا، اور خود دوسرے دن ۲۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ کی راہ سے ڈھاکہ تشریف لے گئے، (عبدالقادر ۲۵)

ڈھاکہ کی ترجیح کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ مولانا کو ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ میں سیرت کے لئے بعض کتابیں دیکھنی تھیں، دوسری یہ کہ بنگال کے احباب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ آجائیں تو مدرسۂ عالیہ وغیرہ کی اصلاح کا کام بھی انجام پاجائے، ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو وہ

لہ مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ "اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ میں سرجان وڈبرن لفٹننٹ گورنر وقت نے بھی مولانا سے خواہش کی تھی کہ مدرسۂ عالیہ کی اصلاح میں مدد دیں اس اجلاس میں میں بھی موجود تھا۔"

شروانی صاحب کو خود لکھتے ہیں :- "مدراس میں خود جاتا لیکن عین اُسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی سب کمیٹی میں گورنمنٹ بنگال نے مجھ کو مدعو کیا ہے، اور وہاں کے لوگوں نے مجھے لکھا ہو کہ اگر تم آجاؤ تو مدرسۂ عالیہ وغیرہ کی ابتری کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہوسکتی ہو، اس لئے باایں شکستہ پائی و پیری وہاں جارہا ہوں، سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں"۔ (شروانی ۱۰۲)

ورنیکولر اسکیم الٰہ آباد ۱۹۱۲ء اُردو کو ناگری ہونے سے بچانا

۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد گورنمنٹ نے ایک "ورنیکولر اسکیم کمیٹی" قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اُردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے، نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے، پنڈت سندر لال وغیرہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبجاتِ متحدہ نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی، جس کے دفعہ ۳ و ۴ میں اس تجویز کی تائید میں حسبِ ذیل دلیل قائم کی تھی:

"اردو زبان اور ہندی زبان در اصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ اُن کی گرامر متحد ہے، اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں در اصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بنانا چاہئے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو، اور ہندی دونوں بنجائے۔

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے، اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی مہارت اور واقفیت کے لئے رامائن تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہئے ہندوؤں کے لئے وہ لازمی کردی جائے، اور مسلمانوں کے لئے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا"۔

مولانا سے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، اور اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کیلئے

انھوں نے ایک مدلل یادداشت مرتب کی تھی، جو معارف اکتوبر ۱۹۱۶ء میں چھپ چکی ہے، اور مقالاتِ شبلی کے سلسلہ میں بھی شامل ہے، اس یادداشت کے اخیر میں مولانا نے یہ رائے دی تھی "اخیر میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے قریباً آزاد ہو اختیار کی جا سکتی ہے، لیکن ہائر (اونچے) کلاسوں کے لئے اردو اور ہندی کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہئے، اور اسی صورت میں دونوں اعلیٰ درجہ تک ترقی کر سکتی ہیں"

۳ر مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا نے مجھے مطلع کیا کہ "یہ یادداشت اس قدر مؤثر اور کامیاب رہی کہ خود انگریز اور ہندو ممبروں نے اس سے حرف بحرف اتفاق کیا، (سلیمان ۳۸)

اور ۱۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا کہ تیسرے جلسہ میں مجھ کو کامل فتح نصیب ہوئی اور مسٹر برن نے جو تجویزیں پیش کی تھیں سب کی سب اڑ گئیں (شروانی، ۹۷)

۱۵ر مارچ ۱۹۱۲ء کو کمیٹی کا پھر جلسہ ہوا، اور مولانا کی رائے کے مطابق وہی طے ہوا جسکا خلاصہ اوپر لکھا جا چکا،

مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت اسی سال یوپی گورنمنٹ نے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجراء کی ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے۔ ۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو اس کے اجلاس کی تاریخ تھی، (شروانی ۹۷) مولانا کے خطوط میں پھر اس کمیٹی کا کچھ حال نہیں ملتا، اور زبانی بھی مجھے یاد نہیں کہ کیا پیش آیا،

صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء اِس زمانہ میں تاریخ صرف کسی قوم کے گذشتہ واقعات کا مجموعہ نہیں رہی ہے، بلکہ اس کے احاطہ میں دین و مذہب، اخلاق و عادات، معاشرت و تمدن

اسلافِ کرام اور پوری ملت کی ہزار سالہ علمی زندگی کی مکمل تصویر آجاتی ہے، اس لئے اس کی اہمیت گذشتہ زمانہ سے آج بہت زیادہ ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں آکر اس سے ایک اور کام لیا یعنی یہ کہ چونکہ انھوں نے ہندوستان کا تخت مسلمانوں سے چھینا تھا، اس لئے انھوں نے زیرِ درس اسلامی تاریخ کو ایسے رنگ میں لکھ کر پیش کیا کہ اس سے دو نتیجے نکلیں، ایک یہ کہ مسلم طلبہ ان کے بیانات کو سچ سمجھ کر اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں سے خود شرمانے لگیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مختلف قوموں کے طالب علموں میں تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں، چنانچہ اُن کو یہ دونوں نتیجے حاصل ہوئے اور وہ سب کے سامنے ہیں، اگرچہ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنس اور اخبارات یہ شکایت کیا کرتے تھے، لیکن اب تک اس کام کے لئے کوئی باقاعدہ صیغہ قائم نہیں ہوا تھا، دہلی کے اسی جلسہ میں جو مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوا مولانا نے اس صیغہ کے قائم کرنے کے لئے ایک رزولیوشن پیش کیا جو منظور کیا گیا، اور خاکسار کو اس صیغہ کا سکریٹری مقرر کیا، خاکسار نے اس کام کو شروع کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں سے خط و کتابت کی، اور اُن سے اس بارہ میں مشورہ پوچھا، اور ۲۵ مئی سنہ ۱۹۱۱ء کو عام اطلاع کے لئے اخباروں میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں واقف کار لوگوں سے اس قسم کی قابلِ اعتراض کتابوں کے نام دریافت کئے گئے تھے، اس کے جواب میں متعدد لوگوں نے مختلف کتابوں کے نام لکھکر بھیجے، سب سے زیادہ قابلِ اعتراض کتاب سابق ڈائرکٹر تعلیم مارسڈن صاحب کی تاریخِ ہندوستان تھی، جو نہ صرف الہ آباد بلکہ کلکتہ وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کے بھی جونیر کلاسوں میں پڑھائی جاتی تھی،

دوسری کتاب ڈیلافوس صاحب کی تاریخ ہند تھی، ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر اُن کی قابلِ اعتراض
بارتوں کو نقل کر کے جولائی ۱۹۱۰ئ میں اسلامی اخبارات سے خواہش کی گئی کہ وہ ان کتابوں
کے نکالنے کی تحریک کی پوری تائید کریں، چنانچہ نہ صرف اردو بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے بھی
ں طرف توجہ کی، ساتھ ہی ۳۰ جولائی ۱۹۱۰ئ کو مولانا کی طرف سے رجسٹرار صاحب یونیورسٹی
آباد کی خدمت میں ایک یادداشت بھیجی گئی، جسمیں یہ درخواست کی گئی کہ مارسڈن صاحب
ی اس کتاب کو مڈل کے کورس سے خارج کر کے اس کے بجائے موجودہ ڈائرکٹر تعلیم ڈیلافوس صاحب
ی تاریخِ ہندوستان چند ترمیمات کے بعد داخل کی جائے، رجسٹرار صاحب نے ۲۰ اگست ۱۹۱۰ئ
سنڈیکیٹ کمیٹی کے حسبِ ہدایت اس تحریک کو ڈائرکٹر صاحب سرشتۂ تعلیم کے نام بھیجدیا، اور
س کی نقل مولانا کے پاس بھیجی،

یونیورسٹی نے اس یادداشت کی اطلاع مارسڈن صاحب کو جو اتفاق سے اس وقت
ندوستان ہی میں تھے بھیجدی، اس کو پڑھ کر مارسڈن صاحب نے مولانا سے خط وکتابت شروع
ی، اور خود لکھنؤ آکر مولانا کے مکان پر ملاقات کی، ساتھ ہی فقہ کی ایک بڑی قلمی کتاب ہدیۃً
ش کی، جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، اس ملاقات میں مارسڈن صاحب نے یہ وعدہ
یا کہ وہ آیندہ اشاعت میں ان غلطیوں کی اصلاح کردیں گے، اس کے بعد یکم اپریل ۱۹۱۱ئ
کو کلکتہ سے انھوں نے یہ خط لکھا کہ میں اب اپنی اس کتاب کے طبعِ ثانی کا انتظام کرنا چاہتا
ہوں اس لئے آپ کی حسبِ ذیل عنایتوں کا خواستگار رہوں،

(۱) "ایک یہ کہ ڈیلافوس صاحب کو آپ یہ خط لکھدیں کہ چونکہ مارسڈن صاحب نے اپنی

کتاب کی طبعِ ثانی میں قابلِ اعتراض سطور کو نکال دینا منظور کر لیا ہے، اس لئے اب اس کتاب پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، اور اب میں اپنی تحریک کو واپس لیتا ہوں،

۲- آپ میری کتاب کے انگریزی اور اردو نسخوں کے حاشیوں پر اُن اصلاحات کو لکھدیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں،

اس کے جواب میں شعبہ نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۱ء کو حسب ذیل خط لکھ کر ڈائرکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا جس میں ظاہر کیا کہ مارسڈن صاحب کی پوری کتاب جس لب و لہجہ میں لکھی گئی ہے اُس کے لحاظ سے وہ صرف چند عبارتوں کے بدل جانے سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی ہے بلکہ پوری کتاب کا ڈھانچہ بدلنے کے لائق ہے، ڈائرکٹر صاحب نے ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو اس کا جواب دیا۔

شعبہ نے اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں کی تصحیح کی طرف توجہ کی، اور اُن کے قابلِ اعتراض مقامات کی نشان دہی کی، اور بعض دوسرے صوبوں کی تاریخی کتابوں کا بھی جائزہ لیا، اور ۷ اپریل ۱۹۱۲ء کے اجلاسِ لکھنؤ میں اس شعبہ کی پوری رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ میں قابلِ اعتراض عبارتوں کے جو اقتباسات پیش کئے گئے تھے اُن کو سن کر پورے جلسہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس لئے جب مولانا کھڑے ہوئے تو حاضرین سے پوچھا: "حضرات! کیا آپنے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپکے ہزاروں لاکھوں بچے اُن الفاظ کو مدرسوں میں پڑھتے ہیں جن کو آج آپنے سنا، اور جن کے سننے سے آپکے دل لرز لرز گئے ہیں؛ اور جن پر آپنے نفرت کے نعرے بلند کئے ہیں، (کبھی اس سے پہلے آپ نے نعرے بلند کئے تھے) سوال یہ ہے کہ جب آپ کا لڑکا پڑھ کر گھر میں آتا تھا تو کیا کبھی اس نے شکایت کی کہ آیا ایسے

ناگوار اور لغو الفاظ ہم کو اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں، آپ کا احساسِ مذہبی زائل ہو رہا ہے، آپ کو اس پر رونا چاہئے کہ آپ کی فیلنگ آپکے احساسِ مذہبی بالکل فنا ہوتے جاتے ہیں" (اردوئے معلی لکھنو ۱۹۱۰ء)

اس صیغۂ تاریخ کی تاریخ یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری ان تحریروں اور تحریکوں سے چونک کر صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام نہ وہاں ہوا نہ یہاں ہوا، میں نے صیغہ کے سکریٹری کی حیثیت سے دو سال پہلے ہی ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء کو ان کو یہ خط لکھا تھا "جناب مکرم، دام لطفکم، السلام علیکم، ندوۃ العلماء کے اعلان شعبۂ تصحیح کے بعد البشیر میں یہ خبر نہایت مسرت کیساتھ پڑھی کہ جناب نے بھی اس امر کی طرف توجہ فرمائی ہے، دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر البشیر میں پڑھا کہ جناب نے معلمین و افاضلِ مدرسۃ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیحِ اغلاط مرتب فرمائی ہے، چونکہ ایک قومی کام دو منتشر مقاموں میں انجام پانا خلافِ مصلحت ہے، اس لئے چند امور عرض ہیں، (۱) اس کام کو متحد قوت سے کیونکر عمل میں لایا جائے؟ (۲) آپنے اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟ (۳) انگریزی کورس کی جو تاریخ از سرتاپا لغو ہو اس کو خارج از کورس کرنے کی کیا تدبیر ہے؟

امید ہے کہ قومی کاموں میں یکجہتی کو پیشِ نظر رکھ کر جواب سے مستفیض فرمائیں گے،

مگر جواب حسبِ مراد نہیں آیا،

عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک ۱۹۱۲ء

۱۹۱۲ء میں دہلی کے اجلاسِ ندوہ کے زمانہ میں مولانا کو یہ خیال ہوا کہ موجودہ عربی مدرسوں کا انتشار ان کو کسی ایک سلسلہ میں منسلک ہونے سے مانع ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں جو طوائف الملوکی ہے وہ جس طرح اس کے ہر شعبۂ حیات

کو محیط ہے، عربی مدرسے بھی اُس کے احاطہ سے باہر نہیں، اور اس کے سبب سے عربی مدرسوں کی بہت سی خرابیاں اور بدانتظامیاں دور نہیں ہوسکتیں، اس خیال کا آنا تھا کہ مولانا نے سب سے پہلے حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس اوّل دارالعلوم دیوبند کو اس بارہ میں خط لکھا، موصوف نے اس کا جو جواب دیا وہ حسبِ ذیل ہے: "مکرّم والا درجت زید فضلکم تسلیم مع التکریم،

بوجہ تشریف آوریِ حجاج بندہ کو دہلی، میرٹھ، سہارن پور جانا ہوا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

آپ نے جو خیال لائق مدرس کی نسبت ظاہر فرمایا نہایت ضروری اور قابلِ اہتمام ہے، اس کا بندوبست ہونا چاہیئے،

جیسا آپ نے تصاویر کا انسداد فرمایا، اسی طرح دیگر جزئیات کی طرف وقتاً فوقتاً آپ کی توجہ نہایت مفید اور مؤثر ہوگی،

ایک مختصر مجمع میں جس میں چند حضرات بیرونی بھی شریک تھے، حالاتِ موجودہ پر کچھ بحث ہوئی، دو باتیں قابلِ اہتمام سمجھی گئیں، اوّل یہ کہ مرکز بنایا جائے یا نہیں، اور بنایا جائے تو کس کو؟ دوسری یہ کہ اس کی صورت کیا ہو، امر اوّل کو موجودین نے منظور کیا اور بالاتفاق مسئلہ مرکز کو مستحسن کہا، تعیینِ مرکز کی نسبت جو رائے ہوئی تو بعد گفتگو یہی قرار پایا کہ مدارسِ اسلامیہ بجز دیوبند اور کسی کی ماتحتی نہ پسند کر سکتے ہیں، اور نہ یہ امر مناسب ہے،

بقیہ حضرات سے استفسار کے بعد جو امر طے ہوگا اطلاع دونگا، امر دوم یعنی اس سلسلہ کی صورت اور شرائط و قیود کیا ہوں گی، یہ لمبی بحث ہے جو جملہ ارکین وغیرہ کے بدوں اس کا تصفیہ قابلِ اعتبار ناممکن ہے، بعد مشاورت، اگر کوئی امر قابلِ عملدرآمد طے ہوگیا تو جناب کو اطلاع دی جائے گی، آپ کسی

تجویز مفید سے اطلاع فرمائیں، تو غالباً اس وقت میں مفید ہوگی،

مجھ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو اور ہم کو یونیورسٹی سے کیا تعلق رکھنا مناسب ہے، غالباً آپ نے کوئی امر ضرور مقرر فرمالیا ہوگا۔" والسّلام بندہ۔ محمود حسن۔ دیوبند ۱۰ ربیع الاوّل ۲۹ھ

اس جواب کی بنا پر مدرسوں کی تنظیم کے خیال کو چھوڑ کر صرف مذہبی ضروریات کے لئے ندوۃ العلماء کی مرکزیت کی تجویز پیش ہو کر منظور ہوئی،

مدینہ یونیورسٹی کی تجویز ۱۹۱۳ء

۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ اور بلقان میں عیسائی بلقانی ریاستوں کی بغاوت نے دنیائے اسلام میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی، اسکی تاریخ اس زمانہ کے اخبارات کے صفحوں میں ہے، اس وقت دولتِ عثمانیہ کی امداد و تحفظ کے لئے ساری دنیا کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم، مولوی ظفر علی خاں اور بہت سے ہندوستانی اہلِ فکر مسلمانوں نے ٹرکی کا سفر کیا، اور وہاں کے اہل الرائے اکابر سے ملاقاتیں کیں، اسی سلسلہ میں یہ قرار پایا کہ مدینۂ پاک میں ایک مدینہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں سارے اسلامی ملکوں کے طالب العلم یکجا ہوں، اور اسلامی دنیا کے بڑے بڑے ماہرین علوم اس میں درس و تدریس کے لئے اپنے اوقاتِ عزیز کو وقف کریں، ہندوستان کی طرف سے اس میں مولانا شبلی اور ان کے عزیز و شاگرد مولانا حمید الدین صاحب کے نام لئے گئے، اس سلسلہ میں اس زمانہ کے "زمیندار" اور "الہلال" میں بہت سی تجویزیں زیر بحث آئی تھیں، مکاتیبِ شبلی میں بھی ۲۹ مئی ۱۹۱۳ء کے خط میں اس کا ذکر آگیا ہے، (ابو الکلام عبد الحکیم ۲) ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبد الباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:۔ "مدینہ یونیورسٹی کی تجویز

ہیں قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے تو ارُدھ ہوا، خیر لیکن بہت ضروری چیز ہے، افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کرسکوں، پہلی سی بات ہوتی تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا؟ (۵)

لیکن افسوس ہے کہ بلقان کے معرکہ میں ٹرکی کی ناکامی سے ان تجویزوں پر اوس سی پڑ گئی،

مسلم یونیورسٹی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء | "علی گڈھ تحریک" میں مسلم یونیورسٹی کا تخیل تمام تر سید محمود مرحوم کا ساختہ و پرداختہ ہے، سب سے پہلے اُن ہی نے ۱۸۷۳ء میں ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا جو کیمبرج و آکسفورڈ کی طرح حکومتِ وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، اس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے سرسید کی وفات کے بعد اس خیال کو آگے بڑھایا، اور اُس کو سرسید کی یادگار ٹھہرا کر ایجوکیشنل کانفرنس کے مقصد میں اُس کو داخل کر دیا، اُس وقت سے ۱۹۱۱ء تک جبکہ مسلم یونیورسٹی نے خواب کے بجائے تعبیر کی صورت اختیار کی کانفرنس کے ہر اجلاس کے صدر نے اس خوش آیند خواب کو دہرانا اپنے خطبہ کا ضروری حصہ قرار دے لیا تھا،

مولانا شبلی مرحوم کالج کے تعلق سے اس تحریک کی اندرونی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنونِ تعبیر نہ ہوگا، چنانچہ مئی ۱۹۰۱ء میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، کہ ندوہ میں چند لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کی اجازت دینا، اتنی ذراسی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی "؟ (۲۶)

لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونیورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں واقعی بنجائے گی، اُن میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا،

واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بیحد

جوش وخروش تھا، اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بیحد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی، اور ان کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی، حکام کے سامنے ان ناخوشگوار حالات کا تدارک ازبس ضروری تھا، اس کے لئے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر اسلامی تحریک شروع کردی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو ادھر سے اُدھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لیکر ہز ہائینس سرآغا خاں جو اُس وقت کے مسلم قومی رہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے آگے بڑھے، علی گڈھ پارٹی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہنمائی کی باگ نکل رہی تھی، اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لئے بھی یہ تدبیر کارگر ہوسکتی تھی، بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا، خود ہز ہائینس سرآغا خاں نے صوبوں کا دورہ کیا، اور بڑے بڑے امراء کے دروازوں پر خود جا جا کر دستک دی اور چندہ کی بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں، اور یوں بھی عام طور سے ملک کے مختلف حصوں میں چندوں کی وصولی کی کارروائی شروع ہوگئی اور تھوڑے دنوں کے بعد اکتیس لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری ہوگئی، مولانا نے اس کی تائید میں جنوری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں حسب ذیل نوٹ لکھا، "حکومتِ انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا، جو آج ایک یگانۂ قوم ہز ہائینس سرآغا خاں کی ذات سے وجود میں آئی، محمڈن یونیورسٹی ایک خواب تھا، جو گو نہایت خوشگوار و شیریں تھا، لیکن پھر بھی خواب تھا، ہز ہائینس موصوف نے اس کی تعبیر بتائی، اور بتائی نہیں بلکہ کرکے دکھا دیا، چھ کروڑ مسلمان اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے جو ایک ذاتِ واحد نے انجام دیا، خدا کرے وہ دن آئے کہ علی گڈھ میں مسلمان فیلو نظر آئیں، مسلمان تعلیمی اسکیم بنائیں، مسلمان نصابِ تعلیم تجویز کریں، فیلوشپ کی امیدواریاں ہوں، مسابقت ہو،

دونوں کی کشمکش ہو، اور فریق اور جج دونوں ہمیں ہوں۔" ؎

از ما بہ ما سلام وہم از ما بہ ما پیام　　رنج دلے مباد سلام و پیام ما

اس کے بعد ہی لکھنؤ میں اس کا وفد آیا، تو بڑی خوشی سے اس کی کوششوں میں شریک ہوئے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک فیاض مسلمان نے ندوہ کی طرف سے دس ہزار روپیے اس فنڈ میں داخل کئے، اس پر خوش ہوکر فروری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں دوسرا نوٹ لکھا: "ہز ہائینس سر آغا خاں بہادر کی سرپرستی میں محمڈن یونیورسٹی کا جو وفد لکھنؤ میں آیا، اس کا جس جوش، جس شان، جس خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا، وہ مدت تک اہل لکھنؤ کو یاد رہیگا، امیر و غریب، وکلاء، تاجر، بیرسٹر، عام، خاص، غرض ہر قسم کے لوگ اسٹیشن پر ہز ہائینس موصوف کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے، یونیورسٹی کے لئے چندہ کی جو فہرست کھولی گئی، اس میں بھی ہر قسم کے لوگوں نے اپنے نام لکھوائے، ندوۃ العلماء اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اگرچہ ابھی تک خود قومی فیاضیوں کا محتاج ہے، لیکن محمڈن یونیورسٹی کی تکمیل میں اس نے بھی نمایاں حصہ لیا، اور اپنی طرف سے دس ہزار کی رقم پیش کی، ممکن ہے، لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ندوہ کو جب خود اپنی تکمیل بلکہ اپنی بقاء کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے تو وہ دوسروں کی طرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے، ممکن ہے کسی کو یہ بھی خیال ہو کہ ندوہ کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ندوہ کے سرمایہ کو دوسرے کام میں لگائے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ رقم ندوہ کے سرمایہ سے نہیں دی گئی، بلکہ ندوہ کے ایک بہی خواہ نے اپنے پاس سے دی، باقی یہ کہ ندوہ خود محتاج ہے، تو اسلام میں اس ایثار نفس کی مثالیں موجود ہیں کہ محتاجوں نے محتاجوں کی شرکت کی ہے۔"

لاہور میں ہز ہائینس سر آغا خاں کی سرکردگی میں جو وفد گیا، اس کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے

چنانچہ وہیں اپنی یہ مشہور نظم پڑھی،

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد / کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم / الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد

بساطے تازہ چینیم و طرحے نو در اندازیم / کہ در بزم نوی پیشینیاں را نیز جا باشد

کنوں دہ سال شد کیں خواب نوشیں در نظر داریم / کہ خوابے ایں چنیں خوش و جاں نواز و جانفزا باشد

و لے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے / گماں بردیم کیں اندیشۂ از روے خطا باشد

گہے با خویش می گفتیم کآساں گردد ایں مشکل / و لے وابستۂ صد محنت و رنج و عنا باشد

بود آساں کہ چوں طفلاں دو نقشے کشتی و انگہ / بگوئی کیں در و بام است و ایں قصر و سرا باشد

و لے آساں نہ باشد درسگاہے را بنا کردن / کہ خود ہر گونہ گوں رنجوری ما را شفا باشد

دریں بودیم ما کز پردہ گاہ غیب سر بر زد / ہمایوں طلعتے کیں عقدہ را مشکلکشا باشد

سر آغا خاں کہ خود خواب است ایں تعبیر نوشیں را / چہ خوش باشد کہ خواب ما و تعبیر از خدا باشد

بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود / و لیکن کشتی اسلامیاں را نا خدا باشد

کنوں بینی کہ زود آں گلشن رنگیں بپا گردد
کہ شبلی ہم در و یک بلبل رنگیں نوا باشد

"مجلس تاسیس جامعۂ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط بنانے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی مولانا اُس کے بھی ممبر تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ یونیورسٹی کیا ہوگی، ۲۵ رمارچ ۱۹۱۱ئہ کو مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:- "یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا، یہ

قطعی ہی، باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خود جانتے ہیں لیکن بہرحال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہی" (۲۷)

اسی لئے وہ یونیورسٹی کمیٹی کے سارے کاموں میں شریک رہے، وزیر تعلیم سے گفتگو کرنے کے لئے جو وفد شملہ گیا تھا وہ اُس کے بھی ممبر تھے، راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں لکھنؤ میں یونیورسٹی کے اجلاس بار بار ہوتے تھے۔ ۱۰ راگست ۱۹۱۱ئ کو مولانا ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں :" یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں، بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے، میں بھی ممبر ہوں، اس لئے شریک ہوتا ہوں، اس کے بعد شملہ "ڈیپوٹیشن میں جانا ہے" (۳۱)

یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان بعض شرائط کے تصفیہ کا تھا، ان میں تین باتیں سخت متنازعہ فیہ تھیں،

(۱) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہو، اور گورنمنٹ "علیگڈہ یونیورسٹی" کہتی تھی

(۲) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں اُن کے الحاق کا اختیار رہو، گورنمنٹ اس کو تسلیم نہیں کرتی تھی، اور اب تک تسلیم نہیں کیا،

(۳) گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے متعلقہ امور کے آخری فیصلہ کا اختیار (ویٹو) اپنے حکامِ اعلیٰ کو دینے پر مُصر تھی اور رہے، مسلمان اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے،

اربابِ علی گڈہ متردد تھے کہ اہم مسائل میں عام مسلمانوں کو دخل اندازی کی حاجت ہی یا نہیں، بہرحال اس بحث کو طے کرنے کے لئے لکھنؤ کے قیصر باغ میں یونیورسٹی کا اساسی جلسہ (فونڈیشن کمیٹی) ۲۸ دسمبر ۱۹۱۲ئ کو ہوا جس میں ملک کے تمام اکابر اور رہنمایان ملت شریک تھے جس میں مولانا بھی تھے۔ اربابِ علی گڈہ، راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک طرف تھے،

اوراحرار کی جماعت مسٹر محمد علی (اب مولانا) اور مولانا ابو الکلام کی سیادت میں دوسری طرف تھی پہلے روز کے اجلاس میں محمد علی صاحب نے جلسہ میں نہایت جوش پیدا کیا، اور احرار کی سربراہی کی، لیکن دوسرے دن دفعتًہ معاملہ بدل گیا، واقعاتِ شبینہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہیں، بہرحال جلسہ میں یہ نظر آیا کہ محمد علی صاحب ارباب علی گڈہ کی حمایت میں ہیں، اور تنہا مولانا ابو الکلام ادہر ہیں، کہتے ہیں کہ جابجا کالج کے طلبہ جن کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا وہ نہایت اہتمام سے جلسہ کے اطراف میں باقاعدہ بٹھائے گئے، اور انھوں نے اس قدر جلسہ پر استیلا حاصل کرلیا کہ موافقین کا چیرز سے دل بڑھایا، اور مخالفین کو "شی شی" کی آواز سے مبہوت کردیا، مخالفین نے ہرچند بولنے کی کوشش کی ناکامی ہوئی، یہ واقعات اُس زمانہ میں نہایت اہم تھے،

اسی جلسہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ معاملات کے تصفیہ کے لئے وائسرائے کی خدمت میں ارکان کا ایک وفد بھیجا جائے تو خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی، مگر جب اُن کا نام بھی داخلِ وفد کرلیا گیا تو وہ چپ ہو گئے[۱]

ان میں سے ہر واقعہ پر مولانا کی متعدد نظمیں ہیں جو اُن کے اُردو کلیات میں جمع کردی گئی ہیں، جن صاحبوں کو شوق ہو وہ ان نظموں کو واقعات سے ملاکر دیکھ لیں، ان نظموں نے عام لوگو میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں نہایت گہری دلچسپی پیدا کردی تھی،

لطیفہ:- مولانا کے فارسی قطعہ کے دوسرے مصرع ع کہ "ایں سررشتۂ تعلیم ما درستِ ما باشد" کے جواب میں خوب فرمایا تھا ع "بشرط آنکہ ایں دستِ شما دستِ شما باشد"

---

[۱] خاکسار مؤلف اس جلسہ میں خود شریک تھا،

مذہبی اور قومی کام

وقف علی الاولاد
۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۲ء

اسلام میں اپنی اولاد اور عزیزوں پر بلکہ خود اپنے آپ پر وقف کرنا بھی جائز ہے، ہندوستان پر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو چونکہ یہ مسئلہ اُن کے قانون کے مطابق نہ تھا اس لئے انگریزی عدالتوں نے اس قسم کے مقدمات میں اپنے فیصلوں میں اس اسلامی قانون کو رد کر دیا، حالانکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر نہ صرف مسلمانوں کی جائداد کا تحفظ و بقاء موقوف تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے ان نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح بھی ہو سکتی تھی، جو اپنے آباء و اجداد کی جائداد کو نہایت بیدردی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اپنی ہوائے نفسانی پر قربان کر رہے تھے۔

سرسید نے اسی خیال سے اپنی لیجیلیٹیو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں "وقف خاندانی" کے نام سے ایک مسودۂ قانون کے پیش کرنے کی تیاری کی تھی، جس میں گورنمنٹ سے یہ چاہا تھا کہ ایسی وقف جائداد کی تولیت کا مسئلہ ہمیشہ حکام کی مرضی سے طے ہو، اور نیز یہ جائداد کسی سرکاری مطالبۂ مالگذاری میں ضبط نہ ہو، مگر ایک طرف بعض علماء نے اس سے اختلاف کیا اور دوسری طرف سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے اُن کو بتایا کہ گورنمنٹ اس قانون کو اس لئے منظور نہیں کر سکتی کہ ولایت کے مقننوں کی یہ قطعی رائے قرار پا چکی ہے کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لئے ناقابلِ انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے[1]،

[1] حیات جاوید حصہ اوّل صفحہ ۲۳۹۔

جسٹس مولوی سید امیر علی صاحب جس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے، وقف کے ایک مقدمہ میں (امیر محمد اسماعیل بنام منشی چرن گھوش) اس مسئلہ کے جواز کے تمام دلائل لکھے، لیکن حکام پریوی کونسل نے ۱۸۹۴ء میں (بہ مقدمۂ ابوالفتح بنام راس مایا دھر چودھری مندرجہ جلد ۲۲ ترجمہ انڈین لار پورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء) ان دلائل کو ناکافی خیال کیا، اور "وقف علی الاولاد" کو ناجائز قرار دیا، اس وقت سے مسلمانوں کو برابر یہ خیال رہا کہ اس غلط فیصلہ کی تصحیح کی جائے، چنانچہ خود مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی کے مشہور رسالہ "نائین ٹینتھ سنیچری" میں اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلل مضمون لکھا، لیکن وہ بھی بے اثر رہا، بعد ازاں کلکتہ کے ممتاز وکیل مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے ایک نہایت مدلل و مفصل رسالہ لکھ کر بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک عرضداشت کے ساتھ بھیجا، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے جب وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے اُس وقت کے وزیر ہند سے کہکر اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن یہ تمام پرزور کوششیں اور یہ با اثر شخصیتیں اس لئے ناکامیاب رہیں کہ اس منزل کے طے کرنے کا جو راستہ تھا سب اُس سے الگ جاتے تھے،

سب سے مقدم بات یہ تھی کہ گورنمنٹ کے کانوں تک جو صدا پہنچائی تھی، وہ عام صدا ہونی چاہئے تھی لیکن اب تک جو کچھ کیا گیا تھا، وہ انفرادی حیثیت سے کیا گیا تھا، مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم کے مضمون کی خوبی میں کیا کلام ہوسکتا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شخص خاص کا خیال تھا، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے بے شبہہ اس کے آگے ایک قدم بڑھایا تھا، اور بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے درخواست بھیجی تھی لیکن یہ ایسوسی ایشن کل ہندوستان

کیا کل بنگال کی زبان بھی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ ملک کو اس درخواست کی خبر بھی نہیں ہوئی، اور گورنمنٹ نے مارچ ۱۹۰۸ء میں صاف جواب دیدیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے پریوی کونسل کا فیصلہ جو اس کے خلاف ہی منسوخ ہونا چاہیئے، لیکن جو لوگ یہ صدا بلند کرتے تھے، وہ مسلمانوں کے مذہبی لیڈر یا پیشوا نہ تھے، اس لئے اُن کی آواز مذہبی آواز نہیں ہوسکتی تھی، لیکن مولانا نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا اُس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ تھے،

مولانا کا خیال اس مسئلہ کی طرف ۱۹۰۸ء کے شروع میں رجوع ہوا، اس وقت اُن کے سامنے چند امور قابلِ غور تھے،

۱- آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مسئلہ مذہبی مسئلہ ہے یا نہیں؟

۲- اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیونکر اس کا یقین دلایا جاسکتا ہے،

۳- گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلہ میں مداخلت کرسکتی ہے یا نہیں؟

چونکہ دفعہ اول میں اُن کو کوئی شبہہ نہ تھا اس لئے دفعہ دوم اور سوم کے متعلق انھوں نے قوم کے اکثر نامور قانون دان اور سربرآوردہ اصحاب مثلاً سید علی امام بیرسٹر پٹنہ پریسیڈنٹ مسلم لیگ، مولوی مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ، مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور، نواب سید امیر حسن خاں کلکتہ، مولوی حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ، نواب وقار الملک بہادر علی گڈہ، سید ظہور احمد صاحب بیرسٹر لندن، مولوی محمد شریف آنریری سکریٹری وقف کمیٹی لندن، مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائیکورٹ کلکتہ، مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ، نواب نصیر حسین خاں خیال کلکتہ، نواب عماد الملک مولوی

سید حسین بلگرامی وغیرہ سے خط کتابت کی، فروری اور مارچ ۱۹۰۸ء میں ان میں سے اکثر صاحب نے خطوط کے جواب دیئے، جن کا خلاصہ انجمن وقفِ اولاد کی کارروائی میں درج ہے سب نے متفقاً کامیابی کی امید ظاہر کی اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا، اور خواہش کی کہ صحیح طریقہ سے اس تحریک کو جاری کیا جائے،

ان تمام بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اس سلسلہ کے متعلق گورنمنٹ کو یقین دلایا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مسئلہ مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ پہلے اس کو علماء کے سامنے پیش کیا جائے، ندوۃ العلماء کا جلسۂ عام دارالعلوم کے سنگِ بنیاد کے سلسلہ میں نومبر ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ میں ہو رہا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے اس مسئلہ کو ایک تجویز کی صورت میں پہلے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا، مولوی خلیل الرحمان صاحب کے سوا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا، اور طے پایا کہ تمام ہندوستان کے علماء سے پہلے فتوے حاصل کئے جائیں، اس کے بعد آگے کارروائی کیجائے، یہی تجویز ندوہ کے اس کھلے اجلاسِ عام میں پیش ہو کر منظور ہوئی، اس منظوری کے بعد کام شروع کر دیا، عام اعلان کے لئے ۲۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو الندوہ میں ایک کھلا خط شائع کیا، جس میں کام کے حسبِ ذیل مراتب مقرر فرمائے،

(۱) ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے، جس میں ثابت کیا جائے کہ وقفِ اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلّم اور قطعی مسئلہ ہے،

(۲) اس رسالہ پر تمام علماء ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں،

(۳) اس رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے،

(۴) ہندوستان کے ہائیکورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقفِ اولاد کو ناجائز قرار دیا ہو ان دلائل سے تعرض کیا جائے، اور اُن کی غلطی دکھائی جائے،

(۵) ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے کہ چونکہ وقفِ اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اس لئے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کردی جائے،

(۶) اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کراکے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے،

ان تمام امور کے انجام دینے کے لئے ایک رقم کی ضرورت ہے، جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہو سکیں، اس بنا پر ہم تمام مسلمانانِ ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاکسار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ وجوہ مفصلۂ ذیل میں سے کس قسم کی شرکت کر سکتے ہیں۔

(۱) مشورہ اور رائے میں شرکت،

(۲) چندہ میں شرکت،

(۳) رسالہ کی ترتیب اور تیاری، قانونی مشورہ، اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت،

لوگوں نے بڑی خوشی سے ان تینوں کاموں میں شرکت کا وعدہ کیا،

اس کے بعد ندوۃ العلماء کی تجویز کے مطابق مولانا نے تمام علماء سے استفتا کیا، سب سے پہلا فتویٰ مولانا فضلِ حق[1] صاحب رامپوری مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیۂ رامپور نے لکھا، اور اُس کے بعد عام طور سے

---

[1] شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب و مولانا عبدالحق خیرآبادی و رکن ندوۃ العلماء، افسوس کہ مولینا نے سنہ ۱۹۴۰ء ۱۳۵۹ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں وفات پائی، بڑے پایہ کے مدرس تھے، اخیر عمر تک درس و تدریس میں مصروف رہے

علما نے اس پر دستخط ثبت فرمائے بعضوں نے کچھ اور عبارتیں اور حوالے بھی بڑھائے، عموماً دونوں مذہب (شیعہ وسنی) کے علما نے متفقاً فتوے لکھا کہ یہ مسئلہ شریعت اسلام کا مسلّم مسئلہ ہے، اور پشاور سے بنگال تک کے علما نے اس فتویٰ پر دستخط کئے، اور جب اکثر جگہ سے فتاوے آگئے تو مولانا نے خود اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلّل رسالہ لکھا جس میں پریوی کونسل کے تمام دلائل کے جواب دیئے، اور مسئلہ کی شرعی مصلحتیں ظاہر فرمائیں اور ندوۃ العلما کے جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۲ مئی سنہ ۱۹۰۹ء میں اس کو پیش کیا، جلسہ نے اس کے متعلق حسب ذیل رزولیوشن منظور کئے،

۱- رسالہ وقف علی الاولاد جو اس مسئلہ پر لکھا گیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جائے، مع اُن فتووں کے جو علما نے لکھے ہیں، نیز علماے حرمین سے بھی فتوے حاصل کئے جائیں، اور مصر میں اس کے متعلق جو فیصلے عدالتوں میں ہو چکے ہوں وہ بہم پہنچائے جائیں،

(۲) ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے، اور ہندوستان کے تمام مقتدر مجالس سے اس میں مدد لیجائے،

(۳) ایک عرضداشت اس کے متعلق تیار ہو جس میں گورنمنٹ سے خواہش کی جائے کہ وہ شریعت اسلام کے موافق قانون تیار کر دے،

(۴) اس عرضداشت پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرائے جائیں، اور دستخط کے بعد وہ ایک معزز اور مقتدر ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کیجائے،

ان ضروری مراتب کے طے ہو جانے پر مئی سنہ ۱۹۰۹ء سے مولانا نے عملی کارروائیاں شروع کیں، بزرگان قوم سے مجلس وقف کی ممبری قبول فرمانے کی درخواست کی، عرضداشت پر

دستخط کرانے کے لئے فارم تیار کرا کے نہایت کثرت سے شائع کئے، اور متعدد آدمیوں کو مقرر کیا، جنھوں نے دورہ کر کے ہر طبقہ کے لوگوں سے اس پر دستخط کرائے، ان دستخطوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو گئی،

تمام کارروائیوں کے لئے ایک معتد بہ رقم کی ضرورت تھی، اس لئے چندے کی تحریک کی، اہلِ خیر نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا، چنانچہ لاہور، بہار، مدراس سورت اور بعض دوسرے شہروں میں اس کی اعانت وہمدردی کے لئے نہایت شاندار جلسے ہوئے اور لوگوں نے بخوشی چندے دیئے،

۱۹۱۰ء میں شیعہ کانفرنس نے بھی اس کی تائید میں ایک خاص رزولیوشن پاس کیا، اُسی سال جنوری میں مسلم لیگ کے اجلاسِ دہلی میں بھی ایک خاص رزولیوشن منظور ہوا جس کی تحریک مولوی عزیز مرزا مرحوم نے کی جو اُس وقت لیگ کے سکرٹری تھے، مولانا نے بھی صدر انجمن مسلم لیگ کے ایماء سے اس مسئلہ پر تقریر کی، اور یہ طے ہوا کہ ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے الگ الگ میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں جائیں اور حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجنا قرار پائے تو ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر بہ تعداد مساوی شریک ہوں اور مشترکہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، کیونکہ یہ مسئلہ پولیٹکل اور مذہبی دونوں حیثیتیں رکھتا ہے اس لئے دونوں حیثیتوں سے گورنمنٹ کی خدمت میں سفارت جانی چاہئے،

مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کا جو جلسہ دہلی میں ہوا، اس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا، اور مولانا نے اس کی اصلیت اور صورتِ شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی، اور اس وقت تک اس کے متعلق

جو کچھ کارروائی ہو چکی تھی اُس کو پیش کیا، مولانا کے بعد شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا، چودھری سلطان محمد خاں بیرسٹرایٹ لا، مولانا سید عبدالحئی صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور چند دیگر اشخاص نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی، اور آخر میں شیخ عبدالرحیم صاحب تاجر چرم کی طرف سے وقف علی الاولاد فنڈ کے لئے پانچ سو روپیہ کے چندے کا اعلان ہوا۔

اسی سال میموریل کا مسودہ جس کو مئی سنہ ۱۹۱۰ء میں غالباً سرتیج بہادر سپرو (الٰہ آباد) نے تیار کیا تھا، (شروانی ۸۱) شائع ہوا، اور ملک کے مقنن اور اہل الرائے کی خدمت میں ترمیم و اصلاح کے لئے روانہ کیا گیا، انگریزی اور اُردو اخبارات میں بھی اس کی ایک ایک کاپی بھیجی گئی، لیکن غالباً یہ میموریل قابلِ اعتماد ثابت نہیں ہوا، اس لئے مولانا نے اس کے لکھوانے کے لئے قابل ترین اشخاص کی جستجو کی، اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اُس کے لکھنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر یہ شرط کی کہ مولانا خود حیدرآباد آئیں، مگر ندوہ کی ضرورتوں کی وجہ سے وہ نہ جا سکے، (شروانی ۸۸) جب ہندوستان میں کوئی شخص اس قابل نہ ملا تو جنوری سنہ ۱۹۱۱ء میں تمام کاغذات لندن میں ایک ایسے بزرگ (غالباً مولوی امیر علی) کے پاس روانہ کئے، جن سے بڑھ کر کسی کو اس مسئلہ پر لکھنے کا حق حاصل نہ تھا۱؎۔

اسی زمانہ میں کونسل کی اصلاح و ترقی (ریفارم) کی وہ اسکیم ہندوستان میں جاری ہو گئی جس کو "منٹو مارلے ریفارم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس اسکیم کے نفاذ نے "وقف علی الاولاد" کی کوششوں کا راستہ آسان کر دیا، یعنی اب کونسل کو وضع قوانین کا تھوڑا بہت اختیار حاصل ہوا، اس لئے مولانا نے اس تجویز کو وائسرائے کی کونسل کے مسلمان ممبروں کے اندر ہر ممکن طریقہ

۱؎ شذرات الندوہ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

سے کامیاب بنانا شروع کر دیا، اس کے لئے بار بار کلکتہ جا کر مسلمان ممبروں سے گفتگو کی، اور انھوں نے اس کی تائید پر پوری آمادگی ظاہر کی، ان میں سب سے پیش پیش مولوی مظہر الحق مرحوم بیرسٹر پٹنہ تھے[1]، انھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے اثر سے ہندو ممبروں کو بھی اس کی تائید کے لئے آمادہ کیا،

ان مختلف کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ سارے ملک میں اس مسئلہ کے متعلق ایسی پُرزور آواز پیدا ہوئی کہ گورنمنٹ بھی اس کے سننے سے انکار نہ کر سکی، چنانچہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس میں جب مسٹر محمد علی جینا نے کونسل میں سوال کیا کہ گورنمنٹ اس تحریک سے جو اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے واقف ہے یا نہیں؟ اور اُس کے لئے وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ تو گورنمنٹ نے صاف اعتراف کیا کہ یہ صدائیں اُس کے کانوں میں آچکی ہیں، لیکن وہ خود قانون بنانا نہیں چاہتی، بلکہ جو صورت اس کے متعلق مسلمان پیش کریں گے اس پر غور کرنے کے لئے وہ آمادہ ہے، اس جواب سے لوگوں کو ہمت بندھی، اور آخر مولوی مظہر الحق، مسٹر جینا اور دوسرے قانون داں ممبروں کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ آیندہ اس مسئلہ کو ایک بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا جائے، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو مسٹر جینا نے اس مسئلہ کو وقف بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا، اور اس پر ایک مفصل تقریر کی جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک، ندوۃ العلماء کی تجویز اور مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں اور تجویزوں کا ذکر کیا، اور مولانا موصوف نے جو رسالہ پریوی کونسل کے دلائل کے جواب اور مسئلہ کی فقہی حیثیت کی تشریح میں لکھا تھا، اُس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا، اور بتایا کہ مسلمانوں میں مولانا کا علمی پایہ

[1] شذرات الندوہ نومبر ۱۹۱۰ء

کتنا اونچا، اور مسلمانوں میں اُن کی وقعت کس درجہ ہے، اور اس بنا پر اُن کی رائے کا وزن کتنا ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہہ کر اس کے اقتباسات جگہ جگہ سے پڑھ کر سنائے، اور بتایا کہ مولانا کی زیر نگرانی علماے ہند کی مشہور مجلس ندوۃ العلماء کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا جا رہا ہے، جو یا تو گورنمنٹ میں پہنچ چکا ہوگا، یا پہنچ رہا ہوگا، اور جس پر ہزاروں مسلمانوں کے دستخط ثبت ہیں،

آخر میں انھوں نے وقف اولاد کا بل پیش کیا، اور اُس کے دفعات کی تشریح کی،

اس کے بعد سب سے پہلے مہاراجہ بردوان نے مختصراً اور آنریبل مسٹر سچدانند سنہا (بیرسٹر پٹنہ) نے پوری تفصیل سے اس کی تائید کی، ان کے بعد نواب عبد المجید صاحب بیرسٹر الٰہ آباد نے مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلماء کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا، اور رسالۂ مذکور کے بعض دوسرے ضروری اقتباسات کا اضافہ کیا، بعد ازیں راجہ دیگھاپتیا، مولوی شمس الہدیٰ صاحب وکیل کلکتہ، نواب سید محمد بہادر مدراس، مسٹر سوبہ راؤ، بابو بھوپندر ناتھ باسو، مسٹر گوکھلے، اور سب سے آخر میں مولوی مظہر الحق مرحوم نے تقریر کی، اور ہندو ممبروں کی اس پُر جوش تائید کا شکریہ ادا کیا، آخر میں مسٹر جناح نے اس بل کو بزبان انگریزی گورنمنٹ گزٹ میں اور صوبہ کی حکومتوں میں مختلف زبانوں میں شائع کرنے کی تجویز پیش کی،

گورنمنٹ ممبر نے جواب میں کہا کہ گورنمنٹ مسودہ کو عام طور پر شائع کر کے مسلمانوں کی عام رائے کا انتظار کرے گی، چنانچہ گورنمنٹ نے ملک کے تمام حصوں سے رائیں طلب کیں، اور ہر جگہ سے متفقہ رائیں آئیں،

مسٹر جناح نے جو بل پیش کیا تھا اُس کے بعض دفعات سے مولانا کو اختلاف تھا، اس لئے بمبئی جا کر وہ خود مسٹر جناح سے ملے[1]، اور اُن کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا … انھوں نے اس کے مطابق

[1] مکاتیب عبد الباری ۱۰

اپنے بل میں اصلاح منظور کرلی، بہرحال جولائی ۱۹۱۱ء تک یہ کام باقی رہ گیا کہ میموریل بل کے قانونی وشرعی اصلاحات کے ساتھ چھپواکر اور اعیان واکابر سے دستخط کراکر وائسرائے کی خدمت میں بھیجدیا جائے، اس غرض سے مولانا نے ہوم ممبر سے جن سے تمام قوانین کا تعلق تھا خط وکتابت کی، اور لکھا کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن کی پذیرائی قبول کریں جو اُن کو تمام کاغذات سمجھائے، چنانچہ انھوں نے نہایت خوشی سے اس کو منظور کیا، اور ڈیپوٹیشن کے لئے ایک تاریخ مقرر کی لیکن یہ تاریخ قطعی ویقینی نہ تھی اس لئے ٹل گئی، ۱۹۱۲ء کے اوائل میں مولانا خود کلکتہ تشریف لے گئے، اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کرکے تمام مراتب طے کئے، اور یہ توقع قائم ہوگئی کہ اسی مہینہ میں بل حسبِ مراد پاس ہوجائیگا، اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی، چنانچہ یہ توقع پوری ہوئی، اور گورنمنٹ نے اصولاً وقف علی الاولاد کو تسلیم کرلیا، اور اس کے جزئیات ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں طے ہوگئے[1] مولانا کی چارسال کی جدوجہد، تگ ودو اور سعی ونسنت کا نتیجہ حسبِ مراد نکل آیا، اور مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی، جس سے ہزاروں گھرانے تباہی سے بچ گئے،

تعطیلِ جمعہ ۱۹۱۲ء سرکاری دفاتر اور انگریزی مدارس کے اوقات چونکہ عموماً ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک رکھے گئے ہیں، اس لئے مسلمان عہدہ داروں اور مسلمان ٹیچروں اور طالب علموں کو جمعہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، اگرچہ یہ افسوسناک بات ہو کہ جدید تعلیم کے اثر سے خود مسلمانوں میں فرائضِ مذہبی کی پابندی کا بہت کم احساس باقی رہ گیا ہے، تاہم بہرحال یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اور کوئی مسلمان اپنے اس حق سے دست بردار ہونا نہیں پسند کریگا، مولانا کو وقف علی الاولاد کے معاملہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی

[1] مکتوب بنام شروانی ۹۲ و ۹۳ و ۹۴،

اس نے اُن کے حوصلہ کو بہت کچھ بڑھا دیا، اور انھوں نے اسی سلسلہ میں تعطیلِ جمعہ کی طرف بھی توجہ کی
اور اس کو گورنمنٹ کی خدمت میں اسی طرح پیش کرنا چاہا جس طرح وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو
پیش کیا تھا، چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں جو لکھنؤ
میں ہوا تھا، اس مسئلہ کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا، جو منظور کیا گیا، اس کے بعد انھوں نے
اس کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی جس میں بہ ترتیب حسبِ ذیل متعدد دلیلوں کی بنا
پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیا،

۱- انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو
یہ آزادی دیتی ہے کہ وہ بہ اطمینانِ تمام اپنے اپنے فرائضِ مذہبی کو بجا لاسکیں،

۲- جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو معذور و مجبور نہ ہو فرض قطعی ہے،

۳- چنانچہ جمعہ کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے،

۴- اس نماز کی اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں میں اس دن
تعطیل ہوتی ہے،

۵- یہاں تک کہ ہندوستان کی اکثر ہندو ریاستوں میں بھی باوجودیکہ وہاں مسلمان ملازموں
کی تعداد نسبتہً کم ہے اس دن تعطیل ہوتی ہے،

۶- انگریزی عملداری کے شروع میں چونکہ مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت ایک
غیر حکومت ہے، وہ ہمارے مذہبی فرائض کا لحاظ کیوں کرنے لگی، اس لئے انھوں نے اس درخواست
کی ہمت نہیں کی، لیکن بعد کو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی انصاف پسندی کا جیسے جیسے تجربہ

ہوتا جاتا ہے، اُن کی یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری فرض کے ترک کی طرف گورنمنٹ کو متوجہ کریں،

۷۔ آیندہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی، مسلمان سرکاری ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی جائیگی اور اُسی مناسبت سے نماز جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ روز بروز اہم ہوتا جائے گا،[1]

مولانا کے اسی مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر انگریزی میموریل تیار ہوا، اور تمام مسلمانوں سے اس پر دستخط کرانا چاہا، چنانچہ ۵ ار اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "تعطیل جمعہ کی نسبت جابجا جو کچھ کارروائیاں ہو رہی ہیں، آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے لیکن جب تک وقف اولاد کی طرح متحدہ، پُرزور اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائے گی کامیابی نہ ہوگی، میں نے انگریزی میں میموریل لکھوالیا ہے، اور اس کو چھپوا کر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی کارروائی شروع کرنی چاہتا ہوں، لیکن اس معاملہ کے آخر تک پہنچانے کے لئے کم از کم چار پانچسو روپیہ کی رقم درکار ہوگی، آپ اس سرمایہ میں جو کچھ عنایت فرما سکیں مطلع فرمائیں۔" (۱۰۵)

ان اغراض کے لئے مولانا نے جس رقم کی درخواست کی تھی وہ نہایت آسانی سے جمع ہو گئی، اور اب اس کام میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، کام شروع تھا کہ مارچ ۱۹۱۳ء میں مسٹر غزنوی (بنگال کے ممبر) نے بنگال کونسل میں اس کے متعلق گورنمنٹ سے سوال کیا، سرکاری ممبر نے اس کا جواب تشفی بخش دیا، اور گورنمنٹ بنگال نے نماز جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کرلی اس پر مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور نے مولانا کو لکھا کہ اب اس تحریک کو آگے چلانے کی ضرورت نہیں،

---

[1] مولانا کا یہ پورا مضمون مقالات شبلی حصہ ہشتم ص ۲۹ میں ہے [2] مکاتیب حصہ دوم سلیمان ۱۰۔۴،

(ریاض حسن ۱۲ وشروانی ۱۰۷) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا خیال تھا کہ کامیابی ناممکن ہو (شروانی ۱۰۰)
لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات نے اس سے موافقت نہیں کی، چنانچہ مولانا نے ایک اور
میموریل تیار کرایا، جس میں بنگال گورنمنٹ کے فیاضانہ حکم کا حوالہ دے کر گورنمنٹ سے خواہش
کی کہ جمعہ کو دو گھنٹوں کی تعطیل کے بجائے ایک بجے سے آدھے دن کی عام تعطیل دی جائے
اس مطالبہ کا حق بجانب ہونا حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا: "گورنمنٹ بنگال تمام مسلمانوں کے
شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے نہایت فراخدلی سے مسلمانوں کی اپیل نہایت توجہ سے سُنی، اور مسلمان سرکاری
ملازموں کو جمعہ کے دن دو گھنٹہ کی رخصت عطا کی، اس میں شبہ نہیں کہ یہ رعایت ادائے مذہبی فرائض
کو دیکھتے ہوئے کافی ہے، لیکن اس طرفدارانہ انتظام میں ایک خطرہ ہے جو تمام اہل اسلام کے خوف کا
موجب ہوسکتا ہے، خاصکر اس خطرہ کا اثر سبارڈینیٹ سروس (ماتحت اسامیان) پر پڑتا ہے، خطرہ
یہ ہے کہ بہت سے افسر ایسے بھی ہوں گے جو ایسے مسلمانوں کو اپنی ماتحتی میں لینا ناپسند کریں گے جو ہر جمعہ
کو دو گھنٹہ کے لئے کام چھوڑ کر چلے جایا کریں گے، اور چونکہ ایسی اسامیاں جیسے تجویز نویس، محرر، نقل نویس
وغیرہ وغیرہ ایسے ہی افسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اس لئے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ایسی اسامیوں پر مسلمانوں
کے مقابلہ میں جو دو گھنٹہ کے لئے چلے جایا کریں گے، غیر مسلمان ملازموں کو ترجیح دی جائے گی، جو ہر
روز اور ہر وقت اُن کے ساتھ کام کیا کریں گے، اگر اس خطرہ کی کوئی اصلیت ہوسکتی ہے تو ایسے
طرفدارانہ انتظام سے مسلمان سرکاری ملازموں کی آیندہ امیدوں اور ترقیوں پر سخت اثر پڑیگا،
لہذا حضور والا کے ملتمسین یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نصف دن کی تعطیل
ایک بجے سے اس ضرورت کے لئے کافی ہوگی، بلاشبہہ اس رعایت سے ایک حد تک کام پر اثر

پڑے گا، لیکن حضور والا کے خدام بصد ادب ملتجی ہیں کہ اس نقصان کی تلافی بھی آسانی سے کی جاسکتی ہے، بہت سی عدالتوں اور دفتروں میں سنیچر کے روز نصف دن کی تعطیل بالکل فضول ہوتی ہے، بجائے سنیچر کے جمعہ کے دن آسانی کے ساتھ ایسی تعطیل کی جاسکتی ہے۔"

یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ مولانا نے انتقال فرمایا، اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین کو نماز جمعہ میں جانے کی اجازت مل گئی یعنی اگر وہ چاہیں تو آدھ گھنٹہ کی چھٹی لیکر جاسکتے ہیں اور اسکولوں میں یہ سفارش کی گئی کہ یا تو اسکول صبح ایک بجے تک ختم کردیا جائے یا ایک بجے جو لڑکے اور مدرس نماز کو جانا چاہیں، ان کو آدھ گھنٹہ کی چھٹی دے دیجائے،

افسوسناک لطیفہ جن دنوں مولانا نماز جمعہ کی تعطیل کی کوشش کر رہے تھے اکثر فرماتے تھے کہ تعطیل کی کوشش تو ہو رہی ہے مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ کہیں تعطیل ہو جائے اور مسلمان نماز پڑھنے نہ جائیں تو ان کی کیسی جگ ہنسائی ہوگی،

اوقافِ اسلامی ۱۹۱۴ء ہندوستان میں اسلامی اوقاف کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے، اس سے کون واقف نہیں، مولانا کا دل بھی اسلامی اوقاف کی تباہی و بربادی سے کڑھ رہا تھا خصوصیت کے ساتھ وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں ان کو اسلامی اوقاف کی جو کیفیت معلوم ہوتی رہی اس سے ان کے دل کا زخم اور بڑھتا رہا، اور خصوصیت کے ساتھ اس لئے کہ اوقاف کی کثیر رقم بیکار پڑی رہنے کے باوجود قومی اور مذہبی ضرورتوں کے واسطے جس مشکل سے ایک ایک جیب سے ایک ایک دانہ جمع کرکے انبار لگانا پڑتا ہے اس سے خوب واقف تھے، غرض ان مختلف اسباب سے مولانا نے وقف علی الاولاد کی کامیابی کے بعد عام اسلامی اوقاف کے حسنِ انتظام و اہتمام کی طرف

توجہ فرمائی،

مولانا سے پہلے بھی قوم کے کارکن اور ذی احساس افراد نے ادھر توجہ کی تھی، اور اُن کے مداخل و مصارف کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہا تھا، چنانچہ مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی کی طرف متوجہ ہو، لیکن گورنمنٹ نے یہ جواب دیا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ ان اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں نہیں صرف کی جاتی، اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی، اور ایسا ضروری معاملہ جوں کا توں رہ گیا،

مولانا نے وقفِ اولاد کے بعد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، اور جنوری ۱۹۱۴ء میں ایک عام خط[1] شائع کیا جس میں حسبِ ذیل تجویزیں پیش کیں،

۱- ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہو، جو اس کی تدبیروں پر غور کرے، اور کوئی صحیح اور متعین اور قابلِ عمل طریقہ تجویز کرکے ایک اسکیم بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے اور فیصلہ کے بعد اُس پر عمل کیا جائے،

۲- ایک میموریل تیار کیا جائے جس میں انتظامِ اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے، اور اس میموریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ میموریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے،

۳- گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقہ کی ہو کہ مذہبی دست اندازی

[1] یہ خط مقالات شبلی جلد ہشتم ص۲۶ میں موجود ہے،

کا کسی طرح احتمال نہ پیدا ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقہ پر انتخاب کئے جائیں اور انتخاب کی تمامتر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے، اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے لئے دیئے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے، اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۴۔ تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کے لئے ایک خاص عہدہ دار مقرر تھا جسکو صدرُالصدور کہتے تھے. کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے، لیکن صدرالصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو، تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔

مولانا نے جنوری ۱۹۱۴ء میں یہ تحریک کی تھی، اور فروری ۱۹۱۴ء ہی میں گورنمنٹ نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شائع کی اور اسی مہینہ میں اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے ایک کانفرنس بٹھانا چاہا (سلیمان ۶۶) خوشی میں مولانا شروانی صاحب کو ۱۶ فروری ۱۹۱۴ء کو ان لفظوں میں اس کی خبر دی:- "ع انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم"

آپ نے دیکھا، ادھر اوقافِ اسلامی کی تحریک شروع ہوئی، اودھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی، اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے، خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔

ع آگے نصیب ہی، جسے پروردگار دے۔

لیکن افسوس کہ اسی سال مولانا کا انتقال ہوگیا، تاہم اوقاف کی نگرانی اور انتظام کے متعلق جو تحریک چل چکی تھی وہ مردہ نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ نے اور صوبہ کی اسمبلیوں اور کونسلوں نے اس کو جاری رکھا، اور بالآخر مختلف صوبوں میں اس کے لئے پہلے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہوئیں اور ان کی سفارش سے نگرانی اور حسابات کی پڑتال کی ایک صورت قائم ہوگئی، گو مولانا کی خواہش اور مسلمانوں کے مطالبہ سے وہ بہت کم ہے، اسی طرح ہندوستان میں صدرالصدوری یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی اسی تجویز کی صدائے بازگشت ہیں،

اشاعتِ اسلام ۱۹۰۸ء۔ ۱۹۱۳ء	ہندوستان میں ۱۹۰۸ء کا زمانہ اسلام کے لئے عجیب کشمکش کا زمانہ تھا، ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں سینکڑوں ہزاروں راجپوت، جاٹ،

میواتی، اور دوسرے ہندو خاندان مسلمان ہوگئے تھے، ان میواتیوں کی تعداد بہت کافی ہے، یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے اور کس نے اُن کو مسلمان کیا کہ اس وقت سے لیکر آج تک نہ پورے مسلمان ہوئے نہ ہندو ہی رہے، وہ اپنے کو نام کا مسلمان تو ضرور کہتے تھے، مگر ان میں بہت سے رسوم ہندؤں کے بھی جاری تھے، بلکہ بعض کے تو نام تک ہندوانہ تھے، ان کی تعداد لاکھوں کے قریب ہے، اور حدودِ راجپوتانہ سے لے کر دہلی و آگرہ تک پھیلے ہیں، آریہ مبلغ معلوم نہیں کب سے اس شکار کی تاک میں تھے، اور اُن کو دوبارہ ہندو بنانے کے لئے تیاریاں کررہے تھے، ۱۹۰۸ء میں یک بیک یہ راز طشت ازبام ہوا، تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی، اور ہر طرف اس کی مدافعت اور بچاؤ کی کوششیں شروع ہوگئیں، مولانا بھی ضعف اور بیماری کے باوجود اس فتنہ کے انسداد کے لئے فوراً کمربستہ ہوگئے، مارچ ۱۹۰۸ء میں کرنل

عبدالمجید خاں وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ نے جو خود مسلمان راجپوت تھے پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس قائم کی، اور شاید اس لئے کہ مولانا بھی راجپوت نسل سے تھے اُن کو اس جلسہ میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ سخت مصروفیتوں کے باوجود وہ جاکر اُس میں شریک ہوئے،

۱۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو "نومسلم راجپوت اور حفاظتِ اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ ان نومسلموں کے ارتداد کا اصلی سبب مذہبی جہالت ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب حقیقت کا اظہار فرمایا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے، فرمایا "ان نومسلموں کی مذہبی جہالت تو سب کو معلوم ہے لیکن جس جدید تعلیم کے پھیلانے پر اتنا وقت اور سرمایہ صرف کیا جارہا ہے اُس کے مذہبی تعلیم سے سراسر خالی ہونے کی بنا پر اس سے بھی اسی قسم کے نتیجہ کا ڈر ہے"۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:- "سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ ان نومسلمون کے مرتد ہوجانے کا سبب کیا ہوا، اس کا جواب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام اور اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے، ان کا اسلام صرف نام کو اسلام تھا، اس لئے ذرا سی فریب کاری اور دھوکہ سے یہ عارضی رنگ اڑ گیا، یہ جواب بلاشبہ صحیح اور سرتاپا صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی مخفی آواز نہیں آرہی ہے؟

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائدِ اسلام کے استحفاظ کا کوئی بندوبست ہے؟ کیا اس میں تاریخِ اسلام کا کوئی معتدبہ حصہ شامل ہے؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟

بے شبہہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کے آثارات نظر آتے ہیں، لیکن یہ پچھلی و موجودہ سوسائٹی کی بقیہ یادگاریں ہیں"۔

له مکاتیب حمید ۴۱ - ہمدرد ۱۵ فروری

کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ اخباروں میں یہ مضامین مسلمان لیڈروں[1] کی طرف سے شائع ہوتے تھے، کہ اسلام کا قانونِ وراثت بدلنے کے قابل ہے، ایک مسلمان صاحب نے علانیہ لکھا تھا کہ قرآن کی وہ سورتیں جو مدینہ میں اتریں بادشاہانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں بے شبہہ ابھی اس قسم کی مثالیں کم ہیں، لیکن ابھی دنیوی تعلیم کو پھیلتے ہوئے کے دن ہوئے ہیں؟ نو مسلم راجپوت، دو سو برس کے بعد اس حالت کو پہنچے ہیں، جدید تعلیم کی جو رفتار ہے دو سو برس کے بعد اس سے کس قسم کے نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے؟

اس تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی تعلیم کو روکا جائے، ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم کو اس قدر پھیلانا چاہئے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن ساتھ ہی ہم کو "مذہب" کی حفاظت پر بھی اپنی تمام قوت صرف کر دینی چاہئے، اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی تعلیم کی ایک وسیع الشان درسگاہ موجود ہو، جس میں تمام مذہبی علوم نہایت تکمیل اور اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں طلبہ کو عمدہ تربیت دی جائے؟ وہ دریوزہ گری کے طریقہ سے بچائے جائیں، ان کو ایثارِ نفس اور سچی قناعت و خودداری کی تعلیم دلائی جائے۔

اس کے بعد انھوں نے مذہبی تعلیم کی ایک جامع حیثیات درسگاہ کی ضرورت پر زور دیا اور مسلمانوں کو متحد ہو کر کسی ایک تبلیغی مرکز کی کوشش پر آمادہ فرمایا،

ندوۃ العلماء نے اگرچہ ابتدا ہی سے اشاعتِ اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا، اور ارکان میں سے پہلے مولوی خلیل الرحمان صاحب اور پھر مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس کے معتمد قرار پائے تھے، تاہم اب تک اس نے عملی طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی

[1] یہ مضامین مسٹر شاہ دین لاہور کے نام سے نکلتے تھی، دیکھو الندوہ شوال ۱۳۲۲ ہجری (جنوری ۱۹۰۵ء) جلد ۲ نمبر ۹ و ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ (فروری ۱۹۰۵ء) جلد ۱ نمبر ۲ فروری ۱۹۰۶ء (شذرات)

لیکن اب وہ حالت پیش آگئی کہ خاموش رہنا مشکل تھا، مولانا نے ہندوستان کے افق پر نظر ڈالی تو اُن کو نظر آیا کہ مسلمانوں میں مذہبی جوش کا طوفان تو ضرور برپا ہوگیا ہے، لیکن اس کی موجیں بے راہ روی اختیار کر رہی ہیں، اس مذہبی بیچینی اور جوش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ تمام انجمنیں اپنے اپنے سفیر اور اپنے اپنے واعظ مقرر کر کے مختلف مقامات میں بھیج رہی ہیں، لیکن ان انجمنوں میں باہم کسی قسم کا ربط و اتحاد نہیں ہے، اس بنا پر ان کی یہ رائے قرار پائی کہ الگ الگ کام کرنے کے بجائے "انجمن ہدایت الاسلام" دہلی کو جسے مولانا عبد الحق صاحب حقانی مرحوم نے قائم کیا تھا وسعت دے کر اشاعتِ اسلام کی ایک مجلسِ عمومی بنا دی جائے، اور تمام متفرق و پراگندہ قوتیں جو علٰحدہ علٰحدہ کام کر رہی ہیں اسی میں مدغم ہو جائیں، اور ندوہ بھی اپنی بساط کے مطابق اس کی پوری مدد کرے،

شروع میں مولانا کا اصلی خیال یہی تھا، اور انھوں نے اُس خیال کو اس مضمون[1] میں جس کو ۱۳ر اپریل ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا، نہایت بلند آہنگی کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں میں یہ اتفاق عام پیدا نہ ہو سکا، مجبوراً انھوں نے پہلے ندوہ کے اندر رہ کر اشاعت و حفاظتِ اسلام کے مختلف کام کئے، لیکن اُس میں بھی ایک دقت حائل تھی، ندوہ کی مجلس اشاعتِ اسلام کے معتمد جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے، اور مولانا کے خیال میں وہ کام نہیں کر رہے تھے، اس لئے مولانا دو برس تک عجیب کشمکش و پیچ میں رہے، کبھی خود کام کرنے لگتے اور کبھی شاہ صاحب کا خیال کر کے چپ ہو جاتے، اسی حال میں دو برس گذر گئے، اس زمانہ

---

[1] یہ مضمون مقالاتِ شبلی جلد ہشتم ص۳۰ پر چھپا ہے،

میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اُن کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس آگ میں کود پڑے، انھیں اطلاع ملی کہ شاہجہاں پور کے قریب ایک مسلمان زمیندار راجپوت مرتد ہوا چاہتا ہے، یہ سننا تھا کہ بے قرار ہوگئے، پہلے سیدھے دارالعلوم میں تشریف لائے اور طلبہ کے مجمع میں تقریر شروع کی، تقریر کے شروع میں سورۂ نصر کو تعوذ اور بسم اللہ کے بغیر یوں پڑھا، اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ "یخرجون" مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ پھر فرمایا: عزیزو! تم نے خیال کیا ہوگا کہ میں نے آیت غلط پڑھی، ایک دن تھا کہ جب لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوتے تھے، لیکن آج وہ دن ہے کہ لوگ جوق جوق اسلام سے نکلے جاتے ہیں، پھر مسلمانوں کی بے پروائی سے اس فتنہ کے جو نتائج نکلیں گے، اُن کا ہولناک منظر کھینچا، اور طلبہ کو تبلیغ کے سپاہی بننے کی ترغیب دی،

مولانا نے اس واقعہ کا ذکر ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں خود کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"حضرات! میرے اوپر ابتدا اس اثر کی یوں ہے کہ دو سال ہوئے کہ شاہجہاں پور سے ایک خط میرے پاس سفید خاں سوداگر کا آیا، کہ شاہجہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گانوں ہے جلال پور، وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں، آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں، اُن کو ہندو کرنا چاہتے ہیں، آپ جلد آیئے اور مدد کیجئے، انھوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا، وہ وہاں سے تشریف لائے تھے، اور میں ندوہ سے گیا، جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں، میری جو حالت تھی یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ میں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اٹھا رکھی تھی جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہوگی، کہ

اسے بچاؤ اور اسے کم سمجھو! ڈوب مرو یہ واقعات پیش آئے ہیں، ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڈھ کو بھی پھونک دو! یہی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں میں یہاں سے گیا تھا، وہاں جا کر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گانوں میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ گاؤں کے نومسلم راجپوتوں کو ہندو بنانا چاہتے ہیں، مسلمان علما کو بلوایا ہے، جہاں پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے تین سو روپیے کھانے میں صرف ہوئے ہیں، چندہ وغیرہ کیا گیا ہے، وہ نومسلم بیچارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں، پڑھے لکھے نہیں، آپ ہمارے اس گاؤں میں آئیے اور یہاں آکر ہم کو سمجھائیے، جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی ہم آپ سے کہیں گے آپ اُن کا جواب دیجئے، پھر جو کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں، اس کے شاہد سید وزیر حسن صاحب وکیل شاہجہاں پور ہیں، وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں، اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا، کہ گاؤں میں جائے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدانخواستہ فوجداری کریں گے یا ماریں گے، کیونکہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن و امان قائم رہے،

میں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو مجھے تو پالکی میں ڈال کر وہاں لیچلو، میں چلتا ہوں، لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا، غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا، بالآخر اُن لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں، کیا یہ واقعات آپکے کانوں میں پڑتے ہیں، اگر نہیں پڑتے تو آپ کی بے خبری کی داد دینی چاہئیے اور اگر پڑتے ہیں تو آپ کا دل جل نہیں جاتا؟ پھک نہیں جاتا؟ کڑھ نہیں جاتا، اس سے زیادہ کیا بے حمیتی ہو گی؟ کیا یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن سے چشم پوشی کی جائے"؟

مولانا ہنگامی دورہ، مناظرہ اور تقریر وغیرہ کی اُن عارضی تدبیروں کو جو اس وقت کی اسلامی

انجمنیں اختیار کر رہی تھیں حفاظتِ اسلام کی مستقل تدبیر نہیں خیال فرماتے تھے، اُن کے نزدیک صحیح صورت یہ تھی کہ ان آریوں کے مقابلہ کے لئے ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علماء کا گروہ پیدا کیا جائے جو بھاشا میں بات کرسکے اور سنسکرت کی تھوڑی واقفیت رکھے، یہ لوگ دیہاتوں میں جاکر پھیل جائیں اور ان اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی مرکز قائم کرلیں، آریوں کے گروکل کے مقابلہ کیلئے اپنے یہاں بھی اسی قسم کی ایک تربیت گاہ کو ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی کی تقریر میں انھوں نے اپنے اس خیال کی تفصیل کی ہے: "ندوہ کا ایک دوسرا فرض اشاعتِ اسلام ہے یہ مقصد اگرچہ مدت سے ندوہ کے مقاصد میں شامل کیا گیا تھا، اور اس کا ابتدائی دستور العمل مرتب ہوگیا تھا، لیکن ندوہ نے قصداً اس کام کو نہیں شروع کیا، اور مجھ کو تفصیل سے بتانا چاہیئے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ اشاعتِ اسلام کی ضرورت آجکل درحقیقت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ آریوں نے تمام ملک میں اپنے سفیر اور واعظ پھیلا دیئے ہیں، اور انھوں نے جاہل اور نو مسلم مسلمانوں پر مختلف تدبیروں سے اپنا اثر پھیلانا شروع کردیا ہے، یہ حالت نہایت اندیشہ ناک ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ اس خطرہ کا احساس ہوگیا ہے، اور جابجا اس کی مدافعت کے لئے انجمنیں اور مجلسیں قائم ہوگئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، لیکن ہم کو نہایت غور و فکر سے دیکھنا چاہیئے کہ جو کوششیں کی جارہی ہیں یہ کافی ہیں یا نہیں؛ آریوں نے جن اسباب سے اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی ہے اور کرتے جاتے ہیں وہ دو چیزیں ہیں:

(۱) ایثارِ نفس، یعنی اُن کے واعظ نہایت ایثارِ نفسی، نہایت جاں نثاری، نہایت جفاکشی کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں، اُن کا واعظ جو اچھے سے اچھا تعلیم یافتہ ہوتا ہے نہایت فقیرانہ زندگی کیساتھ ایک ایک گاؤں میں پھرتا ہے۔ چنے چبا کر بسر کرلیتا ہے، راتوں کو درخت کے نیچے سو رہتا ہے، لوگوں کی

پٹ میں سفر کرتا ہے،

(۲) دیہات اور قصبات میں پیہم اور لگاتار کوشش جاری رکھنا،

اس کے مقابلہ میں ہمارے علما صرف شہروں پر اکتفا کرتے ہیں، اور دیہات میں جاتے بھی ہیں تو ایک آدھ دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے، اس لئے وہ کوئی پائدار اثر قائم نہیں کر سکتے،

(۳) آریہ واعظ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ، اور جدید علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں اور ہمارے واعظ اکثر ان علوم سے واقف نہیں ہوتے،

(۴) آریوں نے اپنے مذہب کا مدار صرف وید پر رکھا ہے، اور کہتے ہیں کہ وید کے معنی جو عام پنڈت بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں، بلکہ وہ صحیح ہیں جو سوامی دیانند نے بیان کئے ہیں اور چونکہ مسلمان (ایک آدھ کے سوا) سنسکرت سے واقف نہیں، اس لئے وید کی صحت و غلطی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے،

اسبابِ مذکورۂ بالا کے لحاظ سے آریوں کے مقابلہ کے لئے اسبابِ ذیل کی ضرورت ہے:

(۱) ایسے لوگ پیدا کئے جائیں جن میں ایثار نفسی، سادگی، جفاکشی اور جان نثاری کے اوصاف ہوں،

(۲) اشاعتِ اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے، تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، مستقل واعظ مقرر کئے جائیں، جو نومسلم دیہات میں جا کر ایک ایک دو دو مہینے رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں،

(۳) عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دی جائے،

اسی بنا پر ندوہ نے دارالعلوم میں انگریزی اور سنسکرت کی شاخیں کھولیں اور اشاعت اسلام کے مستقل صیغہ کے قائم کرنے کا انتظام کیا جس کی عملی صورت چند دنوں کے بعد نمایاں ہوگی،

ندوہ کا کام یہ ہے کہ دارالعلوم میں خاص مذہبی خدمات انجام دینے والوں کی ایک جماعت موسوم کرے، اُن کو مذہبی وظائف دے، ان کو وقتاً فوقتاً ان اوصاف کے پیدا کرنے کی ترغیب دلائے تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو ان کاموں میں لگائے، یہ تدبیریں ندوہ نے پیشِ نظر رکھی ہیں اوران کو عمل میں لانا شروع کر دیا ہے، خدا اسکی کوششوں میں کامیابی دے۔"

مولانا نے اپنے اسی خیال کے مطابق دارالعلوم میں بھاشا کی تعلیم کا ایک درجہ کھولا، اور خدام الدین کے نام سے دارالعلوم کے طلبہ کا ایک گروہ الگ کیا، ۲۷ مارچ ۱۹۱۰ء میں دلّی کے اجلاس میں جب ندوہ ہی کو مرکزی مذہبی مجلس کی تجویز اور اشاعتِ اسلام کی تحریک منظور ہو گئی تو پھر پوری طاقت سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، ملک کے اکابر کو اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تدابیر کی طرف مائل کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، نومسلموں کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لئے ایک انسپکٹر متعین کیا، وقفِ اولاد کے کام کرنے والے سفیروں کو حکم دیا کہ وہ اشاعت و حفاظت کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھیں، عام مجلس اشاعتِ اسلام کے قیام کی تجویز پیش کی، اور ضروری مقامات پر خود اپنے دورہ کا ایک پروگرام بنایا، یہ زمانہ مئی جون کی سخت گرمیوں کا تھا، اور مولانا ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا تھے، اس کے باوجود شاہجہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ مقامات پر گئے، ۵ مئی ۱۹۱۰ء کو شروانی صاحب کے نام لکھتے ہیں:۔"اشاعتِ اسلام کے لئے مجھ کو ایک بار دورہ کرنا ہے ہیا ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا ہوں...... اسی حالت میں رائے بریلی گیا اور وہاں جلسہ کر کے اس کی بنیا وڈالی، چھینٹا پڑنے پر عام دورہ شروع ہو جائے گا...... بڑی دقت یہ ہے کہ دیہات میں جا کر تلقینِ اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہوگا؟ اشاعتِ اسلام کی کارروائی تمام تر

اس پر موقوف ہے"۔ (شروانی - ۸۱)

۱۲ رجون ۱۹۱۱ء کو پھر انھیں لکھا:- "اشاعتِ اسلام کی بنیاد دو کاموں پر ہے، تقرر و عاظ، آمدنی مشاہرۂ وعاظ، واعظ حسبِ خواہش وضرورت نہیں ملتے، اور ملیں تو کئی سو ماہوار کی آمدنی چاہیئے، ان ہی دونوں باتوں کے متعلق میں نے یادداشت کے لئے لکھا تھا، اس پر مکرر غور فرمائیے اور اپنی رائے قلمبند کرکے دیجئے کہ کیونکر اور کس طریقہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوں گی"۔ (شروانی - ۸۴)

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا شروانی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا، مگر مولانا نے اس تجویز کا جو حل سوچا وہ یہ تھا کہ ائمہ اور موذنین کی تعلیم کے لئے اردو کا برس دو برس کا کوئی کورس بنایا جائے اور اُردو خواں جوانوں کو قرآنِ پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں میں مسجدوں میں پھیلا دیا جائے کہ یہ مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کے لئے اپنے مکتب کھول لیں اور لوگوں کو اسلام کی تلقین کریں، مگر سرمایہ کے نہ ہونے سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی،

حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جاتے تھے، ۲۰ رفروری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا:" نومسلموں کے متعلق نہایت کثرت سے خطوط آئے کہ اکثر جگہ مسجدوں کو گوبر سے لیپتے ہیں، نماز کا ذکر نہیں، میں نے انسپکٹر روانہ کر دیا ہے" (۹۷) اور ادھر مولانا نے مختلف کام شروع کر دیئے تھے، وقفِ اولاد کی تحریک پورے شباب پر تھی، اس کے کام کا سارا بوجھ اکیلے مولانا کے کندھوں پر تھا، تصحیحِ اغلاط کے کام کی نگرانی، سیرتِ نبوی کی تصنیف کا خیال جس کو خود اشاعتِ اسلام نے پیدا کیا تھا، خدام الدین کی تربیت، اشاعتِ اسلام کے لئے دورے، جرجی زیدان کی تمدنِ اسلامی کی تردید، "اردو ورنیکلر اسکیم" کی مخالفت، سید رشید رضا مصری کی آمد کی تیاری، اور لکھنؤ

میں ندوہ کے آیندہ جلسہ کی تدبیر، لیکن اس زمانہ میں ان سب میں اشاعتِ اسلام ہی کا خیال تھا
جو ہر طرح سے اُن پر چھایا ہوا تھا، اور اسی کیلئے یہ سب کچھ تھا، ندوہ کے اجلاسِ دہلی نے ندوہ میں
اشاعت و حفاظت کا کام تو منظور کر دیا مگر یہ طے نہ کیا کہ کام کون کرے، ندوہ کی مجلسِ اشاعت
کے سکرٹری مولانا شاہ سلیمان صاحب تھے، مولانا اُن کے اختیارات میں دخل دینا نہیں چاہتے
تھے اور دخل دیئے بغیر کام نہیں چلتا تھا، یہ ادھیڑ بن الگ تھا۔ ۱۰ رمارچ ۱۹۱۲ء کو اپنے محرمِ
اسرار مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "سیرۃ نبوی کا کام واقعی بڑے پھیلاؤ کا ہے، ادھر اشاعتِ اسلام
کی یہ حالت ہو کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ
میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جابجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے
کہاں کہاں واعظ مقرر کئے جائیں، کہاں کہاں مکتب قائم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے"

آج ایک اپیل بھیجتا ہوں، کاغذات جلسہ (مجوزہ اجلاسِ لکھنؤ) میں پیش کروں گا، کلکتہ میں
ایک انجمن سے کام لیا، اور نواب ڈھاکہ کو راضی کیا، کہ وہ انجمنِ اشاعتِ اسلام کے پریسیڈنٹ ہوں،
لطف یہ ہے کہ ادھر شاہ سلیمان صاحب نہ کچھ کرتے ہیں نہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں، کہ میں باقاعدہ
کام کروں، مجبور ہو کر ندوہ کے دائرہ سے نکل کر کام کرنا پڑے گا، (شروانی۔ ۹۷)

مولانا نے اس تجویز پر ۱۹۱۲ء کے آغازِ سال ہی میں عمل شروع کر دیا تھا یعنی ندوہ کے دائرہ سے
الگ ہو کر ایک عام مجلسِ اشاعت و حفاظت کی بنیاد ڈالی، اور خاکسار کو اس مجلس کا شریک
ناظم بنا کر ہر قسم کی دفتری کارروائیوں کی ذمہ داری عنایت فرمائی، سفر و حضر دونوں میں برابر کام کے
متعلق ہدایات کرتے رہتے، جنوری ۱۹۱۲ء میں نومسلموں کی مردم شماری اور اُن کی موجودہ کیفیت

کی ایک رپورٹ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس بنا پر نومسلموں کی مردم شماری یعنی اُن کی کہاں کہاں آبادیاں ہیں، اور جہاں اُن کی آبادی ہے اس کی تعداد کیا ہے؟ اور اُن کی موجودہ حالت کیا ہے؟ ان تمام معلومات کو حاصل کرنے کے لئے اخبارات میں ایک اطلاع بھیجی گئی، ۱۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو مجھے لکھتے ہیں:- "نوٹس مردم شماری نومسلمان" زمیندار" میں ضرور بھیجنا، اور اخباروں میں تو میں نے دیکھا" (سلیمان - ۳۵)۔

۱۳ فروری ۱۹۱۲ء کو ایک رجسٹر پر اپنے ہاتھ سے حسبِ ذیل نقشہ بنایا، جس کی خانہ پری مطلوب تھی،

نمبر	نام مقام معہ پرگنہ و تحصیل و ضلع	نام قوم و مردم شماری و پیشہ	وضع و لباس و رسم	کس بنا پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں؟	کوئی مسجد یا مدرسہ ہے؟ کیا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر راغب ہو سکتے ہیں؟	کیا گوشت کھاتے ہیں، ذبح کون کرتا ہے؟ اور کیونکر؟	قرآن شریف وہاں موجود ہیں یا نہیں، قرآن کے ساتھ ان کی تعظیم و تکریم کیسی ہے؟	کونسی بات اسلام کی ان میں پائی جاتی ہے اور انکو کیونکر اسلام کے احکام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے؟

اس نقشہ کو لے کر سفرا نے بدایوں، بیاور، اجمیر، جے پور، جودھ پور، کشن گڈھ، الور، باندی کوئی اور ریواڑی وغیرہ کے قصبات اور دیہات میں دورہ کیا، اور مطلوبہ مواد فراہم کیا، جو اس وقت تک دفتر دار المصنفین میں موجود ہے، حسن شاہ صاحب جو ایک سادہ مزاج، متدیّن اور متقی بزرگ تھے، وہ مقرر کئے گئے، کہ دیہاتوں میں جا کر نومسلموں میں احکامِ اسلام کی تلقین کریں، ان کو ایک رجسٹر بنا کر دیا جس میں اپنے قلم سے حسبِ ذیل مدیں لکھیں،

تاریخ و وقت روانگی	مدت سفر و ذریعہ سفر	جاے قیام	مقام تحقیقات	تعداد مردم شماری قومیں و پیشہ	مختصر تحقیقات و کیفیت

ایک علٰحدہ اشتہار اور خطوط کے مسودے لکھے اور مجھے حکم دیا کہ اُن کو چھپوا کر ملک کے اہل الراے کی خدمت میں بھیجوں، اور اُن سے اعانت اور ہمدردی کی خواہش کروں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی، اور اعلانات و اشتہارات اور خطوط روانہ کئے گئے، یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو وہ الٰہ آباد ہو کر وقف اولاد کے سلسلہ میں کلکتہ جارہے تھے، اس لئے میرے لئے حسب ذیل ہدایات لکھیں: "میں نے نومسلموں کی ایک مسل بنوائی ہے، کاتب سے لیکر ان لوگوں کے نام اور ایڈریس لکھ لو، جن لوگوں نے نومسلموں کے متعلق خطوط بھیجے ہیں، نومسلموں کے متعلق ایک اپیل جلی خط میں عبداللہ ولی صاحب کے یہاں چھپوایا ہے، لیکن ابھی ان ہی کے یہاں ہے، وہ منگوا کر ان اشخاص کے نام ایک ایک دو دو پرچے بھیجدو، ایک خط کا مسودہ کاتب کو دے آیا ہوں، ہر اپیل کے ساتھ وہ خط بھی بھیجدو، .....

(۲) اپیل مذکورہ بالا کی سو کاپیاں میرے پاس اس پتہ سے بھیجدو "شبلی مکلاوڈ اسٹریٹ نمبر ۱۳ کلکتہ" (سلیمان)

اوپر کی سطروں میں جس اپیل کا ذکر ہے اس کا عنوان ہے "نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لئے تمام برادرانِ اسلام کی خدمت میں فریاد" یہ اپیل اخبارات میں چھپا (اور اب سلسلۂ مقالات جلد ششم میں شامل ہے) اس میں مولانا نے حسب ذیل تدابیر کا ذکر کیا تھا،

(۱) اس قسم کے واعظ مقرر کئے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہئے،

(۲) دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کئے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے،

(۳) صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے،

۴- مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں، اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں، اور اس لئے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں پیدا ہوسکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور و فکر اور جدّ و جہد سے حل کرنا چاہئے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پروا نہیں کرتے تو اُن کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہئے۔"

حفاظت و اشاعتِ اسلام کے عنوان سے ایک مجلس کی بنیاد کی تجویز پیش کی اور اس کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا، جو مقالات میں شامل ہے،

۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ پہنچکر لکھا کہ یہاں دو تین روز رہ کر اشاعت کا کام شروع کرا دیتا ہوں (سلیمان ۳۰) یہاں ایک انجمن کو یہ کام سپرد کیا، اور جناب نواب خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ کو جو اِن دنوں بنگال کے مسلم لیڈر تھے اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجوزہ مجلسِ اشاعت اسلام کی صدارت قبول کریں، (شروانی ۹۰) اجلاس لکھنؤ کے بعد جو شروع اپریل میں ہو رہا تھا وہ ملک میں دورہ پر آمادہ ہو رہے تھے، ۱۸ مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا:- "ہاں! کام بہت ہیں، لیکن میں اشاعت کے کام کو سب پر مقدم رکھوں گا، قطعی طور سے معلوم ہوا کہ راجپوت خاندان مرتد ہوتے جاتے ہیں، آریوں کی مقامی انجمنیں چپکے چپکے کام کر رہی ہیں، ذرا دقت یہ ہے کہ جلسہ کے بعد ہی میرا دورہ شروع ہونا چاہئے، لیکن موسم ناقابلِ برداشت شروع ہو جائے گا، اس لئے دو مہینوں کا وقفہ ہو جائے گا، جو مضر ہوگا، (شروانی ۹۹)

جو خطوط اور اپیل لوگوں کو بھیجے گئے تھے، اُن کے حوصلہ افزا جوابات آئے، ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھا:- "جلسہ انشاء اللہ نہ صرف بارونق بلکہ مہماتِ امور کے اجراء کا پیش خیمہ ہوگا،

لیکن شرط یہ ہے کہ آپ تین روز پہلے آجائیں، اشاعتِ اسلام کا بہت اچھا اثر ملک میں پھیل رہا ہے، لوگ خط و کتابت کر رہے ہیں، صرف اتنی بات ہے کہ شاہ صاحب وغیرہ اس کام کو کرنے دیں، یہ اُس وقت ہوگا کہ آپ آجائیں، آپ کا توسط سب مشکلات کو حل کر دیگا۔"

چنانچہ مولانا شروانی تشریف لائے، اور مولانا کی دعوت پر بہت سے اہل الرائے حضرات ۶-۷-۸ - اپریل ۱۹۱۲ء / ۱۸-۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کے اجلاسِ لکھنؤ میں شریک ہوئے اجلاس کی اخیر تاریخ میں یعنی ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۸ اپریل ۱۹۱۲ء کی صبح کو جب دار العلوم کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، مولانا ایک خاص کیفیت میں اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تدابیر پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اور تقریر کا آغاز اس تمہید سے فرمایا:-

"حضرات! میں نے اسلام کی تاریخ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھی ہے، میں تیرہ سو برس کی وسیع مدت کا ایک حد تک واقف کار ہوں کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالتیں مختلف زمانوں میں، مختلف سلطنتوں میں، مختلف دوروں میں کیا رہی ہے، مگر آپ کے سامنے میں صحیح شہادت دیتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی زمانہ آج سے زیادہ مشکل، زیادہ شاق اور زیادہ تباہ کنندہ گذرا ہے۔"

پھر مسلمانوں کی اُس تباہی کا ذکر کرکے جو تاتاریوں کے ہاتھوں چھٹی صدی ہجری میں ہوئی فرمایا کہ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی تباہی کا سب سے بڑا واقعہ ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں پر ہر طرف سے جو تباہی آرہی ہے اس سے اُس کا کوئی جوڑ ہی نہیں، وہ تباہی ایک طرفہ تھی یعنی صرف جان و مال کا نقصان ہوا، مگر آج جو تباہی ہے وہ ہمارے مذہب پر ہے، اخلاق پر ہے، تمدن پر ہے،

اس سلسلہ میں فرمایا:۔" لیکن حضرات! جیسا آج کل کئی مہینوں کی خط وکتابت سے معلوم ہوا، اشتہارات دینے کے بعد جو تحریرات جابجا سے آئی ہیں اور جو کیفیتیں محقق طور سے معلوم ہوئیں، جو ایجنٹ اور سفیروں کو بھیج کر دریافت کی گئیں، خاص ایک شخص حسن شاہ مقرر کرکے بھیجے گئے، اُنھوں نے بہت سے مقامات میں جاکر خود دیکھا تو ایسی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی ہیں، جن کی بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ اگر تمام مسلمان قوتِ متفقہ کے ساتھ متحد نہ ہوں گے تو کیا ہونا ہے۔"

پھر تفصیل کے ساتھ آریوں کی مخفی کوششوں، گروکل کی کیفیت اور مسلمانوں کی بے پروائی کی داستان بیان فرمائی، پھر صحابۂ کرام، ائمۂ عظام اور صوفیہ اور خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی مخلصانہ خدمات کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ "ہم میں پھر اخلاص وایثار کا وہی جذبہ پیدا ہو کہ ہم کفنی پہنکر صحرا بہ صحرا اسلام کا پیغام لے کر پھیلیں، اور لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائیں، ایسے علما پیدا کریں جو انگریزی، بھاکا اور علومِ جدیدہ سے واقف ہوں، جو اس زمانہ کی دہریت اور الحاد کا توڑ کریں، آخر میں فرمایا" سردست دو تدبیریں نظر آتی ہیں، ایک یہ کہ دیہات میں نومسلموں کے لئے چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کئے جائیں، پانچ، چھ، سات گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر دیہات ہوں وہاں ایک بڑا مکتب ہو جس میں نہ آپ کا یہ فلسفۂ یونانی ہو اور نہ انگریزی کا ایک لفظ ہو، بلکہ صرف قرآن شریف کا متن اور اردو اتنی کہ جس سے بعض مسائلِ عبادت نماز و روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان اُن کو پڑھائے جائیں، اور زور دے کر فرمایا کہ اردو میں نہیں بلکہ یہ رسائل ناگری ہی میں چھپوائے جائیں، تاکہ آسانی سے وہ اس کو سیکھ کر پڑھ سکیں،

دوسری تدبیر یہ بیان کی کہ ایسے معمولی خواندہ مسلمانوں کو جو اردو پڑھ لیتے ہوں اُن کے لئے

ایک ٹریننگ کلاس ندوہ یا الٰہیات کان پور میں کھول دیا جائے، اور ان کو وظیفہ دے کر ایک سال وہاں پڑھایا جائے، اس کے بعد انکو ان دیہاتوں میں تعلیم و تلقین کے لئے پھیلا دیا جائے، کہ دو دو تین تین مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر مسلمانوں کو مسلمان بنائیں" آخر میں فرمایا "میں فوری جوش کا قائل نہیں، آپ گھروں پر جاکر غور کریں، اور سوچیں، اور اس کے بعد اپنے دل میں اثر پائیں تو اسلام کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائیں"

مولانا کی یہ تقریر بڑی پُر اثر تھی، ندوہ کی روداد کے یہ الفاظ ہیں:

مولانا ممدوح کی یہ تقریر جس کا لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا، حاضرین کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، اور اُن کی اندرونی تاثیر کو امداد کی صورت میں ظاہر کر رہی تھی،

دن کو یہ تقریر ہوئی اور ساتھ خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی کی تائیدی تقریریں بھی ہوئیں، اس کے بعد رات کے جلسہ میں جب ان تقریروں کی تاثیر کی جستجو کی گئی تو ڈیڑھ سو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اپنے نام لکھائے جو اس کام میں ہر طرح کی امداد کے لئے آمادہ تھے،

مولانا یہ چاہتے تھے کہ اشاعت کے کام تمام فرقے مل کر کریں، اسی لئے مرزا بشیر الدین محمود جو اَب خلیفہ قادیان ہیں اور خواجہ کمال الدین صاحب تک کی شرکت سے انکار نہیں کیا گیا، اس پر اسی جلسہ کے دوران میں مولانا پر یہ الزام رکھا گیا کہ انھوں نے قادیانیوں کو جلسہ میں کیوں شریک کیا اور ان کو تقریر کی اجازت کیوں دی، مگر مولانا شروانی کی ثالثی سے یہ بلا ٹلی، جلسہ کے بعد ہی اضلاع کے دورہ کا خیال تھا، اس کا آغاز کان پور سے کیا،

کو وہ کان پور روانہ ہوئے، منشی محمد امین کو لکھتے ہیں:- "میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو ہاتھ ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا" (امین)

مئی ۱۹۱۲ء میں گرمیوں کے ڈر اور سیرت کے خیال سے یکسوئی اور تنہائی کی تلاش میں بمبئی روانہ ہوگئے، اور مجھے سیرت کے کام کے سلسلہ میں رفاقت کا شرف بخشا، (امین - ۹ - ۱۰) تین چار مہینے وہاں رہے اور سیرت کی پہلی جلد تعمیر کعبہ تک ختم کی، مجھے یہ ہدایت ہوئی کہ ابن اسحاق ابن سعد اور طبری کے رجال چھانٹ کر الگ کروں، چونکہ عام طور سے اُن کے رجال نہیں ملتے اس لئے بڑی دقت سے میں نے رجال ابن اسحاق، رجالِ ابن سعد اور رجالِ طبری پر الگ الگ سالے پیش کئے (اشتراکی)

برسات کے بعد بمبئی سے واپسی ہوئی، مجھے ارشاد ہوا کہ میں بمبئی سے بی، بی، سی، آئی ریلوے سے گجرات، اور بڑودہ وغیرہ کا دورہ کرکے مسلمانوں کی عام مذہبی کیفیت کا اندازہ کروں، چنانچہ اس پروگرام کے مطابق گجرات، بڑودہ اور اجمیر تک کا سفر کیا اور وہاں کے اکابر سے مل کر اشاعت و حفاظت کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا، اور آخر آگرہ ہو کر لکھنؤ پہنچا، واپسی کے بعد مولانا نے یہ طے کیا کہ وہ اشاعت کا کام ندوہ سے بالکل الگ ہو کر کریں، مجھ سے فرمایا کہ جن لوگوں نے جلسۂ سالانہ میں امداد کا وعدہ کیا تھا اور دوسرے ہمدرد حضرات کے نام ایک مطبوعہ خط بھیجوں، اور ان سے مجلس اشاعت و حفاظت اسلام کی رکنیت کی خواہش کروں، اور ہر رکن سے دو روپئے سال کے چندہ کا وعدہ لوں اس تجویز کے مطابق میں نے پانچ سو اصحاب کے نام یہ خطوط بھیجے، اور ان کے جوابات آئے

۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو مجھے الٰہ آباد سے لکھتے ہیں:- "اشاعت کے جوابات آ رہے ہیں، میری دانست

میں خط ملفوف اور اس کے ساتھ اور مطبوعہ کاغذات کے پمفلٹ بھیجے، چند لوگوں نے استحسان اور ممبری قبول کی ہے، یہ از دیاد رقم ممبری"

لکھنؤ کے پچھلے اجلاس میں اردو خواں معلموں کی جو تجویز پیش کی تھی اُس سلسلہ میں فرمایا:۔"دس روپئے ماہوار پر مسلم گزٹ میں ایسے ابتدائی معلموں کے لئے اشتہار دیدو جو دیہات میں جاکر اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن مجید پڑھا سکیں"

میں نے چاہا کہ صیغۂ اشاعتِ اسلام الگ قائم کر کے اس کی طرف سے اعلان ہو، مولانا نے اس کو ابھی پسند نہیں کیا، فرمایا:۔" صیغۂ اشاعتِ اسلام کے نام کی ابھی ضرورت نہیں، آریہ بھڑک جائیں گے صرف میرا نام لکھدو" (سلیمان ۳۹)

میں نے پھر اپنے خیالات لکھ بھیجے اور عرض کی کہ اشاعت و حفاظت کے کام کو بڑے پیمانہ پر شروع کرنا چاہئے، اور اسی کے مطابق ایک یادداشت لکھ کر الہ آباد بھیجی، ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ئہ کو جواب آیا:۔"خط پہنچا، آپ کے پروگرام کے ابتدائی حصہ سے میں سردست متفق نہیں، اسی لئے پہلے پروگرام کو اتفاق کی رایوں کے انضمام کے ساتھ بھیجتا ہوں، بڑے بڑے امراء ابھی شریک نہیں ہوں گے، بلکہ ایسے بڑے پروگرام سے بھڑکیں گے، ان سے استفسار کرنا اور ناکامیاب ہونا دل شکستہ کر دے گا، اس لئے ابھی بہت اونچا نہ دیکھئے اگر مارچ میں اس کا کہیں اجلاس ہوتا تو رستہ نکلتا، غلام حسین عارف کو خاص طرح پر لکھنا چاہئے، شاید کلکتہ میں انتظام ہوسکے"

میں نے عرض کیا تھا کہ اشاعت و حفاظت کا کام اگر آپ کے بجائے اور ممبروں کے نام سے چلایا جائے تو شاید دوسرے ارکان کے رشک و حسد کی آگ نہ بھڑکے، اور کام چل نکلے، اس پر اسی خط

میں لکھا: "لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام کی تکرار سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس کے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں، اور زبان سے ہر وقت ہائے ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق "الہلال" میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے اس کے ساتھ ہوں اور پیرو بن سکتا ہوں" (سلیمان ۴۰)

اشاعت فنڈ میں روپیہ نہ تھا، اس لئے اجازت دی کہ جمعیہ فنڈ سے قرض لے کر کام شروع کروں، پھر لکھا: "کلکتہ، پٹنہ، رامپور میں اشاعت کے کاغذات کیا کم گئے؟ پرنس ارکاٹ کو انگریزی خط لکھوا کر اس کے ساتھ کاغذات بھیجو۔ غلام احمد خاں کو خاص طور پر لکھو، خود اپنے دستخط سے بھیجو، اور جنٹ سکریٹری اشاعت اپنا نام لکھو .... اشاعتِ اسلام کو حکّ و اصلاح کے بعد بھیجتا ہوں، دو ہزار یا زیادہ چھپوالو، اور بڑا خط بھی"

پانچسو کے اندازے میں یہ کاغذات ملک کے اکابر کے نام بھیجے گئے، مگر ۶ر فروری ۱۹۱۳ء تک صرف بیس پچیس اصحاب کے جواب آئے، یہ صورت دیکھ کر مولانا نے مجھے لکھا: "برادرم! دیکھا، پانچسو اشتہار اور کل بیس پچیس جواب، ان ہی باتوں کو میں دیکھ رہا تھا، خیر اب تو پیچھے ہٹنا نہیں ہے، زنہار اس رسید بہی سے کام نہ لو (ندوہ کی پرانی چھپی ہوئی رسیدوں سے) ورنہ شاہ سلیمان اور مولوی خلیل الرحمان صاحب فوراً آکر ہاتھ پکڑ لیں گے، اور کچھ کرنے نہ دیں گے، ندوہ سے بالکل آزاد رہنا چاہئے، ایک مؤتمر دینی عمومی کا مسودہ لکھ کر چھپنے کو دیدیا جائے، وہ اصل اسکیم ہے جس پر چلنا چاہئے، آجائے تو بھیجدوں، آج جن لوگوں کے جواب قبول ممبری کے آئے ہیں حسبِ ذیل ہیں"

اس تجویز پر عمل کا وقت آیا ہی تھا کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا

خاکسار دل برداشتہ ہو کر وطن چلا آیا، اور وہاں سے "الہلال" کلکتہ کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اور مولانا بیمار اور پراگندہ خاطر ہو کر مولوی عبد السلام صاحب اور سیرت کو لے کر بمبئی روانہ ہو گئے اور دو چار ماہ کے غور و فکر کے بعد جولائی ۱۹۱۳ء کو ندوہ سے مستعفی ہو کر سبکدوش ہو گئے، اور کام کی ساری تجویزیں درہم ہو کر رہ گئیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

خدام الدین ۱۹۱۲ء

مولانا نے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا تو اُن کو نظر آیا کہ جب تک مبلغینِ اسلام کی ایک ایسی جماعت نہ تیار کی جائے جو مذہبی تعلیم کے ساتھ سادہ مذہبی زندگی بسر کرے، اس میں ایثار، قناعت اور جفاکشی کا مادہ ہو اس وقت تک آریوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اس وقت آریہ مبلغوں کا سب سے بڑا مرکز گروکل تھا، گروکل کے حالات اخباروں میں پڑھ کر اور وہاں جانے والوں سے زبانی سُنکر وہ بہت بیتاب تھے، کہ اس کے مقابلہ کے لئے ایک جماعت مسلمانوں میں بھی ہو،

اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک قصبہ سرائے میر ہے، مولانا کی برادری کے لوگوں نے عربی کا ایک مدرسہ نیا نیا قائم کیا تھا جس میں زیادہ تر اسی ضلع کے دیہاتی لڑکے عربی تعلیم حاصل کر رہے تھے، چونکہ یہ مدرسہ بالکل مولانا کے زیر اثر تھا، اور اُن دیہاتی بچوں میں نہایت آسانی کے ساتھ یہ تمام اوصاف پیدا کئے جا سکتے تھے، یعنی یہ کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کے دیہاتوں میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سفر کریں، اور تبلیغ کا کام انجام دیں، اس لئے مولانا نے اس مقصد کے لئے اس مدرسہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا، چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟

میں بھی شاید آؤں، اور اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے،

اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمحِ زندگی ہو" (حمید ۵۰)

مدرسہ سرائے میر کی نسبت تو ابھی خیال ہی تھا کہ مولانا نے خود دار العلوم میں ایک جماعت کی بنیاد ڈالدی، اور اس کا نام "خدام الدین" رکھا، جو طلبہ اس کام کے لئے تیار ہوے تھے اُن کے والدین کو لکھ کر اُن کی رضامندی منگوائی، پھر طلبہ کو اس میں داخل کیا، اُن کے لئے سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکامِ اسلام کی پوری پابندی اور تقوی اور قناعت اُن کی زندگی کا اصول بنایا گیا، اس زمانہ میں خود مولانا پر بھی یہی اثر تھا، اور یہ اخیر زندگی تک رہا،

مولوی حمید الدین صاحب کو ۸ رفروری ۱۹۱۲ء کو یہ خوشخبری سناتے ہیں:۔"میں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کر دی، الگ مکان دے دیا ہے اور الگ تربیت ہے، قریباً ایک ماہ ہوا، اب تک امید افزا آثار ہیں، احکامِ اسلام کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے، ابھی تک سات لڑکے عہد وپیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوے ہیں، یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی آئیں گے، اور جو کام اُن کو بتایا جائے گا" (حمید ۵۵)

ان سات طالبعلموں میں سے ایک طالب علم مولوی عبد الرحمان نگرامی مرحوم تھے، انھوں نے واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں مولانا کے ہاتھ پر جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک نباہا، افسوس ہے کہ جوانی ہی میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو مولانا کے حسنِ انتخاب کا زندہ پیکر ہوتے،

جنوری ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد جب مولانا نے اعظم گڈہ کو اپنا دائرہ عمل

قرار دیا، اور نیشنل اسکول اور مدرسہ سرائے میر میں سے پہلے کو تمام قوم کی دنیوی اور دوسرے کو دینی تعلیم کا مرکز بنانا اور اُسی میں خدامِ دین کی جماعت کا انتظام کرنا چاہا، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھا: "مدرسہ اپنی آمدنی سے چل رہا ہے، بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت، سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڈھ پر، دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہئے، اور اُن کا باہمی تعلق،

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اُسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدامِ دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہئے، ہم سب کو وہیں بود و باش رکھنی چاہئے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہئے، اگر تم یہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں" (حمید ۶۷)

بہرحال ابھی یہ تجویز خواب و خیال ہی میں تھی کہ مولانا نے اس کے ایک سال کے بعد آنکھیں بند کرلیں، مولانا کی یہ تجویز حقیقت میں بڑی اہمیت کی چیز تھی اور اُن کی نکتہ رس نظر بہت دور پہنچی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حقیقی کامیابی کے لئے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہئے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لئے وقت درکار تھا، اس کے لئے گروکل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگانِ دین اور ائمۂ ہدیٰ کی نظیریں سامنے رہنی چاہئے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں اُن کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی، اگر مولانا کچھ دن اور زندہ رہتے تو اُن کے دل میں اخیر میں جو تخم پیدا ہو چکا تھا، وہ یقیناً ایک دن بارآور ہوتا،

جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء	مصر میں شام کا ایک عیسائی مورخ و ادیب جرجی زیدان نام تھا جس کا رسالہ الہلال ان دنوں بہت مشہور تھا، یہ عربوں کے علوم

و فنون اور اسلامی تاریخ پر مضامین اور کتابیں لکھا کرتا تھا، اس کے کئی تاریخی ناول ہیں، جن میں کسی نہ کسی اسلامی عہد کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے، اُس کی سب سے مشہور کتاب تمدنِ اسلامی کی تاریخ ہے، جو اس نے عربی میں پانچ جلدوں میں لکھی ہے، یہ تاریخ تمدنِ اسلامی مستشرقوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ پروفیسر مارگولیتھ (اوکسفورڈ یونیورسٹی) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، (اور بعض صاحبوں نے اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے)

مصنف چونکہ عیسائی تھا، اس لئے اس نے اپنے قلم سے اس میں اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر ایسے اسلوب سے اس کو دکھایا ہے کہ بظاہر وہ حسن نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چینی ہوتی ہے،

جرجی زیدان سے مولانا کے پرانے تعلقات تھے، خط و کتابت تھی، الہلال میں اُن کے مضمون نکلتے تھے، مگر اس کے باوجود مولانا نے اس کی اس کتاب کی حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کے لئے وقت کے منتظر تھے، اس اثنا میں برلن سے ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمود لبیب کا خط ۱۹۰۸ء میں مولانا کے نام آیا، جس میں مولانا سے اسلامی آلات پر ایک رسالہ کی نسبت سوال تھا، مولانا نے بہت دن ہوئے وہ رسالہ اڈیٹر الہلال کے پاس مصر بھیجدیا تھا، مولانا نے اُن کو جرجی زیدان کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجدیا، جس میں لکھا تھا کہ "اس رسالہ کو وہ ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کردیں" اسی تقریب سے مولانا نے اس خط میں جرجی زیدان کی ابلہ فریبیوں اور دسیسہ کاریوں پر بھی کچھ سطریں

لکھی تھیں ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں برلن سے ۱۱ر اگست ۱۹۱۰ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں مولانا کی تائید کی تھی، اور اس کی تصنیفات کا راز فاش کیا تھا، یہ خط مزید تحریک کا باعث ہوا، لیکن اس وقت مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لئے مجھے اشارہ ہوا، اور میں نے ایک مختصر مضمون جرجی زیدان کی تصنیفات کی غرض و غایت اور قدر و قیمت پر لکھا، جو اکتوبر ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں شائع ہوا، پھر اگست ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں اس کی تمدن اسلامی کے اس باب کا جو کتبخانۂ اسکندریہ پر ہے اور جس میں اس نے مولانا کے "کتب خانۂ اسکندریہ" کے دلائل کا رد کیا ہے جواب لکھا، لیکن ۱۹۱۱ء میں چند واقعے ایسے پیش آئے کہ مولانا کو باوجود قلت فرصت اس کی کتاب پر مستقل طور سے ایک نہایت سخت اور مبسوط تنقید بلکہ تردید لکھنی پڑی،

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر یوسف ہارویز کی تجویز سے اس عربی کتاب کا کچھ حصہ ہماری صوبہ کے مولوی فاضل کے امتحان[1] میں رکھا جانے لگا، دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مارگولیوس نے اس کتاب کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو اسی زمانہ میں ٹائمس نے ایک مضمون لکھا کہ حضرت عمرؓ کا کتب خانۂ اسکندریہ کو جلانا ثابت ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے اس کو تمدن اسلام میں جدید دلائل سے ثابت[2] کر دیا ہے، اس پر

---

[1] ۲۴ر اگست ۱۹۱۱ء کو ابو الکلام صاحب کو لکھتے ہیں: "۔۔۔ تمدن اسلام کا ضرر بہت متعدی ہوا، یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی کہ امتحانات فاضل و عالم میں وہ داخل درس کیجائے، مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا، اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بافیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت تک ۲۰ صفحے ہو چکے ہیں، عربی میں لکھونگا، اور عربی اخبارات میں طبع کراؤنگا" (ابو الکلام ۳۲) [2] مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں: "جرجی زیدان کے صرف ایک حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے، مارگولیوس نے کیا ہے، جو اسلام کا سخت دشمن ہے، اور درحقیقت اسی انگریزی ترجمہ نے مجھ کو رد لکھنے پر آمادہ کیا" (ریاض ۱۸)
اس مضمون کی تمہید الندوہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں پڑھیے جس میں اس واقعہ کا حوالہ ہے،

طرہ یہ ہوا کہ مصر کی یونیورسٹی کو جسکا نام جامعۂ مصریہ تھا اسلامی تاریخ پر لکچر دینے کے لئے ایک پروفیسر کی ضرورت ہوئی تو بعض آزاد خیالوں نے جرجی زیدان کا نام پیش کیا، یہ نام منظور ہونا ہی چاہتا تھا کہ مصر میں اس تقرر کے خلاف ایک شورش سی برپا ہوگئی، آخر اس کے بجائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے[1] جن کے تاریخی لکچر چھپ چکے ہیں، اور اردو میں تاریخ الامتہ کے نام سے روشناس ہیں،

ان واقعات نے مولانا کو مجبور کیا کہ ۱۹۱۱ء کے آخر میں اس کتاب پر ایک سخت تنقید لکھیں، جس سے اُس کی بے اعتباری نمایاں ہو جائے، غالباً اگست ۱۹۱۱ء سے مولانا پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوئے، جو کئی مہینے تک جاری رہا، بیسیوں تصنیفات کے ہزار ہا صفحات جن کے حوالے اصل کتاب میں تھے اُن کو ملا ملا کر دیکھنا، اور مختلف اڈیشنوں کو تلاش کرنا اُن میں مصنف کے دیئے ہوئے حوالوں کو ڈھونڈھنا، آسان کام نہ تھا، یہ رمضان کا مہینہ اور برسات (ستمبر) کی اُمس اور حبس، مولانا روزہ رکھ کر اسی طرح کتابیں دیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کی محنت اُٹھاتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا، اور اس کی بینائی گویا جاتی رہی، اس پر بھی کام جاری رہا، اور اُس کو تمام کرکے چھوڑا،

۱۰ نومبر ۱۹۱۱ء کو مولانا اس واقعہ کو کس حسرت سے مولوی ابوالکلام کو لکھتے ہیں:۔ "تمدّن کے رد میں ابتداءً ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اُترنا محسوس ہوا، اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے، ایک آنکھ جو صحیح ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے، اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہوگیا، جو اس[2] سالہ صفحے ہو کر رہ گئے، اور اسی پر کتاب ختم کردی، طبیعت بہت افسردہ رہتی ہے، سپاہی کا ہتھیار چھن جائے تو پھر وہ کس کام کا ہے" (ابوالکلام ۳۴)

[1] الندوہ جنوری ۱۹۱۱ء
[2] ابوالکلام (۳۲)

اسی تنقید و تردید کا اردو خلاصہ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا، اور اصل عربی مضمون کو جو عربی ادب کا نمونہ ہے الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے پہلے خود مولانا نے جنوری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں لکھنؤ کے ایک مطبع میں چھپوایا، اور ساتھ ہی اس کے اجزاء مصر میں فروری ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس بھیجے، سید موصوف نے بڑی تعریف کی، اور اس اہم کام کے انجام پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور لکھا کہ وہ مصر کے کئی علماء کو ادھر متوجہ کر چکے تھے، مگر کسی نے ہمت نہیں کی، بحمد اللہ کہ یہ فرض کفایہ ہندوستان کے ایک عالم سے ادا ہو سکا (ریاض حسن ۱ وحمید ۵۵)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "سید رشید رضا نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں خود بھی تردید کرنی چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائد اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یکجا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پایا اور تردید کر دی"

سید موصوف اس کے بعد مولانا کی خواہش پر ۱۹۱۲ء کے شروع میں ہندوستان آئے اور یہاں سے واپس جا کر اس کو المنار میں اور بعد کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا،

اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشاپردازانہ ہے، مولانا عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے، جس زمانہ میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے جاحظ کی بیان وتبیین اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی، راقم کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب میں بنو امیہ کی علمی سرپرستی کا باب جو طبع ہند کے صفحہ ۴۸ سے صفحہ ۵۳ تک ہے حضرۃ الاستاذ کے اشارہ سے اس شکستہ رقم کے قلم سے نکلا ہے، وللہ الحمد،

اس کتاب کے چھپوانے کا مرحلہ درپیش تھا کہ حکیم نور الدین صاحب نے قادیان سے اس کے لئے پچاس روپیے بھیجدیئے، باقی کے لئے انھوں نے اپنے دوستوں میں سے مولانا شروانی، نواب

مزمل اللہ خاں، اور عزیزوں میں سے مولانا حمید الدین کو لکھا، اور خود مولانا نے بھی اپنا حصّہ دیا، اور کتاب چھپکر شائع ہوئی، (شروانی ۹۵)

اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان اور مصر اور دنیاے اسلام کے دوسرے حصّوں میں جہاں تک تمدنِ اسلامی کا زہر پھیلا تھا تریاق کا کام دیا، اور ایک بڑے فتنے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا، والحمد للہ علیٰ ذٰلک ،

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۹۱۰ء

اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوئے تھے وہ کل عیسائیوں کے قلم سے نکلے تھے، انگریزی میں سب سے پہلا اور مشہور ترجمہ سیل کا تھا اور اسکے بعد پامر کا اور سنہ ۱۹۰۹ء میں راڈویل کا ترجمہ شائع ہوا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے نزدیک کسی استناد کے لائق نہیں ہو سکتے تھے، ہندوستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کے سبب سے جن نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے کی طرف توجہ ہوئی، وہ ان ہی ترجموں کی طرف توجہ کرتے تھے، غیر مسلم لوگ بھی جب اسلام کی دعوت کا صحیح مطلب سمجھنا چاہتے تھے تو ان ہی ترجموں میں سے کسی ایک کو پڑھتے تھے ،

اس زمانہ میں آریوں کے سبب سے جب مولانا کو تبلیغ و حفاظتِ اسلام کی طرف توجہ ہوئی تو قرآنِ پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کی ضرورت بھی معلوم ہوئی، چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب دلّی میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا تو مولانا نے اس جلسہ میں یہ تجویز پیش کی، اور تمام لوگوں نے اس کی تائید میں صدائیں بلند کیں، مصارف کا مرحلہ اسی جلسہ میں نہایت آسانی کے ساتھ طے ہوگیا، یعنی سردار اسمٰعیل خاں سفیرِ افغانستان نے اعلان کیا کہ وہ سردست اس مقصد

کے لئے پانچزار روپیہ دیتے ہیں، اور اس کے علاوہ جو مصارف پڑیں گے وہ اُن کو بھی برداشت کریں گے، اب جو کچھ دقت تھی وہ صرف یہ تھی کہ کون شخص اس کام کو انجام دے، مولانا کے نزدیک اس کے لئے ایک ایسا جامع الحیثیتین شخص درکار تھا جو عربی اور انگریزی دونوں کا ماہر ہو، اور اس کے ساتھ قرآن مجید پر کافی غور کر چکا ہو، اس لحاظ سے اُن کی نگاہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم پر پڑی، اُسی زمانہ میں مولانا نے مولوی محمد صالح صاحب پروفیسر بہاولپور کالج کی بھی تعریف سنی، اور ان سب سے خط و کتابت کی لیکن نواب عماد الملک جو انگریزی کے ایک اعلیٰ ادیب تھے، اور عربی زبان سے بھی واقف تھے، اس کام کے لئے سب سے زیادہ مستعد نظر آئے حالانکہ اُن کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی، اس پر بھی مستعدی ظاہر کی، اور ۴ گھنٹہ روزانہ کام کرنا شروع کیا، چنانچہ انھوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ مسودہ مولانا کے پاس بھیج دیں گے، جو چھپوا کر مولانا حمید الدین اور مولوی محمد صالح اور دوسرے قابل حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا، پھر جو رائیں اُن کی نسبت موصول ہوں گی وہ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی جائیں گی، اور متفقہ رائے سے فیصلہ ہوگا اس کے ساتھ مولانا نے یہ رائے بھی قائم کی کہ انگریزی کا اردو ترجمہ علما کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوگا، تاکہ وہ اس کی صحت و غلطی کا فیصلہ کر سکیں،

نواب صاحب کا یہ ترجمہ پندرہ پاروں تک مکمل ہو چکا تھا، ۱۹۱۴ء میں جب مولانا کی کوششوں اور نواب عماد الملک کے اصرار سے مولوی حمید الدین صاحب دار العلوم حیدر آباد کے صدر (پرنسپل) مقرر ہو کر حیدر آباد پہنچے تو نواب صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور روزانہ مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انگریزی ترجمہ پر نظر ثانی شروع کی، یہ کام تمام بھی نہیں ہوا تھا کہ خود مولانا

کی عمر تمام ہوگئی، مولوی حمید الدین صاحب اور نواب صاحب کا کام اس پر بھی جاری رہا، اور اس متفقہ کوشش سے جو اصلاح ہوئی تھی وہ غالباً چار پاروں تک پہنچی تھی، اسی اثنا میں ۱۹۱۷ء میں مولوی حمید الدین صاحب حیدر آباد سے چلے آئے اور نواب صاحب ضعف بصارت اور علالت کے سبب سے تنہا کام کرنے سے معذور ہوگئے، اور ۱۹۲۶ء میں اُن کا انتقال ہوگیا، اور کام سولہ پاروں سے آگے نہ بڑھ سکا، نواب صاحب نے جن ۱۶ پاروں کا ترجمہ کیا تھا اس کا چھپا ہوا مسودہ تو موجود ہے، مگر افسوس ہے کہ چار پاروں کے اصلاح شدہ مسودہ کا تلاش کے باوجود پتہ نہیں چلا،

مولانا کی یہ تجویز گو اُن کی وفات سے ناتمام رہی، مگر بحمد اللہ کہ ناکام نہیں رہی یعنی گو ان کے ہاتھوں سے یہ انجام نہ پاسکی، مگر اس واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اُن کی اسی تحریک کا فیض تھا کہ اس کے بعد قادیانیوں نے، مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے، مسٹر محمد پکتھال (حیدر آباد) نے اور بعض دوسرے مخلص مسلمانوں نے اس کام کو انجام تک پہنچایا، اس لئے الدال علی الخیر کفاعلہ کے اصول پر انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی اس ثواب سے حصہ ملیگا،

مجلس علم کلام کی تجویز ۱۹۱۲ء

اسلام کی مستقل حفاظت و اشاعت کی غرض سے جو تجویزیں اس زمانہ میں مولانا کے ذہن میں آرہی تھیں، اُن میں سے ایک مجلسِ علم کلام کی تجویز تھی، جس کے ذریعہ سے یورپ کے فاسد خیالات و اعتراضات کا استیصال مقصود تھا، اُن کے خیال میں اس مشکل کا اصل حل قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج تھا جس کے لئے وہ ہر طرف کوشش کر رہے تھے، لیکن جب تک اس امتزاج کا سامان نہ ہو، اور اس کا نتیجہ پیدا نہ ہو، اُن مشکلات سے اعراض نہیں برتا جا سکتا جو جدید تعلیم کے بدولت مسلمانوں کو پیش آرہی تھیں، اس بنا پر اُن کو یہ خیال ہوا کہ

ملک میں اس وقت نئے تعلیم یافتوں میں سے ایسے لوگوں کو جو فلسفہ کا ذوق اور اسلام کا درد رکھتے ہوں ایک طرف سے لیا جائے، اور دوسری طرف سے ایسے علماء کو لیا جائے جو قدیم فلسفہ کے ماہر جدید تعلیم سے مانوس اور فلسفۂ جدیدہ کے نئے اعتراضات کی تردید و تنقید کی قوت رکھتے ہوں، اور ان دونوں کو ملا کر ایک مجلس علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے جس میں یہ غور کیا جائے کہ فلسفۂ جدیدہ کے کون کون سے مسائل مذہب کے مخالف ہیں، اور یہ مسائل کہاں تک یقینی ہیں، اور ان کی بناء پر مذہب پر جو اعتراضات پڑ سکتے ہیں اُن کا جواب کیا ہے؟ اس مجلس کے لئے علماء میں سے انھوں نے مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولانا شیر علی صاحب حیدرآباد، سید رشید رضا مصری کو لیا، اور نئے تعلیم یافتوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال لاہور، مولوی حمید الدین صاحب پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد اور مولوی عبدالقادر صاحب بی اے بھاگلپوری کو لیا، اور ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ میں ایک مضمون[1] کی صورت میں اس تجویز کو شائع کیا، اور دلی کے اجلاس ندوہ میں اس پر غور و فکر کی دعوت دی، اس مضمون میں مولانا نے پہلے عباسیوں کے زمانہ میں علم کلام کی بنیاد پڑنے کی کیفیت لکھی ہے اور اسی پرواز پر موجودہ زمانہ میں کام کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے،

اس تجویز پر عمل کا آغاز اس سے کیا کہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ کو اس تجویز کے مطابق خطوط لکھے، اور اُن کے جوابات بھی آئے، مگر مجلس کا کام شروع نہ ہو سکا، گویا تجویز تجویز کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی،

کلکتہ کا سفر ۱۹۱۲ء کلکتہ اس زمانہ میں حکومت کا پایہ تخت تھا، وقف اولاد کونسل کے اکثر مسلمان ممبروں سے ملنے کے لئے مولانا کو کئی دفعہ کلکتہ کا سفر کرنا پڑا، وہاں کبھی جسٹس شرف الدین کے ہاں

---

[1] یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم صفحہ ۵۳ میں ہے،

ٹھہرے، اور کبھی مولانا ابو الکلام صاحب کے پاس ۱۹۱۲ء کے شروع میں انھوں نے پھر کلکتہ کا سفر کیا، اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کئے، اور واپسی میں پٹنہ میں قیام کیا،

پٹنہ کا سفر ۱۹۱۲ء | مولانا نے پٹنہ کا متعدد بار سفر کیا، شروع میں ۱۸۹۶ء میں ندوہ کے لئے گئے اور غالباً مولوی عبد الغنی[۱] صاحب مرحوم وکیل کے دولتکدہ پر قیام فرمایا، پھر خدا بخش خاں کے کتب خانہ کی سیر کو کئی دفعہ گئے، ۱۹۰۶ء میں بھی گئے تھے، اور مولوی شرف الدین صاحب بیرسٹر کے یہاں ٹھہرے تھے، ڈھاکہ سے واپسی میں بھی پٹنہ میں ٹھہرے، اور خدا بخش خاں کے یہاں اترے، ایک دفعہ شمس العلماء مولوی حافظ محب الحق صاحب (مصنف دعوۃ الحق) کے یہاں مہمان ہوئے تھے،

اس دفعہ ۴ فروری ۱۹۱۲ء کی صبح کو وہ پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے معتقدین کا نہایت کثرت سے مجمع تھا، شہر کے عمائد اور کالج کے تمام طلبہ موجود تھے، آدھی راہ کے بعد طلبہ کے اصرار سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے، اور خود طلبہ ذوق و شوق کے عالم میں اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچکر فرودگاہ تک لائے، مولانا اس واقعہ کو لکھ کر فرماتے ہیں:- "یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پرست نفس کو بُری نہیں ہوئی ہوگی، لیکن واقعاً ہنسی آتی تھی کہ عجیب خوش اعتقاد، بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں" (ابو الکلام ۳۵)

مولانا کا ایسا سمجھنا اُن کے حسنِ تواضع کی دلیل ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں ان کے کا مول

---

[۱] مولوی عبد الغنی صاحب مرحوم ایک لائق خاندان کے لائق فرد تھے، پٹنہ کا مشہور مردم خیز گاؤں ڈیانواں اُن کا وطن تھا، علم دوست اور علماء کے قدرشناس تھے، پٹنہ کے مشہور وکلا میں تھے،

ں اور خصوصًا نوجوانوں میں اتنا ہی ہر دلعزیز بنا دیا تھا،

نا ایک جلسہ ہوا جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوئے اور مولانا نے اس میں وقف

ں کے سلسلہ میں ندوہ کا مناسب ذکر کیا، (ابوالکلام ۳۵)

اسی سال اکتوبر کے آخر میں انھوں نے پٹنہ کا ایک اور سفر کیا، اور غالبًا اس سفر کی غرض تعطیل جمعہ کے موریل کی تیاری کے سلسلہ میں تھا، اور غالبًا کتب خانہ میں قیام فرمایا، ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر محمود کو جواب پٹنہ میں بیرسٹری کر رہے تھے حسب ذیل خط[1] لکھا:- بانکی پور (پٹنہ) میں تو غالبًا کتب خانہ ہی میں ٹھہروں، مدت سے وہاں آمد و رفت ہے اور وہیں ٹھہرتا ہوں"

سیاسیات

مولانا کی سیاست واقعات کا جو سلسلہ چلا آتا ہے اُس سے ہمارے ناظرین پر یہ بات بے پردہ ہو چکی ہوگی کہ گو سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے، لیکن اُن کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں اُن کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جزو تھا، یعنی ان کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کو اسلام کی حکومت عزیز ہو، اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں اُس کو وہ مجسّم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمنِ اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا، اُن کی طرف سے اُن کو پورا انحراف ہو یہی اُن کی سیاست تھی

[1] اس خط کا عکس ندیم گیا اگست ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے،

ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لئے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست بُرد سے تہمہ تن فریاد، اسی جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک دوسری شکل اُن کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے، لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے بین اسلامی تھے،

مابین الاسلامی سیاست ترکوں سے محبت

اس وقت ساری دنیا میں صرف ٹرکی ہی کی وہ سلطنت تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلام کے شان وشکوہ کا جلوہ نظر آتا تھا، اس لئے اُن کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، اُن کی جوانی تھی کہ ۱۸۷۶ء میں روس و روم کی جنگ نمودار ہوئی، اس لڑائی میں سارا ہندوستان، بلکہ ساری اسلامی دنیا ترکوں کے ساتھ تھی، ہندوستان بھر میں مسلمانوں نے ترکوں کی اعانت کیلئے چندے جمع کئے، بلکہ حضرات علماء نے بھی اس میں پوری طرح حصّہ لیا، اور چندے جمع کرکے ٹرکی بھیجے، مولانا نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس سلسلہ میں کام کیا، اور اپنے شہر کی طرف سے کئی ہزار روپیے سفیر ترکی مقیم بمبئی کی معرفت قسطنطنیہ بھیجا، یہی وہ راستہ ہے جس سے ترکوں کی محبت نے اُن کے دل میں گھر کیا، اور اسی محبت میں ٹرکی کا سفر کیا، اور وہ عشق جو اب تک صرف گفتار کے ذریعہ تھا، دیدار سے وہ اور دہ چند بڑھ گیا، اُن کو ترکوں کے کوکبۂ جلال میں بدر و حنین کے جلوے نظر آتے تھے،

تازگیِ بدر و حنین از تو ہست	زیب وطراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ	آنکہ بود شرع نبی را پناہ
فرۂ دینِ نبوی از تو ہست	بازوے اسلام قوی از تو ہست

اس زمانہ میں ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ کی سیاسیات کی نگاہ میں بڑا جرم تھا، مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور ہرچند کہ ٹرکی کے سفرنامہ کی ترتیب میں صرف اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا، سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا، مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگذر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا، اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی، انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ نے اس سفرنامہ پر ریویو لکھا تو کانپور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر "سلطان روم" کی تعریف کرتے ہو اور مولوی صاحب کو معذرت کرنی پڑی،

۱۸۹۵-۹۶ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کرکے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا، اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں، تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا، انھوں نے ۱۲ر فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڈہ کالج کی ملازمت میں تھے،

۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ جب پیش آئی، تو وہ علی گڈہ میں تھے، اور سرسید کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے، گو مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا، لیکن ان کو علیگڈہ کی فضا میں [illegible] گھٹن ہونے لگی، اور نتیجہ اسی قسم کی سیاسی کشمکش کا علحدگی تھا،

ان کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل و مناقب اور دلچسپ قصوں کے بیان سے

---

[1] یہ دونوں واقعے مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو مولانا کے اسی زمانہ کے ملنے والے اور دوست ہیں، اپنے مضمون یادِ ایام میں لکھے ہیں۔

خالی ہوتی تھی، اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے بلبل ہزار داستان بنجاتے تھے،

۱۹۰۸ء میں جب انور بے وغیرہ کے زیر علم ٹرکی نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ خوشی میں آپے سے باہر تھے، ایک ایک نامور نوجوان ترک، اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جانباز رکن کی تعریفیں کرتے تھے، سلطان عبد الحمید خاں کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے، کہ محمد علی شاہ کجکلاہ ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں نہیں برباد کردیا، بلکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا، انھوں نے اس انقلاب سے بڑی بڑی اُمیدیں قائم کر رکھی تھیں، اُس زمانہ میں شیخ عبد العزیز شاویش ٹرکی سے "العرب" نام ایک عربی اخبار نکالتے تھے، وہ اُن کے پاس آتا تھا، اس کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے، اور جو پڑھتے تھے اپنی مجلس میں اس کو دو دو ہفتہ تک بیان کرتے رہتے تھے،

۲۸ اگست ۱۹۰۸ء کو ایک خط میں مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں :- "ٹرکی کی جدید زندگی نے اس کے ہوا خواہوں کو مخمور کر دیا ہے، کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آجکل کیا نشہ ہوتا ہے، سو سو دفعہ پڑھتا ہوں، اور سیر نہیں ہوتا، آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے اُن میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کمانڈر ایک جنسِ لطیف تھی۔ . . . . ایران اور ٹرکی کی پارلیمنٹ، یورپ کا اثر نہیں، گو تو اردہے اَمْرُھُمْ شُوریٰ کا سبق مسلمانوں کو اب یاد آیا، اور چونکہ گھر کی چیز تھی کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال، دنیا کی تاریخ دکھائے گی تو اسلام ہی کے آئینہ میں دکھائے گی، خیال فرمائیے آٹھ لاکھ آدمیوں کا دربار قسطنطنیہ میں کوہ شکن موجیں لے رہا تھا، اور ایک تنکے کا بال بیکا نہ ہوا، معاویہؓ[1] کی غلطی کا کفارہ عبد الحمید نے ادا کیا" (مہدی ۹۴)

[1] یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس خطا کی طرف اشارہ ہے جو ان سے اسلام کے نظام شورائی کے توڑنے اور یزید کی ولیعہدی کے متعلق ہوئی۔ "س"

یہ خط اپنے لکھنے والے کے وفورِ جوش کا مرقع ہے، بار بار پڑھئے محسوس ہوگا کہ مسرت اور خوشی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر ہے، جو موجیں لے رہا ہے، اور یہ راز بھی یہیں سے کھلے گا کہ اُن کی سیاست کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہے، یورپ کی آزادی نہیں،

اسی زمانہ میں عطیہ بیگم (بمبئی) ٹرکی کے سفر سے واپس آئی تھیں، اُن سے حالات سُننے، اور جب انھوں نے یہ کہا کہ "ترکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہے، اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں، جدید قرض نے رہا جاں ستانی کا کام انجام دیا ہے اور دیتا جاتا ہے" تو انھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا (مہدی-۵۳) ان ہی کو سلطان عبدالحمید خاں کی نسبت کس قدر بلیغ فقرہ لکھ کر بھیجا ہے،

"عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے" (۵۶) ۲۲ نومبر ۱۹۱۰ء کو پھر انھیں لکھتے ہیں:- "ترکوں نے دکھا دیا کہ

بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پہ ۔۔۔ ناخنوں سے عندلیب کو میں نے دبا لیا

(ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں) عربی اخبارات آجکل پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں" (۴۴)

پھر دفعۃً جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا، تو اُن کے دل میں ٹھیس سی لگی اُس زمانہ میں اُن کا رہ رہ کر اضطراب، اور باتوں باتوں میں شعلہ نفسی مجھکو اچھی طرح یاد ہے، ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ما سوا سے بیخبر ہو جاتے تھے، اور ترک بہادروں کی جانبازی اور شجاعت کے قصّے مزے لے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری اور دو سرے نوجوان ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلیوں پر رکھ کر چھپ چھپ کے طرابلس پہنچ رہے تھے، اُن کی اس جوانمردی کے قصّوں کے دہرانے میں اس بڑھاپے میں بھی ان

میں جوانی کی اکڑ پیدا ہو جاتی تھی،

طرابلس کی اس لڑائی کے زمانہ میں ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، ہندوستان کا برِ اعظم اس زمانہ میں اسلامی جوش و خروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا یاد ہوگا کہ ترکی نے اٹلی سے اس بات پر صلح کر لی تھی، کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں گے، اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نبٹ لے، چنانچہ باب عالی نے اس کے مطابق طرابلس کو خود مختاری بخش دی[1]، اور شیخ سنوسی وغیرہ نے اس کی آزادی کا بیڑا اٹھایا مجھ اسی زمانہ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ یاد ہے، رات کو تقریباً آٹھ نو بجے بے وقت مولانا کا رقعہ آیا جس میں مجھے اور اونچے درجہ کے دو تین طالب علموں کو یاد فرمایا تھا، ہم سمجھے کوئی ضروری بات پیش آئی ہوگی جو اس وقت طلب فرمایا ہم لوگ بتمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں، سامنے لیمپ ہے، اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں، ارشاد ہوا، بھئی سنا؟ بڑا مزہ ہوا، عربی اخبار آئے ہیں، ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ترکی کی ندمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی نئی حکومت بنائیں گے اور آخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے، اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا، مگر اکیلے ہنستے نہیں بنتا تھا، اس لئے تم لوگوں کو بلوایا ہے، یہ کہہ کر صندوقچہ سے روپیے نکالے اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی منگائی، خوشی و مسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا، حالانکہ مولانا عموماً نو بجے سو جانے کے ہمیشہ سے عادی تھے،

---

[1] دنیا کے انقلاب کا حیرت انگیز منظر ہے، اس وقت ۲۴ رجنوری ۱۹۳۲ء کو اٹلی کی یہ سلطنت طرابلس ختم ہوگئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور اسی کے ساتھ اٹلی کی ذوافریقہ کی شہنشاہی کی زمین کا ایک ایک چپہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا، اور انگریزوں کے زیر علم آگیا، تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ،

ابھی طرابلس الغرب کی یہ مصیبت ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا، اسلامی جذبات کا وہ سمندر جو ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پایا تھا پھر جوش میں آیا، اور مسلمانوں کے دلوں میں علانیہ آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی، اس زمانہ میں اس تحریک کی رہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے، "شہر آشوب اسلام" کے نام سے غم و حسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پہ مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا، اور آج بھی جو کوئی اس کو سُنے گا، اس کی آنکھوں سے اشکِ غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے،

حکومت پہ زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کبتک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑینگی دھجیاں کبتک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کبتک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر انکو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کبتک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ اُن کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کبتک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کبتک

یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کبتک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کبتک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کبتک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو | دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کبتک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے | سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کبتک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا | ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کبتک
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں | ہمارے ذرۂ خاک ہوں گے زر فشاں کبتک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی | دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کبتک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں | مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کبتک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے | عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کبتک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟ | نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کبتک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے | تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کبتک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے | تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کبتک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی | چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کبتک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے | غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کبتک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں | تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کبتک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں | کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کبتک

یہ نظم (شاعرانہ معنوں میں) سراسر الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کی متعدد پیشین گوئیاں حرف حرف پوری ہوئی ہیں،

یہ نظم مولانا نے لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں جو ٹرکی کی فراہمی چندہ کے لئے ہوا تھا پڑھی تھی۔ خود[1]

[1] مکاتیب جلد دوم بنام مولوی ظفر علی خاں،

بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے، خواجہ کمال الدین صاحب (لاہور) اُس زمانہ میں اشاعتِ اسلام کی غرض سے لندن (بشپ گیٹ نمبر ۲۶) میں مقیم تھے، اس نظم نے ہزاروں میل دور سے اُن کے دل پر جو اثر کیا، اس کا ذکر اُن کے اس خط میں ہے، جو انھوں نے لندن سے مولانا کے نام لکھا تھا:- مکرمی مولانا : السلام علیکم

اگرچہ چھ ہزار کوس دور بیٹھے ہوئے کسی بات نے مجھے بچوں کی طرح رلایا تو آپ کے طبع زادِ جدید کے اس مصرع نے

ع چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک" کی حقیقت اور صداقت ہے، اور کیسا یاس افزا منظر سامنے آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرے . . . .

مسلمانوں نے بار بار حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساس کا لحاظ کرے، اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے، مگر اُس کا جواب ہمیشہ یاس انگیز ملا، اس پر شاعر نے جل کر یہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے توڑے،

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا	مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستاں تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیر ملت	عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ "میں ٹرکی سے یکسو ہوں"	یہ وہ الفاظ ہیں جنکی جہانگیری زباں تک ہے
ہمارا جوشِ اسلامی اُنھیں باور نہیں آتا	یہ اندازِ تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں	کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جا کر یہ کہدے ہم گنہگاروں کی جانب سے	کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

اسی زمانہ میں جب تمام ہندوستان میں وزراے برطانیہ کے اس طرزِ سیاست کے

خلاف جوش و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی، بمبئی میں ایک گمنام وفادار اسلامی انجمن بمبئی کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اُس کی تجویزیں شائع ہوئی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی،

ایک دن تھا کہ وفاداریِ مسلم کی متاع ہر جگہ عام تھی، اور نرخ میں ارزانی بھی

دفعۃً ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم قوم کو سخت مصیبت تھی، پریشانی بھی

ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا ڈھونڈھنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی

ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن! کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی

تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی

یہ الگ بات ہے اندھوں کو وہ آئے نہ نظر گو اسی زمرہ میں ہے "یوسف[1] توبانی" بھی

اُس زمانہ میں ہز ہائینس سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمینِ یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ وہ دولِ یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غم و غصہ پیدا ہوا، کیونکہ اس سے اُن کے عالمگیر سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا، مولانا نے آغا خاں کو اپنی دو نظموں میں طنزیہ جواب دیا، جو کلیات میں موجود ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں اس لڑائی میں ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں ترکی کے محاذِ جنگ پر بھیجا گیا تھا، اس کے ممبر شعیب قریشی (موجودہ وزیر حضوری بھوپال) چودھری خلیق الزمان وکیل لکھنؤ، عبدالرحمان صاحب صدیقی (موجودہ ممبر اسمبلی بنگال)

[1] سیٹھ یوسف توبانی مرحوم، عمر توبانی کے والد، بمبئی کے ممتاز تاجر تھے، اور تعلیم کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے تھے، وہی اس جماعت کے سرگروہ تھے،

عبدالعزیز انصاری وغیرہ تھے، یہ سب اُس زمانہ میں علی گڈہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے، مگر جوش کا یہ عالم
تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کیلئے چل کھڑے ہوئے، ڈاکٹر سید عبدالرحمان صاحب (موجودہ
میڈیکل آفیسر بھوپال) جو اُس وقت انگلینڈ میں اپنی طبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے وہیں سے سیدھے
چل کر قسطنطنیہ پہنچے، ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہمراہ تھے، اور وہ بھی انگلینڈ ہی سے آکر ملے تھے،
اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کئے، اور تاریخ
میں یہ ترک بھائیوں کی خدمت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا پہلا کارنامہ تھا، ڈاکٹر
انصاری مرحوم جو برسوں لندن کے شفاخانوں میں کام کر چکے تھے، اس وقت ہندوستان میں موجود
تھے، موصوف کا وطن غازی پور میں یوسف پور کا قصبہ ہے جو اعظم گڈہ سے جو مولانا کا وطن تھا نسبتہً
قریب ہے، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب مشہور حکیم نابینا صاحب مولانا
کے ہم درس تھے، انھوں نے بھی اعظم گڈہ میں مولانا فاروقی صاحب سے پڑھا تھا، مولانا اور ڈاکٹر صاحب
کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، ڈاکٹر صاحب اُس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے، اس پر بھی
یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہوکر روانگی کے لئے دلی جا رہے ہیں، لکھنؤ کے
اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے
ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں، کہ دفعتہً اس ہمہ تن جوش
علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعتہً ڈاکٹر انصاری
کے بوٹ پر جھک گیا[1]، آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا، اور لب نے اس کے بوسے لئے اور
گاڑی اسلامی غیرت وحمیت کے ان گہرہائے گرانمایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی،

[1] اس نظم کے واقعہ کو غلبۂ حال پر محمول سمجھنا چاہئے "س"

چند مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا یہ طبی وفد لے کر ہندوستان واپس آئے ہیں تو مولانا اتفاق سے بمبئی میں تھے، جب وہ جہاز سے اترے تو مولانا نے اُن کے پاؤں دو بارہ چومنے چاہے، ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ "یہ تمھارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں" اُن کے یہی جذبات موزون نالہ کی صورت بن کر بمبئی کے اُس جلسہ میں ظاہر ہوئے جو اس وفد طبی کے استقبال و خیر مقدم کے لئے بمبئی میں ہوا تھا، بڑی پُر درد نظم ہے،

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی، یہی تھی رسمِ غمخواری

فراقِ ملک و ترکِ خانمان و دوریِ منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

تمھارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہ ہائے درد و جوشِ گریہ و زاری

نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں باری
فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری

مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں باایں گرانباری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لئے وہ آپ کی شب ہائے بیداری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمھیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری

تمھارا ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے نازبرداری

تمھارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری

تمھیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری

نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی — تمھارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

مسلمانوں کے تم نے طالعِ واژوں بھی دیکھے ہیں — نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمھارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے — کہ تم نے وہ مظالم ہائے روزافزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سُنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے — زبانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا — بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی — نتائج ہائے اُمیدِ گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں

تمھیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں — شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں

تمھاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے — کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر — زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پُر توں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی — شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمھیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا — کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کو کوئی سمجھا تو تم سمجھے — کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی — تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے — کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبولِ یزدانی — تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

ایک فتویٰ اسی لڑائی کے زمانہ میں بقرعید کا زمانہ آگیا تھا، مولانا کو خیال ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس سال قربانی کے روپیے ٹرکی کے فنڈ میں داخل کردیں تو اچھا ہے کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کے

ہاتھوں میں چلا جائے گا، جو اس وقت اپنی حقیقی قربانی کر رہے ہیں، فقہ کی رو سے انھوں نے اس پر غور کیا تو ان کو کوئی مانع نظر نہیں آیا، مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی بھی یہیں تھے، اُن سے رجوع کیا، مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کو لکھا، اور اس باب میں جو فتوی مرتب کیا تھا وہ دکھایا تو سب نے تائید کی، ادھر سے تسلی ہو گئی تو اس تحریک کو اخباروں میں پیش کیا، اور وہ چل پڑی، اس طرح ہزاروں روپے اس فنڈ میں جمع ہو گئے، بعض علماء نے اُن کے اس فتوی سے اختلاف بھی کیا، چنانچہ مولوی ظفر علی خاں نے مولانا کو اپنا شبہہ لکھ بھیجا، تو ۷ ر نومبر ۱۹۱۲ء کو اس کے جواب میں لکھا:- "عزیزی مولوی ظفر علیخان صاحب دام قدرہ السلام علیکم، میں نے جو فتوی لکھا، اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں، اور مولوی عبد الباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے، ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے۔[1] البتہ ہدایہ میں صرف جواز ہے، اور میں نے افضلیت کا فتوی دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے،

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا، اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسمٰعیل پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟

پھر ۱۱ ر نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخباروں میں اپنا یہ خط چھپوایا،

[1] مولانا نے اپنی تائید میں ہدایہ کی یہ عبارت پیش کی تھی، والتضحیۃ فیہا افضل من التصدق بثمن الاضحیۃ یعنی عید اضحی کی قربانی کے دنوں میں قربانی کی قیمت کے صدقہ کرنے سے قربانی کرنا بہتر ہے، (ہدایہ کتاب الاضحیۃ) اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ اگر قربانی کے جانور کی قیمت نقد خیرات کر دی جائے تو گو اس صدقہ کا بھی ثواب ہوگا، مگر قربانی کی سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی، جیسا کہ اس کے آگے کی عبارت میں تفصیل ہے، لانہا تقع واجبۃ او سنۃ والتصدق تطوع محض فتفضل علیہ، "س"

جناب من! بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے،

لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نماز عصر قضا ہوئی، تو کیا یہ حجت ہوسکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لئے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لئے کیا حجت ہوسکتی ہے؟

قربانی شعار اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم اُن کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کرسکتے ہیں،

امید کہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کردیں!!

ترک اس جنگ میں اڈریانوپل (اورنہ) تک پیچھے ہٹ آئے تھے، اور اڈریانوپل بھی ہاتھ سے جاچکا تھا، مگر آخر آخر ایسی صورت ہوئی کہ انھوں نے اس شہر کو جو یورپ میں ان کا پہلا پایہ تخت تھا دوبارہ لے لیا، مسلمانوں کو اس فتح سے بڑی خوشی ہوئی، شاعر نے ۰ دسمبر ۱۹۱۲ء کو اس پر تہنیت کے یہ چند شعر گائے،

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق ۔۔۔ اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملّتِ ختم الامم ہے تو ۔۔۔ تو آج زورِ بازوے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود ۔۔۔ مغرب ترا ہی عرصہ گہِ ترکتاز ہے

تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں | اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقعِ عالم کا ہر ورق | شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

طرابلس اور بلقان کے ساتھ ساتھ سیاسیاتِ اسلامی کا تیسرا اہم حادثہ خود ہندوستان میں مسجد کانپور کی صورت میں پیش آیا،

مسجد کانپور کا ہنگامہ
اگست ۱۹۱۳ء
رمضان ۱۳۳۱ھ

بلقان کا شورِ محشر ابھی برپا ہی تھا کہ مسجد کانپور کا ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و قومی جوش و خروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونیں منظر ہے، یہ عین اس وقت رونما ہوا جب جنگِ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور بھڑک رہی تھی[1]، اور مسلمانوں کے دل برطانی وزارتِ خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے، دلوں کا یہ بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور اُن کے ماتحت حکامِ کانپور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہنچا دیا، کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی، وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی، جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا، اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اُس کو منہدم کر دیا گیا، حالانکہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں اک آگ سی لگا دی، ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی مسلمانانِ کانپور نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسۂ الٰہیات کانپور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا، جلسہ

[1] ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے ادرنہ نوپل لے لیا تھا، اس کے بعد گو لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر صلح ابھی تک نہیں ہوئی تھی صلح کی کانفرنسیں ستمبر ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئیں، "س"

کے بعد پُرجوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے مسجد کا رُخ کیا، اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چُن چُن کر رکھنے لگے، مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کانپور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو اِن نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے اُن پر نہایت بے رحمی سے دور سے گولیاں برسائیں، اور قریب سے برچھے مارے، شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے، شہداء کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہوا، سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا، اس خونی سانحہ نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا، آتش بیان مقرروں شعلہ افشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی، یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے، مولانا مرحوم پر اس واقعہ نے بے حد اثر کیا، اور یہ اثرات نالہائے موزوں بنکر اُن کی زبان و قلم سے ادا ہوئے، اور اُن کی اِن نظموں نے حقیقت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی انقلاب میں مسلّم طور سے بہت بڑا حصہ لیا، اس واقعہ کے کئی برس کے بعد تک یہ نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں، اور اب بھی ہیں،

اس واقعہ کے وقت مولانا بمبئی میں تھے، اور راقم الحروف کلکتہ میں الہلال کے ادارہ میں شامل تھا، اس واقعہ کو واقعہ بنانے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمانانِ کانپور کی پُرجوش حمایت میں کھڑا کر دینے، اور مقتول شہیدوں کے عزیزوں کی دلدہی و دستگیری، زخمیوں کی غمخواری و تیمارداری اور قیدیوں کی قانونی چارہ جوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان و قلم کا سب سے زیادہ مرہون ہے، وہ مولانا ابوالکلام کی ذات ہے، اس زمانہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر[1] پٹنہ کو کانپور بھیجا، اور

---

[1] شیوخ فاروقی میں تھے، چھپرا (بہار) کا ایک گاؤں فرید پور نامی اُن کا وطن تھا، انٹرنس کے بعد انگلستان گئے اور

اُن کے ساتھ ہر صوبہ کے ممتاز وکیلوں اور بیرسٹروں کا کانپور پہنچ جانا، ان ہی کی تحریک کا فیض تھا، مقامی حیثیت سے سید فضل الرحمان صاحب مرحوم وکیل کانپور کی محنتیں بھی بھولنے کے قابل نہیں، اسی واقعہ نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی کو سب سے پہلے ملک میں روشناس کیا، ملک کے سارے طول وعرض میں ان مظلوموں کی حمایت کے لئے مسلمانوں نے بے خطر جلسے کئے، آتشین تقریریں کیں، آزادی کا پیام سنایا اور مظلوموں کی امداد اور مقدمہ کے مصارف کے لئے تھوڑی سی کوشش میں انھوں نے ایک لاکھ کی رقم ایسی حالت میں جمع کر دی جبکہ ابھی مسلم یونیورسٹی کے لئے تیس لاکھ اور بلقان وطرابلس میں ترکی کی امداد کے لئے ہزاروں روپیے وہ دے چکے تھے اور دے رہے تھے،

غرض ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے ذکر کے قابل ہے، مولانا نے اس واقعہ پر جو پُرجوش نظمیں لکھیں، وہ اس قدر پُراثر تھیں کہ جس ہفتہ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۱) بیرسٹر ہوئے، یہ اور گاندھی جی ایک ساتھ ایک جہاز میں بیرسٹر ہوکر ہندوستان واپس آئے تھے، پٹنہ میں بیرسٹری کرتے تھے، کانگریس کے حامی تھے، اور مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے، نہایت پرجوش اور بیباک لیڈر تھے، کونسل اور اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے، وقف اولاد کے کاموں میں ان کو زیادہ مشورہ انہی سے ملتا تھا، کانگریس و لیگ کے ملانے میں ان کا بھی حصہ تھا، ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک میں شامل تھے، اور ترک موالات کے سلسلہ میں پریکٹس چھوڑ دی تھی، پٹنہ میں صداقت آشرم کے نام سے ایک سیاسی خانقاہ بناکر اس میں گوشہ نشین فقیر بنکر بیٹھ گئے، یا تو زندگی سراسر انگریزی تھی اور یا بدلی تو ایسی بدلی کہ گلاس میں پانی تک نہ پیتے تھے کہ یہ انگریزی چیز ہے مٹی کے کٹورے میں پانی پیتے تھے، تہبند باندھتے اور انگرکھا پہننے لگے تھے، سپید داڑھی سینے تک لمبی ہوگئی تھی، زمین پر بیٹھتے تھے، اور اسی پر سوتے تھے، اور اسی سلسلہ میں روحانیات یعنی اسپر چولزم کا شوق پیدا ہوگیا تھا، میانہ قد گورا رنگ، بلند آواز، اسی فقیری اور گوشہ گیری کی حالت میں جنوری ۱۹۳۰ء میں وفات پائی، ستر برس کے قریب عمر ہوئی ہوگی۔

الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک اسلامی جوش وخروش کے رجز کا کام دیتی تھیں، اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی نظم لکھی اس میں اب بھی جوش وخروش کا وہی طوفان ہے،

کل مجھکو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے	دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر	بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر	نیند آگئی ہے، منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب	ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ	مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار	از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھدیتے ہیں جو سر	لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا	جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا	"ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں"

انھیں اس کا غم تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں کیوں تھے؟

مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے	خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہرہ سے یہ صدا آئے	"مجھے بھی کم سے کم اک غسلخانہ کی ضرورت ہے"
پنھائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں	یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی	تو مجھکو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلیؔ بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

اُن کے ولی تاثر کا اندازہ ان دو قطعوں سے کیجیے،

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں

سُن لو وہ گنج ہائے گرانمایہ دفن ہیں
کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کانپور میں

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کانپور کو سزا دی جائے، مسجد اپنی جگہ پر پھر بنوا دی جائے، قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے، اور مقتولوں کا خونبہا ادا کیا جائے، سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر یو پی اڑے تھے کہ مسٹر ٹیلر جو فیصلہ کر چکے اسمیں ترمیم نہیں ہو سکتی،

ابھی دو برس پہلے دہلی کی تاجپوشی کے موقع پر تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا تماشا ہو چکا تھا کہ لارڈ کرزن کی تقدیر مبرم کو خود شہنشاہِ برطانیہ نے آکر بدل دیا تھا جس کے متعلق ویسرائے اور وزرائے برطانیہ بار بار کہہ چکے تھے کہ "یہ طے شدہ اور ناقابلِ تغیر مسئلہ ہے" مولانا نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے تعریض و تلمیح کے رنگ میں یہ دو فارسی قطعے ارشاد فرمائے،

حضرت لاٹ بفرمود کہ فرمانفرمائے (جیمس مسٹن)
نیست ممکن کہ دگر بگذرد از گفتۂ خود"

صدرِ اعظم بہ سوئے قسمتِ بنگالۂ شرق (ویسرائے / وزیرِ اعظم)
نگہے کرد و بفرمود کہ "من کردم و شد"

مولانا نے فرمایا کہ اس اصول کی استواری کا حال تقسیم بنگالہ کے مسئلہ میں معلوم ہو چکا، اب جب وہ بنگالیوں کے ایجیٹیشن سے بدل چکا، تو اب مسلمان بھی اس فیصلہ کو بدلوائے بغیر دم نہیں لیں گے، "گربہ کشتن روزِ اوّل باید"

جنابِ لاٹ از فرمودۂ خود برنمی گردد | کہ تمکینِ حکومت را سیاست بیشتر باید
ولے در قسمتِ بنگالہ ایں اندیشہ می بایست | کہ "گربہ کشتن اوّل روز می باید اگر باید"

سر سید علی امام مرحوم اُس زمانہ میں ویسرائے کی کونسل میں ممبر تھے، انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم کو اور اُن کے ذریعہ سے مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم کو مصالحت کا پیام دیا، اور صلح کی گفت و شنید کا آغاز ہوا، اور بات یوں شروع ہوئی کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائیگا، ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، اور مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی، لیکن مسجد کا جو حصہ توڑ دیا گیا ہے وہ اب اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور مسلمان اس کو دوبارہ بنوانے پر اصرار نہ کریں، یہ سُنکر مولانا نے یہ قطعہ لکھ کر چھپوایا،

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح
یہ اگر سچ ہو تو جز خوبیِ تقدیر نہیں
لیکن انعامِ گرانقدر و وظائف کی طمع
یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے
دیتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
دادخواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا
ورنہ اُن کو گلۂ سختیِ تقدیر نہیں
ہم سے خود ذوقِ اسیری نے یہ کانوں میں کہا
کہ خمِ طرۂ محبوب ہے، زنجیر نہیں
جزوِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی
یہ بجا مسئلۂ فقہ کی تعبیر نہیں

آپ اس بحث کی تکلیف فرمائیں کہ آ | حاملِ فتنہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں
بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زباں | یہ بھی کچھ مانعِ آزادیِ تحریر نہیں
اور بھی برہمیِ طبع کا ساماں ہے یہ | فتنۂ عام کے دبنے کی یہ تدبیر نہیں
فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیمِ قلوب | تیر ترکش میں نہیں ہاتھ میں شمشیر نہیں
اور ہی کچھ ہے گرفتاریِ دل کی تدبیر | سختیِ طوق و گراں باریِ زنجیر نہیں
جبر سے برہمیِ عام کا رکنا ہے محال | یعنی اس خوابِ پریشاں کی یہ تعبیر نہیں
دادخواہوں سے یہ آخر نے جو ارشاد کیا | کہ یہ حکمِ ازلی قابلِ تغییر نہیں"
حسنِ ظن کے جو گرفتار تھے یہ بول اٹھے | اس مرقع میں بھی اسلام کی تصویر نہیں
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک | پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں

بالآخر مصالحت کی تدبیر کامیاب ہوئی، لارڈ ہارڈنگ ویسرائے خود کانپور آئے اور سر علی امام نے حکومت کی طرف سے اور مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی نے مسلمانوں کی نیابت فرماکر معاملہ کو اس طرح طے فرمایا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، مقدمے واپس لے لئے جائیں، اور مسجد جو بلندی پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصہ کو اس طرح بنایا جائے کہ اوپر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے، اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمد و رفت کا راستہ رہے، اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا، اور ویسرائے نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان پر مسلمانوں کے احرار اور وفادار دونوں طبقوں نے شکرگذاری کا اظہار کیا، مولانا نے ویسرائے کو خطاب کرکے حسبِ ذیل قطعہ میں اپنی شکرگذاری کا فرض ادا کیا،

اے ہمایوں گہر و افسرِ اورنگِ شہی | وہ کیا تو نے جو آئینِ جہانبانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست | یہ حقیقت میں ظفر مندیٔ سلطانی ہے
تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ انبوہ، وہ جوش | گرچہ زائد نہ سہی فطرتِ انسانی ہے
تیرے لطف و کرم عام نے دیدی یہ ندا | کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا | بازوؤں میں یہ ترے زورِ جہانبانی ہے
بات رکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی | گرچہ لازم انھیں اظہارِ پشیمانی ہے
گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی | شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سیاہ | اُن میں یہ پیشکشِ شبلیِ نعمانی ہے

اور مولانا ابوالکلام کو جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کی جان تھے لکھا:- "برادرم: کان پور کا معاملہ جس طرح ہوا فیصل ہوگیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔" (ابوالکلام - ۳۰)

چنانچہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا، مظہرالحق صاحب کے پاس جو ہزاروں روپیے جمع ہوگئے تھے، اس سے برسوں تک پہلے کانپور کے مظلومین اور بیواؤں کی امدادیں ہوتی رہیں، پھر وہ سلسلہ بند ہوگیا۔

سیاسیاتِ ہند | ملکی معاملات میں وہ ہمیشہ سے آزاد تھے، اور آزاد رہے، حالانکہ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس نے اُس زمانہ کے دستور کے مطابق حکومتِ وقت سے وفاداری اور حکامِ شہر کی تابعداری میں نیک نامی حاصل کی تھی، اُن کے والد ماجد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے، اپنی ساری عمر حکامِ ضلع کی خوشنودی کی دولت جمع کرنے میں صرف کی تھی، وہ گھر سے

سے نکل کر علی گڈھ گئے تو وہاں کی فضا بھی یہی تھی، وہاں کے آنے جانے والے بھی وہی تھے، بلکہ اس موضوع نے وہاں قومی مذہب کی حیثیت اختیار کرلی تھی جس سے انکار ارتداد سے کم نہ تھا، اس لئے ان موانع کے ساتھ مولانا کی سیاسی آزادی اُن کی فطری صلاحیت کے سوا کسی اور سبب کی ممنون نہیں ہوسکتی،

مولانا اپنے ایک خط میں جو معارف میں چھپ چکا ہے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں: "پالٹکس میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا، اور کانگرس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔ (معارف نومبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۹۴)

خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو سرسید اور مولانا شبلی کے زمانہ کے علی گڈہ کالج میں پڑھے ہوئے تھے اور دونوں سے اچھی طرح واقف تھے، مولانا کے سانحۂ وفات پر اپنے "عصر جدید" (مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء میں) لکھتے ہیں:۔ "سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوے تھے، اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانہ ہی سے مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔"

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ سرسید نے لکھنؤ میں کانگریس کے خلاف جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے اپنا نام چھپا کر علی گڈہ گزٹ میں اُس کا جواب لکھا تھا،

۱۸۹۲ء میں یونین کے ایک جلسہ میں شخصی اور جمہوری حکومت پر جو مباحثہ ہوا تھا، اور مولانا نے جمہوریت کی تائید پر جو تقریر کی تھی اور سرسید نے اس کے جواب میں اپنے گزٹ میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے،

با ایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی، وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگریس کے مطالبوں پر رجز خوانی، اور مسلمانوں کی سیاسی گمرہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس، اُردو اخباروں میں "ہندوستانی" لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورما نکالتے تھے، بہت شوق سے پڑھتے تھے، اور اُس سے اثر لیتے تھے، لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں "تقسیمِ بنگال" کی تنسیخ نے دفعتہ لبوں کی مہر کو توڑ دیا، نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا بیباکانہ مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا، جس کی سُرخی "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" ہے، مسلمانوں میں مستقل سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لئے آزاد اخبارات کا وجود بہت ضروری تھا، اس وقت لاہور سے زمیندار دلی سے ہمدرد اور کلکتہ سے الہلال جیسے آزاد اخبارات نکل رہے تھے اور یوپی جو اصل میں مسلمانوں کا تمدنی و سیاسی مرکز تھا، اس قسم کے اخباروں کے وجود سے خالی تھا، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنا چاہا

مسلم گزٹ ۱۹۱۲ء — اس زمانہ میں لکھنؤ میں ایک عالی ہمت نوجوان سیّد میر جان صاحب تھے انھوں نے اُن دنوں لکھنؤ کی سرگرمیوں میں بہت اچھا خاصہ حصہ لیا تھا، ایک ریڈنگ روم قائم کیا تھا، مولانا نے اُن دنوں امین آباد پارک کی شمالی قطار میں ایک بالاخانہ کرایہ پر لیا تھا، اس میں رہتے تھے، اسی کے پاس یہ ریڈنگ روم تھا، سید میر جان صاحب اکثر مولانا کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، مولانا نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ ایک آزاد مسلمان اخبار جاری کریں، جس کے تبادلہ میں اخبارات آئیں گے بھی اور صحیح خیالات کی ترویج بھی ہوگی، انھوں نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے مضامین کی نگرانی مولانا اپنے ذمہ لیں، انھوں نے اس کو قبول کیا، اور اسی طرح مسلم گزٹ کے نام سے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے اخبار نکلا،

اخبار کی اڈیٹری کے لئے مولانا نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم کو پسند کیا، جو اس سے پہلے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور معارف (علی گڑھ) کے اڈیٹر تھے، اُن کا کمال یہ تھا کہ وہ پورا اخبار تنہا تیار کر لیتے تھے، بڑے لکھنے والے تھے اور جو لکھتے تھے وہ ٹھوس لکھتے تھے، اس میں نری لفاظی اور بھرتی نہیں ہوتی تھی لیکن، دقت یہ تھی کہ علی گڈھ کے زمانہ میں اُن کے اور مولانا کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس کی بنا پر مولوی وحید الدین صاحب سلیم کا دل مولانا کی طرف سے صاف نہ تھا، الفاروق نکلی تو مئی ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی نے اس پر ریویو لکھا، اور اس کو مولوی وحید الدین صاحب کے رسالۂ معارف علی گڈھ میں چھپوانا چاہا تو مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا :-

بہتر ہے معارف میں بھیج دیجئے، مگر پہلے اُن سے پوچھ لیجئے، کہ چھاپیں گے یا نہیں ؟ اڈیٹر صاحب مجھ سے خفا ہیں،" (شروانی - ۵) مگر بہر حال وہ ریویو اس میں چھپا، اس کے دو ہی برس کے بعد ۱۹۰۱ء میں جب حیاتِ جاوید نکلی تو اُس اختلاف کی بنا پر جو مولانا کو سر سید کے بعض خیالات یا پچھلی کارروائیوں سے تھا اور جن کا ذکر حیاتِ جاوید میں نہیں یا بہت ہلکا ہے، مولانا نے اس کتاب کو مدلّل مداحی یا کتاب المناقب کہا جس سے مولانا حالی کی تنقیص مقصود نہ تھی، بلکہ یہ مقصود تھا کہ اس کتاب میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے دونوں رُخ نہیں، مولانا حالی کو اس کمی کا احساس خود بھی تھا، چنانچہ انھوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرزِ عمل کی توجیہ کی ہے،

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "میں نے جو ریویو حیاتِ جاوید پر لکھا تھا اس میں یہ پہلو بسط سے دکھایا تھا، مولانا نے اس کو پڑھ کر لکھا کہ اگر اور ریویو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے" بہر حال مولانا کی اس تنقید سے مولانا حالی کے بعض خاص عقیدتمندوں کو بڑی تکلیف پہونچی

اور اس وقت سے ان صاحبوں کے قلم سے جب کوئی ایسا مضمون نکلا جس میں مولانا شبلی کا ذکر کسی طرح آسکتا ہو تو اس کو قصداً لایا گیا، اور اُن پر چند نا ملائم حرف کہنا صداقت کا منشا سمجھا گیا، حالانکہ خود ان دونوں بزرگوں کے دل باہم صاف تھے اور دونوں ایک دوسرے کے پورے جوہر شناس تھے۔

غرض یہ کہ اس اختلاف کے باوجود مولانا نے اُن کو اڈیٹری کے لئے منتخب کیا، اور وہ خود کسی تقریب سے علی گڈھ گئے تو مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے اور اُن سے مولانا حمید الدین صاحب کے قیام گاہ پر ملاقات ہوئی، اور طرفین کے گلہ و شکایت کے بعد جس میں سرسید کی لائف لکھنے کے پرانے واقعہ سے حیاتِ جاوید تک کے معاملات پر گفتگو ہوئی، اور آخر کار پرانی شکایتوں کی بساط لپیٹی گئی، اور باہم لطف و محبت کا نیا عہد نامہ مرتب ہوا، اور مولوی صاحب مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے لئے لکھنؤ تشریف لے آئے، اور مولانا کے قریب ہی ایک دوسرے بالاخانہ میں قیام کیا، اور مسلم گزٹ ایک آزاد اخبار کی حیثیت سے بہت کامیابی سے نکلا، اور دو سال تک نکلتا رہا، اور مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء تک اس کے اڈیٹر رہے،

شروع شروع میں مولوی صاحب اور مولانا میں بڑا اتحاد رہا، اکثر ساتھ نشستیں رہتیں صحبتیں ہوتیں اور معاملات پر گفتگو اور اخبار کی سیاست کی تجویزوں پر بحثیں ہوتیں، مولانا اس اخبار میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی بے نام کے مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ خاص مولانا کا اخبار ہے، اس لئے اس اخبار کی پسندیدگی کا سارا کریڈیٹ مولانا کے حصہ میں آتا رہا، مولانا کا خیال تھا کہ مولوی وحید الدین صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا، اور وہ اس کی فکر میں رہے

سلہ بروایت مولوی اقبال احمد صاحب سہیل جو اُس وقت وہیں موجود تھے،

کہ کوئی ایسا موقع آئے جس میں خود مولانا کے مقابلہ میں وہ اپنی آزادی کا ثبوت دیں، چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کے سلسلہ میں اُن کو یہ موقع ہاتھ آیا، اور انھوں نے نہایت ناموزوں طریقہ سے مولانا کے خلاف سخت و درشت مضمون لکھنے اور چھاپنے شروع کئے، پھر ۱۹۱۳ء میں طلبائے ندوہ کی اسٹرائک کی تقریب سے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا تاکہ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ اخبار سارا مولانا کا ساختہ و پرداختہ ہے دور ہو جائے، اسی درمیان میں مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء میں پولیٹکل وجوہ سے گورنمنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے باہر کر دیئے گئے، اور یہ سلسلہ ختم ہوا[1]

مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ بہرحال مسلم گزٹ جس سیاسی مقصد کو لے کر پیدا ہوا، اور چلا اور بڑھا وہ تمامتر مولانا کی تجویز و ہدایت کے مطابق تھا، اس وقت تقسیم بنگال کی تنسیخ، بلقان کی جنگ، مسلم یونیورسٹی کے مطالبات، کانپور کی مسجد، اور مسلم لیگ کی اصلاح اور مسلمانوں میں صحیح پالیٹکس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش وغیرہ مسائل خاص اہمیت رکھتے تھے، اور ان ہی مسئلوں پر مولانا کے مضامین اور نظمیں نکل رہی تھیں، مسلم گزٹ میں اُن کے جو سیاسی مضمون نکلے اُن میں سب سے اہم سلسلۂ مضمون وہ ہے جو "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" کے عنوان سے چار نمبروں میں شائع ہوا، حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلل اور پُرجوش تھا کہ اُس نے مسلمانوں کی سیاست کا رُخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا، مضمون کا پہلا نمبر جو ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو نکلا اس کا آغاز یہ ہے: "اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر گیا، تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے، لیکن مرکز پالیٹکس اور اس کے حوالی سے جو صدائیں آتی ہیں ز و وفنا ہونے

[1] مکاتیب سلیمان ص ۵۳ نیز دیکھیے عبدالباری ص ۔

کے ساتھ خود ان کا لہجہ بھی غلط ہی،

پانیر کا مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے کہ "چونکہ اب نظر آتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہمارا فارن رتبہ قائم نہیں رہیگا، اس لئے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا چاہئے"! ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہی، لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی، اور ہمیشہ اچھی بات رہیگی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے وہ اسلام کا ننگ ہی، کیا ہم کو ہمسایوں کے دامن میں اسی لئے پناہ لینی چاہئے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا؟ کیا اگر ٹرکی اور ایران پُر زور ہوتے تو ہمارے ہمسایہ کے مقابلہ میں مدد کرسکتے؟ کیا شملہ ڈیپوٹیشن کی اس فنخاری پر انگریزوں کو یقین آگیا تھا کہ ہمارا پولیٹیکل وزن اپنے ہمسایوں سے زیادہ ہے؟

اس کے بعد نواب وقارالملک بہادر کے اُس بہادرانہ مضمون کا ذکر ہے جو تنسیخِ بنگال کے بعد اُن کے قلم سے نکلا، لیکن اُن کی اس رائے سے کہ "مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو اُن کی ہستی فنا ہوجائے گی" اتفاق نہیں کیا، لکھا ہے۔ "نواب وقارالملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز ہوسکتا تھا، اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہوجاتی کہ ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہوجائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہوجائے گی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں، اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کرور، اور مسلمانوں کے ۷ کرور افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے، اگر دادا بھائی نوروزجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہوسکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۷ کروڑ مسلمانو کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئے،

غرض دلائل اگرچہ غلط ہیں لیکن بات بالکل صحیح ہے، کہ پولیٹیکل خواب سے بیدار ہونے کا وقت آگیا ہی"

اُس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غفلت پر ماتم کیا ہے: "ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی، ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل تک تھا، ہماری پالیٹکس جبکی آواز کلمۂ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی۔ "ابھی وقت نہیں آیا ہے" "ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہئے، ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے، ہماری تعداد کم ہے، اس لئے نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں"

یہ الفاظ اس قدر دُہرائے گئے کہ قوم کی رگ وپے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ اُن خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیمافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دُہراتا ہے،

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جد وجہد، سعی وکوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا، ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے، اور جو باوجود دولت مندی کے زمین پر سوتے اور کمل اوڑھتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے، جہاں اس وقت ۲۹ بی اے پالیٹکس کی تعلیم پا رہے ہیں، جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے، اور اُن کی کل زندگی کی قیمت صرف ۳۰ روپیہ ماہوار ہوگی، ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج میں ۱۹ پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی اے سے کم تعلیمیافتہ نہیں، صرف ۵۰ روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ تارپہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک

ذرہ جنبش نہیں پیدا کر سکتے، ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی، ہمارا قومی تربیت یافتہ گریجویٹ قومی کام میں نرخِ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت نہیں کم کرتا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہمارا پولیٹیکل احساس بالکل مر گیا ہے،

دنیا میں صرف آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پُرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لئے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرشِ خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن اور بزدلی چھا گئی، ہمارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظامِ حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے، اور پھر پارلیمنٹ اور وایسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں، اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں، یہانتک کہ مرحوم کو علی گڈھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑتا ہے کہ "تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں" ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لئے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے،

جب ہم اس اختلافِ حالت کا سبب پوچھتے ہیں تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں کہ "ہندو مچھر ہیں" اس لئے گورنمنٹ کو اُن کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں، لیکن مسلمان شیرِ نیستاں ہیں اُنکی ہمہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے، خیر! یہ فریب کاری ختم ہو چکی، غفلت کا دور گذر چکا، قوم میں ایک احساس

پیدا ہو چلا ہے، اور صرف یہ متعین کرنا رہ گیا ہے، کہ نئی زندگی کا طریق عمل کیا ہوگا؟

مضمون نے دوسرے نمبر میں حسبِ ذیل اُمور پر بحث کی ہے:۔

(۱) پالیٹکس کی صحیح اسکیم،

(۲) ہمارے موجودہ طریقہ کی غلطیاں،

(۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد،

پھر لکھا ہے کہ مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں، ایک یہ کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں (موجودہ زمانہ میں اس کو یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی ہیں) اور دوسری یہ کہ وہ مسلمان ہیں، اب مسلمانوں کی پالیٹکس کا ہیولیٰ ان ہی دو جزوں سے بنکر تیار ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا نے پہلے شخصی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت کی تائید کرکے اس غلطی کو دور کیا ہے کہ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ اُن کی ذاتی رائے تھی، بلکہ اُن کے پس پشت کوئی اور قوت تھی جو (کالج کے فائدے دکھاکر اور مسلمانوں کی تعلیمی کمزوری سے ڈراکر) گویا زبردستی اُن کے منہ سے یہ کہلوارہی تھی، چنانچہ سرسید کی سیاسی آزادی کے چند واقعے نہایت بلیغ انداز میں گنواکر فرماتے ہیں:۔" ایسے بہادر کو حالات، اور گردوپیش کے واقعات نے اس پر مجبور کیا کہ اُس نے تمام اسلامی ملک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلافِ حالت پیدا کردیا؟ ان سوالات کا آج جواب دینا، غیر ضروری بلکہ مضر ہے"

اس کے بعد سرسید کی لکھنؤ والی تقریر کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر واقعات سے اس کا مدلل اور مُسکت جواب دیا ہے، آخر میں کہتے ہیں:۔" بہرحال سیدنے اگر نیشنل کانگریس سے روکا تو اچھا کیا کانگریس

میں شریک ہونا پھر بھی تقلید تھی، جو ہمارا عار ہے، ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، ہم کو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے، ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی، اس لئے ہم کو ایک جداگانہ پولیٹکل اسٹیج کی ضرورت ہے، اس موقع پر پہنچکر دفعتہً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے "مسلم لیگ" یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں، اینٹی کانگریس ہے؟ نہیں، کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے"۔

مضمون کے ان دو نمبروں کا شائع ہونا تھا کہ سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی فیض آباد اور راولپنڈی میں اُن کے خلاف تحریک کھڑی کی گئی، اور ساتھ ہی اسی جرم میں نواب وقارالملک کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی، اس پر مولانا نے اپنے مضمون کا تیسرا نمبر لکھا جن کا آغاز ان فقروں سے ہے:- ہمارے پچھلے دو آرٹکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہے، ہمارا جرم مفرد جُرم نہیں، بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہے، ہم نے مسلمانوں کی سنی سالہ پالیٹکس کی بے احترامی کی، ہم نے مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی سے بغاوت کی، ہم نے اتفاقِ عام کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا چاہا، ہماری گستاخیوں سے ڈر ہے کہ لیڈروں کی عظمت وشان میں فرق آجائے، ہمارا لہجہ سخت ہے، ہم لیگ جیسے بزرگ انسٹیٹیوشن کی عظمت کے منکر ہیں، ہم مصنف کے درجہ پر قانع نہ ہو کر پولیٹیکل لیڈر بننا چاہتے ہیں، ہم کونسل کی ممبری کے امیدوار ہیں"۔

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ کی غلط پالیسی پر پورا تبصرہ کر کے صحیح پالیٹکس کا ایک نظام پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ فقرہ کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے:- "اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائینگے لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے، یہی صحیح پالیٹکس ہے"۔

پھر مسلم لیگ کی کیا حقیقت ہے؟ اور وہ کیونکر عالم وجود میں آئی، اس پر چند فقرے ہیں:۔

"اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج، بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی، مسلم لیگ کیونکر قائم ہوئی؟ کب قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وحی (بقول سرسید مرحوم) خود دل سے اٹھی تھی یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا؟

یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں، اور اگرچہ اُن کے جواب دینے کا حق ہم کو اُسی قدر حاصل ہے جس قدر خود بانیِ اوّل کو (کیونکہ جب یہ تماشا ہو رہا تھا تو مجھ کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی)، تاہم اس سے ضروری تر باتیں درپیش ہیں، اور ہم کو پہلے اُن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

امور تنقیح طلب حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کیا لیگ کا کانسٹیٹیوشن پالیٹکس سے مطابقت رکھتا ہے؟

۲۔ کیا اس میں پالیٹکس کی علامات پائی جاتی ہیں؟

۳۔ کیا مسلم لیگ، مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے؟

لیگ کا سنگِ اوّلیں شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا، اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہیگی، ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا، اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی سی سالہ جدوجہد سے) حاصل کئے ہیں، اس میں مسلمانوں کا حصّہ متعین کر دیا جائے۔"

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگریس کی رودادوں سے ان دونوں کے مطالبات کی قدر و قیمت کا موازنہ کیا ہے، اور دونوں کے تخیل اور طریقِ عمل کے فرق کو دکھایا ہے، پھر آخر میں مسلم لیگ کے نظامِ ترکیبی پر بحث کی ہے، اور پوچھا ہے:۔ "سب سے آخری بحث یہ ہے کہ مسلم لیگ

کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اُس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے، اور اس کو اپنے انجمن کے لئے نیابتِ صدر کے لئے، سکریٹری شپ کے لئے، ارکان کے لئے، اضلاع کے عہدہ داروں کے لئے وہ مہرے مطلوب ہیں جن پر طلائی رنگ ہو؟ لیکن پولیٹیکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولتمند اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے؟ ہندؤوں کے پاس زمینداری، دولت اور خطاب کی کمی نہیں، لیکن کیا انھوں نے تیس برس کی وسیع مدت میں کسی بڑے زمیندار یا تعلقہ دار کو پریسیڈنٹی کا کرسی نشین کیا؟ کیا اس کے پریسیڈنٹوں میں کسی کا سر خطاب کے تاج سے آراستہ ہے؟"

مولانا نے اس کے بعد اضلاع میں مسلم لیگ کی شاخوں کی ضرورت پر اس لئے بحث کی ہے کہ سارے اضلاع میں چونکہ ایسے مسلمان نہیں مل سکتے جو بہادری سے صحیح پالیٹکس پر چل سکیں، اس لئے حالت یہ ہوئی ہے کہ جاہ پسند دولتمندوں کی تلاش ہوتی ہے، اور چار و ناچار اُن کے سر پر یہ تاج رکھ دیا جاتا ہے،

اس کے بعد صحیح پالیٹکس کا نظام پیش کیا ہے، اور اس کی پہلی دفعہ یہ لکھی ہے:-

۱- سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں، اُن کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے، جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ ہے جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا، یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا مدار ہے، ہر شخص اپنی

آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشتکار روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں، ہر بندوبست مال گذاری کی مقدار میں اس قدر اضافہ کردیتا ہے کہ جو زمینیں مویشی کا حق تھیں اُن کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے، چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے، چراگاہیں مزروعہ بنتی جاتی ہیں، ایک فصل بھی اگر کمی کرجائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ہزاروں کاشتکار گھر چھوڑکر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں، مالگذاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہوکر بے دردمہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، بایں ہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے، اور زمیندار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے،

فرض کرو، اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہوجائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا، یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں؟

۲۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انتظامی کاموں میں یہ خواہش کیجائے کہ ہندوستانیوں کی شرکت ہو گوکھلے نے یہ بل پیش کیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک کونسل چھ آدمیوں کی قائم ہو، اور کلکٹر ضلع اُن کے مشورے سے انتظامی امور عمل میں لائے، کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اپنا حال ہم دوسروں سے زیادہ جان سکتے ہیں، کس کو اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ اپنی تکلیف کا جس قدر احساس ہم کو ہوسکتا ہے دوسرے کو نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ سب سے عمدہ تدبیر تھی جو ملک کی بہبودی کے لئے پیش کی جاسکتی تھی، لیکن یہ بل نامنظور کردیا گیا مختصر یہ کہ بجز کسی خاص رزولیوشن کے باقی تمام اُن تجاویز کو جو کانگریس میں پیش کی جاتی ہیں، مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہئے، جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے،

۳۔ مولوی امیر علی صاحب نے حال میں جو صورت تجویز کی ہے، یعنی یہ کہ مشترکہ مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ اسٹیج قائم ہو، اور جب حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن جائے تو دونوں

گروہ کے ممبر برابر کے شریک ہوں، یہ نہایت صحیح تجویز ہے، اور اس کو فوراً اختیار کرنا چاہیے،

۴۔ مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمینداروں اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کرلی جائے صرف وہ لوگ شریک کئے جائیں، جو آزادی اور حقگوئی کے ساتھ اظہار رائے کرسکیں،

۵۔ سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قومی پالیٹکس کا ذوق پیدا ہوجائے، پالیٹکس ایک وسیع علم ہے، اس کے مسائل اور معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، اُن کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے، مہمات مسائل پر رسالے اور پمفلٹ شائع کئے جائیں، کچھ لوگ مقرر کئے جائیں جو ملک میں دورہ کریں، اور پولیٹکل مسائل پر عالمانہ لکچر دیں، جو دلائل، معلومات اور اعداد پر مبنی ہو،

۶۔ چند لوگ آنریری یا تنخواہ دار مقرر کئے جائیں، جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، مثلاً کسی ایک ضلع کے صدر مقام میں قیام کرکے ان امور کی تحقیقات کریں کہ تیس برس پہلے ضلع کی کیا حالت تھی؟ کتنے بڑے بڑے زمیندار تھے، کن لوگوں کے پاس زمینداریاں تھیں، اب کیا حالت ہے؟ کتنی زمینداریاں نیلام ہوگئیں، کس قسم کے قرضوں میں نیلام ہوئیں، بندوبست کا کیا اثر پڑا، کاشتکاروں کی کیا حالت ہے، کتنے آدمی دوسرے ممالک میں چلے گئے، اس قسم کے اعداد اور واقعات سے پُر نتائج یادداشتیں تیار ہوسکیں گی، اور گورنمنٹ ان سے فائدہ اٹھا سکے گی"

آپ نے دیکھا کہ صحیح پالیٹکس کے متعلق اُن کا نظریہ کیا تھا، مضمون کے آخر میں انھوں نے ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی، اور بتایا تھا کہ مغلوں کی حکومت کے دور میں یہ مصالحانہ اتحاد باہمی محبت اور رواداری کیونکر پیدا ہوئی، اور اب بھی وہ ممکن ہے،

مسلم لیگ کی اصلاح | ان مضامین نے مسلمانوں کے خیالات میں عجیب انقلاب برپا کیا، یہاں تک کہ

مسلم لیگ کے ارباب بست وکشاد نے بھی اپنے اندر ترقی اور اصلاح کی ضرورت محسوس کی، اور قوم کے بعض ممتاز لیڈروں نے مولانا کو یقین دلایا کہ ایکے سالانہ اجلاس (۱۹۱۲ء) میں لیگ کا نظام بدل جائیگا، مولانا اپنے مضمون کے چوتھے نمبر کے شروع میں لکھتے ہیں: "پچھلے آرٹیکل میں ہم نے مسلم لیگ کی جو موجودہ حالت، اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق بحث کی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ مضمون کے پہلے حصہ سے اکثر بزرگوں کو اتفاق ہے، اور قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ ایکے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریباً بدل دیا جائے گا، اور جو تجویزیں ہم نے لیگ کی اصلاح کی پیش کی ہیں، قریب قریب لیگ اسی قالب میں ڈھل جائے گی، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی، اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے۔"

لیکن ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ میں مولانا نے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا اس میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہیں رہے تھے یعنی ہندوؤں کی رواداری کو اتنا سراہا تھا کہ دوسری طرف مسلمان مجرم نظر آتے تھے، اس لئے اخیر نمبر میں یہ دکھایا کہ ہندوؤں میں یہ رواداری مسلمانوں کی بے تعصبی کے جواب میں تھی، اور تاریخی واقعات سے اس پر استدلال کیا، مگر افسوس کہ یہ نمبر ان کی زندگی کے بعد شائع ہوا،

۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، نظام بدلا، نصب العین کسی قدر اونچا کیا گیا "سلف گورنمنٹ" کو لیگ کا مقصد قرار دیا گیا، لیکن اُس کے ساتھ ایک ذو معنیین لفظ بڑھا کر سرکار اور احرار دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی یعنی "سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ"۔[۱]

مولانا مرحوم نے لیگ کی اس بوالعجبی پر خوب خوب طنزیہ نظمیں لکھیں، جو کچھ لکھیں وہ ایسی صحیح نکلیں،

[۱] دیکھو کلیات شبلی (اردو)

کہ آج تک اُن کی صحت میں فرق نہیں آیا۔ بہرحال اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نشترِ زیرِ قلم کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ مولوی نظام الدین صاحب بدایونی (اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں) نے کسوف النیّرین کے نام سے ۱۹۱۵ء میں مولانا شبلی اور مولانا حالی کی وفات پر ایک رسالہ مع مرثیوں کے چھاپا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں:۔ "اس کے علاوہ سلف گورنمنٹ کے رزولیوشن کے بانیوں میں بھی مولانا کا نام ایک وقیع جگہ رکھتا ہے، گذشتہ چند سال سے وہ تمام قومی اور سیاسی معاملات کے متعلق اپنی بلند پایہ نظموں کی شکل میں اخبارات میں شائع کراتے رہے" (صفحہ ۲۷)

مولوی سید طفیل احمد صاحب اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں لکھتے ہیں: "سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا، بلکہ انھوں ہی نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جن میں سب سے اوّل مولانا شبلی نعمانی تھے۔۔۔ انھیں موقع ملا کہ وہ اپنا زورِ قلم مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بدلنے میں صرف کریں۔۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے۔" (طبع دوم از صفحہ ۷۴ تا صفحہ ۷۹)

مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد

بہرحال مولانا کی یہ کوششیں ضائع نہیں ہوئیں اور اُن ہی کے بقول خود زمانہ کے دلمانچوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا، ان میں روز بروز احرار کی تعداد بڑھنے لگی، ابو الکلام، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری، اور بہت سے

نوجوان احرار آگے بڑھے اور بوڑھوں کو بھی اپنے ساتھ لگا لائے، حکیم اجمل خاں، نواب اسحاق خاں، میجر سید حسن بلگرامی، راجہ محمد علی محمد خاں والی محمود آباد وغیرہ بہت سے کہن سال رہنما بھی جوانوں کے قدم بہ قدم چلنے پر آمادہ ہوئے، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (پٹنہ) اور مسٹر محمد علی جینا (بمبئی) نے احرار لیگ کے اس مشترکہ اقدام کی رہبری کی، یہ دیکھ کر مولانا نے فرمایا،

لاکھ آزادی انکار کو روکا لیکن — یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
غیر کمبخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر — اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے
کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے — لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا — جا چکا قافلہ اب بانگِ جرس باقی ہے

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی، لیگ اور کانگریس کے تعلقات آپس میں بڑھتے گئے، یہانتک کہ مولانا کی وفات کے ایک سال بعد اخیر دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کے صدر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ، اور صدر استقبالیہ مسٹر محمد علی جینا تھے، اسی زمانہ میں وہیں کانگریس کا اجلاس بھی تھا، دونوں کے رہنما آپس میں ملے اور خیالات میں اتحاد کی شکل پیدا ہوئی، اور لیگ اور کانگریس میں اشتراک عمل نمایاں ہوا، لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس میں، اور کانگریس کے لیڈروں نے جن میں گاندھی جی، پنڈت مالوی جی، مسز سروجنی نائیڈو، سر ایس پی سنہا صدر کانگریس، مسز اینی بسنٹ اور مسٹر ہارنی من اڈیٹر بمبئی کرانیکل وغیرہ شامل تھے لیگ کے اجلاس میں شرکت کی، اور حاضرین نے پرتپاک چیرز سے ان کا خیر مقدم کیا[1]، دوسرے سال

[1] اس اجلاس میں راقم شریک تھا، اس وقت مولانا مرحوم کے رنگ میں لکھنے کی کوشش تھی، اس موقع

دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں سیاسی مجلسوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے، مسلم لیگ کی صدارت کا فرض مسٹر محمد علی جینا[1] نے انجام دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲۴) پر یہ نظم قلم نے لکھی:-

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا ۔۔۔ ابر، خورشید حقیقت پر بہت چھایا رہا
پر شب تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں ۔۔۔ ملک میں پچھلے دنوں کچھ کچھ اُجالا سا رہا
وہ زمانہ جا چکا جب بُت پرستی عام تھی ۔۔۔ جب خدا کا حکم، ہر عیار کا ایما رہا
جب متاعِ رہنمائی تھی سزاوارِ خرید ۔۔۔ جب کہ ہر قارون پہ ہمکو خضر کا دھوکا رہا
جبکہ تھی آزادگانِ عشق کی ہمت میں کمی ۔۔۔ جبکہ ہر فرعون ہمت میں قوم کا موسیٰ رہا
پھر بھی تمیزِ حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا ۔۔۔ جو ہمیشہ قوم میں شمعِ رہِ صحرا رہا
رزمگاہِ نور و ظلمت مبنیٔ مدت سے ہے ۔۔۔ گر ہمیں انوارِ حق چمکے تو کیا بیجا رہا

آیتِ قرآں کہ جَآءَ الْحَقُّ مصدق ہوگئی
مجلسِ آئیں ہماری "مَظہرِ حق" ہوگئی

یہ اشارہ مسٹر مظہر الحق کی طرف تھا،

[1] راقم اس دوسرے اجلاس میں بھی شریک تھا، اور یہ نظم موزوں ہوئی،

اک زمانہ تھا کہ اسرار درون مستور تھے ۔۔۔ کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا
جبکہ داروے وفا ہر درد کا درماں رہی ۔۔۔ جبکہ ہر ناداں عطائی بو علی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اُسے ۔۔۔ جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِّ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے ۔۔۔ دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علتِ دیریں سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں ۔۔۔ گوش شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا

پر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

یہیں دونوں قوموں کے درمیان "لکھنؤ پیکٹ" طے ہوا، اور اب یہ اتحاد سال بہ سال اتنا آگے بڑھا کہ کئی سال تک متواتر دونوں مجلسوں کے اجلاس ایک شہر میں ایک ساتھ ہونے لگے، اور ایک دوسرے کے اکابر دوسرے کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے، اور ایک ہی قسم کے رزولیوشن دونوں جگہ منظور ہونے لگے، مسٹر محمد علی جینا نے لکھنؤ کے اس جلسہ کے صدارتی خطبہ میں ایک جگہ فرمایا:- "تجدید ملی کا سب سے زیادہ پُر اُمید پہلو یہ ہے کہ ہندو مسلمان مشترکہ مقصد کے لئے متحد ہو رہے ہیں، بمبئی کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ گذشتہ دسمبر میں پہلی بار لیگ و کانگریس کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے، بڑی کٹھن منازل طے کرنے کے بعد اس اتحاد کا مظاہرہ نظر آیا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج پھر لکھنؤ کا تاریخی شہر جو اسلامی ادب و تہذیب کا گہوارہ ہے، اور جہاں سے چند برس ہوئے لیگ کی بنیاد پڑی تھی، کانگریس اور لیگ کے متحدہ اجلاس کا منظر پیش کر رہا ہے[1]"

یہ وہ خوش آیند منظر تھا کہ جس کو اگر مولانا مرحوم دیکھتے تو اپنی تحریک کی کامیابی پر بے انتہا خوش ہوتے۔

احرار کو تنبیہ | اس موقع پر ایک اور بات بھی یاد دلانی ہے، احرار کے نام سے جو گروہ بن رہا تھا جیسا کہ قاعدہ ہے، قدیم سیاسی حدبندیوں کے ٹوٹنے سے وہ اعتدال سے آگے قدم رکھ رہا تھا، مولانا نے اس کو بھی ٹوکا، اور اپنی متعدد نظموں میں اس کی بے اعتدالی لہجہ کی سختی اور طرزِ کلام کی ناہمواری پر گرفت کی، پہلے تو قدیم بزرگوں کی خدمت میں معذرت کے طور پر فرمایا۔

اعتدال آنے نہ پایا ہو نہ آئے گا کبھی | آپ کی طرح سے مجھ کو بھی یہی کھٹکا تھا
یہ تو ہوتا ہی کہ اُچھلے گی اسی زور سے آپ | آپ نے قوم کو جس زور سے دے پٹکا تھا

[1] مسلم لیگ کی تاریخ مؤلفہ سید اختر حسین صہ ۱۳۰۔

آشنائی میں تو اک عمر بسر کی میں نے
اب تو سب سے مجھے بیگانہ ہی رہنے دیجئے

مدتوں آپ نے عاقل تو مجھے دیکھا ہے
اب تو کچھ دن مجھے دیوانہ ہی رہنے دیجئے

ایک اور نظم میں احرار کی سیاست کو ابھی نو عمر بتا کر اُن کی سیاسی خطاؤں سے درگذر کرنے کی درخواست کی

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے
احرار قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی

چلتے ہیں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی

زود اعتقادیاں ہیں تلوّن ہے، وہم ہے
ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی

دل میں نہ عزم ہے، نہ ارادوں میں ہے ثبات
جھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی

بے اعتدالیاں ہیں ادا سے کلام میں
باہر ہے اختیار سے اُن کی زباں ابھی

ہر دم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر
اُن میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی

یہ سب بجا درست، مگر سچ جو پوچھیے
جو کچھ کہ ہے، یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی

یہ ہے اسی سیاستِ پارینہ کا اثر
گو شمع بجھ چکی ہے، مگر ہے دھواں ابھی

موزوں نہیں ہے جنبشِ اعضا تو کیا عجب
شب کے خمار کی ہیں یہ انگڑائیاں ابھی

چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں
چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ خستہ جاں ابھی

بیکار کر دیے تھے جو خود بازوئے عمل
گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی

آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں
کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی

غوں غاں ہے کچھ مباحثِ ملکی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے سیاستِ ہندوستاں ابھی

اس کے بعد احرار کو خطاب کر کے اُن کو بھی مناسب سرزنش فرمائی،

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا | قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر | ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد
ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے یہ قابلِ غور | یہ تو فرمائیے، اس باب میں کیا ہے ارشاد؟
بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن | شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد
آبلہ قابلِ نشتر تھا، یہ مانا لیکن | دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ جمع ناجائز تھا | خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے، نہ توحیدِ خیال | نہ کوئی جادۂ مقصد ہے، نہ کچھ توشۂ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم | خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ، نہ ہو پھر آباد
ذرّے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اُڑ اُڑ کے فنا | یونہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا | یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد
بھاپ پُرزور ہے، لیکن کوئی انجن بھی تو ہو | کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فصّاد

بعض پُرجوش احرار کا قلم خاص طور سے تیر و نشتر تھا، اس کی طرف رُخ کرکے یہ نظم ارشاد کی،

دیکھ کر حرّیتِ فکر کا یہ دورِ جدید | سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام | اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر | اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئینِ سخن | بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہے کہ نہیں؟
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ | کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟

شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہو بساط | اس میں اُن پر بھی کہیں سر کوئی زد ہو کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی، تو اب خیرہ سری | اس دورا ہی میں کوئی بیچ کی حد ہو کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے ہیں ذرا دیکھ تو لوں | جزر جیسا تھا، اُسی زور کا "مد" ہو کہ نہیں؟

حریتِ خیال کے مسافر نے یہاں تک منزل طے کی تھی کہ بہت سے کہنہ سال وفادارانِ قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگراں نہ کر دے اور طرابلس، بلقان، کانپور، اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی، اور مسلم لیگ کے انقلاب، مسلم لیگ و کانگریس کے اتحاد اور لکھنؤ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی آزادہ روی سے حکومتِ وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی نہ ہو، اس لئے بظاہر صلح کانپور کے شکریہ میں، اور در حقیقت مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا، جس میں حزب الاحرار کے بھی بعض نامور افراد نے افسوس ہے کہ شرکت کی، اور گویا انھوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کیا، اس وفد نے ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء کو وائسرائے سے ملاقات کی، اور ایک ایڈریس پیش کیا، لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے احرار نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا، اور اس کے خلاف سخت مضامین لکھے، مولانا نے اس عجیب و غریب وفد کے متعلق تین قطعے ارشاد فرمائے،

سچ تو یہ ہو کہ وفا کیشِ ازل ہیں ہم لوگ | ہم کو شکوہ نہیں آئینِ جہاں بانی کا
ہم نے یہ لکھ کے جو دی آپ کو تحریرِ وفا | یہ مثنیٰ ہے ہماری خطِ پیشانی کا

مشق ہے جادۂ طاعت پہ ہمیں چلنے کی | ہم سے اس راہ میں اغیار کبھی بڑھ نہ سکے

ہم نے تحریر وفا پڑھ کے سنائی اُن کو　　　کہ ذرا خط جو خفی تھا، تو وہ خود پڑھ نہ سکے

احرار اور مدعیانِ وفا ہیں اور　　　دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ

دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف　　　ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ

اس پر بھی صاف صاف تھا امتیازِ حق　　　کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے؟ کہاں الگ؟

دہلی کی انجمن نے دہ پردہ اٹھا دیا　　　قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ

اب صاف ہو گیا حق و باطل میں امتیاز　　　اب فصلِ نو بہار الگ ہے خزاں الگ

اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا　　　اب شمعِ دلفروز الگ ہے، دھواں الگ

وہ اختلاطِ دُرد و مئے صاف اب نہیں　　　گم گشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ

جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار　　　کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ

یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے　　　سُنیئے گا "الہلال" میں یہ داستاں الگ

مولانا کے سیاسی کلام کا یہ آخری بند ہے، اور اسی کے چند مہینوں کے بعد انھوں نے وفات پائی

سیاست میں بھی اعتدال تھا　تاہم اس زمانہ میں آزاد سے آزاد آدمی کا حکومتِ وقت سے مطالبہ صرف اصلاحات کا تھا، مولانا کی سیاست بھی اس سے آگے نہ تھی، اور نہ اس کے آگے کوئی راستہ کسی کو معلوم ہوتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس سیاسی حریت طلبی کے باوجود وہ حکومتِ وقت سے انحراف کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تھے، اور ذرا سے دباؤ سے وہ اپنی مسلّم وفاداری کا اقرار کرانے لگتے تھے۔

یاد ہو گا کہ "ترکی کے سفر سے واپسی کے بعد سے ان پر "ترکی خلیفہ کے خفیہ سفیر" ہونے کا الزام تھا

سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۷ء میں یونان وروم کی جنگ کے موقع پر جب مسلمانوں میں بڑا جوش تھا انھوں نے علی گڈہ کالج میگزین میں "خلافت" پر تین چار صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر یہ بتانا چاہا کہ تاریخ اسلام میں اب تک کسی غیر قریشی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اس لئے ترکوں کا دعواے خلافت بھی تسلیم کے قابل نہیں لیکن چونکہ یہ مضمون "آورد" تھا، آمد نہ تھا، اس لئے ایک نمبر کے بعد اس کے دوسرے نمبر کا چھپنا، بلکہ شاید سپرد قلم ہونا بھی نصیب نہیں ہوا، اور سی طرح ناتمام رہا۔ ۱۹۲۰ء میں جب راقم وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے لندن میں تھا اور وہاں کے وزراء اور ارباب سیاست سے ترکی خلافت کی نسبت بحث و گفتگو جاری تھی، تو پروفیسر آرنلڈ جو ان دنوں انڈیا آفس سے متعلق تھے، اکثر کرم فرما کر میرے پاس تشریف لاتے، اور مولانا کے اس مضمون کا حوالہ دے کر ترکوں کے دعواے خلافت کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے تھے، میں کہتا کہ یہ مضمون مولانا نے لکھا نہیں، ان سے لکھوایا گیا ہے اور اس کی ناتمامی خود اس کی دلیل ہے،

۱۹۰۷ء میں جب کرنل عبدالمجید خاں وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ جو انگریزوں کے بڑے دوست تھے اور ان دنوں گورنمنٹ اور ندوۃ العلماء کے درمیان صلح و صفائی کی پیامبری کر رہے تھے، مولانا نے الندوہ رجب ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک مضمون لکھا کہ "مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے؟" اور اس میں یہ ثابت کیا کہ "مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ قومی شعار رہا ہے کہ وہ جس قوم کی حکومت میں رہیں اس کے وفادار ہو کر رہیں"[1] یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ

---

[1] یہ دونوں مضمون مقالات شبلی جلد اوّل میں چھپ گئے ہیں، افسوس ہے کہ مولانا نے اس دوسرے مضمون (مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے" میں رد المحتار کے جس فقرہ پر اپنے نظریہ کی بنیاد

کو اُس کے اُس چھ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اُس نے دار العلوم کو دینا منظور کی تھی،

اس کے بعد طرابلس، بلقان اور کانپور کے ہنگاموں میں مولانا نے جو تیز و تند نظمیں لکھیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا، صوبہ متحدہ کی حکومت اس واقعہ سے بیخبر نہ تھی، اُس زمانہ میں مسٹر برن نامی ایک لائق اور علم دوست انگریز حکومت یوپی کے چیف سکریٹری تھے، وہ اُردو بہت اچھی بولتے تھے، اور فارسی خوب سمجھتے تھے، اور اسی لئے ان سے اور مولانا سے مراسم تھے، لوگوں نے یہ نظمیں اُن تک پہنچائیں، اسی زمانہ میں بنگال کی حکومت نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں ایک اُردو مجموعۂ اشعار کو ضبط کیا جس میں مولانا کی نظم بھی تھی، اخبارات میں مولانا کی شہرت کی وجہ سے یا لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کے لئے اس کو یہ کہہ کر شائع کیا گیا کہ بنگال گورنمنٹ نے مولانا کی نظمیں خلافِ قانون قرار دیں، اور ضبط کرلیں[1]،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۱) رکھی ہے اس کے صحیح پڑھنے میں ان سے سہو ہوا ہے ویفترض علینا اتباعھم میں انھوں نے اِتْبَاعٌ (پیچھا کرنا) کو اِتِّبَاع (پیچھے ہونا یا تابع ہونا) پڑھا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے کہ "اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر قبضہ کرلیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہوں گے، اور ہم پر اُنکی اطاعت فرض ہے" لیکن یہ تمامتر غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم حملہ کرکے مسلمانوں کے مال و دولت پر قبضہ کرلیں اور اسکو اپنے ملک یعنی دار الحرب میں لیکر چلے جائیں تو وہ اس کے مالک ہوجائیں گے اور وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں باقی نہیں رہیگا، لیکن جب کفار دار الحرب سے آکر دار الاسلام میں حملہ کرکے مسلمانوں کے مال و دولت پر اس طرح قبضہ کرلیں تو مسلمانوں پر ان حملہ آوروں کا پیچھا کرنا اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ دار الاسلام کے حدود میں ہوں، البتہ جب وہ دار الاسلام کے حدود سے نکل جائیں اور مال لے کر دار الحرب میں داخل ہوجائیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا مسلمانوں پر فرض نہ رہے گا" (دیکھئے شامی حاشیۂ رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ صفحہ ۳۰۰ مصر)

[1] اس زمانہ میں میں کلکتہ میں موجود تھا، تاہم اس کا حوالہ مکاتیب میں بھی ہے (دیکھئے عبد الحکیم بہ سلیمان ۶۶)

جنوری ۱۹۱۴ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی، جس میں مولانا بھی شریک تھے، اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انھوں نے شکایت آمیز بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے، چیف سکریٹری صاحب بھی کچھ سرگراں رہے اور دوستانہ شکایت کی، مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں، ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے، مولانا نے یہ پورا واقعہ ۵ فروری ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھ کر مجھ کو بھیجا، "میری نظموں کی ضبطی کا یہاں بہت برا اثر ہوا، لفٹنٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہوگیا، پہلے تو کہا "مزاج مقدس" پھر شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے، ابھی تک میں اُن سے مل نہ سکا، جاسوسوں نے اُن کو سب نظمیں پہنچائیں، اور معنی سمجھائے، چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاکی تھے، میں نے کہا یہ اتفاقیہ خلافِ معمول بات ہوئی، ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے"

اس واقعہ کی مزید تفصیل مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہے، جو انھوں نے مکاتیب شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیہ کے طور پر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ (حاذق الملک) حکیم اجمل خاں مرحوم جو اُن دنوں نہایت حکام رس تھے، اور ریاست رام پور سے تعلقات کی بنا پر مسٹر برن سے اُن کے خاص مراسم تھے، لکھنؤ آئے تو یکم فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا کو ساتھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے، مگر مولانا کی طرف سے اُن کی پیشانی پر بل بدستور رہے، وہاں سے واپس آکر رات ہی کو مولانا نے ایک رقعہ لکھ کر (عبدالماجد ۱۱) مولوی عبدالماجد صاحب کو بلوایا، جو اُن دنوں سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلہ میں مولانا کے انگریزی کاروبار کو انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں: "تحریر بالا شب کو ملی، میں اسی وقت گیا، مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے، ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہے، خصوصاً معاملۂ کانپور

کے متعلق میری نظموں سے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے، وہ بہت کبیدہ تھے، حالانکہ اس سے پیشتر نہایت اخلاق وتپاک سے ملتے تھے، تم ان کے نام ایک مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھدو کہ میں مدۃ العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق ومغرب کے درمیان یگانگت بڑھے، اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں، چنانچہ اس پر میری تصانیف شاہد ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبًا فرض ہے، اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کرایا، پھر معاملۂ عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں، رہا واقعۂ کانپور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں جس میں ساری ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا،

خط کے اسی سلسلہ میں مولوی صاحب کو یہ دوسرا رقعہ لکھا، جو مکاتیب میں شامل ہے:۔

"جس خط کے لئے میں نے شب کو کہا ہے، وہ آدمی کے ہاتھ نہ بھیجئے گا، یہ بھی مناسب موقع پر بڑھا دیجئے گا کہ "میں نے اپنے کانشنس کے مطابق معاملہ میں پانچ ارکان کو ساتھ لے کر جو کیا، باوجود اس کے کہ بعد کو پبلک کے شور وغل کی وجہ سے سب نے اخبارات کے ذریعہ سے اپنی برأت ظاہر کی، اور یہ لکھا کہ ہم نے فلاں شخص کی وجہ سے مجبور ہو کر ایسا کیا، لیکن صرف میں اپنی رائے پر اپنے فرض کے مطابق قائم رہا" (عبدالماجد ۱۲)

آخری واقعات ہم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں، اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ مولانا کی اس ساری مدافعانہ کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ کے تعلقات جو اس کد و کاوش

اور جد وجہد کے بعد درست ہوئے تھے وہ اُن کی بدولت پھر بگڑ نہ جائیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولنٰنا کی سیاسی خوے بد" میں بقولِ سعدی اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا، چنانچہ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۱۴ء میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو گو وہ اُس وقت اپنے بھائی کی ناگہانی وفات کے سبب سے نہایت نڈھال تھے، تاہم اس ناتوانی میں بھی اُن کی کمان سے یہ تیر نکل ہی گیا، جس میں انھوں نے غالب کے اس شعر کی

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تضمین کی تھی۔

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور — آسان نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل — آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا" غلط ہے ترا دعوئِ غرور — دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گُنے — تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور — پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
اُس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

یہ تیر پورے نشانہ پر بیٹھا، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کی روایت ہے کہ اس نظم پر حکومت نے اُن کی گرفتاری کا حکم دیا، لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے، اتفاق سے ایک نیکدل مسلمان پولیس افسر اس زمانہ میں یہاں متعین تھے، جو مولانا کے پورے قدرشناس تھے، وہ اُن کی اس بیماری کے عذر پر اس کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قیدِ عنصری سے آزاد ہو گیا،

اخیر زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سننے کے قابل ہے،

نومبر ۱۹۱۴ئ میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہوکر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڈھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا، اور اس کے لئے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا جس کی مولانا کو کوئی خبر نہ تھی، عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرہ میں موت کے بستر پر پڑے تھے ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست اُن کے پاس گئے کہ آپ رضامندی دیں تو جلسہ آپکی صدارت میں ہو" مولانا یہ سُنکر بے چین ہوگئے، اُن کی طرف منہ کرکے فرمایا "بھائی صاحب! میں تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں" یہ اس مرد عالم کی بین الاقوامی سیاست کا اخیر فقرہ تھا۔

ندوۃ العلماء میں مولینا کی مخالفت

اور

معتمدی سے استعفاء

۱۹۰۵ئ میں جب مدرسہ کا انتظام مولانا کے ہاتھ میں دیا گیا تو کسی لائق ناظم کی عدم موجودگی کے باعث یا یوں کہئے کہ کسی ایک واحد ذات پر پورا اعتماد نہ ہونے کے سبب سے ندوہ کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر ایک کے لئے ایک ایک معتمدی قائم کر دی گئی تھی،

۱۔ دار العلوم اور اس کے تعلیمی انتظامات   معتمد   مولانا شبلی نعمانی،

فرمراسلات ، معتمد مولٰنا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب ،

سیغۂ مال ، معتمد منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری

انتظام تھا جس میں وحدت کا سر رشتہ گم تھا، یہ تینوں نہریں الگ الگ بہتی تھیں، یعنی یہ
پھر کہیں ایک نہیں ہوتی تھیں، اور کسی ایک شخص کے ہاتھ میں طاقت اگر سارے کاموں
ں اشتراک اور اتحاد نہیں پیدا ہوتا تھا، اس اتحاد و اشتراک کی صرف ایک ہی صورت تھی، اور
وہ ان کارکنوں کا اخلاص اور باہمی اعتماد تھا جب تک ان کارکنوں میں یہ روح موجود رہی، کام
ں رفتار آگے کو بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا کہ اعتماد کی جگہ بدگمانی نے لے لی، اب اتحاد کا
و روحانی سر رشتہ بکھر گیا، اور ایک دوسرے کے ہر کام پر بدگمانی کی نگاہیں پڑنے لگیں،

پھر اس تقسیم عمل سے ندوہ کے دفتری کام کا تو انتظام ہو گیا، مگر ندوہ کے اصل مقاصد کی تکمیل
ور اس کے ذریعہ سے اہم اصلاحات، اور قومی و مذہبی مطالب کے لئے سعی و کوشش کا کام ان میں
سے کسی فہرست میں بھی داخل نہیں ہوا، دوسرے اصحاب اپنی اپنی ذاتی مصروفیتیں بھی رکھتے تھے،
ور مولانا کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہر ذاتی کاروبار سے بے پروا ہو کر ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھے تھے، او
ندوہ ہی کے کام کو اپنی زندگی کا کام بنا لیا تھا، اس لئے وہ اُن کاموں کو بھی کر دینا چاہتے تھے، لیکن
دوسرے لوگ اس کو اپنے حدود فرائض سے تجاوز اور دوسرے کے کاموں میں مداخلت سے تعبیر کرتے تھے

اب تک جو واقعات آپ کی نگاہ کے سامنے سے گذرے ہیں، اُن سے یہ اچھی طرح
معلوم ہو چکا ہوگا، کہ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی، اور اُس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا
اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا، یعنی ندوہ کی کثرت

میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، یہ گو واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کرے جانا ہر انسان کا کام نہیں، اس لئے رشک وحسد نے بے اعتمادی، اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا،

لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا اُن کے تمام دوسرے مخالف رفقا، اخلاص اور حسنِ نیت سے خالی تھے، ایک بڑی جرأت ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علیگڈہ میں بسر ہوا تھا، اور علی گڈہ تحریک سے اُن کی وابستگی شہرتِ عام رکھتی تھی، لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا، کہ اُن کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصّوں سے سراسر اختلاف تھا، اور اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوے تھے، مگر عام علما، اور اُن کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڈہ تحریک کے آدمی ہیں، اور علی گڈہ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لئے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کریں[1]

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقا اور مذہبی تورّع وتقدس جو علماے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا، اور اس لئے اُن علما، کی نگاہوں میں جو اِن چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا، اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لئے اُن کی تعلیم وصحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے،

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کی ہزار احتیاط کے باوجود علما، کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں، اُن کے بعض مباحث ٹھیٹھ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے علما، کی ایک جماعت جو متکلمین کی آرا وتحقیقات سے بے خبر تھی ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے اُن کو موزوں نہیں سمجھتی تھی،

[1] مضمون پروفیسر مولانا شبلی نوشتۂ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی،

اس پر مستزاد یہ کہ مولانا دارالعلوم کی تعلیم میں جس قسم کی اصلاح اور ترقی چاہتے تھے علماء کا بڑا حصّہ اُس سے نفور تھا، وہ قدیم معقولات کی ان کتابوں کو جن سے علماء کو صدیوں کا قلبی اُنس تھا یکسر الگ کر رہے تھے، اور اُن کی جگہ نئے علوم لانا چاہتے تھے، جس کو وہ اپنے خیال میں کفر و زندقہ جانتے تھے، مولانا انگریزی کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور اُن کو اس ضرورت سے شدید انکار تھا غرض ارکان میں مختلف مذاق کے افراد تھے، لیکن دوسرے قومی کارکنوں کی طرح مولانا نے کبھی اس کی نہ تدبیر کی اور نہ پروا کی کہ ارکان میں اُن کے خیال اور مذاق کے لوگوں کی اکثریت ہو، حالانکہ مخالف پارٹی نے اس کا پورا بندوبست کیا اور ایک ہی جلسہ میں زبردستی ممبروں کی تعداد ۳۵ سے ۵۱ کرلی اور خلافِ قاعدہ اپنے ۱۵- آدمی دفعتہً بڑھا لئے (مکاتیب نواب علی حسن خاں صاحب ۱۳) نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے ہمدردوں اور معاونوں کی جماعت اقلیت میں آگئی، اور جلسۂ انتظامیہ کی کارروائیوں پر فریق ثانی کا پورا قبضہ ہوگیا،

مولانا خلیل الرحمان صاحب کا اختلاف

جب مولانا نے ندوۃ العلماء میں قیام کا ارادہ کیا تھا، اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ "ندوہ کی اس کس مپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتہً تمام مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے، اور آمادۂ مخالفت ہوں گے" یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسۂ سنگِ بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی، مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری مرحوم جو پہلے رسمًا نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے۔ بطور حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے، اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی جس میں مولانا نے اُن کو یہ لکھا تھا کہ اس وقت

ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالانکہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام ناظم سمجھتے تھے) بہرحال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمان صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا ہے کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا، سب سے پہلے جلسہ سنگ بنیاد کے موقع پر ۱۹۰۸ء میں مولانا نے جلسہ انتظامیہ میں مسئلہ وقف علی الاولاد کو بغرض منظوری پیش کیا، تو مولانا خلیل الرحمان صاحب مرحوم نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد جب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ ایڈ کی تقسیم اور جدید مدرسین کے تقرر کے لئے جلسہ انتظامیہ ہوا تو مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے ایک یادداشت کے ذریعہ سے تمام ممبروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی معتمدی یعنی مولانا کا عہدہ توڑ دیا جائے (ہمدی-۵۶) جون ۱۹۱۰ء میں مولانا نے مولانا شروانی صاحب کو جو اپنی فطری متانت وسنجیدگی اور صلح کل طبیعت کی بنا پر طرفین کے معتمد علیہ تھے یہ لکھا: "اگر آپ کو ندوہ کا درد ہے تو آٹھ سات دن کے لئے آئیے، مولوی خلیل الرحمان صاحب کو بلائیے، پہلے آپس میں صلح اور نیک نیتی کے ساتھ تمام مراتب طے ہو جائیں، اور ضرور ہو سکتے ہیں، پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسہ میں طے کر لیجئے، جب ہم لوگ متفق ہوں گے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا، ورنہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب انجمن حمایت الاسلام کی طرح ندوہ کی مالی کارروائیاں بھی اخبارات کے منظر پر نظر آئیں گی، چار برس ہوئے کوئی حساب کتاب نہ مرتب ہوا نہ شائع ہوا، لوگ چاہتے ہیں کہ ماہ بماہ الندوہ میں جمع خرچ چھپے، یہاں کسی کو خبر بھی نہیں۔ مد تعمیر کی ایک مجلس ہے، اس کا ایک اجلاس ابتدائی کے سوا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، سب جمع خرچ محض ذاتی رائے سے ہو رہا ہے"۔ (۸۳)

مگر اس پر عمل نہ ہو سکا،

کمیشن کا معاملہ | سنہ ۱۹۱۰ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولوی خلیل الرحمان صاحب کی تجویز بالا جب ارکان نے منظور نہیں کی تو انھوں نے بلا اطلاع یعنی قاعدہ کے خلاف ایجنڈے میں درج ہوئے بغیر یہ وقت یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے طلبہ کی مذہبی حالت کی تحقیق و تفتیش کے لئے ایک کمیشن بٹھایا جائے، مولانا اس تجویز پر خاموش رہے، اور جلسہ انتظامیہ نے منظور کر لیا، اس کے بعد مخالفوں نے اس کے طریق کار میں یہ وسعت پیدا کی کہ خود معتمد دارالعلوم کی بھی شہادت ہو یعنی گویا مجرم کی حیثیت سے اُس کو بھی سامنے لایا جائے،

مولانا پر اس تجویز کا اس قدر بُرا اثر پڑا کہ وہ ندوۃ العلما سے الگ ہونے کے لئے تیار ہو گئے، چنانچہ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۱۰ء کو اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، پھر ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو دوبارہ دوسرا اور زیادہ مفصل خط لکھا، یہ دونوں خط (۸۵ و ۸۶) مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، مولانا شروانی نے اس کے جواب میں غالباً کچھ تسلی آمیز باتیں لکھیں، اسی پر اُن کو فوراً ہی ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو لکھا ہے "ندوہ کے مواد فاسد کی ہر دفعہ اوپر سے لیپ پوت کر دی جاتی ہے اور اندر اندر مواد پکتا رہتا ہے، اس لئے ہمیشہ خلجان رہتا ہے، اگر واقعی ندوہ کا درد ہے (اور ضرور ہے) تو ایک ہفتہ کے لئے آئیے، اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بلکہ مولوی عبدالحئی صاحب کو کسی قدر یقین ہو کہ میں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں، اور اُن کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں، اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے، اس لئے اگر میری اور اُن کی سُنیے، اور دیکھئے کہ کیا واقعہ ہے، مجھ کو آپ کی رائے پر پورا بھروسہ ہے، اگر آپ کے نزدیک میں نے ایک ذرہ بھی اپنے حدود سے تجاوز کیا ہوگا، تو معترف ہو کر معافی مانگوں گا، ورنہ جب تک ان لوگو

کا یقین زائل نہ ہوگا، کوئی کمیشن اور اصلاح سود مند نہ ہوگی، یہ تو سب اسی رنجش کے بخارات ہیں، باقی مفصل خط پہلے لکھ چکا ہوں۔" (۸۷)

ارکان کی یہ باہمی کشاکش ختم نہیں ہوئی، اور فیصلہ کے لئے جلسۂ انتظامیہ کی ایک تاریخ مقرر ہوئی، مخالف ارکان نے اس تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے تمام شہر میں گشت کیا، اور بہت سے معززین کو دار العلوم کے ہال میں جو گولہ گنج میں واقع تھا اس لئے جمع کیا کہ وہ مولانا شبلی کی برطرفی کا تماشا دیکھیں، مگر اس اجتماع کا عجیب مضحکہ خیز انجام ہوا جو لطیفہ سے کم نہیں، ارکان اور شہر کے معززین کا یہ اجتماع جب دار العلوم کے ایک ہال میں جمع تھا، مولانا ندوہ کے دستور العمل کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہال میں داخل ہوئے، اور جب جلسہ کی کارروائی شروع ہونے لگی تو سب سے پہلے اٹھ کر یہ دریافت فرمایا کہ ندوہ کے جلسوں کی تین قسمیں ہیں، جلسۂ عام، جلسۂ خاص جو کسی امر کے طے کرنے کے لئے ارکان اور دوسرے اہل الرّاے حضرات کی شرکت سے ہوتا ہے، تیسرا جلسۂ انتظامیہ جس میں صرف ارکان شریک ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ کون سا جلسہ ہے، اس پر شاہ سلیمان صاحب نے یا کسی اور نے فرمایا کہ یہ جلسۂ خاص ہے، مولانا نے فرمایا دستور العمل میں جلسۂ خاص کی تعریف یہ کی گئی ہے" جلسۂ خاص وہ جلسہ ہے جس کو جلسۂ انتظامیہ کسی خاص مقصد سے کسی معین تاریخ میں طلب کرے، اور ملک کے سربرآوردہ اور اہل الرّاے حضرات کی خدمت میں شرکت کی دعوت بھیجے۔" اب اس اجتماع کی کیفیت پر غور کیجئے کہ نہ تو اس اجتماع کو جلسۂ انتظامیہ نے بلایا ہے نہ اس کی تاریخ متعین کی ہے، اور نہ ملک کے تمام اہل الرّاے حضرات کو دعوت دی گئی ہے، اس قانونی اعتراض پر سب دم بخود رہ گئے، اس پر بعض مخالف ارکان نے کہا کہ بہتر ہے ہم

ابھی دوسرے کمرہ میں بیٹھ کر جلسۂ انتظامیہ کئے لیتے ہیں، اور اس کو جلسۂ خاص بنا ڈالتے ہیں، اس تجویز کے مطابق سب ارکان اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلے گئے، اور جلسۂ انتظامیہ کی کارروائی شروع ہوئی، مولانا نے پھر فرمایا یہ جلسہ گو ارکان کا ہے، مگر یہ جلسۂ انتظامیہ نہیں ہے، کیونکہ جلسۂ انتظامیہ کے لئے ضروری ہے کہ انعقاد سے پندرہ روز پہلے اس کی تحریری یادداشت تمام ارکان کے پاس بھیجدی جائے، اس اعتراض پر ایک سادہ دل مولوی صاحب (مولانا احمد علی صاحب محدث میرٹھی) نے کیا خوب فرمایا" یہ قاعدہ تو ہم ہی ارکان نے مل کر بنایا ہے، اب ہم کہدیتے ہیں کہ یہ قاعدہ غلط ہے" اس پر بہت سے لوگوں کو ہنسی آگئی، اور یہ سارا اجتماع بے نیل مرام منتشر ہوگیا،

مولانا نے قانون کی جو تعلیم حاصل کی تھی، شاید تمام عمر میں اس موقع سے زیادہ اس نے کبھی اُن کو فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا،

بالآخر اس باہمی کشاکش کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ کرنل عبدالمجید خاں بہادر فارن منسٹر ریاست پٹیالہ نے جو اس وقت ندوہ کے مربی خاص اور ندوہ کے بڑے محسن تھے اس طرف خاص طور پر توجہ کی اور اُن کے سامنے ایک انتظامی جلسہ میں تمام لوگوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کر کے مصالحت کی، اور باہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوے،

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا معاملہ

اس مصالحت کے بعد کچھ عرصہ تک ندوۃ العلماء میں ہر قسم کا سکون رہا، لیکن شروع ۱۹۱۳ء میں ایک دوسرا ہنگامہ برپا ہوا، مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نامی ایک بزرگ تھے جو سرحد کے رہنے والے تھے، پہلے حیدرآباد میں مدرس تھے پھر مولانا مسیح الزمان خاں صاحب کے تعلق سے شاہجہاں پور کے مدرسۂ عین العلوم میں مدرس ہوئے

اور وہاں سے مولانا کے اخیر زمانہ میں فقیہ اوّل کے عہدہ پر دار العلوم میں رکھے گئے، موصوف اچھے خاصے طبّاع اور ذہین تھے، مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رُخ دوسری طرف تھا، وہ بہت جلد دوسروں کے حلقۂ اثر میں آ گئے، جنھوں نے اُن کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مدِ مقابل بنا کر کھڑا کیا، مولانا نے الندوہ کی اڈیٹری سے جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ مطابق مئی ۱۹۱۲ء کے پرچہ کے بعد جب استعفا دیدیا، تو نائب ناظم صاحب نے جلسۂ انتظامیہ کی منظوری کی اُمید پر انہی مولوی عبد الکریم صاحب کو اس الندوہ کا اڈیٹر مقرر کر دیا، جس کی منظوری چند ماہ بعد ۶ ستمبر ۱۹۱۲ء کے جلسۂ انتظامیہ میں ہوئی، اس وقت جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا، مولوی عبد الکریم صاحب[۱] نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچہ میں جو ۱۹۱۲ء کے آخر میں جون ۱۹۱۲ء کے مہینہ کا چھپا جہاد کے فضائل و مناقب پر ایک طویل مضمون لکھکر شائع کیا، اس زمانہ میں لفظ جہاد کے نام کی جو ہیبت انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا تصور بھی آج مشکل ہے، اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت ہوا تھا، اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا، مولانا نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صورتِ حال پیش کی، سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے لئے معطل کر دیئے گئے، اور اس کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی، یہ کارروائی اگرچہ تمام معتمدین اور مقامی ارکان کے اتفاقِ رائے سے کی گئی تھی، لیکن مخالفین نے اخبارات میں جب شور و غل کیا تو اُن میں سے متعدد ارکان نے اپنی برأت ظاہر کی، اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں

[۱] مولوی عبد الکریم صاحب نے افسوس ہے کہ دار العلوم کی مدرسی ہی کے زمانہ میں اپریل ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں لُو لگ جانے سے وفات پائی۔

مقامی وکلا، تھے، ۹ر مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک جلسۂ انتظامیہ کرکے اس قانونی نقص کی بنا پر اُس کو منسوخ
کرایا، کہ اس معطلی کا قانونی اختیار نہ معتمدین کو تھا اور نہ صرف مقامی ارکان کو، لیکن اس کے بعد جب
منشی احتشام علی صاحب وغیرہ کمشنر سے ملے تو اس کی خواہش یہ معلوم ہوئی کہ اڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تنبیہ
ضروری ہے، اس لئے انھوں نے ۲۰ر مارچ ۱۹۱۳ء کو ارکان کے نام خطوط جاری کئے اور چھ مہینے
کے لئے مولوی عبدالکریم صاحب کو باقاعدہ معطل کرایا، لیکن اس پوری کارروائی کو بھی بعض لوگوں
نے مولانا ہی کی طرف منسوب کرکے اُن کو بدنام کرنا چاہا، اور خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنو
کے اڈیٹر مولوی وحیدالدین صاحب سلیم نے ایک خاص غرض سے اس فتنہ کے بڑھانے
میں بڑا حصّہ لیا، حالانکہ مولانا کو اس دوسری کارروائی سے کوئی تعلق نہ تھا،

مولانا ایک خط میں جو ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں:- "لکھنؤ میں میرے مخالف
پہلے سے تھے اُنھوں نے موقع پاکر اس قصّہ کو طول دیا اور ایک جتھا بنا لیا ہے، جو مختلف اخباروں
میں مضامین لکھتا ہے، یہ ایک باقاعدہ اور مسلسل کوشش ہے جو .... وغیرہ کی طرف سے کی جارہی ہے
حیرت یہ ہے کہ میں نے اس معاملہ کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں مطلق حصہ نہیں لیا، البتہ جب
سب نے کہا تو میں نے بھی اتفاق کیا، اس پر یہ حال ہے کہ آپ الگ ہیں، نفاق کا یہ حال ہے کہ پبلک
میں اپنی علٰحدگی دکھاتے ہیں، اور گورنمنٹ آفیسرس سے مل کر تمام کام انجام دیئے، مجھ کو خبر تک نہیں
ہونے پائی، حکام سے ملنا، خط و کتابت کرنا، چھ مہینے کی معطلی کا ممبروں سے منظور کرانا، مجھ کو ذرہ بھر اس سے
تعلق نہیں۔" (عبدالحکیم-۲)

ایک اور خط میں ۱۴ر جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:- "میرے خلاف چند خودغرضوں نے ندوہ

کے معاملہ میں جو طوفان مچایا، آپنے سنا ہی ہوگا، لطف یہ کہ شرکت سب نے کی اور اب سب الگ ہیں،
اور لطف یہ کہ گورنمنٹ افسروں سے گورنمنٹ ہی کا پہلو ظاہر کرتے ہیں، اور سرخرو بنتے ہیں، مولوی عبد الکریم
کی چند روزہ معطلی جو میں نے کی اس کو نرغہ کرکے منسوخ کرایا، پھر ...... وغیرہ چپکے خود کمشنر کے پاس
گئے، اور اُن کی مرضی سے کرمخفی خطوط ارکان کے نام جاری کئے، اور چھ مہینے کے لئے مولوی صاحب کو معطل
کرایا، اور پبلک کو اب تک دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم کو اُن کی معطلی سے واسطہ نہیں شبلی نے کیا جو کچھ
کیا، میرے پاس تمام اصلی اور مطبوعہ کاغذات ہیں، موقع ہوا تو دکھادوں گا، ہز آنر نے جو خط بھیجا اس میں
لکھا ہے کہ وہ الندوہ کے مضمون کو سخت شرارت انگیز خیال کرتے ہیں، مجھ کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ
گورنمنٹ ایسا خیال کرے گی، اگر ندوہ کی طرف سے خبر نہ لی جاتی تو گورنمنٹ خود مقدمہ قائم کرتی اور
نواب وقار الملک کی طرح[1] ہم لوگوں کو عدالت میں جاکر گواہی دینی پڑتی" (امین - ۱۵)

مولانا کے ان بیانات کی تصدیق کے لئے حاشیہ پر ندوہ کے ایک غیر مطبوعہ دفتری خط کی نقل
درج کی جاتی ہے، جو ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا اور دیگر ارکان کے نام لکھا گیا تھا، اور جس کا دفتری
نشان $\frac{۲۰۱۴}{۴۳۵}$ ہے، اور جس پر مولانا سید عبد الحئی صاحب اور مولانا خلیل الرحمان صاحب کے دستخط ہیں
اس خط سے واقعہ کی پوری کیفیت معلوم ہوسکتی ہے[2]،

---

[1] غالباً ۱۹۰۸ء میں مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے اردوئے معلی میں جس کو وہ علیگڈھ سے نکالتے تھے، مصر کے متعلق ایک پُرجوش مضمون شائع کیا تھا جس کو گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا، وہ گرفتار کرکے عدالت میں حاضر کئے گئے اور نواب وقار الملک شہادت میں پیش کئے گئے، سید حسرت موہانی صاحب اسی مقدمہ میں پہلی دفعہ قید ہوئے تھے۔ [2] یہ خط حسب ذیل ہے:-

از دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء $\frac{۲۰۱۴}{۴۳۵}$

ندوہ کے اس دفتری مراسلہ سے ثابت ہوگا کہ کن لوگوں نے اس کو حکومت تک پہنچایا، اور کس طرح اُن کی شش ماہہ معطلی عمل میں آئی، اُن کی چند روزہ معطلی کے پہلے جلسہ میں مولانا عبدالباری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۶) مخدومی مکرمی جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی دام لطفہٗ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جلسۂ انتظامی ۹ رمارچ ۱۹۱۳ء نے یہ طے کیا کہ اس جلسہ کی رائے میں کل کارروائی جلسۂ غیر معمولی ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء و کارروائی معتمد صاحب دارالعلوم بہ نسبتِ معطلیِ مولوی عبدالکریم صاحب خلاف دستورالعمل ندوۃ العلماء بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی ہے، لہٰذا کالعدم سمجھی جائے،

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لکھنؤ نے قبل جلسہ کے منشی احتشام علی صاحب کو بلا کر اپنی خواہش ظاہر کی تھی کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو بے موقع اشاعت مسئلۂ جہاد کی وجہ سے چھ مہینے کے لئے معطل کیا جائے، چنانچہ اس کا اظہار منشی صاحب نے جلسہ میں کیا، اور لکھا بھی گیا، مگر جلسہ نے اس کی اشاعت کو بخیال ناگواری حکام منع کیا اور بطور خود تجویز کر کے یہ چاہا کہ ارکین سے مولوی صاحب کی بابتہ رائے طلب کریں کہ اس اشاعت کی بابتہ مولوی عبدالکریم صاحب سے کچھ تدارک کیا جائے یا نہیں، اور کیا جائے تو کیا؟

جلسہ کے بعد احتیاطاً میں اور منشی محمد احتشام علی صاحب ۵ رمارچ ۱۹۱۳ء کو ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے ملے اور اس بارہ میں گفتگو کی تو صاحب نے فرمایا کہ ضرور ہمارا یہ منشا اور خواہش ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو صرف چھ مہینے کے لئے معطل کیا جائے، اور پھر وہ بدستور اپنا کام کریں، اور ہماری اس خواہش کا اعلان کر سکتے ہو، اور مولوی عبدالکریم صاحب کی سچائی کی ہم نے ہز آنر سے سفارش کی ہے، اور مقدمہ جو اُن کے اوپر بہ وجہ نہ لکھنے نام مشتہر کنندہ پرچہ کے چل سکتا تھا نہیں چلایا، مگر اس قدر معطلی کا اس اشاعت کی بابتہ ضرور خیال ہے، اس کے بعد ہم کو اُن سے اور ندوہ سے کچھ شکایت نہیں، وہ اپنا کام کریں،

چونکہ جلسۂ انتظامی ۹ رمارچ کو ہو چکا ہے، فوراً دوسرا جلسہ طلب نہیں ہو سکتا، اور اس کا التوا جلسۂ ثانی تک باعث بدظنیِ حکام ہوگا، اور احتمال نقصان کا ہے، اس لئے بموجب دفعہ ۲۵ دستورالعمل دربارہ معطلی مولوی عبدالکریم صاحب تحریری رائے کا خواستگار ہوں کہ اندر ایک ہفتہ کے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے، تاکہ کثرت تحریری رائے پر عمل کر سکوں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو اُن کی خواہش کے نتیجہ کی اطلاع دے سکوں۔ والسّلام خلیل الرحمن، نائب ناظم ندوۃ العلماء۔ بقلم عبدالحیٔ۔

فرنگی محلی بھی بحیثیت رکنِ انتظامی شریک تھے، مگر بعض مقامی اخباروں کے شور و غل کے بعد انھوں نے ایک اخبار میں اپنی شہادت شائع کرائی، اور اپنی برأت ظاہر کی، اس کا جواب مولانا نے ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء کے وکیل امرتسر میں چھپ دیا، یہ تحریر اور دوسری تحریر جو مولانا سید عبدالحئی صاحب کے جواب میں ہے، مقالات شبلی جلد سوم صفحہ ۱۱۵- اور صفحہ ۱۳۱ پر چھپی ہوئی ہے،

دارالعلوم کی معتمدی سے استعفا

بہرحال مولانا ان ہنگاموں سے ایسے بددل ہوئے کہ انھوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہوجانے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفا دفتر میں بھیج دیا، اُن کے ساتھ اور معتمدین یعنی مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب بھی اپنی اپنی معتمدیوں سے مستعفی ہوگئے، بعض اور دوسرے ارکان نے بھی رکنیت سے استعفا دیا، اس کے بعد ۱۸، ۱۹، ۲۰، جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولٰنا خلیل الرحمن صاحب مرحوم مستقل ناظم بنائے گئے، اور ندوہ کی عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں دیدی گئی، (شروانی ۱۰۹) اور مولوی سید عبدالحئی صاحب اور منشی احتشام علی صاحب عہدوں کے لحاظ سے نائب ناظم مقرر کئے گئے،

نظامت کے عہدے کے لئے مولانا خلیل الرحمان صاحب مرحوم کا انتخاب اگرچہ دستور العمل کے قواعد اور مولانا کی مصلحت بینی کے بالکل خلاف تھا، کیونکہ وہ مولانا کے نزدیک دارالعلوم کے اصلی نصب العین اور مقصد سے متفق نہ تھے، اور وہ اس کو پرانی قسم کی ایک عربی درسگاہ بنادینا چاہتے تھے، تاہم چونکہ مولانا صرف ندوۃ العلماء کی اصلاح اور بہبودی کے خواستگار تھے، اس لئے اس یکسوئی میں ان کو ندوۃ العلماء کے فوائد نظر آئے، اور وہ اس پر خوش ہوئے، چنانچہ ۷ اگست ۱۹۱۳ء کو

مجھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :- "باوجود تجربات کے چند باتیں خود بخود مفید بھی نکل آئیں، ہیڈ ماسٹر نے دوسری جگہ تعلق کر لیا، اور سر دست چھ مہینے کی رخصت لی، پھر غالباً مستعفی ہو جائے گا، اس سے انگریزی کا جو سخت نقصان تھا رفع ہو جائے گا، مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کے اختیارات وسیع ہوئے اور . . . . . کے استعفار سے ہر ہر کام میں رکاوٹ جاتی رہی . . . . . معتمدیوں کے ٹوٹ جانے سے اتنا فائدہ ہوا کہ بہر حال قوت ایک جگہ ہو گئی، یہ دوسری بحث ہے کہ اس وقت انجمن خراب ہی لیکن کوئی کام کا آدمی منتخب ہو گا تو کام میں رکاوٹ نہ ہو گی، ورنہ معتمدین کا ہٹانا بہت مشکل تھا" (سلیمان)[۱]

مولانا کے استعفیٰ کا اثر | مولانا کے استعفے کی خبر جب طلبہ کو معلوم ہوئی تو اُن کو سخت افسوس ہوا، پہلے سب نے ایک جلسہ کر کے مولانا کو بمبئی پے در پے کئی تار بھیجے،[۲] جن میں اُن سے استعفے کی واپسی کی پُر زور خواہش کی تھی، اور فرداً فرداً دوسرے طالب علموں نے بھی اسی قسم کے خطوط لکھے، اور التجائیں کیں کہ وہ اپنے استعفے کو واپس لے کر اُن کو مرہونِ منت فرمائیں، لیکن مولانا نے عہدہ کی ذمہ داری لینے سے بدستور انکار کیا، لیکن اس انکار کے باوجود یہ اقرار کیا کہ معمولی رکن کی حیثیت سے اب بھی ان کی زندگی کا مقصد ندوہ ہی کی خدمت ہے، چنانچہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء کو طلبائے ندوہ کے نام حسبِ ذیل خط لکھا:- "عزیزانِ من! السلام علیکم، آپ لوگوں کے پُر اثر خطوط اور تار پے در پے آئے ہیں، ایسا سنگدل نہ تھا کہ ان سے متاثر نہ ہوتا، لیکن موجودہ حالت میں کام کرنا ناممکن تھا، اور میں دار العلوم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا، مجھ کو اپنی تمام کوششوں اور جانفشانیوں کی (اگر میں نے بہ فرض کچھ کی ہیں) داد مل گئی، اور یہ میرا پورہ صلہ ہے کہ جن کی خدمت کی گئی وہ اس کی قدر کرتے ہیں، آپ لوگ مایوس ہیں لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں، عام اسلامی جماعت بیدار ہو گئی ہے، وہ اپنے ہر قسم کے فوائد کو سمجھے گی،

[۱] مکاتیب ابو الکلام
[۲] بعد الحکیم

اور اس کی نگہداشت کرے گی، ممکن ہے کہ کچھ دیر ہو، لیکن جو تخم زمین پر پڑ چکا ہے، وہ انشاء اللہ برباد نہ جائیگا۔

ندوہ کیا چیز ہے؟ موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں مذہب کی حمایت، یہ احساس عام ہو چلا ہے، معارف قرآنیہ[1] دہلی اسی رفتار کا ایک قدم ہے، ندوہ بھی اپنے اولیت کے نتائج حاصل کریگا، ولو بعد برھتہ، باوجود استعفا میری زندگی کا مقصد ندوہ ہی رہے گا، اور آپ لوگوں کی خدمت نہ صرف دل بلکہ ہاتھ سے بھی کر سکوں گا، وعلی اللہ التکلان،" (مکاتیب اول)

پھر مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدرس اعلیٰ دار العلوم اور حضرات مدرسین کے جواب میں یہ خط لکھا:- "آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمائیے چارہ کیا ہے؟ پورے چار برس گذرے، بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی، اور کیا ہوا، اس بنا پر میں ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں، دو ایک برس بھی آزادی سے کوشش کر سکتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا:

اس لئے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں، ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کر سکیں، بہرحال میں مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گذار ہوں گا، اب محبت اور ہمدردی کا تعلق بالکل بے لاگ ہوگا، یعنی یعنی افسری کی ظاہری بے گانگی بھی نہ رہے گی، اور بچے دیکھیں گے کہ میں کیونکر ان کا برابر کا بھائی بنکر کام کرتا ہوں"

۱۹ رجولائی ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا:- "ندوہ سے تعلق منقطع ہونا تو محال ہے، لیکن یہ وہیں آکر فیصلہ ہو سکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو" (مسعود علی ۲)

---

[1] شاید ۱۹۱۲ء میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے اس نام سے ایک قرآنی درسگاہ کی بنیاد مسجد فتحپوری دہلی میں ڈالی تھی جس کا مقصد سند یافتہ عربی طلبہ اور مسلمان گریجوئیٹوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا تھا، ۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی میں مولٰنا عبیداللہ صاحب وغیرہ نے جب ہندوستان کو چھوڑا تو یہ ادارہ بند ہوگیا۔

ملک کے مختلف گوشوں سے بھی استعفے کی واپسی کے لئے تحریکیں اٹھیں، مگر مولانا اپنی رائے پر جمے رہے

حیدرآباد کا سفر اور ماہانہ میں اضافہ

مولانا بمبئی سے نواب عماد الملک کی طلبی پر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے دوسرے ہفتہ میں (امین ۷، و ابو الکلام ۴۷) حیدرآباد روانہ ہوگئے، نواب صاحب اس وقت مولانا کی تحریک سے قرآن پاک کا جو انگریزی ترجمہ کر رہے تھے اس میں مولانا سے مشورے درکار تھے، یاد ہوگا کہ سرکار آصفیہ سے مولانا کے سو روپیے ماہوار رجب ۱۸۹۶ء میں مقرر ہوئے تھے تو اس فرمان میں آیندہ کے اضافہ کا اشارہ بھی تھا، مگر اب تک نہ مولانا نے خواہش کی اور نہ سرکار آصفیہ نے توجہ فرمائی، اس سفر میں نواب صاحب نے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی سرکار میں اضافہ کی تحریک کی تو اعلیحضرت نے مسرت ظاہر فرمائی (عبد الماجد ۱۷) اور دو سو ماہوار کا اضافہ منظور فرمایا، اس اضافہ سے مولانا کو اپنے بہت سے پیش نظر علمی و قومی کاموں میں سہولت حاصل ہوگئی،

حیدرآباد میں اس دفعہ ان کو مکان بہت دلخواہ اور تفریح بخش مل گیا تھا، اس لئے وہ دو تین مہینے حیدرآباد میں ٹھہر گئے، اور سیرت کی پہلی جلد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہوگئے،

لکھنؤ کو واپسی

آخر ہم سب لوگوں کے بڑے تقاضے سے ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ کا قصد کیا (سلیمان ۶۳) اس اثنا میں میں الہلال کلکتہ سے الگ ہو کر پٹنہ میں ٹھہرا ہوا تھا، مولانا کے لکھنؤ کی آمد کی خبر سنکر میں بھی حاضر خدمت ہوا، اور چند ہی روز کے بعد مجھے دکن کالج پونہ کی ایک خدمت پر روانہ کیا، اور خود لکھنؤ میں قیام فرمایا،

طلبۂ دار العلوم سے بدستور تعلق

طلبہ نے اُن کے آنے پر ایک جلسہ کیا، جلسہ میں انھوں نے اپنی تقریر سے

پہلے طالب علموں سے مخاطب ہو کر بڑی حسرت سے اپنا یہ قطعہ پڑھا جس کو وداعیہ کہنا چاہئے،

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا

اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ اُمیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

درس بخاری کو روکنا | دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انھیں بخاری شریف کا درس دیں، مولانا نے اس کو قبول کیا، اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع ہو گیا، اور بہت سے لڑکوں نے اس میں شرکت کی لیکن ناظم صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا انھوں نے جناب مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی سے جو مہتمم و مدرس اعلیٰ تھے، خواہش کی کہ وہ طلبہ کو اس سے روکیں، مفتی صاحب نے اس میں تامل کیا، اور اس کا تذکرہ مولانا سے کیا، انھوں نے فرمایا کہ وہ آپ کو تحریری حکم بھیجدیں تو آپ اس پر عمل کیجئے، لیکن جناب ناظم صاحب نے اس ناگوار فرض کی انجام دہی سے پہلوتہی کی، اور مفتی صاحب کو مجبور کیا کہ وہی اپنے قلم سے حکم لکھیں، انھوں نے یہ کیا کہ بہ تخصیص بخاری کے درس کے روکنے کے بجائے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی، اس کا اثر طلبہ پر بہت برا پڑا، بہت سے طلبہ خارج اوقات میں دوسروں سے اپنے اسباق کی کمی کو پورا کرتے تھے، وہ سب بند ہو گئے،

میلاد میں مولانا کی تقریر کو روکنا | دوسرا واقعہ یہ پیش آیا، کہ دارالعلوم کے طلبہ ہر سال کسی نہ کسی تاریخ میں دھوم دھام سے بیان سیرت کی مجلس کرتے تھے، جس میں تمام اہل شہر مدعو ہوتے تھے، اور مولانا عموماً سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی مفید و مؤثر تقریر فرماتے تھے، اس سال بھی اس مجلس کا اہتمام شروع ہوا، اور خیال تھا کہ طلبہ مولانا سے تقریر کی درخواست کریں گے، اس لئے

[1] الندوہ کا ماہ جنوری ۱۹۱۴ء... (margin note): ماہ ایوان الکلام عبد الحکیم ۵ ضمیمہ ایضاً

پہلے اس مجلس ہی کو روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس کی منظوری دیدی گئی،

اسٹرایک اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلبہ میں ہیجان کا باعث بنتے گئے، جن میں سے ایک طلبہ کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے کلّی باز رکھنا بھی تھا، آخر، مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا کی ہر قسم کی فہمائش کے باوجود طلبہ نے اسٹرائک کا عام اعلان کر دیا، اور چونکہ طرابلس و بلقان کی لڑائی اور کانپور کے ہنگاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پُرجوش مطالبوں کے باعث طبائع میں عام طور سے ہیجان تھا، اس لئے اسٹرایک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلہ کی طرح پھیل گئی، زمیندار لاہور ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانہ کے مشہور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پُرزور مضامین لکھ رہے تھے، وقت کی سیاسی بے چینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کر دیا تھا، ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا، جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخِ طریقت مولانا شبلی تھے، دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا، جنہیں اُس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے، احرار کا طبقہ ہر طرح طلبہ کی ہمدردی و حوصلہ افزائی کر رہا تھا، اور دوسرا طبقہ ندوہ کے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا، مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنانِ مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڈھ کالج کے اربابِ اقتدار، اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے، اور یہ تصادم ملک کے طول و عرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم رہا،

مولوی مسعود علی ندوی اور طلبائے قدیم

اسٹرائک کے اعلان کے ساتھ بعض اُن قدیم طلبہ نے جو لکھنؤ میں رہتے تھے مناسب سمجھا کہ طلبائے قدیم کی ایک مجلس کی بنیاد ڈال کر اس اسٹرائک کی رہنمائی کریں، اس مجلس کے پہلے ناظم مولوی مسعود علی صاحب ندوی منتخب ہوئے، مولوی صاحب ممدوح کی عملی قابلیت کا غیر معمولی اظہار اسی اسٹرایک کی رہنمائی کے دوران میں ہوا، انھوں نے بڑی قوت اور قابلیت سے طلبہ کی اسٹرائک کو پورے زور شور سے اس خوبی سے جاری رکھا کہ تمام ملک دنگ رہ گیا، ایک طرف تنو سے زائد طلبہ کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام اُن کو قابو میں رکھنا، ان میں بددلی نہ پیدا ہونے دینا، اور ساتھ ہی اُن کے پڑھنے کے لئے مدرسین کا فراہم کرنا، اور دوسری طرف تمام ملک میں اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعہ سے رائے عامہ کو ابھارتے رہنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں،

اصلاحِ ندوہ کی کوشش

مولانا نے استعفا دینے کے ساتھ اپنے ہمدرد احباب اور شاگردوں کو ندوہ کے علاج سے مایوس ہونے کے بجائے اصلاحِ ندوہ کی تجویزوں کی طرف متوجہ کیا تھا، دوستوں میں سے خصوصیت کے ساتھ نواب سید علی حسن خاں، مولانا ابوالکلام، اور شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور خاکسار کو متعدد خطوط لکھے، اور ان کو ندوہ کی اصلاح کے لئے آمادہ کیا[1]، ان ہی میں سے بعض خطوط کو ڈاک سے اُڑا کر دفتر نظامت نے ۲۶-۲۷-۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخباروں میں شائع کرایا، اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ مدرسہ میں یہ اسٹرائک اُن کی سازش سے ہوئی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، لیکن جہاں تک اصلاح کا تعلق

---

[1] یہ خطوط اب بھی نواب صاحب، مولوی ابوالکلام صاحب، مولوی مسعود علی صاحب اور میرے نام کے مکاتیب شبلی میں چھپے ہوئے موجود ہیں،

ہے مولانا نے علی الاعلان اعتراف کیا کہ بے شبہہ یہ میری تحریک ہے، اور لوگوں سے میری یہ استدعا ہے کہ وہ ندوہ کی اصلاح کے لئے فوراً کھڑے ہو جائیں،[1]

مجلس اصلاحِ ندوہ کا قیام ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا، اور مختلف شہروں میں ندوہ کے کارکن اصحاب کے خلاف احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، آخر ندوہ کے ارکان میں سے اُن لوگوں نے جو اصلاح کے حامی تھے اور جن کی تعداد دو تہائی کے قریب تھی، متفق ہو کر اپریل ۱۹۱۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں مجلس اصلاحِ ندوہ کی بنیاد ڈالی، نواب سید علی حسن خاں مرحوم اس مجلس کے ناظم، اور مولوی نظام الدین حسن صاحب (سابق منصب دار بھوپال وحیدر آباد) صدر قرار پائے اور بہت سے حضرات نے اس کی ممبری قبول کی، اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں، بلکہ قصبات و دیہات میں تقریباً پچاس جلسے مطالبۂ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے،

---

[1] یہ تمام واقعات مولانا کے اس مضمون میں مذکور ہیں جو "اسٹرایک کا سبب کون تھا" کے عنوان سے ہمدرد دہلی مورخہ ۶ اپریل ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا، اور اب مقالاتِ شبلی جلد ہشتم کے ص ۱۲۵ پر چھپا ہے،

اس سلسلہ میں مولوی عبد السلام صاحب ندوی کے ایک خط نے بڑا ہنگامہ برپا کر دیا، انھوں نے ۲۵ جولائی ۱۹۱۳ء کو بمبئی سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ "اب خاموشی کا وقت نہیں، مختلف مقاموں میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو اظہار افسوس اور ندوہ کے موجودہ نظام سے بے اطمینانی کے جلسے کرائیے، سرکشی اور اسٹرایک کا وقت اب آیا ہے" اس کے آخر میں لکھا تھا کہ "اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو، یہ مولانا کا حکم ہے" یہ خط بھی دفتر نظامت نے ڈاک سے اڑا لیا، اور بعد کو اسٹرایک کے بعد اس کو پبلک میں شائع کیا، مولانا نے اس خط کے متعلق بہ حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ "نہ یہ خط میرے ایما سے لکھا گیا ہے، نہ میں نے اس کو دیکھا ہے، اور نہ میں اس کو اب بھی جائز سمجھتا ہوں" مولوی عبد السلام صاحب نے اس خط کو اپنا قبول کیا، مگر یہ لکھا کہ میں نے مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مضطرب ہو کر لکھا، اور مولانا کی طرف اس لئے نسبت کی کہ طلبہ میں اس تحریک کی اہمیت بڑھ جائے" مگر یہ خط نہ مکتوب الیہ کو ملا، اور نہ طلبہ تک پہنچا، اور نہ وہ اس اسٹرایک کا سبب بنا،

یہ اسٹرایک اس خط کی تاریخ کے سات مہینوں کے بعد ہوئی،

الہلال اور مولانا ابوالکلام | اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا، انھوں نے الہلال میں مسلسل نو کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی، اور ہر طرف ندوہ ندوہ کا شور برپا ہو گیا،

حکیم اجمل خاں مرحوم | یہ حالت تھی جب حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنی مسیحانفسی کا ثبوت دیا، انھوں نے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کی اہمیت کو سمجھ کر تمام ملک کے اہل الرّاے حضرات کو دہلی میں ایک مشورہ کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی، جو ۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کو وہاں ہونی قرار پائی،

مجلس اصلاح ندوہ کا اجلاس عام دہلی میں | مولانا کا قیام دلّی میں حکیم صاحب ہی کے مکان پر تھا، ہر روز اصلاح حال کے جلسے اور مشورے ہوتے رہتے تھے، مختلف ہمدرد اصحاب آتے اور معاملہ کی یکسوئی کی رائیں پیش کرتے تھے، ۲۹ راپریل ۱۹۱۴ء کو مولانا دلّی سے نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں:- "مقامی کمیٹی جلسہ کے انتظام میں مصروف ہے، باہر سے بہت سے لوگ آتے نظر آتے ہیں، خطوط آرہے ہیں، مولوی خلیل الرحمان صاحب منشی سخاوت علی، نواب وقارالملک، مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے مواجہ میں مختلف جلسے معاملات کے طے ہونے کے ہوے، گو میں شریک نہ تھا، اب تک جو امور طے ہوے، بہ ظاہر قابلِ اطمینان ہیں۔ دیکھئے اگر اخیر تک قائم رہ جائیں، ایک خاص امر میں زیادہ بحث ہے، اور وہ ۱۰ رکے جلسہ کا انعقاد ہے، بہرحال دو ایک دن میں آخری نتائج معلوم ہونگے اور مطلع کروں گا، کوئی امر بغیر آپ کی اصلاحی کمیٹی کی منظوری کے طے نہ کیا جائے گا، ابھی تک مسودہ ہے، (نواب علی حسن خاں - ۹)

محمد علی مرحوم ابھی تک پوری مستعدی سے اصلاحی کمیٹی میں شرکت نہیں کررہے تھے، اُن کا خیال تھا کہ جب تک اصلاح کی تمام دوسری صورتیں ناکام نہ ہوجائیں، ۱۰ مئی کی کانفرنس کو ملتوی کردینا چاہیئے، ۲۴ اپریل کے ہمدرد میں انھوں نے اپنے اس خیال کو پھیلا کر لکھا، مولانا نے یکم مئی ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں اُن کو جواب دیا، جس میں پہلے ان کی مخلصانہ کوشش کا اعتراف کیا، پھر لکھا کہ اب تک میں نے اور میرے ہمدرد ارکان نے مصالحانہ اصلاح کی کیا کیا کوششیں کیں، اور وہ ناکام رہیں، اور اب بجز مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس کے کوئی دوسرا علاج باقی نہیں رہا؛ غرض ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کی اصلاحی کانفرنس کی تاریخ قائم رہی،

مولانا کی تکفیر مخالفین نے اس اصلاحی تحریک کو ناکام کرنے کے لئے جو آخری ہتھیار اٹھایا وہ مولانا کی تکفیر کا فتویٰ تھا، دلّی میں مخالف ارکان و علماء کا مرکز مولانا عبدالحق صاحب حقانی کا مکان تھا، کہتے ہیں کہ اُن ہی کے مشورہ سے بعض علماء نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر تکفیر کا یہ فتویٰ مرتب کیا، جس میں اُن پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قدمِ مادہ کے قائل ہیں، اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؛ یہ فتویٰ ملک میں شائع ہوا، اور اشتہار کے طور پر مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا،[۱] اس موقع پر سیّد عبدالسّلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا کی خدمت میں ایک استفسار پیش کیا، جس میں یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ مادّۂ عالم کو قدیم اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟ مولانا نے اس کے جواب میں پہلے ایک مفصل بیان لکھا کہ "میں مادّۂ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفاتِ الٰہی کے قدم کا قائل ہوں، اور اسی طرح نبوت کو اکتسابی بھی نہیں جانتا، بلکہ اس کو عطیۂ الٰہی مانتا ہوں"[۲] سیّد عبدالسّلام صاحب نے کہا کہ یہ تحریر ذرا لمبی ہے، اور عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے، مولانا نے

[۱] اب یہ مضمون مقالاتِ شبلی جلد ہشتم میں ملے گا، [۲] مکاتیب نمبر دانی ۱۱۶،

اسی مطلب کی ایک دوسری مختصر تحریر لکھدی، میں اس وقت پاس بیٹھا تھا، میں نے مولانا کے ہاتھ کی وہ دونوں تحریریں اپنے پاس رکھ لیں (جو انشاء اللہ آیندہ کسی موقع پر پیش ہوں گی) اور دوسری تحریر کی نقل سیّد صاحب کے حوالہ کی، جو عام طور سے شائع کی گئی جس سے اس فتنہ کا سارا تار و پود بکھر گیا،

دلی کی اصلاحی کانفرنس، محمد علی مرحوم اور اسٹرائیک کا خاتمہ

بہرحال ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو دلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دلجمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا، اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے، اور ہر طرف سے موافق و مخالف سمٹ کر اس میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی رودادیں سنائیں، اور تجویزیں پیش کیں، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے، کہ محمد علی مرحوم جو حزب احرار کے دوسرے دست و بازو تھے وہ ابھی تک گومگو میں تھے، اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے، میں اور مولوی مسعود علی صاحب اُن سے کئی دفعہ ملے، اور اُن کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لئے آمادہ کیا، انھوں نے کہا جب تک طلبہ اسٹرائیک نہ ختم کریں، میں اُن کی حمایت نہیں کر سکتا، ہم دونوں نے کہا، اگر آپ اُن کے مطالبات کی ذمہ داری قبول کریں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائیک ختم کر دیں گے، یہ سن کر وہ خوش ہوئے، کیونکہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لئے کوشش کر کے ناکام ہو چکے تھے، غرض اسی وقت ہم نے اور انھوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام جواب آیا، کہ "ہم بخوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں، اور آپ کے حسب مشورہ اسٹرائیک کو ختم کرتے ہیں"، یہ ایسی خوشخبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑے،

اور فوراً تار لئے ہوئے جلسہ میں آئے، اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کردیا،

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنادیا وہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحبزادہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہہ اُٹھے کہ "اگر استبداد مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو" آخر صاحبزادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے اور ایسی گرم اور پرزور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں ہل گئیں، اس سلسلہ میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابو الکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں[1]،

اصلاحی سب کمیٹی | بہرحال ان گرماگرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرتِ رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں، اور ایک سب کمیٹی بنی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لئے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، اس دستور العمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا، اور حکیم صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خاں مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے،

---

[1] روداد جلسۂ عام انجمن اصلاح منعقدہ دہلی بتاریخ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۴ء،

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیش نظر رکھے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں، اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آیندہ کسی کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، غرض یہ قرار پایا کہ ۲۴ مئی کو ایک جلسہ بلایا جائے جس میں تمام ارکان جمع ہوں، اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ بار بار اجتماع کی ضرورت پیش نہ آئے، ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو پھر مقام جلسہ تجویز کیا گیا، اور مجلس اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی، اس تجویز کے مطابق ۲۴ مئی کو ایک جلسہ ہوا، اور آیندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئیں، اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستور العمل بنایا، جس کو مجلس اصلاح نے چھاپ کر شائع کیا،

مولانا بمبئی میں مولانا نے اس اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں پورا اپریل و مئی اور جون کا ایک حصہ دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے، اور سیرۃ النبیؐ جلد اوّل کی تکمیل میں مصروف ہوئے، اور ساتھ ہی دار المصنفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے، اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستور العمل کے نقائص اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستور العمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں،

علی گڈہ کانفرنس کا کمیشن چونکہ اس شورش کے زمانہ میں حیدر آباد کے سوا دوسری ریاستوں نے دار العلوم کی ماہانہ و سالانہ امدادیں روک دی تھیں، اور گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم نے بھی سخت اعتراضات کئے تھے، اس لئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز پیش کی جو موجودہ منتظمین کے موافق ایسا

[1] مکاتیب شبلی بنام نواب علی حسن خاں ۱۲

معاینہ لکھے جس کو وہ سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کرکے مسدود امدادوں کو دوبارہ جاری کراسکیں،
چنانچہ اس تجویز کے مطابق کانفرنس کے کچھ اہل کار دارالعلوم کے معاینہ کے لئے تشریف لائے اور منتظمین
نے اس ننگ کو گوارا کرلیا، مولانا گو الگ ہوچکے تھے، مگر اُن کی خودداری طبیعت کو ندوہ کی اس پستی
سے ٹھیس لگی، اور آنسو کے چند قطرے شعروں کی صورت میں نکل گئے، اس سلسلہ کی پہلی نظم یہ ہے،
جس میں ۱۰ / مئی ۱۹۱۳ء کے اجلاسِ دہلی میں علی گڈھ پارٹی کے طرزِ عمل کی تشریح ہے۔

کیا لُطف ہو کہ حامیٔ ندوہ ہیں اب وہ لوگ — جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ غریب — اک بیہودہ خیال تھا یا آنکھ خواب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز — اعلانِ جنگِ "سیدِ" عالی جناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ حقیر — تعلیمِ مغربی کے لئے سدِّ باب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں ندوہ کا یہ طلسم — سرتا قدم فریب وہ شیخِ شاب تھا
ندوہ کا نام سُن کے جو کھاتے تھے پیچ و تاب — جن کے لئے وہ موجبِ رنج و عذاب تھا
حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی میں یہ گروہ — ندوہ کے حلّ و عقد کا نائب مناب تھا
ندوہ پہ حرف گیر جو ہوتا تھا کوئی شخص — وہ اس گروہِ پاک کا وقفِ عتاب تھا
ندوہ میں کوئی نقص بتاتا اگر کوئی — ان کی طرف سے ایک کا سو سو جواب تھا
سیارگانِ چرخِ علی گڈھ تھے پیش پیش — جن میں کوئی قمر تھا کوئی "آفتاب" تھا
حیرت میں تھے تمام تماشائیانِ بزم — یعنی یہ کیا طلسم تھا؟ کیا انقلاب تھا؟
ندوہ کہاں کہاں وہ علیگڈھ کی انجمن؟ — اس بزمِ قدس میں یہ کہاں باریاب تھا

کس دن کی دوستی ہے، یہ کب کا ہے ارتباط؟ | یوں کب وہ موردِ کرمِ بے حساب تھا
شایانِ آفریں ہے وہی ندوہ غریب | جو مدتوں سے موردِ خشم و عتاب تھا
سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ | جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا
بغضِ معاویہ ہے، یہ حُبِّ علی نہیں | اک ایک کی زبان پہ یہ فصل الخطاب تھا
یہ قصۂ بیعت ابھی ناتمام ہے | جو کچھ بیاں ہوا ہے یہ آغازِ باب تھا

خاص اس کمیشن کے سلسلہ میں دوسری نظم ارشاد فرمائی،

آتا ہے اب معاینہ ندوہ کا مشن | جو اختراعِ مجمعِ حکمت شعار ہے
جن میں ہیں کچھ شریکِ نزاعِ قدیم بھی | کچھ ابتدا سے بانیِ آغاز کار ہے
جنہیں ہے کوئی محکمۂ راز کا شریک | مضمونِ "آفتاب" کا مضمون نگار ہے
خود کوزہ گر ہے، خود گلِ کوزہ بھی ہے وہی | جو صلح ہے وہی روشِ کارزار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم | جو مدعیِ رہبریِ روزگار ہے
جو مایۂ امید ہے نسلِ جدید کا | جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ ہر زمعِ کرام | جس کا کہ مہر شاہ ہے ابتک وقار ہے
آیا تھا جسکے شوق میں وہ فاضلِ عرب[1] | جس کا مرقعِ ادبی "المنار" ہے
چلتے ہیں جسکے نقشِ قدم پر حریف بھی | گو اعترافِ حق سے ابھی اُن کو عار ہے
جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج | جو فنِ جرح و نقد کا آموزگار ہے

---

[1] سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر،

جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم	یہ انقلاب گردشِ لیل و نہار ہے
آتے ہیں اسکی جانچ کو ناآشنائے فن	جو رہبر طریقۂ اصلاح کار ہے
تعلیمِ مشرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض	ندوہ اب اُن کا نازکشِ اقتدار ہے
اربابِ ریش و جبۂ اقدس کا وہ گروہ	اب چند منشیوں کا اطاعت گذار ہے
یہ داستانِ درد، یہ افسانۂ الم	ندوہ کا نوحۂ نفسِ احتضار ہے

بہرحال یہ کمیشن آیا، اور اُس نے دارالعلوم کا معاینہ کیا، اور رپورٹ تیار کی، جو گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم اور ریاستوں میں بھیجی گئی،

مصالحت کے لئے مولانا کی آخری کوشش

۱۴ر جون ۱۹۱۴ء کو ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ ہونا طے ہوا، اور اس کا ایجنڈا رُکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا گیا، اس میں غالبًا دہلی کی اصلاحی کانفرنس کی مخالفت کی طرف بھی کوئی اشارہ تھا، اس پر مولانا نے ۲۵ر مئی ۱۹۱۴ء کو اس کے جواب میں بمبئی سے ایک مفصل تحریر لکھ کر بھیجی، اور مصالحت کی تجویز پیش کی، خوش قسمتی سے اتفاقاً مجھے یہ تحریر دفتر ندوہ کے پرانے کاغذات میں اس وقت مل گئی، گو نیچے سے اس کی ایک دو سطریں پھٹ کر الگ ہو گئی ہیں، تاہم مطلب کی بات اس میں سب کچھ موجود ہے:-

"جناب من! السلام علیکم - جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۱۴ر جون ۱۹۱۴ء کا اجنڈا پہنچا، اس زمانہ میں غالبًا میں ان اطراف میں نہ رہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبویؐ کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہو سکوں، بعض ضروری امور گذارش ہیں،

(۱) جلسۂ دہلی کے متعلق میری رائے ہے، کہ اس کا منشا ارکانِ ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی، بلکہ صرف

یہ تھی کہ چونکہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد ارکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہو چکی، مولوی عبدالباری صاحب[1] اور میرزا ظفر اللہ خاں صاحب[2] کے خطوطِ مطبوعہ، اور یادداشتِ مطبوعہ سب کے پیش نظر ہیں، باوجود اس کے کوئی توجہ . . . اس لئے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا جائے، لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ (اس کا مقصد) کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے، یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرانا ہے، اس لئے نہایت فریق بندانہ جوش پیدا ہوا لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا، صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستورالعمل کے اصلی نقائص، اور اُس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں، یہ اسکیم غالباً خود ارکانِ ندوہ کے سامنے پیش ہوگی، اس بنا پر جلسۂ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی،

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرسے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے،

(۲) مولوی عبداللہ صاحب[3] کی رپورٹ متعلق اسٹرائک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محوّل ہے، مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق روکنے پر اپنی مجبوری بیان کی، اور کہا کہ میں کیا کروں؟ ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں، لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا" میں نے کہا

---

[1] مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم [2] میرزا ظفر اللہ خاں صاحب ڈسٹرکٹ جج سیالکوٹ پنجاب،

[3] مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدرس اعلیٰ دارالعلوم نے اسٹرائک کے متعلق ایک یادداشت لکھ کر موجودہ ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی جس کو انھوں نے چھاپ کر تمام ارکان کے پاس بھیجا تھا، اس میں انھوں نے اسٹرائک کے ان اسباب کی تردید کی تھی جو عام طور سے طلبہ نے اپنی شہادت میں بتائے تھے،

کہ آپ اُن سے حکم لکھوا لیجئے، اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں، آئیں گے تو میں لکھواؤں گا، پھر یہ بھی کہا کہ اُن کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا،

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ندوہ جب سے قائم ہے، لڑکے باہر اساتذہ وغیر اساتذہ سے پڑھتے تھے، خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق . . . .

مثلاً خلیل صاحب (شیخ محمد عرب صاحب کے فرزند) سے . . . . کیں،

بخاری شریف کے سبق کے متعلق چونکہ مولانا نے براہِ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے، اس لئے یہ چند سطریں لکھنی پڑیں،

(۳) اسی رپورٹ میں میرے دارالاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، لیکن دارالاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہِ راست نہیں رہا، جو مہتمم ہوتا تھا، اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا،

یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے،

خاص طور پر میری یہ گذارش ہے کہ بجائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دیدیجئے، جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کریں، پھر وہ جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجئے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیونکہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے،

ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔"

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لئے اشخاصِ ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سبحانی (کان پور)

مولوی سید سلیمان، پونہ - دکن۔

(شبلی ۲۵ رمئی ۱۹۱۴ء)

آخری مصالحت مئی ۱۹۱۵ء مولانا نے مصالحت کی جو تجویز اس وقت پیش کی تھی، وہ بدستور ناقابلِ قبول ٹھہری، لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس کے چھ مہینے کے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا نے وفات پائی تو ناممکن ممکن، اور ناقابلِ قبول، قابلِ قبول ہوگیا۔ حادثۂ وفات کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی۔ اس موقع پر ۲۰ رمارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفترِ نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آپہنچا تھا، اس لئے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا، اور مولانا ابوالکلام اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکانِ ندوہ نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا، اور یہ طے کیا کہ دس آدمیوں کی ایک مشترک مجلس ۲۱ رمارچ کی شام کو منعقد ہو، اس میں پانچ ندوہ کے موجودہ ارکان، اور پانچ مجلس اصلاح ندوہ کے ارکان شریک ہو کر کثرتِ رائے سے تمام اختلافی معاملات کا تصفیہ کردیں، چنانچہ انجمن اصلاح کی جانب سے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا ابوالکلام صاحب،

ابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائیکورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب، اور موجودہ ارکان ندوہ کی طرف سے مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے یہ اصحاب ۱۳ مارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے، اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور و فکر کیا، اور حسب ذیل امور اتفاق کامل سے منظور کئے۔

(۱) ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح و ترمیم،

(۲) مسئلہ نظامت کا تصفیہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا جسکو مولٰنا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا

(۳) معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا،

(۴) دارالعلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوہ کا ممبر بنانا قبول کیا گیا،

اس تصفیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب "مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لئے پہلی اپریل کو علی گڈھ چلے گئے، جہاں سے وہ ۵ اپریل کو واپس آکر ندوہ کے آخری سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے، اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسہ میں تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا، اور دونوں فریق نے اتحاد و اتفاق کے اس پرمسرت منظر پر خوشی ظاہر کی، لیکن اس خوشی و شادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح امید ہے کہ شاد ہوئی ہوگی،

بھائی کی وفات

اور

وطن کی طرف بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم

مولوی اسحاق صاحب مرحوم مولانا کے بعد اس وقت سب بھائیوں میں بڑے تھے، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے اولوالعزم کامیاب وکیل تھے، نہایت سنجیدہ، متین، کم سخن، بلند ہمت، مستقل مزاج، اور بہت صائب رائے اور باتدبیر تھے، مولانا کو شیخ صاحب مرحوم یعنی اپنے والد کے قرضہ کے ادا ہو جانے کے بعد سے گھر کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا، گھر کی زمینداری، تحصیل وصول، مقدمات، مالگذاری اور دوسرے خانگی کاروبار کی دیکھ بھال یہی منجھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم کیا کرتے تھے، ادھر جب سے مسلمانوں میں پالیٹکس کا انقلاب پیدا ہوا تھا، وہ پالیٹکس میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے، منٹو مارلے اسکیم کے زمانہ میں وہ یوپی کے ان بڑھتے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے جو الٰہ آباد میں رائے عامہ کی نمایندگی کر رہے تھے، سر علی امام جو اس سال (۱۹۰۸ء) کی مسلم لیگ امرتسر کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسلم لیڈر ہو رہے تھے، اسی اسکیم کے زمانہ میں انھوں نے جب اپنی رائے مخلوط انتخاب کی ایک[1] خاص شکل کی حمایت میں ظاہر کی تو یوپی میں ان کے خلاف جو تحریک اٹھی

---

[1] عام مسلمان جداگانہ انتخاب پر مُصر تھے، سر علی امام نے یہ پیش کیا کہ کچھ مسلمان ممبر جداگانہ انتخاب سے اور کچھ مخلوط انتخاب سے منتخب ہوں

اس کے رہبروں میں مولوی اسحاق صاحب مرحوم سب سے آگے تھے، یہاں تک کہ سرعلی امام پر ملامت کا ووٹ تک الٰہ آباد میں پاس کرایا گیا،

مولانا نے اپنی برادری اور ضلع میں جو تعلیمی کام چھیڑ رکھے تھے، ان دنوں اُن کی نگرانی بھی مولوی اسحاق صاحب ہی کرتے تھے، ایک تعلیمی کمیٹی بھی ضلع میں قائم کی تھی، اور اب اسی کے ماتحت نیشنل ہائی اسکول جو اتنے دنوں کی غفلت میں جارج مڈل اسکول بن چکا تھا، اس کو محمڈن شبلی اسکول کا نام دے کر اس کی اصلاح وترقی کی تجویز بھی ان کے زیر غور تھی، اور عنقریب اس کام کے لئے وہ اعظم گڈھ میں آکر ضلع کا دورہ کرنے والے تھے، ساتھ ہی مدرستہ الاصلاح سرائے میر بھی پیش نظر تھا،

جولائی ۱۹۱۴ء کا اخیر تھا، مولانا بمبئی میں تھے، ۷ر جولائی ۱۹۱۴ء کو قرآن پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ڈھائی سو میں بمبئی میں خریدا تھا اس کی خوشی میں تھے، (شروانی ۱۱۷) اور ہمہ تن سیرت نبوی کی جلد اول کی تکمیل میں مصروف تھے، چنانچہ ۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ء کو اپنی مصروفیت کا حال ان لفظوں میں لکھتے ہیں:- "سیرت کے اتمام کے لئے یہیں کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لئے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول بہ ہمہ جہت تمام کرکے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے، اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں" (شروانی ۱۱۸)

اُن کا خیال تھا کہ وہ رمضان بھر وہیں رہیں گے، اور تکمیل کے طلبہ کو وہیں بلوائیں گے، (عبدالحکیم، مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۴ء) وہ ان ہی منصوبوں میں تھے کہ دفعتہً الٰہ آباد سے بھائی کی سخت علالت کی اطلاع آئی، یہ خبر سنتے ہی وہ فوراً الٰہ آباد روانہ ہو گئے، علالت ایسی سخت اور پیچیدہ تھی کہ خود ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی، شاید چودہ پندرہ روز کی مختصر علالت کے بعد انھوں

نے ۵ اگست ۱۹۱۴ء کو الٰہ آباد میں وفات پائی، اور وہیں سپردِ خاک ہوئے،

مولانا کے لئے یہ حادثہ بڑا روح فرسا ہوا، اُن کے سکون و اطمینان کی دنیا ہی الٹ گئی، اب ہر طرف سے منھ موڑ کر انھوں نے اس ویرانہ کو آباد کرنے کا عزم کیا جس کو عمر بھر آبادی کے قابل نہیں سمجھا، یعنی اعظم گڑھ کو مراجعت فرمائی، اور شبلی منزل میں بیٹھ کر بقیہ عمر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں صرف کرنے کا عزم کرلیا، یہیں بیٹھ کر ان کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے، یعنی ایسا پُر درد مرثیہ[1] لکھا جس کا لفظ لفظ اُن کے خون شدہ دل کی ایک بوند ہے

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا! ۔۔۔ وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا ۔۔۔ قوتِ دست و دلِ شبلیٔ نعمانی تھا

جوش اُسی کا تھا جو میرے سرِ پُر شور میں تھا

بل اُسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا

ہم سے ناکاروں میں اک قوتِ عامل تھا وہی ۔۔۔ مایۂ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی

مسندِ والدِ مرحوم کے قابل تھا وہی ۔۔۔ یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں

ہائے افسوس! میں اسحاق کہاں سے لاؤں

جب کیا والدِ مرحوم نے دنیا سے سفر ۔۔۔ گھر کا گھر تھا ہدفِ ناوکِ صد گونہ خطر

بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر ۔۔۔ تیر جو آئے گیا آپ وہ اُن کی زد پر

---

[1] یہ مرثیہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں بیٹھ کر لکھا ہے، (مسعود ۲۴۳)

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لئے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اُس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم
گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج والم

امن و راحت کے جو ساماں تھے ہر طرح بہم
میں تھا اور مشغلۂ نامہ و قرطاس و قلم

اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا میرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدیِ مرحوم کا داغ
کہ مرا قوتِ بازو تھا مرا چشم و چراغ

اُسکو جنت میں جو خالق نے دیا گنجِ فراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے یہ باغ

یعنی وہ آئینۂ خوبیِ اخلاق تو ہے
اُٹھ گیا مہدیِ مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیّرِ تاباں بھی گیا
میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں بھی گیا

اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں بھی گیا
عتبۂ والدِ مرحوم کا درباں بھی گیا

گلۂ خوبیِ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاکِ لحد آج اجل نے سونپی
وہ امانت جو مرے والدِ مرحوم کی تھی

بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی
نازپروردۂ نعمت تھا اپنی سادہ وشی

دیکھنا اُڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں

گرد پڑ جائے نہ اُس عارضِ روشن پہ کہیں

اُس کے اخلاق کھنک جاتے ہیں دل میں ہر بار　　وہ شکر ریز تبسّم، وہ متانت، وہ وقار

وہ وفا کیشیِ احباب، وہ مردانہ شعار　　وہ دل آویزیِ خو، وہ نگہِ الفت یار

صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی

اس کی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اُسکی تخمیر　　خوبیِ خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر

بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر　　اس کی اک ذات تھی مجموعۂ اوصافِ کثیر

بسکہ خوش طبع تھا وہ صاحبِ تدبیر بھی تھا

سچ تو یہ ہر کہ وہ نوخیز بھی تھا، پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا　　وہ گرفتارِ کمندِ ہوسِ خام نہ تھا

اُسکی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا　　وہ کبھی مدعیِ رہبریِ عام نہ تھا

اس کو مطلوب کبھی گرمیِ بازار نہ تھی

اس کی جو بات تھی کردار تھی، گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعتِ تعلیم کا راز　　اس نے دیکھی تھی جو منزل کے نشیب اور فراز

اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز　　مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخشِ تگ و تاز

کوششوں کے جو نتیجے تھے اُسے مل نہ سکے

ہائے وہ پھول کہ پھوٹے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن   وہ ترا اوج شباب اور وہ بچے کمسن
مسندِ حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن   تو ہی تھا اب خلفِ صدرنشینانِ مِن

دن جب آئے کہ تجھے رہبرِ جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور   اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور   کیا ہوا تجھکو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز   تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک تھا وہ کوئی چیز   رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اُس نے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا! شبلی دل خستہ باایں موئے سفید   لے کے آیا ہے ترے درگہِ عالی میں اُمید
مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید   خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

کیا لکھوں قصۂ غم تابِ رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامۂ پرزور میں دم بھی تو نہیں

اُن کے اس درد و غم کا اندازہ اُن کے اُن خطوط سے بھی کیجئے جو اُس زمانہ میں اپنے دوستوں

اور عزیزوں کو لکھے، کتنے مختصر مگر کتنے بلیغ اور ساتھ ہی کس قدر اثر میں ڈوبے ہوئے، ۱۰ راگست ۱۹۱۴ء کو الہ آباد سے راقم کو ان لفظوں میں حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں :۔ "میرا سب کچھ جاتا رہا" اِنَّا لِلّٰہ (سیلمان) دو لفظوں کے اس کوزہ میں غم والم کا ایک سمندر بند ہے، ۲۹ راگست کو مولوی مسعود علی صاحب کو لکھتے ہیں :۔ "آخر ساری دنیا لٹا کے گھر آیا" (۱۹)

ان لفظوں میں غم و ماتم کی ایک دنیا آباد ہے، ۵ ستمبر کو پھر مجھے لکھتے ہیں :۔ "واقعۂ حال نے میرے حواس کھو دیئے" (۸۰)

۱۶ راکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں :۔ "میں واقعۂ حال سے اس قدر افسردہ ہوگیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی" (۸)

بہرحال اس شدتِ غم نے گو اُن کی طبیعت کو اس قدر ملول اور افسردہ بنا دیا تھا کہ وہ خود مرنے کو تیار بیٹھے تھے، تاہم دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس عالم میں بھی دین وملت اور علم کی خدمت کے ولولہ میں کمی نہیں آئی، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دارالمصنفین کے قیام اور سیرتِ نبویؐ کی تکمیل کا کام اسی طرح اُن کے دل سے لگا ہے، اس بارہ میں ان کا ایک مکتوب جو ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا تھا، پڑھنے کے قابل ہے، (یہ مکتوب خدا جانے کس طرح مکاتیب شبلی میں درج ہونے سے رہ گیا ہے، مولانا شروانی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون علی گڈھ گزٹ میں لکھا تھا اس میں اس کو پورا نقل کر دیا ہے،)

"عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالانکہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گذر چکا تھا، بہرحال میں اعظم گڈہ چلا آیا، محمڈن شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول

سے مڈل اسکول تک آگیا، عزیز مرحوم اُس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے، دو مہینے کا دورہ رکھا تھا، اور پانسو روپیے مصارفِ دورہ کے لئے الگ کردیئے تھے، اشتہارات اور رسید بہیاں سب چھپ گئی تھیں،

مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی فکر ہے، ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا، ۶ برس کشاکش میں گذرے، جو ہوگیا وہ تعجب انگیز ہے، بہرحال صورتِ موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بیگھہ پختہ ہے، اُس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکا بھی راضی ہوگئے ہیں، مسودہ لکھا جاچکا، رجسٹری کرنا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ (دوبارہ) بقدرِ معتدبہ مہیا ہوگیا ہے، اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہوجائے گا، بلکہ صرف کتبخانہ کے لئے کافی ہوگا، دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا، چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے ۴ عناصرِ اُردو کے نام سے تعمیر ہوں، اور عمارت پر تمام موجودہ معززین اربابِ قلم کے نام کندہ ہوں، چندہ مشروط نہیں، ہر صاحبِ قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا، اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں، وہ مددگار ہوں گے، انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا، سردست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور اُن کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں اُن کو دی جائیں گی، جو کچھ لکھیں گے اس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی۔ وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے، جو کم از کم ۲۰-۲۵ روپیے ماہوار ہوں گے، دستاویز کی رجسٹری ہوجائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے، ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے، یہ آخر عمر کا خواب ہے، اور امید ہے کہ ع "چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود"

نواب عماد الملک نے دار المصنفین کی صدر انجمنی قبول کرلی ہے، تکمیلِ دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد، ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے، والتسلیم"

مولانا شروانی اس مضمون میں فرماتے ہیں: "اس تحریر (مذکورۂ بالا خط) میں دو امر خاص قابلِ لحاظ ہیں، ایک پاک اور کارآمد منصوبے، دوسرے یہ کہ شدتِ غم میں بھی دماغ علم کی غمخواری میں مصروف تھا،

بعد وفات علامۂ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روے وصیت وقف کردیا ہے، اور بلند حوصلہ اعزہ تعمیلِ وصیت پر آمادہ ہیں، قبر اسی باغ میں بنی ہے، اور وہیں تکمیلِ سیرت کے سامان ہو رہے ہیں ؎

شدیم خاک ولیکن ز بوے تربت ما توان شناخت کزیں خاک مردمی خیزد"

اس خط سے قیاس ہوگا کہ اس کرب و بیتابی کے عالم میں بھی وہ اپنے اصلی کاموں کو نہیں بھولے تھے، مولوی حمید الدین صاحب، مولوی مسعود علی صاحب، اور راقم کے نام کے خطوط سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت اُن کے پیشِ نظر، ندوہ کی اصلاح، سرائے میر کا انتظام، نیشنل اسکول کی تعمیر، دار المصنفین اور دار التکمیل کے قیام اور سیرت کی تکمیل کی تجویزیں تھیں،

شبلی اسکول

سنہ ۱۹۱۳ء سنہ ۱۹۱۴ء

پچھلے صفحوں میں مولانا کے ابتدائی تعلیمی کارناموں میں نیشنل اسکول کا نام بار بار آیا ہے، مولنا جب سے حیدرآباد گئے اور وہاں سے واپس پر ندوہ کے کاموں میں اتنے منہمک رہے کہ وہ اپنے اس اسکول کو جس سے انھیں بڑی محبت تھی بھول سے گئے، اتنے عرصہ میں اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ

شبلی انٹر کالج اعظم گڈھ

شبلی کالج ہائی اسکول اعظم گڑھ
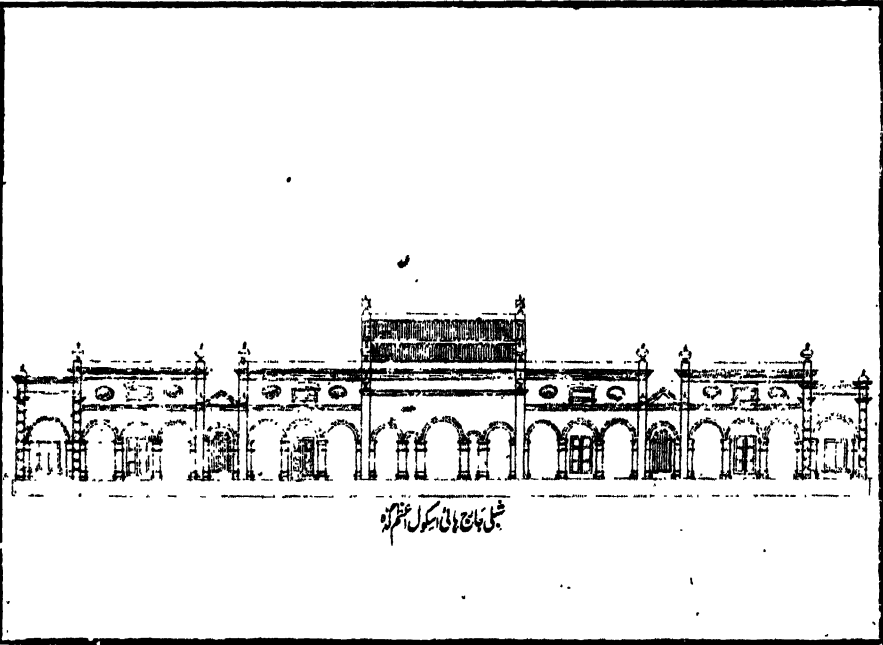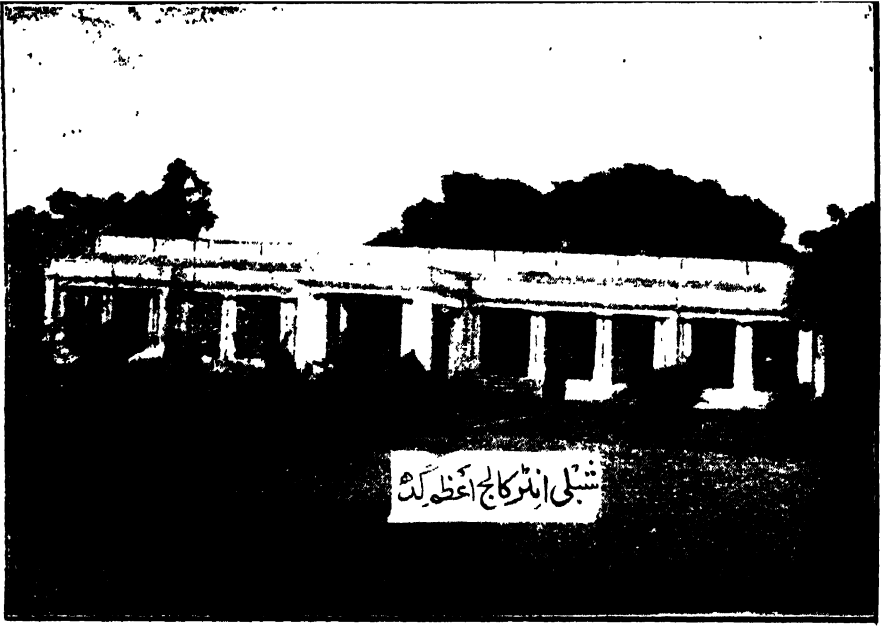
ہائی سکول سے تنزل کرکے مڈل اسکول ہوگیا، اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کا کام تھا انھوں
نے شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر اسکول کا نام جارج اسکول بناکر لفظی تغیر سے اس کی معنوی
ترقی کا خیال باندھا، جو تمام تر بے سود تھا، اسکول اپنی موجودہ حالت سے ذرا آگے نہ بڑھ سکا، آخر جب
مولانا ندوہ کے ہنگاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی، ۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو مولوی اسحاق
مرحوم کو لکھا، "وہاں (اعظم گڈہ) رہ کر اسکول کا بھی تفریحی مشغلہ ہے" (اسحاق ۸۴)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کو اس کے لئے آمادہ کیا، اور لکھا کہ "اعظم گڈہ میں پہلے ایک پرزور
تعلیمی کانفرنس ہو" مولوی اسحاق مرحوم نے کچھ اختلاف کیا، تو انھیں لکھا: "یہ شور وغل فی نفسہ بیہودہ
چیز ہے، لیکن اس کو کیا کیا جائے، کہ کوئی کام دنیا میں بے اس کے نہیں چلتا، انبیاء اور ریفارمرز دونوں کی نظیر
دیکھ لو، علی گڈہ کالج صرف شور وغل سے قائم ہوا، اور اب تک اسی پر قائم ہے،

تم نے کانفرنس تسلیم تو کرلی، لیکن اس کے لئے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اُردو میں چھپوا کر تمام
برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسائے دیہات کے پاس بھیجنا ضرور ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلاء
منصف، عہدہ دار، جو اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا
ہے، نیشنل اسکول یا سرائے میر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں، تم پرائیوٹ خطوط لکھ کر باصرار و تقاضا ان لوگوں
کو جمع کرو، مثلاً مولوی عبدالحمید سبرہدی، مولوی عبدالحلیم منصف، میاں جنید وغیرہ وغیرہ پر تمھارا ہی اثر
پڑسکتا ہے، میرا کہنا تو ان لوگوں کے لئے بھی ایک معمولی عام صدا ہوگی،

کانفرنس کا مقام اعظم گڈہ ہوگا، نیشنل اسکول یا بنگلہ میں، اور اگر سرائے میر میں ہو تو عامی مذاق غالب ہوگا،
میرے لئے یہ مشکل ہے کہ علی گڈہ والوں کا سخت تقاضا ہے، وعدہ بھی کرچکا ہوں، تاہم زیادہ بلکہ

قطعی یہی ارادہ ہے کہ اعظم گڈھ ہی آؤں،

اعظم گڈھ کانفرنس میں حکام کو بھی مدعو کیا جاسکتا ہے، بورڈنگ کو اگر وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جون پور تک کے لڑکے آسکتے ہیں، غرض ایک نہایت وسیع پیمانہ خیال میں ہے،

افسوس ہے، قبل از وقت معذور سا ہوگیا ہوں ۲۴ گھنٹہ میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹہ کام کرسکتا ہوں یہ غنیمت وقت صرف سیرت پر صرف کرتا ہوں، ع عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت ،

میاں حمید کو بھی یہ خط دکھاؤ، اور کانفرنس کا اعلان و پروگرام دونوں صاحب مل کر اور چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے پاس بھیجو اور تقسیم کرو۔"

پھر دوبارہ ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو انھیں لکھا:- "قابلِ غور یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہئے، یا ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہئے، اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں، اور ان کے برابر اسٹاف کا اسکول بنانا آسان نہیں، اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں، کہ اسلامی بورڈنگ بنانا نہایت مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہئے، جس کو رفتہ رفتہ بہت ترقی دیجاسکتی ہے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کرسکیں گے، اور کفایت شعاری کے ساتھ،

مولوی محمد عمر صاحب، اور سمیع، سال بھر میں پنشن لے لیں گے، یہ لوگ بورڈنگ یا مدرسہ کے قیام و ترقی کے متعلق اپنا کافی وقت دے سکیں گے، اور ان پر برادری کو اعتماد بھی ہے۔"

بہرحال مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے ۱۹۱۴ء میں ضلع اعظم گڈھ میں ایک ایجوکیشن سوسائٹی

کی بنیاد ڈالی، اور اسکول کو اُس کی نگرانی میں دے دیا، اور یہ عزم تھا کہ اس سال الٰہ آباد ہائیکورٹ کی بڑی تعطیل میں جو تین مہینہ کی ہوتی ہے، پورے ضلع کا دورہ کریں گے، اور نئے سر سے اسکول کو اُٹھائیں گے، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس تعطیل کے آنے سے پہلے ہی انھوں نے ۵ر اگست ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، اُن کی وفات کے بعد جب مولانا نے اعظم گڈھ کا قیام اختیار کیا تو اسکول کی طرف توجہ فرمائی، مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی یادگار میں اسکول میں چند کمروں کی تعمیر کی تجویز منظور کی، اور متعدد عزیزوں سے چندے لے کر اُن کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، ابھی یہ معاملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں خود مولانا نے وفات پائی، مگر بحمداللہ کام جاری رہا، بلکہ کام کرنے والوں میں اب ایک کے بجائے دو بزرگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا جذبہ پیدا ہوا، مولوی سمیع صاحب کے بڑے بھانجے مرزا مصطفیٰ بیگ مرحوم اس وقت ایل ایل بی ہو کر اعظم گڈھ آئے اور اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، اور پوری محنت و تندہی سے کام کر رہے تھے کہ دو تین سال کے بعد مبتلائے دق ہو کر وفات پائی، اس کے بعد شہر کے ایک ممتاز وکیل مولوی ولی جان صاحب بی اے ایل ایل بی نے اس کی خدمت کا جائزہ لیا، مگر وہ اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ کر سکے، آخر مولانا کے ایک ماموں زاد بھائی شیخ محمد صاحب (زمیندار پھریا) نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی محنت اور کوشش نے اسکول کو دوبارہ زندہ کر دیا، اور اس کو پھر ہائی اسکول تک پہنچایا، اور تعمیرات میں بھی اضافہ کیا، مولانا کے صاحبزادہ حامد صاحب نعمانی نے بھی اس کی تعمیر کی تکمیل میں پوری کوشش فرمائی،

اس کے دوسرے انتخاب میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کے چھوٹے بھانجے اور مرزا مصطفیٰ بیگ مرحوم کے چھوٹے بھائی مرزا مرتضیٰ بیگ صاحب بی اے ال ال بی سکریٹری ہوئے، اُن کے دور میں جواب تک جاری ہے، اسکول نے شاندار کامیابی حاصل کی، اور اب اس سال ۱۹۴۰ء میں اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مولوی بشیر احمد صاحب صدیقی کی کوشش اور حسنِ تدبیر سے اس اسکول نے ترقی کرکے "شبلی کالج" کا رتبہ حاصل کرلیا، کالج کی عمارت الگ بن گئی، جس کی تعمیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے جن کو شروع سے اپنے استاد کے اس ابتدائی تعلیمی کارنامہ سے دلچسپی رہی تھی اَن تھک محنت کی، اور کالج کی پوری عمارت اُن ہی کی کوشش اور اہتمام سے بن کر تیار ہوئی،

کالج کے کارکنوں نے مناسب سمجھا کہ اس کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد اُس شخص کے ہاتھ سے رکھوایا جائے جو اس اسکول کے بانی کا حبیب، سہیم تھا، یعنی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی، چنانچہ موصوف سے عرض کیا گیا اور وہ زحمتِ سفر برداشت کرکے اعظم گڈہ آئے، اور ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء کی شام کو ایک بہت بڑے جلسہ میں اس کے افتتاح کا اعلان کرکے بہت سے معززین کی معیت میں اپنے ہاتھ سے شبلی کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا،

کالج بحمد اللہ اسی سال جولائی سے کھل گیا، اور اس میں اس وقت ایف اے تک کی تعلیم ہو رہی ہے،

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

۱۹۰۸ء — ۱۹۱۴ء

سرائے میر، اعظم گڈہ اور شاہ گنج کے بیچ میں ایک مشہور پرانا قصبہ ہے، حضرت میر علی عاشقاں رحمۃ اللہ علیہ

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر
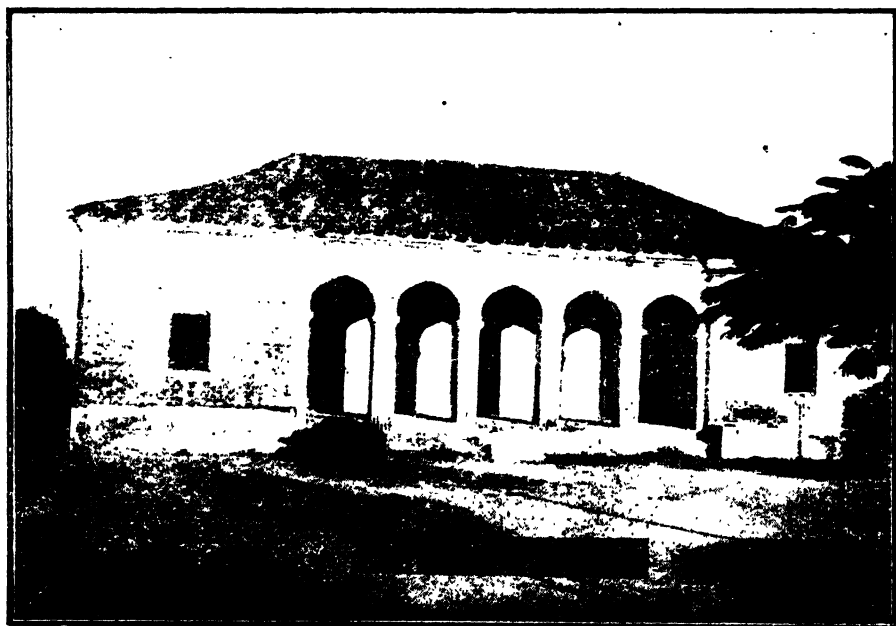
شیر شاہ اور ہمایوں کے عہد میں ایک صاحب دل گذرے ہیں اُن ہی کی نسبت سے یہ مشہور ہے، اُن کا مقبرہ اور اُن کی خانقاہ کی عمارتیں اب بھی گری پڑی قصبہ کے وسط میں موجود ہیں، اس کے آس پاس بعض دولت مند شیعہ زمیندار بھی آباد ہیں، مگر کثرت اُن لوگوں کی ہے جو مولانا مرحوم کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور اکثر نہایت محنت سے معمولی زمینداری اور کاشتکاری پر گذر کرتے ہیں، اور بعض لوگ اور ملکوں اور جزیروں میں جاکر تجارت کرتے ہیں، یہ سب نیک اور دیندار لوگ ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کا وطن پھریا بھی اسی کے قریب ہے،

مولوی شفیع صاحب نام ایک بزرگ نے جو نہایت نیک اور مقدس، اور ان ہی اطراف کے رہنے والے ہیں، اور دوسرے مقامی علما، اور علم دوست اور دیندار مسلمان زمینداروں نے (جن میں مولوی حمید الدین صاحب کے خاندان کے بزرگ جو مولانا کے بھی نانہالی بزرگ تھے) مل کر شاید ۱۹۰۶ء میں ایک انجمن "اصلاح المسلمین" قائم کی، جس کا عام جلسہ ہر مہینہ کسی نہ کسی آس پاس کے قصبہ میں ہوتا تھا، اور اصلاح و ترکِ بدعات کے مواعظ اس میں بیان کئے جاتے تھے، اس کے سالانہ جلسے بھی بڑے پیمانہ پر ہوتے تھے، اُن میں وقتاً فوقتاً مولانا عبد الحق صاحب حقانی دہلوی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری جیسے مشاہیر علما، آتے، اور لوگوں کو مستفید کرتے رہتے اسی سلسلہ میں ایک اسلامی مدرسہ کی بنا کا خیال پیدا ہوا، اتفاق یہ کہ اُسی زمانہ میں ان ہی اطراف کے ایک مدرس مولوی عبد الاحد صاحب (جو منجھیریٹی نام ایک گانوں کے باشندہ تھے جو سرائے میر سے ایک میل پر واقع ہے) جون پور کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، وہ کسی سبب سے مدرسہ چھوڑ کر

اپنے گاؤں میں آگئے، اُن کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے، جن کو وہ اپنے گاؤں میں بیٹھ کر پڑھانے لگے، مدرسہ کی تحریک کرنے والوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور مدرسہ کے لئے سرائے میر میں اسٹیشن کے پاس ۴۴ بیگھہ کی ایک زمین پسند کی، یہ زمین چند سنّی اور شیعہ زمینداروں کی ملکیت تھی، سب نے بخوشی اپنے اپنے حصہ کو اس نیک کام کے لئے وقف کیا، اسی زمین میں سنہ ۱۳۲۶ھ مطابق سنہ ۱۹۰۹ء میں ایک چبوترہ بنا کر چھپّر ڈال دیا گیا، اور وہ مدرسہ ہو گیا، اُس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب جو اب دیوبند کے مدرسہ میں ہیں، اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اٹالہ کی جامع مسجد جونپور میں پچیس ۲۵ برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور اُن کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا، مولوی عبد الاحد صاحب یہیں آکر پڑھانے لگے، مولوی فیض الحسن صاحب میرٹھی نامی ایک خوش بیان واعظ، اتفاق سے انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں آئے، تو لوگوں نے اُن کو اور انھوں نے اس مقام کو غنیمت سمجھا، چنانچہ انھوں نے چند سال یہاں رہ کر مدرسہ کے لئے چندوں سے سرمایہ جمع کیا اور ایک بنگلہ اور کچھ کچے کمرے بنوائے،

مدرسہ کی تحریک اور بنیاد تک اس میں مولانا کا ہاتھ نہ تھا، لیکن جوں ہی اس نے برگ و بار پیدا کیا، برادری کی ایک نیک تحریک کے خیال سے مولانا نے اس کی سرپرستی قبول کرلی، سنہ ۱۹۱۰ء میں اس کا بڑا جلسہ ہوا، اطراف کے سارے مسلمان جمع ہوئے، دیوبند سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور ندوۃ العلماء سے مولانا مرحوم دار العلوم کے دو چھوٹے طالب علموں، عبد الرحمان نگرامی اور معین الدین کو لے کر جو باوجود کمسنی کے بہت اچھی تقریر کرتے تھے، جلسہ میں شریک ہوئے، یہیں مولانا مرحوم اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی میں پہلی ملاقات ہوئی، اور تخلیہ میں گفتگوئیں

مسجد۔ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر
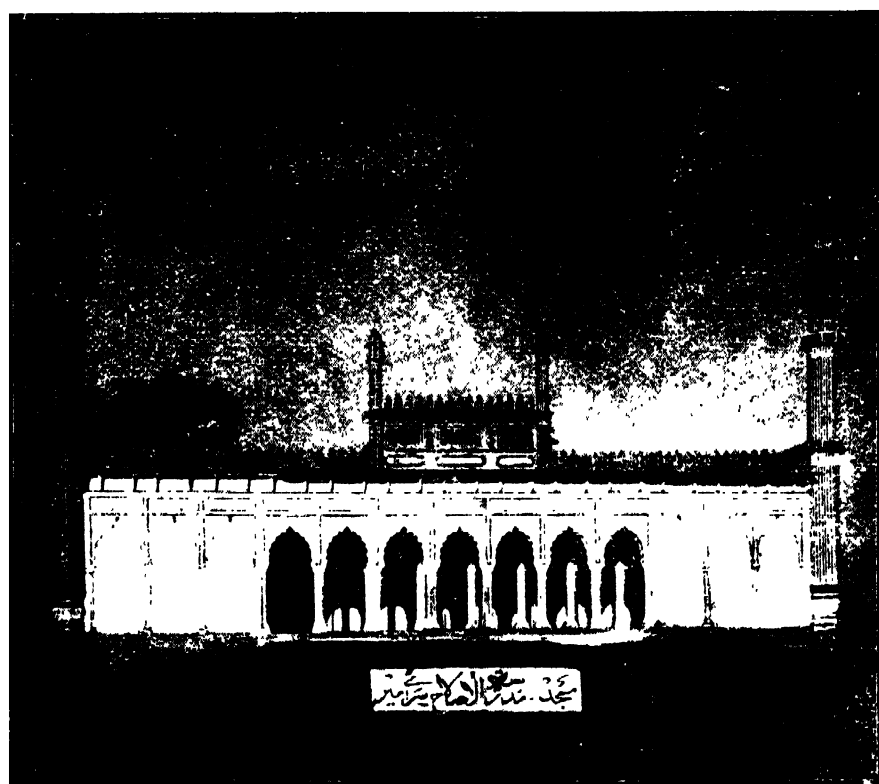
ہوئیں، اور ایک نے دوسرے کو پہچانا، اس تعارف میں شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا حمید الدین صاحب مدت تک کراچی میں رہے تھے، اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اور اُن سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں، دونوں میں قرآن پاک کے درس اور غور و فکر کا ذوق مشترک تھا،

اس زمانہ میں مولانا پر آریوں کے حملوں کی وجہ سے اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تحریک بالکل چھائی ہوئی تھی، اور آریوں کے گروکل کی سادگی، اور مذہبی خدمات کے لئے اُن کی تیاری کے قصوں سے بہت متاثر تھے، اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جماعت یا درسگاہ اسی اصول پر قائم کیجائے، یہ مدرسہ جو بالکل دیہات میں قائم تھا اس کام کے لئے ان کو بہت موزوں نظر آیا، ۲۹ر اپریل ۱۹۱۱ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا:- "کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خاص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت، اور مذہبی خدمت مطمحِ زندگی ہو" (حمید- ۵)

۱۹۱۲ء میں مولانا نے اس کے انتظامی جلسوں میں شرکت فرمائی، اور مولوی فیض الحسن کو جن پر لوگوں کو بہت سے اعتراضات تھے، خوش اسلوبی سے الگ کیا گیا،

۱۹۱۳ء میں جب مولانا نے دار العلوم کی معتمدی سے سبکدوشی حاصل کی تو مدرسۂ سرائمیر کی طرف مزید توجہ فرمائی، اس وقت وہ حیدر آباد میں تھے، اور دار العلوم حیدر آباد دکن میں مولانا حمید الدین صاحب کی تقرری کا مسئلہ گرانقدر مشاہرہ پر طے پا رہا تھا، تاہم انھوں نے مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا:- بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڈھ[1] پر، دونوں کے برداشت کے

---

[1] مقصود نیشنل اسکول سے ہے، جو اب شبلی کالج کہلاتا ہے،

قابلِ توم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہئے، اور ان کا باہمی تعلق،

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے،

یہیں خدامِ دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ

کام کرنے نہیں دیتے، تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہئے، ہم سب کو وہیں بود و باش کرنی چاہئے، ایک معقول

کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہئے، اگر تم بہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں،

آج ڈائرکٹر تعلیمات سے تمھارے متعلق فیصلہ کرنا ہے، صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ

موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا، البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہئے،

وہ بقدرِ کفاف کسی نہ کسی طرح ہوتا رہیگا، آخر تمھارا بھی خود خیال تھا، پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں،

اور یہ کام ابدی ہے" (حمید، ۶)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جب مولانا اعظم گڈھ آئے اور یہاں کے

منتشر اداروں کو باہم ملا کر ایک منظم شکل دینی چاہی تو اس کی ایک کڑی مدرسہ سرائے میر بھی

قرار دی، مولوی حمید الدین صاحب نے اُن کو لکھا کہ آپ اس مدرسہ کی نظامت قبول فرما کر

اسی کو اپنی کوششوں کا محور قرار دے لیں"، اُس کے جواب میں ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو انھیں لکھا:۔

"بھائی! بہ ایں ضعف و دل شکستگی مدرسہ سرائے میر کی نظامت کیونکر کر سکتا ہوں، کوئی دوسرا شخص

سوچو، امکانی مدد کرتا رہوں گا" (حمید۔ ۵)

بالآخر مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب

ندوی کو جن کے حسنِ انتظام کا ان کو تجربہ ہو چکا تھا، اعظم گڈھ بلالیں، اور دارالمصنفین کے ساتھ

مدرسہ سرائے میر کی نگرانی بھی اُن کے سپرد کریں۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے شروع میں مولوی مسعود علی صاحب اعظم گڈھ آئے، اور انھوں نے مجوزہ دار المصنفین کے مکان اور مدرسۂ سرائے میر کو جا کر دیکھا، ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا نے مجھے لکھا:۔ "تمھارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے" وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دار المصنفین وتکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں" (سلیمان ۸۱)

مولوی صاحب نے واپس جا کر مولانا کو لکھا کہ "مدرسہ میں جو مدرس اول ہیں وہ اس جگہ کے لئے موزوں نہیں" مولانا نے جواب دیا:۔ "سرائے میر کے منتظم دیر نہیں ہیں، مدرس حال گو ان کے نزدیک ناقابل ہیں لیکن ان کو فوراً موقوف نہ کریں گے، اور شاید اس میں کچھ دیر لگے، ورجۂ تکمیل والوں کے ساتھ شبلی یہاں چلے آئیں، جب تک کوئی انتظام نہ ہو وہ تکمیل میں رہیں" (مسعود ۲۱)

یہاں شبلی سے مقصود مولوی شبلی[1] صاحب ندوی متعلم ہیں جو اعظم گڈھ ہی کے رہنے والے اور دار العلوم سے فارغ ہو کر دو برس سے دار العلوم کے درجۂ تکمیل میں علم کلام اور معقولات کی تکمیل میں مصروف تھے، مولانا اُن کو سرائے میر کے کام کے لئے تجویز فرما رہے تھے، مگر چونکہ وہاں کے انتظام میں کچھ تاخیر تھی، اس لئے سردست ان کو اعظم گڈھ آنے کی ہدایت فرمائی، مولانا کے ذہن میں اس وقت دار المصنفین، درجۂ تکمیل اور سرائے میر کو ملا کر ایک اچھے خاصے جامعۂ اسلامیہ کا تصور قائم

[1] لطیفہ:۔ دار العلوم میں بیک وقت تین شبلی جمع تھے، مولانا شبلی صاحب معتمد دار العلوم، مولانا شبلی صاحب مدرس اور یہ مولوی شبلی متعلم، ان بیچارے کے نام کے ساتھ اسی فرق کے لئے متعلم کا لفظ لگایا گیا، وہ احباب کی زبان پر اُن کے نام کا ایسا لازمی جز بنگیا کہ اس کے ملائے بغیر اُن کی شخصیت کا تصور نہیں آتا تھا، مگر جب انھوں نے علم کلام کی تکمیل کرلی تو اسی وزن پر متکلم کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا جو اب تک قائم ہے، یہ ہماری جماعت میں کلام و معقولات میں نہایت لائق و فاضل اور ساتھ ہی نہایت متواضع، خاکسار اور ایثار پسند ہیں، مولانا ان سے محبت رکھتے تھے،

ہوگیا تھا، مولوی مسعود علی صاحب کو اپنی ایسی غم انگیز حالت میں بھی کس خوشی سے اپنے اس خوش آیند خواب کی اطلاع دیتے ہیں:۔ "دارالمصنفین، درجۂ تکمیل، سرائے میر درجۂ ابتدائی، پورا جامعۂ اسلامیہ[1] کا مصالحہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے، سرائے میر والے چند بار آئے، وہ تمھارے بہت آرزومند ہیں، وہاں کے موجودہ ناظم اور بانی مدرسہ مولوی محمد شفیع کی خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ، اور وہ واعظ بن کر قصبات کا دورہ کرتے رہیں، کہ مالی حالت کی طرف سے اطمینان ہوجائے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو نظم و نسق نہیں آتا، یہ بھی خیال تھا کہ انسپکٹر مدارس سے مل کر اس کی سرکاری امداد کا کوئی انتظام ہو، اسی خط میں لکھتے ہیں: "انسپکٹر مدارس آئے تھے، وہ سرائے میر کو دو مہینہ کے بعد دیکھیں گے، اور امداد کی پوری توقع ہے" (مسعود ۲۵)

پہلی نومبر کو پھر مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا،" میں ایک مفصل اسکیم لکھ چکا ہوں، اب جو آنے والے ہوں فوراً آجائیں، تاکہ ایک صحیح اسکیم قائم ہوجائے، شبلی متعلم بھی، اور اور لوگ بھی، تم اپنی نسبت فیصلہ کرلو کہ کہاں رہنا بہتر ہے، لکھنؤ سے بالکل قطع تعلق مناسب معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ایک عمدہ اسکیم یہ تھی کہ سرائے میر کا نظام تمھارے ہاتھ میں ہوتا، اگر اس کا کچھ تدارک یعنی تلافی ہوسکے تو سرائے میر کے ارادہ سے آجاؤ، میرا دورہ بھی اکثر رہیگا" (مسعود ۳۰)

مولوی مسعود علی صاحب نے لکھا کہ وہ بالفعل چھ مہینے کے لئے سرائے میر کے مدرسہ کے کام کو اپنے

---

[1] جامعہ کا لفظ جامعۂ ملیہ دہلی کے بعد سے تو عام ہو گیا مگر یہ لفظ ہماری زبان میں اس معنی میں پہلے مولانا ہی کے قلم سے نکلا، اور بعد کو اشاعت پذیر ہوا، جامعہ ملیہ کے نام کی تاریخ بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے، مسلم یونیورسٹی سے ٹوٹ کر اس کے بالمقابل جو نئی قومی مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی، اس کا لیٹر پیپر یعنی خط کا کاغذ مولانا ابوالکلام نے چھپوایا تھا، ان ہی نے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے انگریزی لفظوں کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ بھی کر دیا، پھر بعد کو یہ لفظ چل گیا، جامعۂ مصر کی نئی عربی زبان میں یونیورسٹی کو کہتے ہیں جو یونیورسٹی کا گو لفظی ترجمہ ہے لیکن چونکہ جامع عربی میں مسجد اعظم کو کہتے ہیں، اور شروع میں مسجدیں ہی درسگاہیں تھیں اس لئے جامع کے ساتھ جامعہ کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہے،

ہاتھ میں لیں گے۔" مولانا نے ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو اُنھیں لکھا: "تمھاری نسبت یقیناً سرائے میر میں رہنا بہتر ہے، اور چھ مہینے کی رائے ٹھیک ہے، تم کو ہر بات کا تجربہ ہوجائے گا، اختیارات جس قدر چاہو گے مل جائیں گے۔" (مسعودی ۳۴)

مولوی مسعود علی صاحب جب آئے تو مولانا نے والا مرض الموت کے بستر پر تھا۔

مولوی شبلی صاحب متکلم مولانا کی وفات سے تین روز پہلے پہنچ گئے تھے، اُن کو پاس بلا کر فرمایا کہ میری زندگی کے حاصل تم لوگ ہو، جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو۔

مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے اُن چند شاگردوں کو لیکر جو اس وقت جمع تھے ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی، اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اُس وقت مولانا حمید الدین کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاکسار، اس مقصد کی بنا پر ہم لوگوں نے مولوی شبلی صاحب متکلم کو مدرسۂ سرائے میر کی صدر مدرسی، اور مولوی مسعود علی صاحب کو اس کی نگرانی کی خدمت سپرد کی، جس کو ان دونوں صاحبوں نے قبول کیا، مولوی مسعود علی صاحب تو سال دو سال کے بعد دار المصنفین کے کاموں کے پھیلاؤ کے سبب سے اُس کی نگرانی کی خدمت سے الگ ہوگئے، اور خود مولوی حمید الدین صاحب نے اس بوجھ کو اپنے سر اٹھالیا، لیکن مولوی شبلی صاحب اُس وقت سے لیکر اس وقت تک پوری جانفشانی، محنت اور ایثار کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتوں کو مردانہ وار جھیل کر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں، اور بحمد اللہ کہ اُن کے اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور ایثار کی بدولت مدرسہ آج ایک ممتاز علمی حیثیت رکھتا ہے، آخر عمر میں گویا مولانا کی آرزو کے مطابق جسکا پچھلے خط میں

ذکر ہے، مولانا حمید الدین صاحب نے حیدر آباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اور قرآن پاک کی تعلیم و تدریس اس کا خاص مقصد قرار دے کر اس کا خاص نصاب بنایا، جس پر وہ آج تک گامزن ہے، اور اچھے نتائج پیش کر رہا ہے،

دارالمصنفین

سنہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء

ابتدائی خیال مولانا مرحوم کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتبخانہ ندوۃ العلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دارالعلوم کی جو سہ سالہ رپورٹ اُنھوں نے لکھ کر پیش کی تھی، اُس میں یہ بھی لکھا تھا:- "قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانۂ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضرور ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جنھیں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں، اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتبخانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو، تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں،

کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ
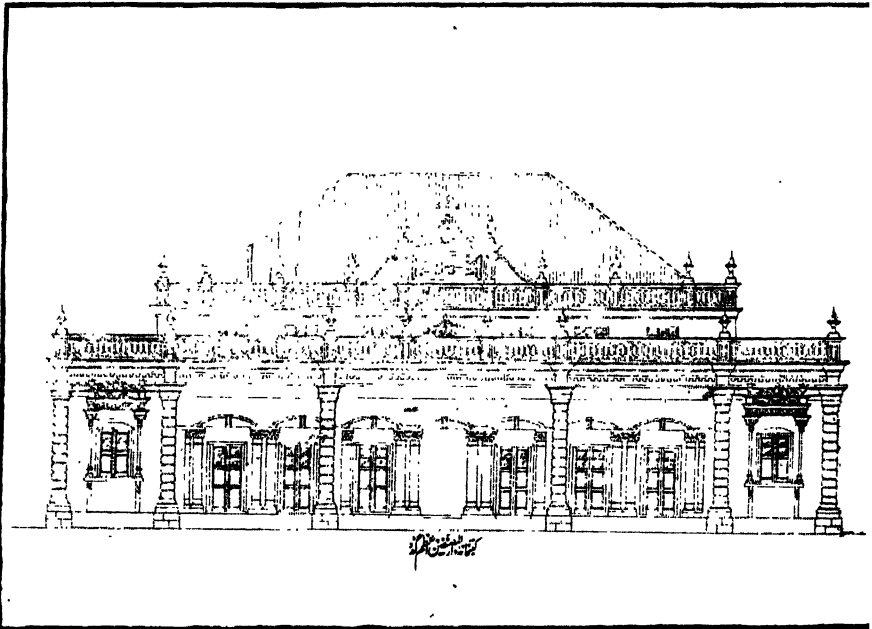
یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے، جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کردیا جائے "

مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھنے کے لئے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتبخانہ کی ضرورت" کا عنوان میرے حوالہ فرمایا تھا، اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو، میری یہ تقریر ندوہ کے اجلاس دہلی کی رپورٹ اور الندوہ میں چھپ چکی ہے، اس کے آخر میں صیغۂ تصنیف وتالیف کے عنوان کے نیچے ہے: "ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے، کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف وتصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تالیف وتصنیف قائم کیا جائے، جس سے علوم وتاریخ اسلام کا احیاء ہو، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو، جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں، اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے، لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ سو صفحوں کی کتاب ہندوستان، مصر، قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو کھنگال کر لکھی گئی ہے، یہ امر بدیہی ہے، کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی، کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذونادر شائع ہوتی ہیں، اگر قوم ندوۃ العلماء کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کردے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو، تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہوجائے، اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوگی کہ ممتاز طلباے دارالعلوم کا

ایک حصّہ صیغۂ تالیف و تصنیف کے لئے وقف کیا جائے، جس کی قوم کو اس وقت نہایت ضرورت ہے۔"

"دارالعلوم کی جدید عمارت میں اس کتب خانۂ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے، جس میں کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لئے بنایا جائے، جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو، مادری زبان کو جس کا گہوارۂ طفولیت یہی دہلی ہے، ان تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام دارالمصنفین ہو۔ بظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں، لیکن قوم کی امداد سے آج جہاں بہت سے مشکل اور بظاہر محال کام انجام پا رہے ہیں، اس کتب خانۂ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں جس کے لئے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔"

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوائیں گے تو مولانا نے الندوہ (اگست ۱۹۱۰ء) میں یہ نوٹ لکھا: "جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں، ہماری تصنیفات کی توقیر کیا وقعت ہے، لیکن نواب صاحب موصوف چونکہ علم دوست ہیں، اس لئے انھوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں، ان کے لئے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون

کی کتابیں میار ہیں، چونکہ ندوہ کا کتبخانہ اعلیٰ درجہ کا کتبخانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لئے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے، نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لئے دس ہزار روپیہ درکار ہوں گے،

اسکے بعد ندوہ میں اختلافات کا دور پیدا ہو گیا اور یہ خیال اُنکے دماغ میں یونہی پیچیدہ رہا،

جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو ادھر سے یکسو ہو کر اُن کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب زبیری کو (جو اس وقت ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے) ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "ہاں یہ دونوں (سلیمان۔ عبدالسلام) اچھے بن گئے، کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا، ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہرحال یہ طے ہوئے کہ کہاں صدر مقام کروں، تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے، اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔" (۱۰)

سیرت اکاڈیمی ایک خیال یہ بھی تھا، کہ مخصوص طور پر سیرت کی ایک اکاڈیمی بنائی جائے، اور اس کے ذریعہ سے اس فن کے ماہر تیار کئے جائیں، چنانچہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "آپنے یہ نہ لکھا کہ کونسا کام لے کر بیٹھوں، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں، لیکن ابھی

مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا قطعی انتخاب نہیں ہوتا، چاہوں تو خود سیرت کو ایک مقصد مستقل قرار دوں، یعنی ایک اکاڈیمی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور فیلوشپ کے دیئے جائیں، کہ سیرت کی اسٹڈی کریں، اور خاص اس فن میں ماہر بنیں، اور سیرت پر تقریر و تحریر کریں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بہ قدر ضرورت مالی اعانت بھی مل سکتی ہے۔" (۳۹)

دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت | بہرحال دارالمصنفین کا خیال اس قدر پختہ ہو گیا کہ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا، اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا، اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسولپور (ضلع مظفرپور۔ بہار) کو ۲۶ فروری ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھا:- "ہاں دارالمصنفین کی تجویز الہلال میں کیا نظر سے نہیں گذری، ضرور دیکھئے، آپ اس کے خاص مخاطب ہیں، اس کیلئے خود دو بار تک آؤں گا، یہ میرا اخیر کام ہے اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔" (۲۳)

ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ چند طلبہ خود مولانا کے ساتھ رہیں اور ان کو خاص خاص فنون میں تیار کرایا جائے، چنانچہ وہ مجھی کو جون ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:- "آزاد سے مشورہ ہوا، رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے، اس لئے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں، اور ان کو کسی فن میں تیار کروں، اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کا تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو، اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو۔ نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہئے، اس میں کچھ ما ہوار تم بھی دو۔" (سلیمان ۶۰)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد اس زیر تجویز ادارہ کے اہتمام و انصرام کا کام مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کی انتظامی قابلیت اور حسنِ تدبیر کے مولانا معترف تھے اور جو آپ ندوہ کے اصلاحی کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور کسی علمی مشغلہ کی تلاش میں تھے، سپرد کرنا چاہا، اسی بنا پر دار المصنفین کے آیندہ قیام اور نظام کے مشورے اس زمانہ میں اُن سے ہوتے رہے، جن کے ذکر اُن کے خطوط میں بکثرت ہیں،

دار المصنفین کا مرکز: سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دار المصنفین کو کہاں قائم کیا جائے؟ مولانا نے اس کے متعلق سب سے پہلے ارکانِ ندوہ سے اتمامِ حجت کرنا چاہا، ۱۴ر فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی سے پوچھا "ہاں دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے، میں اس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا، اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" (۱۱۳)

پھر چند روز کے بعد ۳ر مارچ ۱۹۱۴ء کو اُنھیں دوبارہ لکھا "دار المصنفین کی تجویزیں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے، میں خود اپنے پاس سے ادا کر دوں گا، چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنواؤں گا، بہرحال اس وقت صرف آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے، اگر علی گڈھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ خاں کا مقلد کہیں گے، اس لئے میں اتمامِ حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پُرلطف تجویزیں دار المصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں" (۱۱۴)

لیکن مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے غالباً اس کے لئے خود اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا، لکھا:- "آپ دار المصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو

حضرت میں اعظم گڈہ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڈہ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کرسکتا ہوں" (۱۱۵)

لیکن مولانا کی اصلی خواہش یہ تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب نے جب ان کو یہ لکھا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں اور ندوہ ہی کے احاطہ میں قائم ہو تو اس کے جواب میں ۲۷ رجولائی ۱۹۱۴ء کو انھیں لکھا: "بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں میری اصل خواہش بھی ہی ہے لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے" (۱۳)

ندوہ سے الگ بھی وہ دارالمصنفین کا مرکز لکھنؤ ہی کو بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۱۸ رجولائی ۱۹۱۴ء کو ان ہی کو لکھا: "ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب[۱] محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے۔ چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں، کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک پھوس کا مختصر بنگلہ اور چند اور چھپر کے کمرے بنوائے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالباً وہاں میری صحت بھی درست رہے" (۱۵)

بالآخر دارالمصنفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں اُن کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے اُن کو اعظم گڈہ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا:- "میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو، اور خود ان کو لکھدو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں"،

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں،

[۱] سابق مہاراجہ محمود آباد محمد علی محمد خاں۔

کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجوایٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے، اور سب حسب خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا، دارالمصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔" (۲۷)

اب اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لئے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا، لیکن چونکہ خاندان کے اور لوگ بھی اس میں شریک تھے، اس لئے اُن کی رضامندی بھی حاصل کرنا چاہی، یہ لوگ راضی ہو گئے تو وقف نامہ لکھوانا شروع کیا، چنانچہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مجھے لکھتے ہیں:- "تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آ کبھی ادر چلے گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین، تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہو گئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامۂ باغ زیرِ تحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے۔ (۸۱)

وظائف کا انتظام چونکہ اب تک دارالمصنفین کے لئے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی اس لئے درجۂ تکمیل کے وظائف کے لئے مولانا حمید الدین صاحب نے ۳۰ روپیہ ماہوار مقرر کئے، اسی قدر مولانا نے اپنی طرف سے منظور کیا، کتب خانہ، باغ اور بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارفِ کثیر پڑنے والے تھے، ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا، دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لئے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا اُس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا، (مسعود ۲۲

دار المصنفین کا تعلیمی خاکہ | ان تمام مراتب کے طے ہو جانے کے بعد طلبا سے دار المصنفین کے لئے حسب ذیل

قواعد داخلہ بنائے،

۱۔ مدت تعلیم دو سال،

۲۔ اس کی دو شاخیں ہوں گی، تکمیل۱ و تصنیف۲،

۳۔ ہر طالب العلم جو صرف و نحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہو سکیگا،

۴۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا،

درجۂ تکمیل، اس درجہ میں ۲ مضمون لازمی ہوں گے، ادب اور علوم ثلثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن۱ مجید مع تفسیر، حدیث۲، علم کلام۳ مع فلسفہ،

درجۂ تصنیف (۱) اس میں وہ شخص شامل ہو سکیگا جس کو انشا پردازی کا فی الجملہ مذاق ہو، اور عربی صرف و نحو کافی طور سے جانتا ہو، اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو،

(۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشاپرداز ہو، لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے،

(۳) طریقۂ تعلیم فن تصنیف،

۱۔ پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دیئے جائیں گے، اور مضامین لکھوائے جائیں گے،

۲۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے،

۳۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے ماٰخذ بتائے جائیں گے، اور تمام ماٰخذ مہیا کر دیئے جائیں گے کہ مطالعہ کر سکے،

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ
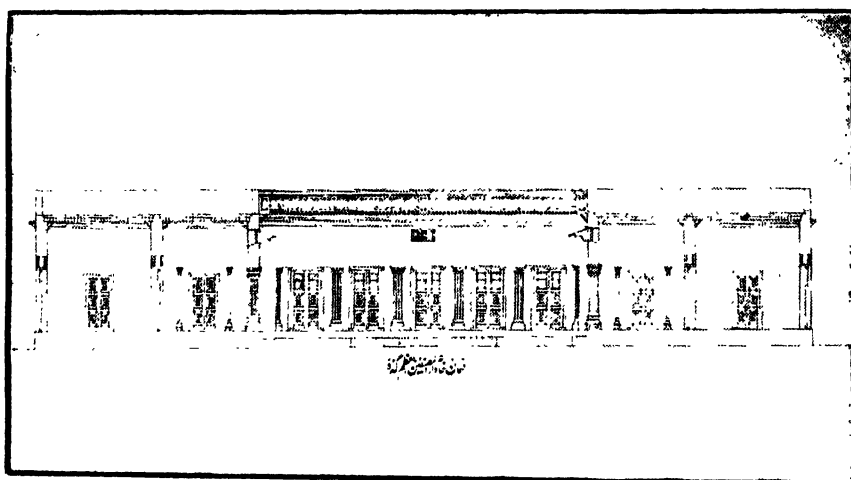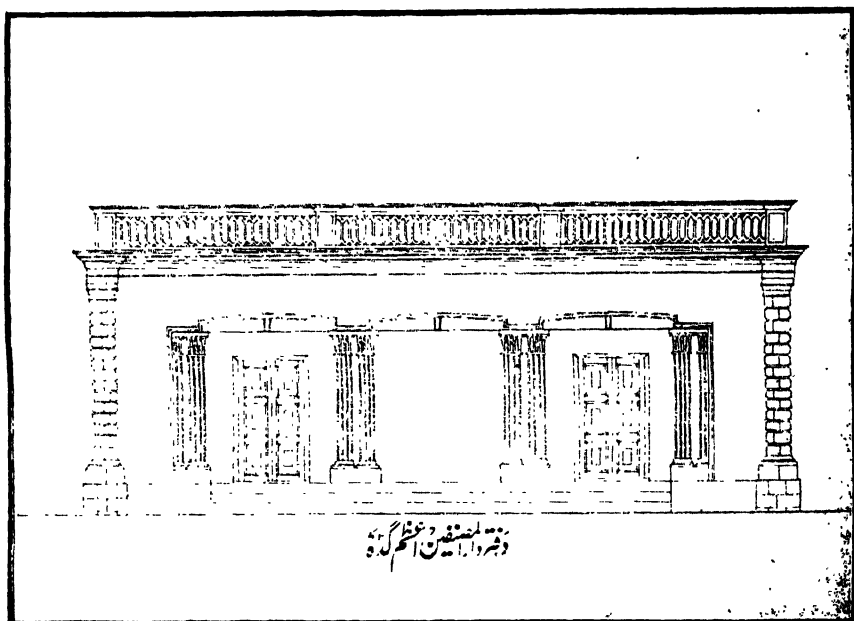
۴ - پھر جو (یونہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی ہے)

اس کے بعد طلبہ کی جستجو ہوئی اور اس کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا کہ "درجۂ تکمیل یا تصنیف والوں کے متعلق نقشۂ ذیل کی خانہ پری کرکے بھیجدو:"

۱- نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ؛

۲- مستطیع ہیں یا غیر مستطیع،

۳- کس فن کی تکمیل چاہتے ہیں، سردست صرف تفسیر اور ادب کی تکمیل کا انتظام ہو سکتا ہے؛

۴- کتنی مدت تک قیام کریں گے،

۵- مقصدِ زندگی کیا ہے[1]،

۶- وضع[2] و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں،

گو یہ جزئی بات ہے لیکن میں شیروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قطعِ[3] لحیہ تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت[4] دونوں عالمانہ ہو، علماء کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلبہ بھی اسی کے قریب قریب استعمال کرتے تھے۔" (مسعود - ۲۱)

طلبہ کا انتخاب ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد طلبہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، ندوۃ

---

[1] یہ تمام قواعد خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں [2] یہ دفعہ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو مکاتیب میں شامل ہے [3] داڑھی ترشوانا [4] یہ وہ حقیقت ہے جو اس زمانہ میں مولانا پر منکشف ہو چکی تھی، اور اب اسی کی تلافی ان کے پیش نظر تھی،

کے فارغ التحصیل یا قریب فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے وہ خود واقف تھے، چند طلبہ کا انتخاب کیا، اس کے بعد متعدد طلباے ندوہ نے داخلہ کے لئے بہ شوق خطوط لکھے تو یہ قرار پایا کہ تمام طلبہ بقرعید کے بعد آجائیں (مسعود۔ ۲۴) مولوی ابو الحسنات عبدالشکور ندوی[1] مرحوم سابق رفیق دار المصنفین کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔" عبدالشکور کا ایک قصیدہ ملا، تمھارے پتہ سے جواب مانگا ہے، جواب کی کیا حاجت ہے، بقرعید کے بعد آجانا چاہیئے، قصیدہ میں کچھ غلطیاں اور کمزوریاں ہیں، لیکن طبیعت میں قابلیت ہے، اس لئے بہت جلد یہ خامیاں نکل جائیں گی۔" (مسعود۔ ۲۵)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد ندوہ کے جن طلبہ کو قابلِ تربیت سمجھتے تھے، اُن پر خود بخود اُن کی نگاہ پڑی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔" عبدالرحمان[2] نگرامی بھی قابلِ تربیت ہے۔" (سلیمان ۶۹) ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔" سید سلیمان نے محسن[3] کی تعریف لکھی ہے کہ وہ میرے پاس رہنے کے قابل ہیں، انشا پردازی کا بھی مادہ ہے، خلیل[4] صاحب اگر آئیں تو بلا لوں، ان کے لئے تو وظیفہ میں خود اپنے پاس سے دونگا"

---

[1] عین شباب میں وفات ہوئی، یہ بہار کے ایک قصبہ کے تھے، ان کے حالات کے لئے دیکھئے معارف نومبر ۱۹۲۴ء
[2] عین جوانی میں انھوں نے بھی وفات پائی، یہ نگرام ضلع لکھنؤ کے باشندہ تھے، اور ایک علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تفصیل کے لئے دیکھئے معارف مارچ ۱۹۲۶ء
[3] یہ بہار محلہ کاغذی محلہ کے باشندہ، اور ندوہ کے فارغ التحصیل تھے، کچھ دنوں ندوہ کے کتبخانہ میں کام کرتے رہے، پھر وطن چلے گئے اور وہاں کے ایک مقامی سکول میں ہیڈ مولوی ہو گئے، اور چند سال کے بعد مرض دق میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کو عربی ادب سے کافی ذوق تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ،
[4] یہ مشہور محدث یمنی شیخ حسین صاحب عرب کے جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی قدر دانی سے بھوپال میں رہ گئے تھے، اور ہزاروں علما، اور محدثین کے استاد تھے پوتے تھے، ان کے والد شیخ محمد صاحب عرب ندوہ میں مدرس ادب تھے، اسی سلسلہ میں شیخ محمد خلیل صاحب نے ندوہ میں تعلیم پائی، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، چند سال کے بعد مزاج کی ناسازی کے سبب سے مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے، اور اس وقت ۱۹۴۰ء ۱۳۵۹ھ مجلس علما بھوپال کے رکن ہیں جو ریاست بھوپال کا ایک معزز سرکاری منصب ہے،

مسجد دار المصنفین اعظم گڈھ

بہرحال کام جس سرگرمی سے ہو رہا تھا اُس کے لحاظ سے ۲ نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہوگئے تھے کہ دو تین مہینہ کے بعد اپنے احباب خاص کو دارالمصنفین کے دیکھنے کے لئے مدعو کرسکیں، چنانچہ نواب علی حسن خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میرا تو یہ حال ہے کہ میں نے اچھا وسیع قطعہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کیلئے لے لیا ہے اور جو وقت اور افادہ وہاں بیکار جا رہا تھا اس کو موزوں اور مناسب موقع پر صرف کرونگا

دو تین مہینہ کے بعد آپ کو تکلیف دوں گا کہ آپ خود بھی دیکھ لیں" (علی حسن خاں ۱۵)

لیکن اس کے سولہ ہی دن کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور دل کی حسرت دل میں رہ گئی، تاہم مولانا نے دارالمصنفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ: "شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" (شروانی ۱۱۴) وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے اُن کے بعد ہی دارالمصنفین قائم ہوا، اور اب تک جس طرح چل رہا ہے اس کو ہر شخص بطور خود دیکھ سکتا ہے،

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ذاتِ نبویؐ سے عقیدت اُستاذ مرحوم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے بڑی شیفتگی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ اس نامِ نامی کے ساتھ اُن کی عقیدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی، یہاں تک کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں بظاہر اس حد سے بھی تجاوز کرتے ہیں، کہتے ہیں،

شیفتگانیم و پیمبر پرست[1] سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

[1] پرستیدن کے دو معنی ہیں، پوجنا اور خدمت کرنا، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی ہم خادم رسول ہیں، مگر شاعرانہ ابہام دوسرے غیر مقصود معنی کی طرف لیجاکر لطف پیدا کرتا ہے،

بدء الاسلام | انھوں نے علی گڈھ آکر نئی طرز پر جب تصنیفات کا آغاز کیا تو یہ آغاز بھی ذات مبارک کے ذکر خیر ہی سے فرمایا اور بدء الاسلام کے نام سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو علیگڈھ کے کالج کے نصاب میں داخل تھا،

سیرت کا ابتدائی خیال | اردو میں جب ناموران اسلام کا سلسلہ چھیڑا تو بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا ہے، اس لئے الفاروق و الغزالی کے بعد ۴ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۵ رجون ۱۹۰۳ء کو انھوں نے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں اس کام کا آغاز کیا، اور ۲۳ھ تک کے واقعات قلمبند کئے (یہ مسودہ اب تک دار المصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے) مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آرہا تھا، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا، اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق انھوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی سے نہیں کہا، صرف ایک خط میں اس کا تذکرہ اس بنا پر آگیا ہے، کہ حیدرآباد میں مولوی حسین عطاء اللہ صاحب کے پاس بہت اچھا کتبخانہ تھا، اس کتاب کے لئے ان کو بعض کتابوں کی ضرورت پیش آئی تو ۲۰ رمئی ۱۹۰۳ء کو ان کو لکھا: "میں نے جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنی شروع کی ہے، جو سعادت دارین کا ذریعہ ہے، اس کے لئے اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے، میرا کتب خانہ تمام وطن میں ہے" (مکاتیب اول طبع دوم صفحہ ۳۲۶)

لیکن اس پر بھی وہ غزوۂ خندق سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

اصل یہ ہے کہ ان کے ذہن میں اس زیر تجویز کتاب کا معیار بہت بلند تھا، اس سے کم کوئی

چیزان کے دل کو نہیں بھاتی تھی، فرماتے تھے کہ سوانحمری ایسی لکھنی چاہیئے جس سے صاحبِ سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے" غالباً ان کے اسی خیال کا عکس اُن کے اس قطعہ میں ہے، جس کو غالباً ۱۹۱۴ء میں نظم فرمایا تھا،

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم
دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے

صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے"

فرماتے تھے کہ نعت کے متعلق عرفی نے بالکل صحیح کہا ہے:۔

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا ست
آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیح کے و جم را

تالیفِ سیرت کا عزم | اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں، اور وہ ان کو سن کر چپ رہ جاتے تھے، لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیلتی جاتی تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جاتی تھی، اور یہ صورتِ حال ایسی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی اس ضرورت کے احساس کا آغاز ان کو سب سے پہلی دفعہ ۱۹۰۶ء میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے جب اُس سے ایک سال پہلے (۱۹۰۵ء) میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے محمدؐ کے نام سے سیرت میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی اور بڑی محنت سے لکھی اور اس خصوصیت کے ساتھ لکھی کہ اس میں اکثر حوالے احادیث کی کتابوں کے تھے

یہ کتاب بڑی زہرناک تھی اور انگریزی تعلیم یافتہ اس کی تحقیق و تلاش کے نتیجوں سے نہایت متاثر ہو رہے تھے، اور اس تاثر کا اظہار سب سے پہلے مولانا کے سامنے اسی نے کیا جو اس عہد میں جدید تعلیم کا سب سے مایۂ ناز فرزند گذرا ہے یعنی محمد علی مرحوم نے، مرحوم اس زمانہ میں بڑودہ کی ریاست میں ایک عہدہ پر ممتاز تھے گو وہ نئی تعلیم کے سب سے بہترین پیداوار تھے، تاہم اُن کا دل ہمیشہ سے مسلمان تھا، ۱۰ اگست ۱۹۱۸ء کو چھندواڑہ (سی پی) سے جہاں وہ نظربند تھے، مجھے ایک خط میں لکھا جو اُن کے مجموعۂ خطوط میں چھپ گیا ہے، اور جو حسب ذیل ہے،

"۱۹۰۶ء میں مولانا و اُستاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے، اور میرے ہی پاس مقیم تھے .... اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمائیے کہ سیرۃ نبوی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے، ہندوستان میں کون ہے جو کفار کے پے در پے مگر بیجا سے بیجا تر حملوں کا جواب دیگا، خصوصاً اپنے اوکسفورڈ کے ..... استاد مار گولیوتھ کی طرف اشارہ تھا ..... نہ معلوم اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا، مگر طرز گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا، اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا گیا" (خطوط محمد علی مکتبۂ جامعہ ص ۵۹)

بہرحال جدید تعلیم کی اس ضرورت کے ساتھ اس کے بعد ہی ارتداد وغیرہ کے جو ہنگامے شروع ہوئے اور اشاعت و حفاظت اسلام کی جو تدبیریں اُن کے سامنے آتی رہیں، ان سب نے مل کر سیرت نبوی کی تالیف کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادہ نے عزم کی صورت اختیار کرلی، چنانچہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا، اسی اعلان میں جو اسی ماہ و سال کے الندوہ میں چھپا ہے اس کو بھی واضح کر دیا

ہے کہ ان کو اس ضرورت کا احساس کیوں ہوا، فرماتے ہیں :۔ سیرت نبویؐ کی ضرورت اس لحاظ سے اور
بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے، اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت
کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب
نہیں ملتی۔ اس لئے اس کو چارناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن میں یا تعصب کی
رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں"۔ . . . . . . میں ایک مدت سے ان
باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔ . . . . قوم کی طرف
سے ایک مدت سے تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبویؐ کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود
میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں، اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں" (مقالاتِ شبلی جلد ۲ ص ۲)

اب مصنف نے احادیث وسیر کا مطالعہ شروع کیا، اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا، نظر
میں وسعت، دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی، سیرت کے جو اوراق انھوں نے
۱۹۰۳ء میں لکھے تھے اُن کو ۱۹۱۳ء والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب
صرف دماغ سے اور دوسری دل سے لکھی گئی ہے، نقشِ اوّل میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور
نقشِ ثانی میں جو سراپا کھینچا گیا ہے، اس میں مورخ کے ساتھ محدث کی قلم کاری بھی شامل ہے،

ہمارے دوست اور رفیقِ درس اور مولانا کے عزیز شاگرد مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی
ندوی (ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) نے الندوہ کے سلسلۂ جدید میں "یادِ ایام" کے نام سے جو
مسلسل مضمون لکھا ہے، اسی میں اس موقع پر لکھتے ہیں :۔ "علی گڈھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا، یہ

وہ ۔۔۔ ہے کہ ندوہ میں اسٹرائک ہوچکی ہے، مولویوں نے قبضہ کرلیا ہے، ایک آنکھ میں نزول ماء شروع ہوگیا ہے
اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں، قلق ہوتا ہے، ان کی معذوری پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ اب وقت اس قسم کے
ہیجان برداشت کرنے کا نہیں ہے، عقیدتمند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اس وقت
تک آپ نے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی، مگر اب مخلصین لہ الدین کا وقت ہے، الامر
بالخواتیم، استاذ علامہ بحیین ہو جاتے ہیں، استاد شاگرد آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ استاد فرطِ محبت سے شاگرد
کو پیٹا لیتا ہے، اور پھر دو باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں، علوم القرآن اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم، شاگرد
عرض کرتا ہے کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہے، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہئے تھا، پھر ہندوستان میں اس کا
مخاطب کون ہے، اردو میں اس کو دلچسپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہے، جو آپ کے سن وسال و قویٰ
کے مناسب حال نہیں، آخر میں سیرت ہی پر تخیتم ہو جاتی ہے۔ دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودۂ اعلان یا اپیل
تیار تھا، مجھے دکھایا پھر طباعت کو بھیج دیا۔ کچھ خدمت مواد کے متعلق سپرد ہو جاتی ہے جس کی تعمیل بمشورۂ
ڈاکٹر ہارو ویز کرکے بھیجدی گئی، مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ محض صحیح واقعات اور عمدہ
ترتیب پر مبنی ہونی چاہئے، مولوی کچھ سمجھیں، انما الاعمال بالنیات۔ یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کمی نہ تھی
علم و فہم میں کیا کسر تھی۔ قبولیت کیوں حاصل نہ ہوتی، عشقِ رسول کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔"

مجلس تالیف سیرت | بہرحال جیسا کہ ابھی گذرا ۱۹۱۲ء کی شروع تاریخیں تھیں کہ اُن کے ارادہ نے عزم

لہ مضمون نگار کو واقعہ کی صحیح تاریخ میں کچھ تشابہ ہوگیا ہے۔ ندوہ کی اسٹرائک کا واقعہ اس کے دو سال بعد مارچ ۱۹۱۴ء میں پیش آیا، اور سیرت کی تالیف کا اعلان جنوری ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، بہرحال اختلافات شروع ہوچکے تھے، اور مولانا بددل ہو رہے تھے، جس کا آخر نتیجہ اسٹرائک تھا، (س)

کی صورت اختیار کرلی۔ ۲ جنوری ۱۹۱۲ء کو مولنا شروانی کو لکھا: "سیرۃ نبوی کا شروع سال سے عزم ہے لیکن پچاس ہزار سرمایہ کی ضرورت ہے کیا قوم سے یہ اُمید ہو سکتی ہے" (شروانی ۹۰) مگر اس عزم نے چند ہی روز میں یہ شدت اختیار کی کہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں سیرۃ نبوی کی تالیف کا برملا اعلان کر دیا اور قوم سے اسکے ماہانہ مصارف کے لئے ڈھائی سو ماہوار اور خرید کتب کے لئے کچھ اور نقد روپیہ کی درخواست کی، اور تجویز پیش کی کہ "مجلس تالیف سیرۃ نبوی" کے نام سے ایک مجلس قائم کی جائے جس میں وہ ارکان شامل ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپیہ ماہوار دیں۔ یا جو عام ارکان میں داخل ہو کر ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں یا معین نہیں اور نایاب وقلمی کتابیں بہم پہنچائیں، یا اور کسی مفید طریقہ سے مدد دیں، تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں، اُن کو یکجا کیا جا سکے، اور کچھ مترجم ہوں جو اُن کو پڑھ کر اُن کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں، اور کچھ علما ہوں جو روایات کی تلاش وتنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں، جو مسودوں کو صاف کریں۔

سرکار عالیہ بھوپال کی امداد اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا، اور فال نیک یہ کہ سب سے پہلے ایک مسلمان خاتون بنت نصیر الدین حیدر یہ تیموریہ (حیدر آباد دکن) کا خط اشاعت کے قابل ٹھہرا جس کو مولانا نے اپریل ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں شائع کیا، یہ قدرت الٰہی کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کام کے لئے دانہ دانہ چننے، اور کوڑی کوڑی بٹورنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ کوئی مخدومہ جہاں خود آگے بڑھ کر روپیوں کی تھیلی سامنے رکھدیگی۔ چنانچہ یہی ہوا، منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے، سرکار سے عرض کیا کہ "حضور! آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے، آپ

اس کو پڑھ کر کیوں انھا نہیں لیتیں، یعنی ایک عاشقِ رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرۃ نبوی کی تصنیف کے لئے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے، یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں، اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں، کہ وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے" یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی، انھوں نے اس حصولِ سعادت کی رضامندی ظاہر کی، منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا، اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں اُن سے باقاعدہ درخواست منگوائی گئی، جو ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لئے دوسو ماہوار کے حساب سے منظور ہوئی، مولانا نے مئی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں بڑی مسرت سے اس کا اظہار کیا:" مجلس تالیفِ سیرت نبوی کے لئے چندوں کے وصول کرنے کی جن مختلف تدابیر کا اعلان کیا گیا تھا، ایک زبیدۂ وقت کی فیاضی نے اُن سب کو منسوخ کر دیا، عام مسلمانوں کو سیرت نبوی کے ساتھ جس شدت سے شغف اور اعتنا ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اعلان کے بعد مجالس قومی نے، جدید تعلیم کے افرادِ عالیہ نے، قدیم تعلیمیافتہ اشخاص نے، روسائے ملک نے، عام مسلمانوں نے، اور نہ صرف جنس رجال نے بلکہ جنس اناث نے بھی نہایت جوش کے ساتھ مالی، علمی، اور عام امداد کے لئے آمادگی ظاہر کی، بعض لوگوں نے بلا طلب چندے بھی بھیجنا شروع کر دیئے، لیکن عدم ضرورت کی بنا پر واپس کئے گئے، بعضوں نے اصراراً بھیجے، لیکن پھر واپس کئے گئے، یہ دلائل ہیں ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُس غیر فانی عقیدتمندی کے جس کو مسلمانوں کے سینوں سے نہ تعلیم جدید محو کر سکتی ہے اور نہ مغربی بے اعتنائی کے قوی اثرات اس کو مٹا سکتے ہیں؛"

کتابوں کی خریداری کے لئے دو ہزار روپیے نواب زادہ حمیداللہ خاں موجودہ اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کی طرف سے منظور ہوئے،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہو کر مولانا نے سیرۃ نبویؐ کا دفتر قائم کیا، ایک عربی کا مددگار اور دو انگریزی کے مترجم رکھے، عربی کے مددگار کے عہدہ پر انھوں نے اپنی شفقت سے خاکسار کو منتخب فرمایا، اور صیغۂ تعلیم سے ہٹا کر سیرت کے اسٹاف میں لے لیا، اور یہ خدمت سپرد ہوئی کہ صحیح بخاری سے سیرۃ کے واقعات کو یکجا کروں اور انگریزی مترجموں میں سے ایک کو پروفیسر مارگولیوس کی کتاب محمد اور دوسرے کو سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمد ترجمہ کے لئے دی گئی لیکن خود مولانا اشاعت اسلام وغیرہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے کام جلد شروع نہ کر سکے۔ ۷ اپریل ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: ”ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی لیکن اب قبول کرتے ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں۔

میں آج کانپور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، لیکن چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے بھوپال آؤنگا، پھر بنگلور یا بمبئی جاؤں گا، کتابیں ساتھ نہیں جاسکتیں، نہ اسٹاف ساتھ جاسکتا ہے، اس لئے سیرۃ نبوی کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پاسکتا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لئے جلدی بھی کرتا ہوں کہ کچھ کرلوں، ورنہ جس قدر میں کرسکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا، کتابوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے، بہت سی کتابیں تو خود ندوہ میں موجود ہیں، زائد جو مطلوب ہیں ان کو منگوانا ہے، اشاعت کی فکر نہ کیجئے، میں خود کرسکتا ہوں“ (۷)

لکھنؤ میں رہ کر ان کو سکون نہیں ملتا تھا، اس لئے سیرۃ کی تالیف کی خاطر بمبئی کے کسی ایک

گوشہ میں بیٹھ کر عزلت گزیں ہونا چاہا، منشی صاحب کو ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو لکھا: "میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت کو ختم کر دوں، یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے، اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسٹاف ساتھ لیجاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوشنویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی" (۹)

مئی کے آخر میں بمبئی جاتے ہوئے مولانا بھوپال اترے، اور حضور عالیہ نے شرف ملاقات بخشا، مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کا جو اُن دنوں بھوپال میں تھے، بیان ہے کہ مولانا نے اسی موقع پر اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا،

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی	مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ	خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکار عالیہ اس کو سن کر بیحد متاثر ہوئیں، اور مصنف کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی،

سرکار بھوپال سے سیرت کی امداد کا اجرا صرف دو برس کے لئے ہوا تھا، یہ زمانہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی اہم کتاب کے لئے بہت ہی کم تھا، چنانچہ ۲، نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا: "میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کر دیں، لیکن اب روپے کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں میں کام جاری رکھوں گا، اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی" (۱۲)

دو برس تمام ہوتے ہوتے سرکار عالیہ نے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنی امداد کی مدت تا تکمیل بڑھا دی، اس سے خوش ہو کر مولانا نے قطعہ کہا، جس کو ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کے خط میں لکھ کر بھوپال بھیجا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بایں صورت　　کہ ابر فیض سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی　　تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

مولانا کا خیال تھا کہ سرکار عالیہ کی یہ امداد اس سلسلہ کی دوسری تالیفات کے لئے ہمیشہ جاری رہے تو بڑے کام نکلیں، چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۱۴ء کو منشی صاحب موصوف کو لکھا: "سیرت کی رقم بھی مستقل ہو جاتی تو بہت اچھا تھا، اس مد کی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم رہتا، کانوں میں بھنک تو ڈال دیجئے، یہ وسیع سلسلہ ہے، مثلاً سیرۃ الصحابہؓ، سیرۃ ازواج پیغمبر علیہ السلام وغیرہ وغیرہ"

عجیب بات ہے کہ مولانا اور سرکار عالیہ کی وفات کے بعد اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں کے عہد میں مولانا کی یہ آرزو تکمیل کو پہنچ گئی، سرکاری امداد مستقل ہو گئی، اور سیر الصحابہؓ وغیرہ بھی دس بارہ جلدوں میں لکھ کر پوری کر دی گئی،

تالیف سیرۃ کا آغاز سیرۃ کی تالیف کا آغاز باب کعبہ یعنی ممبئی میں بیٹھ کر کیا گیا، یعنی وہیں قلم نے سیرۃ کی پہلی سطریں لکھیں، آغاز کا زمانہ بھی معلوم ہے۔ ۱۶ جون ۱۹۱۲ء کو لکھتے ہیں:- "ابھی تک میں نے لائف کا کچھ کام نہیں کیا، طبیعت مطمئن نہیں، کل اب کام شروع کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر وہاں کتبخانہ میں تفسیر فتح البیان مع تفسیر ابن کثیر موجود ہو تو ضرور لیتے آئیگا، یہاں نہیں ہے، اور میں ساتھ نہیں لایا، سید سلیمان آ گئے" (امین ۔ ۱۰)

مولانا نے مجھے اس لئے بلایا کہ میں انہیں روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق

میں مدد دوں، یہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ بمبئی میں سیرت کے آغاز کا مقدس کام کس مکان میں ہوا،
کھڑا پارسی کے پاس "پالن جی ہوٹل نامی ایک مکان تھا اس کے اوپر کے ایک کمرہ میں مولانا
مقیم تھے، اور خاکسار بھی اسی عمارت کے دوسرے گوشہ کے ایک دوسرے بالائی کمرہ میں ٹھہرایا
گیا تھا، اس سڑک کی خصوصیت یہ تھی کہ ادھر سے ٹریم نہیں گذرتی تھی، اور مکان بھی سڑک
سے فاصلہ پر تھا، اس لئے بمبئی کے عام شور و غل سے یہ محفوظ تھا اور یہی اس کے انتخاب کی
وجہ ترجیح تھی،

مولانا نے بڑے روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ کتاب کا آغاز کیا، ابھی چند ہی صفحے لکھنے
پائے تھے کہ سفر ڈھاکہ کی ضرورت پیش آگئی، سفر کا باعث ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت
تھی، مگر اس کا ثانوی مقصود کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا تھا،
۲۱ر جولائی ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں :- "سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض
کتابیں بھی دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افترا کا عجب
منظر سامنے آجاتا ہے، مرگولیس پروفیسر آکسفورڈ سب سے بڑا عربی عالم ہے، اس کی لائف آف محمدؐ دیکھنے کے
قابل ہے، لکھتا ہے کہ عبدالمطلب، مطلب کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت صلعم سے صرف سو برس پہلے کی عمارت تھی،
وغیرہ وغیرہ" کام ہو رہا ہے، سیرت کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، اُن کے
تمام رواۃ کا استقصا کر کے ان کا اسماء الرجال، تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں، کہ روایتوں کے انتقاد
میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں، اور وہ یہیں ہیں خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی
کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے" (شروانی ۱۰۲)

وہ اگست کے شروع ہفتہ میں کلکتہ ہوکر ڈھاکہ گئے، (عبدالقادر ۲۵) اور پھر اُسی طرف سے کلکتہ میں کتابیں دیکھ کر بمبئی واپس آگئے، اس وقت تک انگریزی میں سیرت کی بہت سی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا، اگرچہ لائق گریجوایٹ اُن سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے، پھر بھی ان ساری کتابوں کے ترجمہ کے لئے بڑی محنت اور بڑا سرمایہ درکار تھا، اس لیے یہ تجویز کیا کہ اپنے دوستوں میں سے اُن اصحاب کو جو انگریزی جانتے ہیں ایک ایک دو دو کتابیں بانٹ دیں، اور اُن سے خواہش کریں کہ وہ ان کو پڑھ کر قابلِ اعتراض مقامات پر نشان لگادیں، چنانچہ اسی تجویز کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۱۲ء کو ان اصحاب کے نام خطوط جاری کئے جن میں سے مولانا شروانی اور شیخ عبدالقادر صاحب کے نام خطوط مکاتیب میں درج ہیں، (شروانی ۱۰۲ عبدالقادر ۱۸) جن صاحبوں نے اس خدمت کو قبول کیا اُن کے پاس کتابیں بھیجدیں، اور انھوں نے اُن کو دیکھ کر واپس کیا ستمبر ۱۹۱۲ء تک مولانا بمبئی میں رہے، اس اثنا میں ولادتِ باسعادت سے لیکر خانہ کعبہ کی تعمیر کے باب تک لکھا جاچکا تھا کہ جنازۂ سفر نے ہندوستان کا رُخ کیا یعنی مولانا وقف وغیرہ کے کاموں کے سبب سے لکھنؤ واپس چلے آئے، تاہم اس وقت تک کتاب کے سو صفحے ہو چکے تھے، ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء تک اُن پر نظرِ ثانی ہوئی اور مضامین میں حذف واضافہ ہوا، اسی تاریخ میں لکھتے ہیں :- "سیرۃ کے سو صفحے ہوچکے تھے، لیکن نظرِ ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہوگیا، یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لئے سیکڑوں اوراق اُلٹنے پڑتے ہیں، یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں، لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں"[1] (مہدی ۱۲)

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۳۳ (طبع اول) تک،

فروری ۱۹۱۳ء میں وہ بدر تک پہنچے تھے۔ (عبدالباری ۲۰) لیکن اپنی ناسازی طبع کے سبب سے اُن کے دل میں یہ خیال کانٹا سا کھٹکتا تھا کہ وہ اس کی تکمیل اس حالت میں کر سکینگے یا نہیں، یکم مارچ ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں:- "سیرۃ چل رہی ہے، اب نظر آتا ہے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کر سکوں گا یا نہیں (عبدالباری) بایں ہمہ ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو سیرۃ کا سادہ مسودہ فتح مکہ و حنین تک پہنچ چکا تھا" (عبدالباری ۴)

پہلا حصہ | اس زمانہ میں ندوہ کے کاموں میں بہت سے الجھاوے پڑ گئے، جن میں سب سے اہم مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا مسئلہ تھا جس پر اخباروں میں بڑی بحثیں رہیں، اس لئے جون ۱۹۱۳ء میں وہ تنہائی اور دماغی سکون کی خاطر پھر بمبئی چلے گئے، اس سفر میں میرے بجائے مددگار عربی کی حیثیت سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اُن کے ساتھ تھے، اس دفعہ وہ نیو ناگپاڑہ روڈ بائی کلہ کبر بلڈنگ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے، اور سیرت جلد اوّل کی تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، بلکہ دارالعلوم کی معتمدی سے بھی استعفا دیدیا، تاکہ دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دماغ کو پوری یکسوئی حاصل ہو[1]، ۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو شروانی صاحب کو لکھا:- "پہلی جلد کا نصف حصہ گویا تیار ہے، ہر ہفتہ میں طبیعت دو تین روز ناساز ہو جاتی ہے، اس لئے ناغہ سو ہرج ہو جاتا ہے، بڑے بڑے معرکے طے ہوئے، اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی، مجھ کو خود خیال تھا کہ ایسی کامیابی ہو گی، لیکن قدر کون کرے گا، کوئی شخص پہلے طبری و ابن الاثیر کو چھان چکا ہو تب اندازہ کر سکتا ہے" (شروانی ۱۰۰)

اس پر بھی کام اس محنت سے کیا، کہ ۲۴ اگست ۱۹۱۳ء کو اندازہ تھا کہ دو تین مہینہ میں

[1] ۱۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو سید عبدالحکیم صاحب دسنوی کو لکھتے ہیں: "بہرحال اب تو ایک دو برس ..... نجات نہیں اور دربار رسالت کا آستانہ ہوگا۔" (۳)

سیرت کا پہلا حصہ تمام ہو کر مطبع چلا جائے گا، (شروانی ۱۱۰) اسی لئے وہ بمبئی سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے اُن سے کلکتہ آنے کی فرمایش کی، تو ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء کو انھیں لکھا: "کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں سیرت کے لئے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں لئے پھروں، یہاں سورتی[1] سے استغناءً کو بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اس پر بھی بہت سی خریدنی پڑیں، ایک کافی ذخیرہ ساتھ آیا تھا، پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے، چونکہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے، اس لئے اب ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے" (ابوالکلام ۳۶)

اس بنا پر اس دفعہ بمبئی میں چار، پانچ مہینے جم کر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شروع میں جس طرح بنا سیرت کے پہلے حصہ کا مسودہ قریب قریب پورا کر لیا، اور ادھر سے یک گونہ اطمینان پا کر نواب عمادالملک کی خواہش پر حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا: "کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالاتِ زندگی ہیں قریبًا تیار ہو گیا ہے، اگرچہ اس میں بھی نہایت کدو کاوش اور تمام کتبِ حدیث و رجال کی چھان بین کرنی پڑی، تاہم اصلی مرحلے آگے ہیں، کتاب پانچ جلدوں میں ہوگی، جو حصہ گویا تیار ہے وہ قریبًا پانچ سو صفحوں میں ہے، پوری کتاب کو اس کا چوگنا کر لیجئے (امین ۱۸)

حیدرآباد میں اُن کو ایک نہایت پُر فضا مکان مل گیا، اس لئے وہاں کئی مہینے رہے (ابوالکلام ۳۹) یہاں طبیعت بھی فی الجملہ صحیح رہی، اور ارادہ فرمایا کہ جلد اول تمام کر کے یہاں سے اُٹھیں، وہاں کا کتب خانہ بھی اُن کے اس قیام میں معین رہا، (امین ۱۹) تاہم نومبر ۱۹۱۳ء تک سیرت کا پہلا

[1] ابنائے غلام رسول سورتی تاجرین کتب بمبئی،

دیباچہ سپرد قلم نہیں فرمایا، ہنوز اُس کا خاکہ اُن کے ذہن ہی میں تھا، (امین ۱۸) ۱۷، نومبر ۱۹۱۳ء تک اُن کی یہ خواہش تھی کہ وہیں چار پانچ مہینے رہ کر پہلی جلد تمام کرکے اٹھیں (عبدالماجد ۳۸) اسی لئے مولوی عبدالماجد صاحب (دریابادی) سے خواہش کی کہ وہ چند روز کے لئے سیرۃ کے انگریزی دفتر کی نگرانی قبول کریں تو پہلی جلد نکل جائے، کیونکہ معلوم نہیں کہ یورپ کے بیشمار ذخیرہ میں کیا کیا چیزیں لینے کے قابل ہیں، اور عام مترجم یہ نہیں بتا سکتے (عبدالماجد ۳۸) مولوی صاحب نے اس عہدہ کو قبول فرمایا، اور کئی مہینے تک لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتے رہے،

دسمبر کے شروع میں ہم لوگوں کے اصرار سے مولانا حیدرآباد سے لکھنؤ آئے، اور چاہا کہ یہاں بھی سکون نصیب ہو کہ کم از کم پہلی جلد اتمام کو پہنچے، (۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء بنام شروانی صاحب ۱۱۱) لیکن اُن کے استعفٰی کی وجہ سے طلبہ اور مدرسین میں ایک ہیجان برپا تھا جس کا نتیجہ طلبہ کی اسٹرائک میں جاکر نکلا، اور کئی مہینے اُس کے ادھیڑبن میں گذر گئے، آخر مئی ۱۹۱۴ء میں اصلاحِ ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہوا، اور اصلاحِ ندوہ کی بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اور جون ۱۹۱۴ء کے شروع تک وہ دہلی میں مصروفِ کار رہے، مگر ان جھمیلوں میں بھی جن میں ہر روز اُن کی تشویشِ خاطر کی ایک نئی صورت پیش آتی رہتی تھی وہ سیرت سے غافل نہ رہے، جیوں ہی اُن کو ذرا چھٹی ملی، وہ جون کے وسط میں بمبئی روانہ ہوگئے، بھائی کلہ اکبر بلڈنگ میں قیام ہوا، اور سکون کے ساتھ پہلی جلد کو ہر جہت سے مکمل کرنے لگے، اور اب کتاب کی پہلی جلد اس حیثیت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی چھپائی کے مشورے بھی ہونے لگے، اسی درمیان میں سیرت کا وہ مقدمہ جو فنِ مغازی وسیر کی تاریخ اور اسلامی فنِ روایت کے اصول پر ہے مرتب فرمایا،

ایک فتنہ مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوشنما ٹائپ میں چھپے، مولانا نے نمونہ کے طور پر چھاپنے کے لئے اس مقدمہ کو اُنکے پاس الہلال پریس کلکتہ بھیجدیا، مولانا ابوالکلام نے اس مقدمہ کو الہلال میں بھی چھاپ دیا، تاکہ اہلِ نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے، لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی، کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۂ نبوی لکھی جائے وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے، کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کریں، یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب اڈیٹر "النجم" نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی، مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا لیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا، اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ تک پہنچائی گئی، انھوں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت فرمائی، اور اس کے جواب لکھنے کی فرمایش کی، بلکہ خود مولانا کو بھوپال آنے کا اشارہ فرمایا، مولانا نے منشی محمد امین صاحب کو لکھا کہ "نہایت مہمل و رکیک اعتراضات ہیں" جواب کے متعلق لکھا کہ وہ لکھ دیا جائے گا، لیکن میرے نام سے نہیں چھپے گا، نہ اظہارِ حقیقت ہی، نہ اظہارِ نام" وہ یا تو رسالہ کی صورت میں چھپے، یا الہلال میں بھیجدیا جائے[1] آخر میں لکھا: "میں بارش کے قبل نہیں آسکتا، بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لئے آجاؤں، لیکن گو اسی درجہ کے لوگوں کے لکھنے پر میری دار و گیر ہوتی رہیگی تو میں سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہو جاؤں" (امین)

سرکاری مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ "سرکارِ عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اُس کے پاس بھیجدیا جائے" اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل کے صفحہ ۵ پر جو بڑا حاشیہ ہے وہ اسی جواب کا ایک حصّہ ہے،

نام اس کام کے لئے تجویز فرمایا، چنانچہ مولانا نے مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ذریعہ سے اپنی خواہش پیش کی، اور ساتھ ہی اپنا مسودہ بھی مولانا سندھی کے پاس بھیجدیا، کہ وہ اُن کو لے کر مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں جائیں، لیکن اس تجویز کا جو حشر ہوا وہ ان ہی کی زبان سے سنیئے "آج ان کا (مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کا) خط آیا کہ وہ گئے، لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودہ کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ الگ ہیں، چنانچہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو اُن لوگوں نے کافر بنایا، لیکن مولوی محمود حسن صاحب کے تعلقات اب تک ان سے وہی ہیں، بہرحال اب غور کرنا چاہئے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے اس لئے سردست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگا ورنہ سمجھیگا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا،

اب اگر معاملہ اس پر موقوف ہے تو مجھ کو وظیفۂ بھوپال سے خود دست بردار ہوجانا چاہئے، اخبارات میں تو یہ پہلے ہی شائع ہو چکا ہے، کوئی نئی بات نہیں، میں بھی کشمکش سے نجات پا جاؤں گا، اور کتاب کو مطبع میں بھیجدوں گا،

میں جانتا ہوں کہ سرکار کو بھی مولویوں کے بدنام کرنے کا لحاظ ہوگا، اور ہونا چاہئے، اب اگر سرکار چاہیں تو یا تو سرے سے اس رقم کو بند کردیں یا دار المصنفین کی طرف منتقل کردیں، یا جو اُن کی مرضی ہو، مجھ کو ہر حال میں اُن کی رضامندی منظور رہے، یہ معلوم ہے کہ میرا کام رُک نہیں سکتا، میں خود مصارف کا متکفل ہو سکتا ہوں، اس کے علاوہ جس ریاست سے خواہش کروں اعانت کے لئے

تیار ہوگی، جواب جلد عنایت ہو، ورنہ اسٹاف کا خرچ ابھی سے کم کر دینا ہوگا۔" (امین - ۲۹)

فتنہ کی ناکامی چنانچہ اس کارروائی سے جو بالکل صاف تھی سرکار عالیہ نے سمجھ لیا کہ یہ چند مولویوں کی محض معاندانہ باتیں ہیں، منشی محمد امین صاحب نے اس کی اطلاع مولانا کو دی، مولانا نے اُسکے جواب میں ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو لکھا:۔"آپ کا خط پہنچا اطمینان ہوا میں جس تحقیق و تدقیق سے سیرت لکھ رہا ہوں، ناممکن تھا کہ مولوی محمود حسن صاحب اس کو دیکھتے اور تحسین نہ کرتے، لیکن مخالفوں نے اُن کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرے سے دیکھنے ہی سے انکار کردیں، البتہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی مسودہ دیکھ رہے ہیں، اُن کی رائے آجائے گی تو بھیجدوں گا، مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی پر اگر اطمینان ہو تو ان کے پاس بھیجدوں یا جو مصلحت ہو، یا یہ صورت ہے کہ سر دست اس قصہ ہی کو خاموش چھوڑ دیا جائے۔ (۳۰)

اس پریشان خاطری کے باوجود سیرت کا کام بدستور جاری تھا، ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔"تسلیم! سیرت کی اتمام کے لئے یہیں (بمبئی) کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لئے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اوّل بہمہ جہت تمام کرکے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے، اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ . . . خوشنویس (کاپی نویس) کو یہیں بلوالیا ہے، ایک خاص دراندازی[1] کی وجہ سے دیر ہوگئی، ورنہ مسودہ مطبع میں جاچکا ہوتا، ریاست پر زور ڈالا جارہا ہے کہ سیرت چھپنے نہ پائے۔" (شروانی ۱۱۸)

منشی محمد امین کو یہ بھی لکھا کہ اس دفعہ بمبئی میں پورے سال بھر قیام کا ارادہ ہے، بمبئی میں سارا دن کام کے لئے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لئے برس دن یہاں سے ہلنے کا ارادہ نہیں (ایضاً)

---

[1] بھوپال میں معاندین کی کارروائیوں کی طرف اشارہ ہے۔

سیرۃ کی ناتمامی کا داغ لیکن آہ: ع ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال، اس عزم پر ایک ہفتہ بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ جولائی کے تیسرے عشرہ میں ان کو الہ آباد میں اپنے بھائی کی شدید علالت کی اطلاع ملی، اور فوراً ہی وہ الہ آباد روانہ ہوگئے، بھائی نے ۵ اگست ۱۹۱۴ء کو وفات پائی، اور وہ دل شکستگی کے ساتھ گھر (اعظم گڈہ) واپس آئے، ۲۰ اگست ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب کو اپنے وطن واپس آنے کی خبر ان لفظوں میں دیتے ہیں، "آخر ساری دنیا لٹا کے گھر میں آیا" (۱۹) لیکن اس عالم میں بھی سیرت کا خیال دل میں بسا تھا، ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں۔ "میں اب بالکل دل شکستہ ہوگیا ہوں، برادرم اسحاق کی موت نے دل بٹھا دیا . . . [1] . . . سیرت کا کام جاری ہے گویا تاخیر طبع سے طبیعت اچھی طرح آگے نہیں بڑھتی"۔ (امین ۳۱)

سیرت کے ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنھوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے، جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جابجا ہے، اسی سلسلہ میں ان کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کس حسرت سے لکھتے ہیں۔ "افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے"۔

[1] یہاں بعض نجی ذکر ہے۔

وفات

۱۳۳۲ھ
۱۹۱۴ء

خرابیِ صحت مولانا اگرچہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں بڑے قوی و توانا تھے، لیکن علی گڈہ کے زمانہ قیام میں یہاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت و توانائی پر نہایت مضر پڑا، اور معدہ کی مختلف

شکایتیں مثلاً قبض، تبخیر وغیرہ پیدا ہوگئیں، جو اخیر عمر تک قائم رہیں، سفرِ کشمیر کے بعد علالت سخت کا سلسلہ جو برسوں قائم رہا، اس نے اُن کو اور بھی ضعیف و ناتواں کر دیا، چلنے پھرنے سے معدہ کو جو فائدہ پہنچتا تھا، واقعۂ شکستِ پا کے بعد اُس سے بھی محروم ہوگئے، اس لئے معدہ کی شکایتوں میں اور بھی اضافہ ہوا، لکھنؤ کی آب وہوا نے ان شکایتوں کو اور بھی المضاعف کر دیا، اور پیچش اور اسہال کے دورے پڑنے لگے، اور حکیم عبدالولی صاحب لکھنوی اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کے علاج و تدبیر سے افاقہ ہوتا رہا، ان ہی شکایتوں کی بنا پر اخیر عمر میں تبدیلِ آب وہوا کے لئے بمبئی کو پسند کیا تھا، وہاں ہر سال موسمِ گرما میں جا کر چند مہینے قیام کرتے تھے، اور وہاں کی آب وہوا کا اثر اُن کی صحت پر نہایت عمدہ پڑتا تھا، چنانچہ ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "یہاں (بمبئی میں) بلا مبالغہ وہاں (لکھنؤ) کی بہ نسبت دو فی غذا ہے، دعوتوں میں ثقیل غذائیں کھالیتا ہوں کہ لکھنؤ میں وہ مہینوں کی بیماری کے لئے کافی ہیں، یہاں صرف ایک آدھ وقت کا غرّہ کر دینا کافی ہو جاتا ہے۔" (حمید)

لیکن بایں ہمہ وہاں کی آب وہوا کا اثر بھی اُن کی صحت میں کوئی ایسا نمایاں تغیر نہیں پیدا کر سکتا تھا، کہ ان کو صحیح و تندرست کہا جا سکتا، اسی مہینہ اس سے ایک ہفتہ پہلے یکم ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ہاں نسبتہً بہت اچھا ہوں، دوگنی بلکہ چوگنی ترقی ہوئی ہے، تاہم صرف ایک وقت کی غذا رہ گئی ہے، اور وہ بھی دو توس۔" (سمیع ۵۷)

غرض پیچش و اسہال کے جو دورے اکثر پڑا کرتے تھے انھوں نے مولانا کو زندگی سے بہت کچھ مایوس کر دیا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء ہی میں جب لکھنؤ میں اسہال کا دورہ پڑا، اور اس سے صحتیاب ہو کر بمبئی تشریف لے گئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ساتھ تھے، چونکہ ضعف سے خود خطوط

کا جواب نہیں لکھ سکتے تھے، اس لئے وہ اس فرض کو انجام دیتے تھے۔ اسی حالتِ مایوسی میں ایک دوست کو خط میں لکھوایا کہ "اب اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے، اس لئے سال دو سال سے زیادہ جینے کی توقع نہیں" بہرحال وفات سے چند سال پیشتر صرف ایک حباب تھے جو ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ سکتا تھا، چنانچہ ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب کو ۱۰ رجون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں :- "اب لمبئی کے قابل بھی نہیں رہا، یعنی دن بھر دروازے بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا خنک ہو گئی ہے تو اس کی برداشت نہیں ہو سکتی، ایک مرتبہ صرف ذی بے احتیاطی سے بخار آچکا، بھائی تیل تمام ہو چکا بخدا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، غذا ۲۴ گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر، بات کرنا گراں ہوتا ہے، حالانکہ بخار وغیرہ کی کچھ شکایت نہیں" (عبدالباری ۔ ۵)

لیکن بایں ہمہ ضعف و علالت دل و دماغ صحیح تھے، اس لئے دل میں طرح طرح کے علمی مذاق، قومی اور مذہبی ولولے پیدا ہوتے تھے، اور جن کاموں کی تکمیل کا ارادہ کر چکے تھے، اس سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے، لیکن مولوی اسحاق مرحوم کی وفات نے دل و دماغ کو بھی ماؤف کر دیا، اگرچہ اس حالت میں بھی اُن کا دماغ علمی تخیلات سے خالی نہ تھا، تاہم اب وہ اپنی زندگی سے کلیتہً مایوس ہو چکے تھے، اور ہر کام کے لئے اپنا جانشین ڈھونڈتے تھے، چنانچہ مرض الموت سے تقریباً ایک مہینہ پہلے مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کے نام ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو جو خط لکھا ہے اس سے اس مایوسی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے "دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظامِ جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سخت سردی لگی، حالانکہ دوپہر کا وقت ہے،

افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے،

اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا، آج سید سلیمان آئینگے اور کل پرسوں چند طلبہ تکمیل، لیکن

بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے"۔

اسی زمانہ میں عید اضحیٰ کی تقریب سے ۱۰ ذی الحجہ کو اپنے وطن بندول تشریف لے گئے، وہاں سے

دوسرے دن پلٹ کر آئے تو اپنے قدیم مرض اسہال و پیچش میں مبتلا ہوئے،

یہ نومبر کی ۶ تاریخ تھی، تین دن تک پیچش اور بواسیر کا دورہ رہا، ضلع کے اسسٹنٹ سرجن کا

علاج رہا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا، چوتھے دن لوگوں نے طبی علاج شروع کیا، شہر کے طبیب نے پیچش کا

معمولی نسخہ استعمال کرایا، نسخہ کے استعمال سے اس دن ۵۰-۶۰ دست آگئے، اور ایک بار اس

قدر خون آیا کہ طشت کا تین ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے

بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا،

جب حالت نازک ہوگئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبدالولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ

تار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آسکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبدالولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے اور

اسی بیماری میں انھوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انھوں نے نسخہ

اور تجویز بتا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب کو بھیجا، مگر افسوس وہ اس وقت پہنچے جب

بیمار "افاقۃ الموت" پا چکا تھا،

مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہو چکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی اسی وقت سیرۂ نبوی

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام مسودے اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرا دیئے، اور

عزیزوں کو جو تیمارداری میں تھے یہ وصیت فرمائی کہ "یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں"۔ اس پر بھی سیرت کی ناتمامی کا داغ اُن کے دل کو رہ رہ کر بے چین کر رہا تھا، آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو حیدر آباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ، کلکتہ اور دیسنہ[1] کے پتہ سے تار دیے، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا:- "اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرتِ نبویؐ کی تکمیل کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار رہ جائے گی۔ سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا یقین سمجھا دیتا" (ابوالکلام ۴۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں اُن کو یہ تار ملا یا نہیں، میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا، لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا"، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا "اب کیا! اب کیا!!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو"۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ضرور! ضرور!!"

---

[1] پونہ اس لئے کہ راقم ان دنوں دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کا لکچرر تھا، اور کلکتہ کا تار الہلال کے تعلق سے اور دیسنہ بہار کا ایک گاؤں جو خاکسار کا وطن ہے۔

اس کے بعد اُن کی حالت روز بروز بلکہ ساعت بہ ساعت نازک تر ہوتی گئی، اسہال خونی اور آخر میں صرف اسہال برابر جاری رہا، آنتوں میں خراش سے زخم ہوگیا تھا، غذا تمام ایام علالت میں موقوف رہی، لاغری ونحافت کا یہ حال ہوگیا کہ پیٹ اور پیٹھ کے جرم میں شاید دو تین انگل کا حجاب ہو طبی علاج و اہتمام جاری تھا، لیکن مولانا نے دوا کے استعمال سے قطعاً انکار کر دیا تھا، اور پھر تین روز تک قطعاً دوا نہیں پی۔ ۱۶ کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے، جن کے لئے مولانا ابتدا سے منتظر تھے۔ ۱۷ کی صبح کو مجھے اور اوروں کو یاد فرمایا، زبانِ مبارک سے تین مرتبہ "سیرت! سیرت!! سیرت!!!" کہا، اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا "سب کام چھوڑ کے"

ڈاکٹر محمد نعیم صاحب انصاری جو انصاری طبی وفد ترکی کے ایک ممبر رہ چکے تھے، اور ان دنوں جون پور میں مطب کرتے تھے، مولانا کی رحلت سے ۱۲ گھنٹے پیشتر پہنچ گئے، انھوں نے نہایت توجہ کے ساتھ مریض کا ایک ایک عضو دیکھا، اور بحالت یاس کہا کہ دماغ کے سوا اور تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں، اور اب تدبیر بے سود ہے، آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے بروز چہارشنبہ روح نے آخری سانس لی، عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے کہرام برپا ہوگیا، تجہیز و تکفین کی فکر ہوئی، مقامِ دفن میں لوگوں کا اختلاف تھا، آخر اُن کا مسکن ہی جیسی اُن کی پیشین گوئی تھی، مدفن بنا، عصر کے وقت لاش "شبلی منزل" کے ایک گوشہ میں جہاں آج سے آٹھ برس پہلے ان کے شکستہ پاؤں کے ریزے دفن کئے گئے تھے، سپرد خاک کی گئی، تمام شہر اور اطراف کے مسلمان نماز میں شریک تھے، سرکاری عدالتیں اور شہر کے مشن اور مسلم اسکول بند کئے گئے،

"استاد بزرگوار! جا جا، اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی لیکن نہ پائیگی"

لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہیگا،

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہاے مردم عارف مزار ما

تمام ملک میں اُن کی وفات کی خبر سے شورِ قیامت برپا ہوگیا، ہر طرف سے تعزیتی خطوط اور تار آنے لگے، اخبارات میں مہینوں اُن کا ماتم ہوتا رہا، مضمون نگاروں اور اخباروں کے اڈیٹروں نے ان کے کارناموں پر بے شمار مضامین، اور شعرا نے اُن کے مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے، جو زمانہ تک اخباروں میں چھپتے رہے،

مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی یادِ ایّام[1] کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، کہ وہ اس وقت علی گڈھ میں تھے، اور اس وقت تک مولانا کی خبر وفات علی گڈھ نہیں پہنچی تھی، اسی رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ عیدگاہ میں ایک بہت بڑی محفلِ سیرت منعقد ہے، اور مولانا وہاں کھڑے ہوے بیان فرما رہے ہیں، دوسرے روز خبر وفات ملی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(شبلی)

آل و اولاد

مولانا کی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی شادی خود مولانا کے خاندان ہی میں اور گاؤں ہی میں ہوئی تھی یعنی بندول میں، اور اس محل سے متعدد اولاد ہوئی جن میں بعض نے بچپن ہی میں انتقال کیا، اور دو صاحبزادیوں نے صاحبِ اولاد ہو کر مولانا کی زندگی ہی میں وفات پائی،

[1] الندوہ اگست ۱۹۱۴ء ص ۲۰،

ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام رابعہ تھا، دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی، رابعہ بی بی نے
سنہ ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا، فاطمہ بی بی کے نام مکاتیب میں کئی خط ہیں، مولانا اُن کو بہت چاہتے تھے
انھوں نے بھی مرض دق میں مبتلا ہو کر سنہ ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، اس وقت مولانا کی اولاد نرینہ میں
صرف حامد نعمانی موجود ہیں، سنہ ۱۸۸۱ء اُن کی پیدائش کی تاریخ ہے، علی گڈھ میں ایف اے تک تعلیم
پائی، گورنمنٹ میں تحصیلدار (سب ڈپٹی کلکٹر) ہو کر اب پنشن یاب ہو چکے ہیں،

اس محل نے سنہ ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، اُن کے انتقال کے بعد مولانا نے عدم تاہل کا ارادہ کر لیا
تھا، اور پانچ سال تک غیر متاہلانہ زندگی بسر بھی کی، لیکن سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ایک جگہ جمعیت خاطر
سے بیٹھنا چاہا تو پاؤں میں ایک زنجیر ڈالنی چاہی، اس لئے دوسری شادی بھی کی، چنانچہ ۴ رجون
سنہ ۱۹۰۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- " افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ پانچ برس کے تعطل کے بعد میں نے
جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لئے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے، تاکہ مارا مارا نہ پھروں" (سمیع-۴۸)
مولانا کے اس محل سے بھی دو لڑکیاں اور سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا، لیکن تینوں نے
بچپن ہی میں انتقال کیا، اس محل سے جو لڑکا پیدا ہوا تھا اس سے مولانا کو خاص وابستگی تھی، چنانچہ
۲ رمئی سنہ ۱۹۰۴ء کو حیدر آباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں :- " اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو باپ بنایا
کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں " (مہدی-۱۲)

لہ افسوس کہ اُن کی یہ جسمانی یادگار بھی جو مدت سے مرض قلب میں مبتلا تھی ۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق
۲۰ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو مٹ گئی، جونپور میں جہاں بضرورت ۱۹ مارچ کو گئے تھے، وہیں رات کو یعنی ۱۹ مارچ کا دن گذر کر
۲۰ کی شب کو دفعۃً انتقال کیا اور لاش اعظم گڈھ آکر شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں دفن ہوئی، انا للہ وانا الیہ راجعون

لیکن یہ کھلونا بھی ۱۹۰۵ء میں جب مولانا حیدرآباد چھوڑ کر لکھنؤ آ کر رہتے تھے جاتا رہا، لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں منشی احتشام علی صاحب کا ایک بڑا محلسرا تھا اسی کو کرایہ پر لے کر مع اہل و عیال رہتے تھے، وہیں یہ حادثہ پیش آیا، اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسی سال یہ بیوی بھی مرض دق میں مبتلا ہوگئیں[1]، جب حالت بہت غیر ہوگئی تو ان کو اعظم گڈھ لے کر آئے یہاں پہنچ کر انھوں نے بھی جدائی کا داغ دیا جس سے مولانا بہت متاثر ہوئے، اس سفر میں مولانا کے ساتھ مولانا ابوالکلام بھی لکھنؤ سے اعظم گڈھ آئے تھے، وہ کہتے تھے، کہ بیوی کی وفات پر مولانا بہت بے چین ہوئے اور چیخ چیخ کر رو دئے،

اس کے بعد انھوں نے کوئی شادی نہیں کی، اور یہ دس برس تجرد میں بسر کئے۔

اخلاق و عادات

انسان کے جسم کو دیکھا جائے تو وہ دراصل خاک کا ایک تودہ ہے، اس کی اصلی زندگی اس کے اچھے اخلاق اور عادات ہی سے ہے، مولانا کی پیدائش ایک آسودہ خاندان میں اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں اُن کے پھسلنے اور بہکنے کے کئی موقع تھے، مگر انھوں نے تعلیم و تربیت کی اس دشواری کو بخیر و خوبی طے کیا، اور فرماتے تھے کہ یہ برکت اُن کو اپنی والدہ ماجدہ کے بدولت حاصل ہوئی، وہ بہت نیک، عبادت گذار، سحر خیز اور وقت کی پابند تھیں، مولانا نے یہ سبق اُن سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا کا شب و روز کا پروگرام | مولانا صبح سویرے ۴ بجے کے قریب اُٹھ بیٹھتے تھے، پہلے تو یوں ہی بستر

[1] مکاتیب ج ۲۹

پر پڑے پڑے قرآن پاک کی کچھ آیتیں جو ان کو یاد آجاتیں لحن کے ساتھ زور زور سے پڑھتے تھے،
پھر حماسہ کے دو چار عربی اشعار ادھر ادھر سے گاتے تھے، ذرا مطلع صاف ہوا تو پاس ہی چائے
کا چولھا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا رکھا رہتا تھا، خود اٹھ کر اس کو روشن کرتے اور چائے کا پانی
اس پر رکھدیتے تھے، ساتھ لوٹے میں پانی اور طشت رکھا رہتا تھا، اس سے وضو کر کے نماز سے
فرصت کر لیتے تھے، اسی وقت چائے بھی پی لیتے تھے، ان کو قبض کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی،
اس لئے بیت الخلا میں جا کر دیر تک بیٹھتے تھے، اسی لئے وہ بیت الخلا ہمیشہ غیر مشترک چاہتے
تھے، اور رکھتے تھے، اور وہ بھی نہایت صاف، ایسا صاف کہ وہاں اخبارات ساتھ لیجاتے
تھے، اور وہیں پڑھتے تھے، کہ یہ وقت بھی ضائع نہ ہو، حاجت ضروری سے فارغ ہو کر لکھنے کی میز
پر بیٹھ جاتے، آٹھ نو بجے تک اس سے فارغ ہوجاتے تھے، ضروری خطوں کا جواب بھی وہ اسی وقت
لکھ لیتے تھے، یہ وقت اُن کی پوری تنہائی کا ہوتا،

اس کے بعد وہ کتب بینی میں مصروف ہوجاتے تھے، کوئی باہر سے یا اور کوئی ممتاز آدمی
آگیا تو مل بھی لئے، مگر وہ اس وقت خوشدلی سے نہیں ملتے تھے، لکھنؤ میں جب تھے تو پھاٹک پر ایک
نوٹس لگا رکھا تھا، کہ کوئی صاحب ۱۰ بجے سے پہلے ملنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں،

اسی وقت نو دس بجے کے قریب وہ کھانا بھی کھالیتے تھے، اب ۴ بجے شام تک وہ الٹ
پلٹ کر کتابیں دیکھا کرتے، جو آیندہ لکھنا ہوتا اس کا مواد تلاش کرتے، ضروری مقامات پر نشانات
لگا دیتے۔ ۴ بجے کے بعد سے احباب، طلبہ اور ملنے والوں کی آمد ہوتی، نشست بالکل سادہ تھی،
ایک دو کرسیاں، باقی دس بارہ مونڈھے، ایک کھری چارپائی جس پر وہ خود بیٹھتے تھے، لوگ

اودھر اودھر بیٹھ جاتے تھے، بڑی شگفتہ و با معنی مجلس ہوتی تھی، اس وقت وہ بلبل ہزار داستان بنجاتے تھے، عموماً مغرب تک یہ مجلس قائم رہتی تھی، اور کبھی مغرب کے بعد تک بھی، رات کا کھانا عام طور سے مغرب کے آگے پیچھے وہ کھا لیتے تھے، اور رات کو نو بجے وہ سونے کے لئے لیٹ جاتے تھے، سونے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس اتنی دور تک کسی سونے والے کے خراٹے کی آواز سنائی دے، کسی کو سونے نہیں دیتے تھے۔ باہر والوں کی نقل و حرکت ناگوار ہوتی، وہ گھڑی ٹائم پیس رکھتے تھے، اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز ہوتی تھی، اس لئے یا تو اس کو بھی دور رکھواتے تھے یا بند کر دیتے تھے

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "کلکتہ میں ایک موقع پر میرا اُن کا شب کو ایک کمرے میں سونا ہوا تو فرمایا آج عمر میں یہ پہلا اتفاق ہے، بالآخر دوسرا کمرہ تجویز ہوا"

شکل و شمائل | قد بلند و بالا تھا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی، ناک لمبی کھڑی، دہانہ بڑا، چہرہ لمبا، رنگ گندمی، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، بھویں گھنی اور لمبی، گردن اونچی، سر کے بال چھوٹے رکھتے تھے، مونچھیں چھوٹی لبوں تک، داڑھی نہ بہت چھوٹی، درمیانی، بال قبل از وقت پک گئے تھے، اور ستاون برس کی عمر میں وہ بالکل سن سپید ہو گئے تھے،

وہ اپنی جوانی میں بہت توانا و تنومند تھے، کہتے تھے کہ گھونسے سے وہ اینٹ توڑ ڈالتے تھے کرسی کو ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے تھے، پنجے بڑے مضبوط تھے، پنجہ کشی کی مشق کبھی نہیں کی تھی، اس پر یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پنجہ کش ان کا پنجہ نہیں پھیر سکتے تھے، شجاعت اور پہلوانی کے قصوں اور کارناموں سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اسی لئے وہ مغل بادشاہوں کے بڑے دلدادہ تھے، اور اُنکی شجاعت اور بہادری کے قصے بڑے جوش و خروش سے بیان کیا کرتے تھے، گو وہ خود کشتی کبھی

نہیں کھیلتے تھے، لیکن وہ پہلوانوں کی کشتی اور دنگل دیکھنے کے شائق تھے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی فرماتے تھے کہ میں نے ان کو سب سے پہلے علی گڈھ کی نمایش میں دنگل میں دیکھا، نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے جو ساتھ تھے بتایا کہ "یہی مولوی شبلی ہیں"۔ تو وہ فرماتے تھے کہ "مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مولوی اور دنگل"! الہ آباد کی ۱۹۱۲ء والی بڑی نمایش میں رستم ہند غلام پہلوان اور دوسرے پہلوانوں کی جو مشہور کشتی ہوئی تھی اس میں وہ شریک تھے، اور وہ بھی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے غلام کو تمغے پہنائے تھے،

اُن کی پیشانی کی رگ اور پٹھے جلد جلد حرکت کرتے رہتے تھے، ہم نے یہ بڑھاپے میں دیکھا، مولوی حمید الدین صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب مولانا کا شباب تھا تو پورے سر کی رگوں اور پٹھوں میں اتنی تیزی سے حرکت ہوتی رہتی تھی کہ لکھنؤ کے کام کی دو پلڑی ٹوپی جو وہ اس زمانہ میں پہنتے تھے وہ تھوڑی دیر میں سر سے جھک جاتی تھی، اور کبھی نیچے گر پڑتی تھی،

لباس | ان کا لباس جب سے میں نے دیکھا یہ تھا، موٹے ململ کا کرتہ جس سے بدن نمایاں نہ ہو، کسی قدر چوڑی مہری کا سپید چھالٹی کا پائجامہ "ڈھیلی شروانی جس کو وہ باہر نکلنے میں پہنتے تھے، پاؤں میں دلی کا معمولی کام کا سرخ سلیم شاہی جوتہ، پاؤں کے حادثہ کے بعد ایک مصنوعی پاؤں لگانے کے سبب سے جب پاؤں لگاتے تھے تو بوٹ پہن لیتے تھے، سر پر ادنی یا سادہ کپڑے کی سیاہ ابرانی ٹوپی، ترکی کے سفر پر بھی جب نکلے تھے تو وہ اسی قسم کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، اور اسی لئے عربوں نے انھیں شیعہ سمجھا،

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "میں نے جس زمانہ میں سب سے اول دنگل میں ان کو دیکھا تو سر پر سیاہ مخمل

کی گول ٹوپی تھی اس کی بناوٹ سادہ اونچی ہوتی تھی، اوپر کا حصہ گول چین دار ہوتا تھا [illegible] تک یہ ٹوپی استعمال فرماتے رہے، شیروانی زیب تن تھی"۔

جاڑوں میں وہ روئی دار بنڈی اور روئی دار دوگلا پہنتے اور کندھوں پر کشمیر کا شالی رومال رکھتے تھے، جس کو گلے سے لپیٹ لیتے تھے، جاڑوں میں نکلتے تو سرج کا پاجامہ پہنتے، عجیب بات ہے کہ گرمیوں میں بھی وہ تو شک بچھاتے تھے، اور رضائی پائتانے رکھی رہتی تھی،

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "سردی میں کوئی رزائی گرم نہ تھی، حبیب گنج کے قیام میں پہلی شب کو ساری رزائیاں اوڑھائی گئیں، سردی کی شکایت رہی، دوسرے دن خاص طور پر ڈھائی سیر روئی کا لحاف تیار کیا گیا، جب چین آیا، حبیب گنج سے بھیکم پور نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کے یہاں گئے تو شب کو وہی لحاف طلب ہوا، اسی کے ساتھ کوئی پانی اُن کے واسطے ٹھنڈا نہ تھا صراحی کا باسی پانی بھی پاس نہ ہوا، برف دیہات میں موسمِ سرما میں تھی نہیں، فرماتے تھے میرا دماغ گرم ہے جسم سرد، یہ میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ یہ اجتماعِ ضدین کیا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ،

وہ عام طور سے سر پر عمامہ نہیں باندھتے تھے، مگر قومی جلسوں اور تقریبوں میں وہ زردوزی ریشمی کام کا عزیز اللّٰہی عمامہ اور عمدہ مدنی عبا زیبِ تن کرتے تھے، اور اسی لئے اُن کے پاس کئی کئی عبائیں اور عمامے رہتے تھے، مگر اُن سے قرینہ سے عمامہ بندھتا نہ تھا، ان کے استاد مولانا فاروق صاحب کا بھی یہی حال تھا، وہ عمامہ کیا باندھتے تھے سر پر اُلٹے سیدھے اس کو لپیٹ لیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اُن سے تو اچھا باندھتے تھے، مگر پیچ ٹھیک نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ ندوہ میں کوئی تقریب تھی، مولانا نے قیمتی ریشمی کام کا عمامہ باندھ کر آئے تھے، اتفاق سے راقم بھی سوتی ململ کا صافہ باندھ کر حاضر ہوا، فرما

لگے، "دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے، مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے، اور تمہارا
چھ ٹکے کا صافہ ہے مگر اس قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے"،

طعام | کھانے کے شائق تھے، لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ امرا کی طرح متنوع اور متعدد و لذیذ
کھانوں کے دلدادہ تھے، فرماتے تھے کہ "کھانے کی عمدگی کے یہ معنی ہیں کہ عمدہ پکا ہوا ہو، میں عمدہ پکی
ہوئی دال کھا سکتا ہوں، اور برا پکا ہوا گوشت نہیں کھا سکتا"۔

کھانے میں نمک تیز پسند تھا، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے تھے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے تھے۔

شیرینی بہت مرغوب تھی، اور اس کے لئے کسی قسم خاص کی ضرورت نہ تھی، جو بھی ہو، اور جیسی
بھی ہو، فرماتے تھے کہ "شیرینی کے لئے صرف میٹھا ہونا کافی ہے"۔ ایک دفعہ نواب علی حسن خاں صاحب
کے عزیز خواجہ رشید الدین صاحب عرف اچھے صاحب نے مولانا کے لئے چوگنے شکر کے میٹھے
چاول پکوائے، کھاتے وقت مولانا سے پوچھا کہ "مولانا میٹھا تو ٹھیک ہے؟ چوگنی شکر چھوڑی ہے"،
مسکرا کر فرمایا "یہ کون کہتا ہے کہ شکر میں مٹھاس ہوتی ہے"۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "ایک بار ندوہ کے اجلاس سے واپسی میں بریلی سے علی گڑھ مولانا کی
ہمراہی ہوئی، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مٹھائی خریدی چکھی، خواہ اچھی تھی یا ناقص، میں نے
استعجاب ظاہر کیا تو فرمایا مٹھائی ہے، شیرینی کے متعلق لطیفے خوب خوب یاد تھے، ایک موقع پر فرمایا کہ ایک
دوست نے دوسرے شیرینی پرست دوست کو مدعو کیا تو انھوں نے کہا یار کیا کھلاؤ گے! کہا بہت اعلیٰ میٹھے چاول،
گھر آکر باورچی طلب ہوا، باصرار شیرینی کی مقدار بڑھوائی گئی، چوگنا میٹھا پڑا، فخر سے کھلایا، ختم طعام پر داد چاہی
تو جواب ملا جتنے چاول تھے اسی قدر پھیکا تھا!

بنارس کے قیام میں ایک روز دوپہر کو سخت لو کے وقت، ملاجی میرے رفیق اور اپنے ندیم سے فرمائش کی کہ گنے کی گنڈیریاں بازار سے لاؤ، انھوں نے کہا کہ ایسی دھوپ میں، فرمایا بڑا لطف رہیگا، ملاجی گئے، گنڈیریاں لائے، دونوں نے مل کر کھائیں، لطف کی باتیں ہوئیں " ع سخنہائے شیریں بہ از قند ہست "!

رساول بہت شوق سے کھاتے تھے، اور اس اہتمام سے پکواتے تھے کہ مصنوعی طریقوں سے اس کو صاف کروانا بھی پسند نہیں کرتے تھے، کہ اس سے اس کی طبعی مٹھاس کم ہوجاتی ہے، اسی لئے رساول میں بالائی یا دودھ نہیں ملاتے تھے، ایک دفعہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے ان کے پاس رساول بھیجی، اور اُدوھ کے مذاق کے مطابق اس میں بالائی ملادی، ملاقات ہوئی تو فرمایا تم نے تو رساول کو غارت کردیا، بالائی سے تو پھیکی ہوجاتی ہے۔

مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے انگریزی شکر کے ایک ایک دانے منہ میں ڈالا کرتے تھے، اور بیکاری کے اوقات میں یہ ان کا لذیذ ترین مشغلہ تھا، پیشاب میں شکر آتی تھی طبیب، ڈاکٹر اور احباب اس طرح شکر کھانے سے روکتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے، ایک دفعہ نواب سید علی حسن خاں صاحب اور اچھے صاحب فرماتے تھے کہ " مولانا بیمار تھے تو ہم لوگ دیکھنے کے لئے گئے، سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے تھے، منہ بھی بند تھا، مگر کچھ دانتوں کے چلنے کی آواز آتی تھی، پوچھا آپ کیا کر رہے ہیں ؟ فرمایا کچھ نہیں لحاف الٹا تو دیکھا کہ سینہ پر شکر کی ایک طشتری رکھی ہے، اور وہ ذرا ذرا اس کو کھا رہے ہیں، ہم نے عرض کی اس حالت میں شکر سے پرہیز فرمائیے، فرمایا " تو پھر جی کر کیا کروں گا "!

چائے وہ دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے، لیکن صبح کو جب سویرے اٹھتے تھے، تو اس

وقت ملازم کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بلکہ خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا لیتے تھے، چائے کی پیالیاں چھوٹی ہوتی تھیں، عموماً سادی چائے پیتے تھے۔ فرماتے تھے چائے میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے۔"

کھانے میں عمدہ پکا ہوا صرف ایک قسم کا سالن ہوتا تھا، اور اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے تھے، دہی ضرور ڈلواتے تھے، باورچی کے ہاتھ کا سالن پسند نہیں آتا تھا، تو اپنے سامنے منگواکر اپنے ہاتھ سے گوشت بھونتے تھے، سامنے لوہے کا چولھا یا آتشدان رکھ لیتے، اور اس پر دیگچی رکھ کر گوشت بھونتے تھے، کھانے میں سادہ پیاز شوق سے کھاتے تھے۔ مرچوں سے گھبراتے تھے، فرماتے تھے ہر مزہ میں شدت مرغوب لیکن مرچ۔ باقی دال اور روٹی جو ندوہ کے باورچی خانہ میں عموماً پکا کرتی تھی، وہی ہو کے دسترخوان پر بھی نظر آتی تھی، بمبئی میں ضعفِ معدہ کی وجہ سے چوکر کی پاؤ روٹی منگوایا کرتے تھے، اور اخیر میں تو صرف توس ہی کھایا کرتے تھے، کبھی کبھی میٹھے چاول بھی پکواتے تھے، پڈنگ بھی نہایت پسند تھی، او بمبئی میں اکثر کھاتے تھے، فصل میں آم بہ شوق کھاتے تھے، برف کی قلفیاں بھی کھاتے تھے، لیکن اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، ایک بار برف کی قلفیاں بکنے کو آئیں، تو خریدنا چاہی کسی نے کہا اچھی نہیں ہیں، فرمایا "منھ تو بہرحال ٹھنڈا ہو جائے گا" پانی ہمیشہ ٹھنڈا پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ جاڑوں میں بھی برف استعمال کرتے تھے، تازہ اچھے گھی کے بہت شائق تھے، وطن آتے تھے تو اس کی فرمایش کرتے تھے، لکھنؤ میں لکھنؤ کے اس پاس کے رہنے والے شاگردوں سے اُن کے گاؤں سے فرمایش کرکے گھی منگواتے تھے، مولوی مسعود علی صاحب گھی، اور رساول کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، بمبئی میں گھی اچھا نہیں ملتا تو باہر سے

ڈاک سے اچھا گھی دوستوں اور عزیزوں سے فرمایش کرتے تھے، یہ شوق اخیر اخیر تک قائم رہا،

بمبئی سے ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو مظفر پور لکھتے ہیں:۔ "اگر آپ صرف سیر بھر تازہ اور عمدہ گھی بھیجیں تو میں ممنون ہوں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اگر سیر بھر سے ایک ماشہ بھی زیادہ ہوا تو گستاخی معاف ہو گر واپس کر دوں گا، تازگی کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کو بنے ہوئے دو تین روز سے زیادہ نہ ہوئے ہوں، یہاں گھی کے سوا ہر چیز ملتی ہے، میں نے وطن کی مختلف قرابتوں کو بھی فرمایش بھیجدی ہے، مگر مقصد وہی مقدار کی ہے جو اوپر کی ہے" (ریاض ۲۲)

بمبئی میں اچھا گھی نہیں رہتا تھا تو تازہ مکھن لیکر اس کا گھی بنا لیتے تھے،

دولت کی بے قدری۔ مولانا نے جس ماحول میں زندگی بسر کی، اُس کا قدرتی نتیجہ تو یہ تھا کہ وہ دولت، عزت، شہرت، حکومت اور شان و شوکت وغیرہ کے اسی قدر دلدادہ ہوتے، جتنا ایک دنیادار آدمی ہو سکتا تھا، غور کرو، ایک ایسا شخص جس نے ایک آسودہ خاندان میں پرورش پائی ہو، جو ایک صاحب اقتدار زمیندار ہو، جس کے باپ، جس کے بھائی اور جس کے عزیز و اقارب وکیل بیرسٹر، ڈپٹی کلکٹر اور سرکاری عہدہ دار ہوں، اور انگریزی طریق پر بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہوں، جس نے علی گڈھ میں سولہ برس تک قیام کیا ہو، اور اس کی نگاہ سے دنیاوی جاہ و جلال کے تمام مناظر گذر چکے ہوں، جو مدتوں حیدرآباد کے امرا کی سوسائیٹیوں میں زندگی بسر کر چکا ہو، اس کے دل میں دنیوی جاہ و جلال، دنیوی نام و نمود اور دنیوی عیش و عشرت کے علاوہ اور کونسا خیال پیدا ہو سکتا تھا،

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی دنیاوی آرایش و آسایش کی طرف ان کو متوجہ نہ کر سکی،

انھوں نے عام طور پر اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے چند دنوں نقل نویسی اور امانت کا کام کیا جس کی تنخواہ نہایت کم تھی، امانت کی ملازمت میں نوکری یا ملازمت کی بدولت جو مصیبتیں اٹھائیں ان کو لطف سے بیان فرماتے تھے، چند روز وکالت کی، اور آمدنی کے لحاظ سے ان کا وہی حال رہا جو ایک نئے وکیل کا ہو سکتا ہے، علی گڈھ میں ملازمت کی تو ابتدائی تنخواہ چالیس روپیے ماہوار قرار پائی، اور سولہ برس کی مدت میں بتدریج سو روپیہ تک پہنچی، اسی تنخواہ میں ایک بچہ، ایک بھائی، ایک معلم، دو نوکر اور خود مولانا کے مصارف شامل تھے اور ایک بنگلہ میں رہتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل رقم میں وہ اتنی صاف ستھری زندگی کیونکر بسر کرتے تھے، علی گڈہ سے قطع تعلق کیا تو حیدرآباد سے جو وظیفہ مقرر ہوا اس کی مقدار بھی اس سے زیادہ نہ تھی، بعد کو وہ اگرچہ حیدرآباد میں چند سال کے لئے مشاہرہ پانچسو ماہوار ملازم ہو گئے تھے لیکن اس میں بھی ایک معقول رقم والد کے قرضہ میں نکل جاتی تھی، اور بقیہ وہاں کی کثیر المصارف زندگی کی نذر ہوتی تھی، حیدرآباد سے مستعفی ہوئے تو پھر وہی سو روپیہ کا وظیفہ جاری ہو گیا، اخیر میں اگرچہ اس میں دو سو کا، اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن موت نے اُن کو اس سے ایک سال سے زیادہ متمتع ہونے کا موقع نہیں دیا، اور وہ بھی زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوا،

ان کے خاندان اور سسرال کی دو تین ہزار کی جائداد بھی تھی، مگر کبھی انھوں نے اس سے اپنا حصہ لینا پسند نہیں کیا، اور ہمیشہ اپنی ہی کمائی کی روٹی پر قناعت کی، اسی طرح اپنی کتابوں کی آمدنی سے بھی انھوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، جب تک علی گڈہ میں رہے ان کی تالیفات کالج کی نذر ہوتی رہیں یعنی اسی نے اُن کو چھپوایا اور اسی نے منافع حاصل کیا، حیدرآباد گئے تو انکی

کتابیں سررشتۂ علوم وفنون کی ملکیت رہیں، اُن کی ذات کو اُن سے کوئی تعلق نہیں رہا، جب ۱۹۰۵ء میں ندوہ آئے، اور سوانح مولانائے روم، موازنہ اور شعرالعجم چھپیں تو اُن کے زمانہ میں شاید اُنکی لاگت نکل آئی ہو تو نکل آئی ہو، اس زمانہ میں اگر اُن کو فائدہ ہوا تو یہ ہوا کہ ایک کتاب کی فروخت سے جو کچھ ہاتھ آتا وہ دوسری کتاب کی چھپائی میں خرچ ہوجاتا،

امتحانات کے پرچوں سے بھی ان کو کچھ آمدنی ہوجاتی تھی، مگر وہ بھی ضروریات ہی میں صرف ہوجاتی، حیدرآباد کے بعد بے سہارے ندوہ آکر بیٹھ جانا ایسا واقعہ تھا کہ علی گڈھ پارٹی کے لوگ اس کو خودکشی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اس وقت مولانا کیلئے حصولِ معاش کے بیسیوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ بالخصوص علی گڈھ کالج تو ان کے لئے بالکل چشم براہ تھا، اور نواب محسن الملک مولانا کو ہر قسم کی ترغیبات دے کر کالج میں بلانا چاہتے تھے، چنانچہ جب مولٰنا نے حیدرآباد سے الگ ہوکر ندوہ میں آنا چاہا تو نواب صاحب نے لکھا کہ فوراً کالج میں چلے آیئے، حیدرآباد کا سابق وظیفہ بھی جاری ہوجائے گا، اور سَو روپیہ کالج سے بھی ملیں گے، لیکن مولانا نے اس کو نامنظور کیا، اس کے بعد ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف سے اُن کو بھوپال جانے کی ترغیب دی، لیکن یہ افسوں بھی کارگر نہ ہوسکا، ندوہ میں آنے کے بعد بھی انھوں نے مولانا کا پیچھا نہیں چھوڑا، چنانچہ جب کالج میں عربی کی ایک اعلٰی کلاس کھولی گئی، اور اس کے لئے ایک مشہور جرمن مستشرق یوسف ہارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پر ان کی اسسٹنٹی کیلئے بلایا، لیکن مولانا نے صاف لکھ دیا کہ

"شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

حیدرآباد میں علومِ شرقیہ کی یونیورسٹی قائم ہوئی تو نظامت کے لئے بمشاہرۂ معقول مولانا کا نام پیش ہوا، لیکن انھوں نے صاف انکار کردیا، اور ایک خط میں لکھا: "یونیورسٹی کی نظامت مجھ کو دیتے ہیں مشاہرہ بھی معقول ہے، لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں۔" (مہدی۔۔۴۷)

بہرحال اگر مولانا کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو سَو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ ایک ایسی رقم ہے جو مولانا کے کمالات کے سامنے بالکل ہیچ ہے، سادہ زندگی کی وجہ سے اگرچہ اُن کے ذاتی مصارف کچھ بہت زیادہ نہ تھے، تاہم انھوں نے کبھی بدحیثیتی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی، ایک دو ملازم ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتے تھے، کپڑے متوسط درجے کے پہنتے تھے، کھانے کے شوقین تھے، یعنی بدمزہ کھانا وہ کبھی نہیں کھا سکتے تھے، قلمی کتابوں کا شوق الگ تھا، ایک ایک کتاب کے سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیے وہ دے ڈالتے تھے، بڑے بڑے چندے بھی دیتے تھے، قومی اور علمی کاموں کے لئے اکثر اپنے کرایہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے، بلاد اسلامیہ کے سفر کے کل مصارف خود برداشت کئے، اور کسی سے اس میں ایک حبّہ کی مدد قبول نہیں کی، اخیر میں تبدیلِ آب وہوا اور ترقیِ صحت کے لئے ہر سال بمبئی چار پانچ مہینے قیام کرتے تھے، اور اس حالت میں اُن کے مصارف بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، ان اسباب سے اُن کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہتی تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار حیدرآباد سے وظیفہ آیا اور انھوں نے اسی وقت اس کو ضروری مصارف میں خرچ کرنا شروع کیا، اخیر میں صرف چند روپیے رہ گئے، تو دبی زبان سے فرمایا کہ "یہ رقم کافی نہیں ہوئی۔" اگر اتفاق سے کبھی روپیے زیادہ بچ جاتے تو ان کو یوں ہی بے گنے ایک چھوٹے سے آفس بکس میں ڈال دیتے، اور اس میں سے نکالتے رہتے

اور جب کچھ نہ رہتا تو سمجھ لیتے کہ سب خرچ ہو گیا، اور وہ اس باب میں ایسے سادہ تھے کہ ان روپیوں میں سے کوئی دوسرا نکال لیتا تو اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی، ایک دفعہ مولانا کے ایک عزیز طالب العلم جو اُن کے پاس ندوہ کے قیام کے زمانہ میں آتے جاتے رہتے تھے کئی مہینہ تک اُس میں سے نکالتے رہے، اور مولانا کو کچھ پتہ نہ چلا، آخر میں اس میں سے ایک گنّی نکال لی جو اس میں رکھی ہوئی تھی، تو احساس ہوا، روپیے، پیسے، نوٹ یونہی بے قدری سے فرش پر ڈال دیتے تھے، کتابوں میں رکھدیتے تھے، وہ گم بھی ہو جاتے تھے،

ایک دفعہ مولانا پٹنہ گئے، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ملنے گیا تو فرمایا "رات مچھروں نے بہت دق کیا، کسی پتلے کپڑے کی ایک چادر سلوا دو" یہ کہکر روپیہ دیا، میں شام کو کپڑا خرید کر اور چادر سلوا کر لایا، تو وہ موجود نہ تھے، میں نے اُن کے بستر کے سرہانے چادر رکھدی، اور ایک کاغذ پر اس کا حساب لکھ کر رکھدیا، اور باقی پیسے بھی وہیں رکھدیئے، دوسرے دن ملنے گیا تو ملال کا اظہار کیا کہ تم کو ایک روپیہ کے حساب لکھنے کی کیا ضرورت تھی،

شروع شروع میں جب وہ ندوہ آئے ہیں تو مدرسہ گولہ گنج کے ایک مکان میں تھا، اس کی سب سے بالائی چھت پر ایک کمرہ تھا جس کی لمبائی چوڑائی ۱۰×۲۰ فیٹ ہوگی، مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خوابگاہ، یہی ملاقات کا کمرہ، یہی دار المطالعہ، اور یہی کھانے کا کمرہ، یہی مہمان خانہ سب تھا، ایک طرف پلنگ پر بستر تھا، باقی دری تھی جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے، مجھے بارہا حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندوستان معمور ہے وہ کیونکر ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گذار رہا ہے، اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے

اور ان کا اثاثہ کیا تھا، بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ مونڈھے اور بس، غرض اُن کی زندگی گویا حدیثِ نبوی

کن فی الدنیا کانک غریب او | دنیا میں ایسے رہو، گویا کہ تم مسافر ہو، یا
کعابر سبیل، (ترمذی) | راہ سے گذر رہے ہو،

کے مطابق تھی،

استغنا اور بے نیازی قدیم علما کی ایک بڑی خصوصیت بے نیازی تھی، اور مولانا میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر پائی جاتی تھی، آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کالج سے علٰحدہ ہونے کے چند روز بعد امیر عبدالرحمٰن خاں والیِ کابل کو جب ترجمۂ ابن خلدون کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے اس کے لئے ایک معقول رقم یعنی دس ہزار روپیہ صرف کرنا چاہا، اور اپنے سفیر ہندوستان کو اس کی اطلاع دی اور سفیر موصوف نے اس کے لئے مولانا سے خط وکتابت کی، تو مولانا نے صاف انکار کیا، امیر صاحب نے نہایت وسیع پیمانہ پر کلکتہ میں ایک دارالترجمہ قائم کرنا، اور مولانا کو اس کا سکریٹری مقرر کرنا چاہا، تو مولانا نے اس عہدے کو بھی قبول نہیں کیا،

حیدرآباد میں چند سال کی ملازمت بھی جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مجبوراً اختیار کی تھی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :- "گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں" (مکاتیب - ج ۱، ۴۸)

یہی وجہ ہے کہ جب حیدرآباد میں سیاسی تغیر ہوا تو بجاے اس کے کہ وہ اپنے لئے کسی قسم کا جوڑ توڑ کرتے نہایت خوشی کے ساتھ اس تعلق کو چھوڑ کر غریبانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گئے

اس کی نسبت خود لکھتے ہیں :- "میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر، ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچیگا اس سے غریبانہ زندگی ناصی طرح بسر ہو سکتی ہے" (مکاتیب ہی ۱۹)

مولانا جس طرح مال و دولت سے بے نیاز تھے، اُسی طرح جاہ و شہرت کی بھی اُن کو ہوس نہ تھی، جاہ و عزت کا سب سے بڑا مرکز علی گڈھ تھا، لیکن انھوں نے علی گڈھ کالج پر غریب ندوہ کی خدمت کو ترجیح دی، خود ندوہ میں سب سے بڑی چیز نظامت تھی، جس کے لئے اور بھی بہت سے مدعیانِ توکل و قناعت مدتوں اُمیدوار رہے، لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مولانا نے کبھی نظامت کی خواہش نہیں کی، اور ہمیشہ وزیر بن کر کام کرنا چاہا، یہ سچ ہے کہ ندوہ میں وہ تمام کام اپنے نام سے کرتے تھے، جس سے بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ نام و نمود کے لئے کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ ان کاموں کی طرف اُن ہی کو توجہ پہلے ہوئی تھی، وہی ضرورت محسوس کرتے تھے، پھر دوسروں کو متوجہ کرتے تھے، اس لئے قدرتی طور پر اُن کی حیثیت اصل محرک کی، اور دوسروں کی مؤید کی ہوتی تھی،

دوسری بات یہ تھی کہ دنیا اس قدر ظاہر پرست واقع ہوئی ہے کہ جب تک کوئی تحریک کسی ممتاز آدمی کی طرف سے نہیں اُٹھتی، اس کی طرف توجہ نہیں کرتی، مولانا بار بار تجربہ کر کے اس کو دیکھ چکے تھے، اس لئے مجبوراً اپنے کو آگے رکھتے تھے،

ندوہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ایک دفعہ میں نے جرأت کر کے مولانا کو لکھا کہ ان خطوں میں اُن کے بجائے کسی دوسرے رکنِ انتظامی کا نام لکھدیا جائے تو

اچھا ہے، تاکہ مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ ہر کام میں اپنے ہی کو آگے رکھتے ہیں، اس پر جواب آیا:
"لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس سے پیچھے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں، اور زبان سے ہر وقت ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق الہلال میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے، تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں کوئی کرے اس کے ساتھ ہوں، اور پیرو بن سکتا ہوں"۔

اسی خط میں لکھتے ہیں :۔" تم کہتے ہو کہ بجائے اپنے مشیر حسین یا نواب علی حسن خاں کا نام لکھوں، وقف اولاد کے متعلق ابتداءً میں نے خود اشتہار دیا تھا کہ جو چندہ بھیجا جائے منشی احتشام علی کے پاس بھیجا جائے، صرف آٹھ روپیے ان کے پاس آئے، پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے، ایک شخص نے الٹ کر جواب نہیں دیا، مشیر حسین وغیرہ کا نام لکھ کر دیکھ لو، ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے، تجربہ کرو تو معلوم ہو جائے گا، تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے نام کے لئے ہر کام میں اپنا نام رکھتا ہوں، لیکن سب تجربہ کرکے ایسا کرنا پڑتا ہے"۔ ( )

اخیر زندگی میں جس کے چند ہی روز کے بعد انھوں نے وفات پائی، اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا کہ ضرورت اس کی تھی کہ دار المصنفین کے لئے چند لوگ یکجا ہو جاتے...
"لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق گذرتی ہے، ....

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع ۔۔۔ بسے بادشاہی کنم در گدائی :۔

کیسے مؤثر فقرے ہیں،

ترک خدمت و نوکری۔ "س"

خودداری مولانا اگرچہ مغرور نہ تھے، تاہم وہ فطرۃً سخت خوددار تھے، اور جب اُن کو کوئی کام خودداری کے خلاف کرنا پڑتا تھا، تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا، ابتدائی زمانہ میں ان کو امانت و نقل نویسی کے کام سے خلافِ مذاق ہونے کے علاوہ، اس بنا پر بھی عار و شرم محسوس ہوتی تھی کہ وہ اُس کو اپنی خودداری اور عزتِ نفس کے خلاف سمجھتے تھے، نقل نویسی کی تنخواہ ان کو دس روپیہ ماہوار ملتی تھی، جس کی نسبت فرماتے تھے کہ جب اس کا تصوّر کرتا تھا تو مجھے رونا آتا تھا، کچہری کے معمولی ملازم عموماً پیدل جایا کرتے تھے، لیکن مولانا نے اس حالت میں بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا تھا، اور فرماتے تھے کہ باوجودیکہ میری تنخواہ دس روپیے ماہوار تھی، تاہم میں کچہری ہمیشہ یکہ پر جاتا تھا، اور تنخواہ کے نو روپیے صرف یکہ کے کرایہ میں صرف ہو جاتے تھے، علی گڈھ میں گئے تو اگرچہ ابتداءً اسکول کی مدرسی قبول کرلی تاہم وہ اس کو اپنے لئے موجبِ ذلت سمجھتے تھے، چنانچہ اُس زمانہ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ "اینجا کہ آرمیدہ ام وایں مذلت برخویش پسندیدہ نہ دانم تا چرخ را دریں پردہ چہ نیرنگیہاست" (مکاتیب ۔ ۲)

اس زمانہ میں صرف چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، تاہم انھوں نے کبھی ذلت کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا، ابتدا میں وہ شہر میں رہتے تھے جو کالج سے دور تھا، اس لئے کالج میں پیدل نہیں آسکتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ باوجود قلتِ تنخواہ میں نے کبھی یکہ پر آنا جانا پسند نہیں کیا بلکہ ہمیشہ گاڑی پر آیا جایا کرتا تھا،

کالج میں اگرچہ اُن کے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ دوستانہ اور مساویانہ تھے، اور سرسید، نواب محسن الملک اور مولوی سمیع اللہ خاں وغیرہ ان کی نہایت عزت اور قدر کرتے

تھے، تاہم جب کبھی اصول و قواعد کی رو سے اُن کو اپنی حیثیت اور لوگوں سے کم نظر آتی تھی تو اُن کو اس کا سخت صدمہ ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ "ایک بار اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا، اور لوگ تنخواہ کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آگے پیچھے بٹھائے گئے، اور اس وقت میری کرسی بہت پیچھے رہی تو میں نے یہ منظر دیکھ کر گردن جھکالی، اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے"۔

ملازمت سے نفرت، اور آزاد وظیفہ کی خواہش اگرچہ اُن کو زیادہ تر اس بنا پر تھی، کہ وہ ملازمت کی پابندی کے ساتھ خالص علمی اور قومی زندگی نہیں بسر کرسکتے تھے، تاہم اس میں خودداری کا مخفی جذبہ بھی موجود تھا، کیونکہ ملازمت کی وجہ سے بعض اوقات ایسی باتیں پیش آجاتی تھیں جن کو وہ گوارا نہیں کرسکتے تھے،

لیکن باوجود اس خواہش کے انھوں نے وظیفہ کے لئے کبھی اپنی خودداری کو صدمہ نہیں پہنچایا، وہ جس زمانہ میں علی گڈہ میں تھے، اُس وقت نواب علی حسن خاں بہادر بھوپال میں تھے اور ریاست بلکہ خود نواب شاہجہاں بیگم پر اُن کا بہت بڑا اثر تھا، وہ مولانا کے بہت بڑے دوست، اور نہ صرف دوست، بلکہ سخت معتقد تھے، اور اپنے جاہ واقتدار سے مولانا کو ہر قسم کے امکانی فوائد پہنچانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے مولانا کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ مولانا کی طرف سے کسی خواہش کا اظہار ہو، لیکن ایک مدت تک تو مولانا کی خودداری نے اُس کا موقع ہی نہیں دیا، اور اُن کے بار بار کے اصرار سے ایک بار وظیفہ کے لئے لکھا بھی تو شرم وغیرت نے آب آب کردیا، فرماتے تھے کہ عرفی نے ایک موقع پر کہا تھا،

زدود مانِ اصیلم ہمیں گواہم بس | کہ شرم ایں سخنم خوے زچہرہ بیروں داد

میں نے بھی جب نواب صاحب کو یہ خط لکھا تو مجھے پسینہ آگیا۔"

انھوں نے حیدر آباد میں بعض مجبوریوں سے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے گو ملازمت اختیاراً کر لی تھی، لیکن وہ اس کو دل سے پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:" بےشبہہ اگر میں ملازمت کر سکتا، اور کسی قدر دنیا داری بھی مجھ سے بن پڑتی، تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع! عمر کا بہت بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لئے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔" (مکاتیب سمیع، ۴)

حیدر آباد کی ملازمت سے چند ہی سال کے بعد اُن کو الگ ہونا پڑا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خودداری چھوڑ کر امراء کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوئے، چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک بہادر کو تحریر فرماتے ہیں:" مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا دل روان دنیا کی خواہشوں سے بھرا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤبھگت نہیں ہو سکتی، اور بغیر اس کے کامیابی معلوم، اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔"

ایشیائی سلطنتوں میں مدح گستری، اور قصیدہ گوئی کامیابی کا ایک بڑا ذریعہ خیال کی جاتی ہے، اور دیسی ریاستوں میں اب بھی ایشیا کی یہ قدیم شان قائم ہے، مولانا فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، اس لئے اگر انھوں نے ایشیائی شعراء کی اس مبتذل روش کو اختیار کیا ہوتا اور امراء کی قصیدہ خوانی کر سکتے تو اُن کو اپنی کامیابی کا نہایت آسان ذریعہ ہاتھ آجاتا، لیکن انھوں

نے ہمیشہ امراء و سلاطین کی مداحی کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھا، سنہ ۱۹۱۱ء میں موجودہ حضور نظام حیدرآباد
اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں بندوق کے صدمے سے بال بال بچ گئے، تو مولانا نے اس مسرت
میں بے شبہہ ایک قصیدہ لکھا، لیکن یہ اعیانِ حیدرآباد کی فرمایش بلکہ اصرار کا نتیجہ تھا، صلہ و کامیابی
کی خواہش کو اس میں دخل نہ تھا، اور وہ بھی تمام تر تہنیت اور دعاے سلامتی پر مشتمل رہا،
بیگم صاحبہ بھوپال نے جب سنہ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے لئے دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمائے
تو اس کے شکریہ کے لئے جو جلسہ کیا گیا، اس میں بھی مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ قصیدہ
اگرچہ ایک قومی حیثیت رکھتا تھا، تاہم مولانا اپنی خودداری کو ذرہ برابر ٹھیس لگانا پسند نہیں
کرتے تھے، آخر اخیر کے شعر میں اپنی خوددارانہ شان کا اظہار کر ہی دیا،

شبلیِ غمزدہ را مدحِ شہاں شیوہ نبود ... لیک لطفت ہمہ را بندۂ احساں کردہ است

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر ہوے تو بحیثیت ملازم سرکار وہ بھی ان کو
نذر دینے گئے، تو ان کے ایڈیکانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا، تو انھوں نے ذرا
تیکھے ہو کر کہا: "یہ اوروں کا پیشہ ہے، میں یہ کام نہیں کرتا" اس پر ردّ و بدل ہوئی، اور انھوں
نے ناگواری کے ساتھ کہا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا،

اسی طرح سنہ ۱۹۰۹ء میں بیگم صاحبہ جنجیرہ نے ندوہ کی تعمیر میں ایک رقم بھیجی تو اس کے
جواب میں ان کو شکریہ کا ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، مگر ان میں سے کسی میں بھی شاعرانہ خوشامد و
مذلت کی خو روا نہیں رکھی،

نذر و نیاز کے طریقہ کو بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے، اور اس پر کتنے ہی خوشنما پردہ

ڈالا جائے، لیکن اس سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے، نواب علی حسن خاں بہادر نے اُن کے ساتھ ایک بار اس قسم کا سلوک کرنا چاہا، اور ریل پر چلتے وقت ایک معقول رقم نذر کرنی چاہی، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، ایک دفعہ مولانا شروانی فرماتے تھے "بہت ابتدائی زمانۂ تعلّق و ملاقات میں جب مولانا کو میں نے پہچانا نہ تھا، ایک کتاب مطبوعہ میرے یہاں سے طلب فرمائی جو میرے یہاں نہ تھی، میں نے سادہ لوحی سے لکھدیا کہ کتاب دوکان سے طلب کر لیجیے رقم میں ادا کروں گا، اس پر اس گرمی سے ڈانٹا کہ آج تک یاد ہے، میری معذرت ساختہ تھی کہ مقصد یہ تھا کہ کتاب آجائے گی تو میرے یہاں رہیگی" ہر ہائینس بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال نے اپنی ایک تصنیف کی اصلاح کے معاوضہ میں دو سو روپیے نذر کئے، لیکن مولانا نے ان کو خود لینا پسند نہیں فرمایا، سرکاری اہل دفتر کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان کو ندوہ کے حساب میں منتقل کردیں

ایک بار ٹرکی کے سفر میں اس قسم کا نہایت بدنما منظر سامنے آیا، مولانا ذکی پاشا سے ملنے گئے، تو عربی وضع میں تھے، پاشا موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ٹرکی سکہ) نکالیں، پہلے تو مولانا کو سخت تعجب ہوا، پھر خیال آیا کہ انھوں نے ان کو گداگر سمجھا، اس خیال سے مولانا کو سخت رنج ہوا، اور رنج کے ساتھ غصہ آیا، اور چلا کر کہا:-

ماھٰذا ـ ماجئنا لھذا لسنا من الفقراء   یعنی یہ کیا ہے؟ ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں

شیخ علی ظبیان بھی مولانا کے ساتھ تھے، پاشائے موصوف نے اُن سے مولانا کے غصہ کی وجہ پوچھی، انھوں نے مولانا کے آنے کی غرض وغایت بیان کی، تو پاشائے موصوف کو سخت ندامت

ہوئی، اور معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالاخانہ پر چلئے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، مولانا اس واقعہ کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:۔ "مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ یہاں علماء اور متصوفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اسی غرض سے ملتے ہیں کہ ابیضِ نورانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا، لیکن اس فرقہ کے حال پر بہت افسوس ہوا، نذر و نیاز کے طریقہ کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا، لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہیں پائی، (سفرنامہ ص ۷)۔

نہ صرف نذر و نیاز، بلکہ عموماً کسی قسم کی مالی اعانت قبول کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، ایک بار وہ بیمار تھے، ان کے بھائی مولوی اسحاق مرحوم نے بغرض علاج اُن کے پاس دو سو روپئے بھیجے، لیکن انھوں نے واپس کر دیئے،

اٹلی سے اُن کے نام اورینٹل کانفرنس کی شرکت کا دعوت نامہ آیا، تو نواب علی حسن خاں نے یہ تجویز پیش کی، کہ اس علمی سفر کے مصارف قومی چندے سے ادا کئے جائیں، لیکن مولانا نے ان کو لکھا کہ "میری مالی اعانت کی ضرورت نہیں، اگر کسی قدر ہے تو اس کو حمیتِ نفس نے رفع کر دیا ہے، اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیشِ نظر ہے، کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا، اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی دریوزہ گری کر کے یورپ گیا"۔ (مکاتیب دوم)

ندوہ کی کامیابی کے لئے اگرچہ وہ ہر قسم کی کوششیں کرتے تھے، تاہم اس کے لئے بھی ان کا لبِ سوال بہ مشکل کھلتا تھا، شملہ ڈیپوٹیشن میں گئے تو اپنے لکچر میں نہایت دبی زبان سے چندہ کی تحریک کی تو یہ شعر پڑھا،

عاشقِ تازہ ہوں اور وصل کی اوّل شب ہے ۔۔۔ شرم سے کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے

ایک بار لکھنؤ میں جان محمد مالک ہوٹل کی نسبت مشہور ہوا کہ وہ ایک معقول رقم کسی قومی کام میں دینا چاہتے ہیں، بعض احباب کے اصرار سے مولانا بھی اُن سے ملنے گئے، اور اسی قسم کی قومی باتیں ہوئیں، مولانا فرماتے تھے " مجھے تعجب تھا کہ میں اس قدر ذلیل ہو گیا کہ زر و سیم کے لئے دولتمندوں کے گوشۂ چشم کا منتظر رہتا ہوں، میری یہ حالت تھی کہ علی گڈھ کے ایک رئیس نے مجھ سے ملنا چاہا، اور اس غرض سے اپنی گاڑی بھیجدی، لیکن میں نے صاف کہدیا کہ اگر ان کو ملاقات کا شوق ہے تو خود آئیں، میں نہیں جا سکتا"

ایک بار حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس و تاجر کانپور نے ندوہ میں پانچ سو روپیے دئیے، مولوی عبد السلام صاحب ندوی اُس وقت الندوہ کے سب اڈیٹر تھے، انھوں نے اپنے شذرات میں اس کا ذکر منت پذیری کے ساتھ کیا، اور اخیر میں لکھا کہ " اُن کی فیاضی ندوہ کو گل بداماں کر سکتی ہے " چونکہ شذرات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا، مولانا کی طرف منسوب ہوتا تھا اس لئے مولانا نے اس کو دیکھا تو سخت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ میں اس قسم کے خوشامدانہ الفاظ کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کر سکتا،

ایک بار کسی جشن کے موقع پر ندوہ کی طرف سے نواب صاحب بہاولپور کی خدمت میں دعانامہ بھیجنے کی تحریک ہوئی، اور مولانا سے دعانامہ لکھنے کی خواہش کی گئی، تو انھوں نے اس کو سخت ناپسند کیا، اور لکھا کہ " میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ نہایت دناءت کی بات ہے کہ موقعِ جشن پر اور منگتوں کی طرح ندوہ کا وفد بھی اپنا بھجن گائے، علماء کی شرکت اسی قسم کے خیالات پیدا کرتی ہے "

کیا علی گڈھ کالج بھی ایسی بدتمیزی کر سکتا ہے"؟ (عبد الحیٔ - ۱)

عدم قبولِ احسان | خودداری اور بے نیازی نے مولانا کو ہمیشہ لوگوں کے احسانات سے سبکدوش رکھا، غریبی کی طالب علمی کے زمانہ میں تو یہ گناہ عموماً معاف ہوتا ہے، مگر وہ اس گناہ کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے اور ہمیشہ اپنے کھانے پینے کا سامان خود کیا، اُن کے والد جو کچھ ماہوار بھیجتے تھے، اسی میں جس طرح بن پڑتا تھا بسر کرتے تھے، طالب علمی کے بعد جب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوئے تو والد ماجد کو بھی زحمت دینے سے احتراز کیا، حیدرآباد کے وظیفہ کے لئے تو بے شبہہ انھوں نے بعض احباب کا احسان اٹھایا، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے کسی سے معمولی سے معمولی احسان کا اٹھانا بھی گوارا نہیں کیا، ممالکِ اسلامیہ کے سفر کو روانہ ہونے لگے تو اپنے والد سے بھی مالی امداد قبول نہیں کی، اور نہیں چاہا کہ اُن کی وجہ سے کوئی دوسرا زیر بار ہو، بعض بزرگوں نے اس پر بھی ان کے قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ان کے پاس روپیے بھیجے، تو واپس کر دیئے، واپسی کے بعد ریاست رامپور نے سفر کے کل مصارف ادا کرنے چاہے، تو اس سے بھی انکار کیا،

لکھنؤ میں نواب سید علی حسن خاں مولانا کے بہت بڑے دوست بلکہ بہت بڑے معتقد تھے، وہ بہت چاہتے تھے، کہ مولانا سال میں چند مہینے ان کی کوٹھی میں قیام کریں، لیکن مولانا نے اس کو کبھی پسند نہیں کیا، بمبئی میں اگرچہ مکانات بہت گراں ہیں، اور بعض حالات میں بہ مشکل ملتے ہیں، لیکن مولانا نے وہاں بھی کسی دوست یا کسی تاجر کے یہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، ایک دفعہ بمبئی میں ایک رئیس نے ان کو اپنے یہاں ٹھہرانا چاہا، لیکن انھوں نے

اس کو منظور نہیں کیا، بمبئی سے چار مہینہ کے لئے حیدر آباد گئے، تو وہاں بھی کرایہ کا مکان لیا،

اگر کسی موقع پر اُن کے ساتھ کوئی سلوک کرتا، تو جہاں تک ہوتا وہ اس کا معاوضہ ادا کرتے اور اس کے احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے، سفرِ قسطنطنیہ میں حسین آفندی جو پہلے سفیر بمبئی رہ چکے تھے، مولانا کے ساتھ نہایت حسنِ اخلاق سے پیش آئے تھے، مولانا نے وہیں اُن کے احسانات کی گرانباری کو محسوس کیا، اور اُن سے سبکدوش ہونے کے لئے اپنے والد کو لکھا: "اُن کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گرانبار کر دیا ہے، اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اس لئے عرض ہے کہ نہایت اہتمام، نہایت تلاش، اور جدّ وجہد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمائیے، کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے، جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت فرمایشی بنوا کر لائے، یہاں ہندوستان کے ظروفِ گلی آتے ہیں، مگر اچھے نہیں آتے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان، مگر نہایت عمدہ عمدہ فردی بوٹیاں ہوں، نہایت باریک، اور نازک کام ہو، اور تیس روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، خواجہ عزیز اللہ صاحب کی معرفت اگر خرید اجائے تو غالباً اچھا ہوگا، میں یہاں آخر اگست تک رہوں گا، اس وقت تک آجائے، یہ بھی نہ ہو تو مراد آباد کا کوئی برتن، مگر نہایت عمدہ، غرض کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے" (مکاتیب)

راستبازی بیانِ واقعہ میں راست گوئی اور راست بازی اُن کی عادت تھی، وہ کسی کی غیبت و حکایت و شکایت نہیں کرتے تھے، اور یہ طریقہ اُن کو سخت ناپسند تھا، وہ جس زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے علما کے لئے اس وقت سب سے زیادہ آسان، اور سب سے زیادہ کامیاب ذریعۂ معاش جو تھا، وہ وکالت کا پیشہ تھا، مولانا نے بھی اگرچہ اعزہ و احباب، بالخصوص والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا، لیکن اُن کی فطری راست بازی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ

وہ اس پیشہ کے لئے ناموزوں ہیں، اور ایک موقع پر جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے خود اُن کے والد کو یہ کہنا پڑا، کہ بس آپ وکیل بن چکے"

اسی وکالت کے زمانہ میں پیشۂ وکالت کے متعلق جس کو انھوں نے مجبوراً اختیار کیا، لکھتے ہیں:" مگر چہ کنم کہ والد قبلہ را جُز بہ وکالت روے ورا ہے نیست و بہ ایں آزادۂ ذلی اگر بہ وکالت نہ ساختہ باشم در نظرِ انصاف مرا دریں میانہ گناہے نخواہد بود، آہ ازاں ہنگام کہ دولت روے گرداند، و کار بدستِ من افتد، و دراں آشوب دل برجا نہ دارم و خواست و ناخواست روے بہ وکالت آرم خویش را اندازہ نہ نہم و مرُماں را بہرزۂ ولافِ فریب وہم و ایں خواری بہ خویش در پذیرم (مکاتیب)

وکالت کے پیشہ پر ان کی یہ تنقید اُنکی فطری راست پسندی کی غماز ہے،

بالآخر وکالت چھوڑکر علی گڈہ گئے، اور وہاں معمولی اسکول کی مدرسی قبول کرلی جس کی تنخواہ للعہ ماہوار تھی، اگرچہ مولانا کی خودداری اس کو بھی پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انھوں نے دروغ بافی پر اس کو ترجیح دی،

سفارشوں میں جھوٹ بولنا یا مبالغہ کرنا عموماً بُرا نہیں سمجھا جاتا، مگر وہ اس باب میں بھی بہت محتاط تھے اور وہیں تک کہتے یا لکھتے تھے جو اُن کے نزدیک صحیح ہوتا، اُن سے جب کوئی شخص کوئی خلافِ قیاس بات روایت کرتا تھا تو وہ محدثانہ اصول سے اس سے مواخذہ کرتے تھے اور اُس کا سلسلۂ روایت دریافت کرتے تھے اور اس پر تنقید کرتے تھے، اور یہ واقعہ ہر دوسرے تیسرے دن ضرور ہی پیش آیا کرتا تھا،

سفارشوں میں احتیاط سفارش نیکی کا کام ہے، مگر درحقیقت یہ ایک قسم کی شہادت بھی ہے، اس لئے

اس میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے، عام لوگ اس کی نیکی ہی کے پہلو کو دیکھتے ہیں، دوسرے سے
چشم پوشی کرتے ہیں، مولانا کا عمل اس کے برخلاف تھا، اس میں ایک تو اُن کی خودداری کو دخل
تھا کہ وہ اس کو بھی امرا کے سامنے اظہارِ حاجت ہی سمجھتے تھے، جس سے ان کو ہمیشہ اجتناب رہا،
وہ جس قدر صاحبِ اثر تھے اور جس قسم کے لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کے ذریعہ سے اگر
وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے، تو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے، لیکن جس طرح انھوں نے اپنے لئے
کسی کے سامنے زبانِ سوال نہیں کھولی، اسی طرح اپنے اعزہ و احباب کے لئے بھی کسی سے سفارش
کرنا پسند نہیں کیا، حامد اُن کے اکلوتے بیٹے تھے، اور مدتوں نائب تحصیلداری تک پہنچنے کی کوشش
کرتے رہے، لیکن مولانا نے ان کو اس میں کسی قسم کی مدد نہیں دی، چنانچہ مولوی سید ابوظفر صاحب
ندوی کو جنھوں نے اُن سے سفارش کی خواہش کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں: "بات یہ ہے کہ
میں نے اپنے بیٹے کے لئے بھی کبھی سفارش نہیں کی، لیکن موقع آجائے تو ہر طرح کی تائید کر سکتا ہوں" (۹)

مولانا کے والد لوگوں پر اس قسم کے احسانات بہت کیا کرتے تھے، لیکن مولانا فرماتے تھے
کہ مجھے تعجب آتا تھا کہ وہ حکام سے اس طرح لوگوں کی سفارشیں کیا کرتے تھے کہ گویا معمولی بات
چیت کر رہے ہیں، ایک خط میں نواب محسن الملک کو جو اپنے کالج کے طالب علموں کے لئے
ہر قسم کی سفارشوں کے لئے تیار رہتے تھے، یہ لکھا: "رہا قوم کی خدمت تو اس کی یہ تدبیر نہیں کہ جھوٹی
سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دیجائے، اُنکو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں" (مکاتیب اول محسن الملک)
فرمایا کرتے تھے کہ جھوٹی سفارش کر کے ایک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے، اور سیکڑوں کو نقصان،
اس سے یہ معلوم ہوا کہ خودداری کے علاوہ لوگوں کی سفارش نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ

یہ بھی تھی کہ جب تک اُن کو کسی شخص کی اہلیت و قابلیت پر کافی اطمینان نہیں ہوتا تھا وہ اس کے
لئے سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور سفارش نامہ میں صرف اس قدر لکھتے تھے جتنا ان کو صحیح طور
پر معلوم ہوتا تھا۔ محض سُنی سنائی باتوں کی بنا پر یا ایشیائی حسن ظن و حسن اخلاق کی بنا پر وہ کسی کی
سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مولوی منصور احمد صاحب ایم اے علی گڈھ سے تحصیل عربی کے لئے
یورپ جا رہے تھے، اور سرکاری وظیفہ کے لئے سند چاہتے تھے، اگرچہ اُن کو خود ڈاکٹر ہارویز سرٹیفکیٹ
دینے والے تھے، لیکن انھوں نے مولانا سے بھی سند لینا چاہی، اور چونکہ وہ مولانا کے مذاق طبیعت
سے واقف تھے، نمونہ کے طور پر عربی عبارت بھی لکھ کر بھیجی، اس کے متعلق مولانا، مولوی
ضیاء الحسن ندوی کو جو اس وقت کالج میں تھے، لکھتے ہیں: "عربی عبارت تو بہت معمولی ہے، اس سے
گئی گذری اور کیا ہوتی، سرٹیفکیٹ لکھوں گا تو یہ لکھوں گا، کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں"۔ (مکاتیب
دوم ضیاء الحسنؒ)

البتہ جو لوگ علمی مذاق رکھتے تھے، یا علمی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے وہ اس سے مستثنیٰ تھے، اور
یہ مولانا کی علم پروری کی سب سے بڑی دلیل ہے، انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے کبھی سفارش نہیں
کی، لیکن اپنے فرزندانِ روحانی کی سفارش میں کبھی دریغ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ان کے لئے عمدہ
مواقع کی تلاش میں رہے، ۱۹۰۸ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ایک مدرس کی جگہ خالی تھی، راقم
نے آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کی وساطت سے درخواست
دی، اور کلکتہ جانے لگا، مولانا نے سنا تو پاس بلوایا، اور از خود مولوی سید شرف الدین صاحب کے نام
ایک تعارفی خط لکھ کر دیا، جس میں راقم کا ذکر اچھے لفظوں میں فرمایا تھا، جامعہ عثمانیہ میں بھی میرے

لئے سفارش فرمائی تھی (سلیمان ۲۴) لیکن جب اس کا موقع آیا اور ناظم تعلیمات سرکار نظام (الماللطیفی صاحب) نے مجھے بلانا چاہا تو مولانا کا انتقال ہو چکا تھا، اور میرے سر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی، اس لئے انکار کرنا پڑا، دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری پر راقم کا تقرر مولانا ہی کی سفارش بلکہ کوشش سے ہوا، مولوی عبدالسلام صاحب کے لئے بھی مولانا نے بھوپال وغیرہ میں سفارشیں کیں، مولوی عبدالباری صاحب ندوی علی گڈھ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، مولانا نے اُن کیلئے بھی سفارش کی، اور وہ وہاں سے چلے گئے، تب بھی وعدہ کیا کہ آیندہ مراحل کے لئے بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ موجود ہوں۔"

اسی طرح جن لوگوں کی لیاقت وقابلیت پر اُن کو اعتبار تھا اُن کی سفارش پوری قوت سے کرتے تھے،

مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کو علی گڈھ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری مولانا ہی کی سفارش سے ملی، دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی پر اُن کا تقرر مولانا ہی کی کوشش سے ہوا،

مولوی عبدالحکیم صاحب شرر حیدرآباد سے علیحدہ کئے گئے تو بھوپال میں اُن کے لئے پُرزور سفارش کی،

کالج میں نائب ناظم دینیات کی تجویز ہوئی، اور اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی خدمت میں حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کے لئے سفارش چاہی گئی، تو مولانا نے اُن کو لکھا

"مولوی محمد اسلم جیراج پوری کی مجھ سے سفارش چاہی گئی ہے، میں صرف اُن کی نیک بختی کا حال جانتا ہوں باقی معلومات مذہبی اور پابندی فرائض کو آپ خود تحقیق کریں، مجھ کو علم نہیں۔" (مکاتیب اوّل شروانی)

ردوکد سے احتراز | مولانا کے متعلق اخبارات میں رطب ویابس بہت کچھ لکھا جاتا تھا ان کی تصنیفات پر بعض لوگ مخالفانہ ریویو بھی لکھا کرتے تھے، اُن کی متعدد کتابوں کا رد بھی لکھا گیا لیکن وہ کسی کا جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک بار مولانا نے مسئلۂ ارتقا پر ایک فلسفیانہ مضمون لکھا، اس پر بعض مذہبی حلقوں میں شورش پیدا ہوئی، اور بعض اشخاص نے سخت لہجے میں اس پر اعتراضات کئے، مولانا حسبِ عادت خاموش رہے لیکن راقم نے قرآن مجید اور مسئلہ ارتقا کی سرخی سے ایک مضمون لکھا جس میں ثابت کیا کہ یہ مسئلہ قرآن مجید کے مخالف نہیں، اگرچہ یہ مضمون مولانا کے قلم سے نہیں نکلا تھا، تاہم اُن کو ناگوار ہوا، اور مجھے لکھا:- "ارتقا پر جو مضمون تم نے لکھا، گو میں نے نہیں لکھا، اور ممکن ہی کہ اچھا ہو، لیکن میری ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی، تمنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں، یہ کون یقین کرے گا کہ تم نے لکھا ہو سب میری طرف منسوب کرینگے۔" (مکاتیب سلیمان)

علم الکلام اور الکلام پر ایک "طالب علم فلسفی نے رسالہ "الناظر" لکھنؤ میں نہایت سخت تنقید لکھی، جس کو پڑھ کر میں بےچین ہوگیا، اور اسی عالم میں مولانا کے پاس پہنچا، میں اپنی نادانی سے یہ سمجھے تھا کہ جب مجھے اتنا غصہ ہے تو خدا جانے مولانا کا کیا حال ہوگا، وہاں پہنچا تو دیکھا، دریا کی پوری طرح ساکن ہی، مگر پھر بھی یہ عرض کیا کہ اس کا جواب لکھا جائے، ارشاد ہوا "جو وقت اس جواب میں صرف کیا جائے، اسی میں کوئی دوسرا نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے؟"

دکن ریویو میں جب وہ حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا، مولانا کے بعض شاگرد جن کو ان سے کدسی ہوگئی تھی، ان کے مضامین اور تصنیفات پر نہایت بدنما تنقیدیں لکھتے رہے، مگر انھوں نے کبھی اُلٹ کر نہیں دیکھا،

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بیجا ان پر اعتراض کریں، مگر کبھی انھوں نے اس کے سوا کہ "یہ الزام صحیح نہیں" اُن سے کچھ اور نہیں کہا، (ہمارے معاصرین مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سید علی بلگرامی) سیرت نبویؐ کے دیباچہ پر جب لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب نے اعتراضات کئے، اگرچہ بعض مصالح کی بنا پر مولانا نے اس کا جواب لکھا، لیکن اپنے نام سے چھپوانا پسند نہیں کیا، اور اسکی وجہ یہ لکھی کہ "........ کو میں مخاطب نہیں کر سکتا، اس لئے کسی اور کے نام سے وہ چھپ سکتا ہے، میں اپنے نام سے نہیں چھپوا سکتا، غرض اظہارِ حقیقت ہی، نہ اظہار نام"

ابتدائے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے المامون پر جو اعتراضات کئے تھے، مولانا نے صرف اس کا جواب لکھا، اس کے علاوہ انھوں نے کسی ریویو کا جواب لکھنا پسند نہیں کیا، اور یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خود مولانا شروانی فرماتے ہیں "اڈیٹر اخبار آزاد لکھنؤ کے اصرار کا" مولانا شروانی کا بیان ہے کہ "غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا ؎

رسی آنگہ بدرد ما کہ چو ما خامہ گیری و حرف بنگاری

ندوہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں جب بعض ارکانِ ندوہ کے غلط الزامات سے اُن کو قلب حقیقت کا خوف ہوا تو بے شبہہ اخبارات میں ایک دو صاحبوں کی تحریروں کا جواب دیا جو مقالات میں شامل ہے،

صفائی پسندی مولانا باوجود سادگی کے نہایت صفائی پسند تھے، کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے

اور ہفتہ میں کئی بار بدلتے تھے، بعض لوگ جو نمائشی صفائی پسند ہوتے ہیں، یہ کرتے ہیں کہ اوپر سے صاف کپڑے پہن لیتے ہیں، اور نیچے میلی بنیائن، یا میلا کمر بند رہنے دیتے ہیں، ایک دفعہ ایک ملازم نے یہ حرکت کی، تو سخت برہم ہوے، فرماتے تھے کہ "رات دن ایک ہی کپڑا پہننے سے جلد میلا ہوجاتا ہے، اس لئے ایک بار میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی دوسرا کپڑا پہن کر سویا کروں، لیکن پھر خیال ہوا کہ آخر وہ بھی تو میلا ہی ہوگا اور گو اُس پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے، لیکن خود میری طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی"؛ جس کمرے میں رہتے تھے وہ باوجود سادگی کے نہایت صاف و شفاف رہتا تھا، اُس میں روزانہ جھاڑو دلواتے تھے، اور ہر چیز کو صاف کرواتے تھے، ندوہ کے کسی جلسہ میں گئے تھے تو ایک حجرہ ٹھہرنے کے لئے ملا، چونکہ کوئی ملازم ساتھ نہ تھا، اس لئے خود ہی جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔ لوٹا ملازم سے روزانہ منجواتے تھے، خود پان نہیں کھاتے تھے، اور پان کھانے والوں سے سخت نالاں رہتے تھے، اگر کوئی شخص پان کھا کر ان کے مکان میں تھوک دیتا تھا تو سخت منغص ہوتے تھے، اور اس کو چھلوا ڈالتے تھے،

گنا یا آم کھاتے تو ملازم سامنے ایک طشت رکھ دیتا، اسی میں چھلکے اور گٹھلی رکھتے جاتے، زمین پر نہ پھینکتے، ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو فرمایا: "آپ چھلکے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے؟" انھوں نے کہا "بھنگی آئے گا تو اٹھالے جائے گا"؛ بولے کہ "مولوی پہلے لکھتے ہیں، پھر مٹاتے ہیں"؛

کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے، اُن کے دسترخوان پر چمچہ بلکہ کبھی کبھی چھُری کانٹا بھی ہوتا، اور اسی سے بوٹیاں اور ترکاریاں وغیرہ کھاتے، بدبو سے سخت نفرت تھی، اور اسی لئے حقہ

پینے والوں کے پاس بیٹھنے سے سخت بیزار ہوتے تھے، پان کثرت سے چبانا یا تمباکو ڈالکر کھانا سخت ناپسند تھا۔

نفاست پسندی: مولانا اپنی سادگی کے باوجود بہت نفاست پسند تھے، اور اس کا اثر اُن کی ایک ایک چیز سے نمایاں ہوتا تھا۔ مسودات ہمیشہ سفید اور فلسکیپ کاغذ پر لکھتے تھے، میز پر قلم، دوات، نب وغیرہ ہمیشہ عمدہ قسم کی رکھتے تھے مسودات نہایت خوشخط کاتب سے صاف کرواتے تھے، فرماتے تھے کہ جتنا زیادہ صاف اور خوشخط ہو اسی قدر اُس کے بنانے میں جی لگتا ہے، کتاب ہمیشہ بہتر سے بہتر چھپواتے تھے، یورپ اور بیروت کی عمدہ چھپی ہوئی کتابوں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے اور اس کی نہایت خوشنما جلد بندھواتے تھے۔ مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار بمبئی میں میرے سامنے اغانی خریدی، اور جلد بندھنے کے لئے دی، جلد ساز جلد بھدی باندھ کر لایا، تو سخت برہم ہوئے۔

مولانا میز پر لکھنے کے عادی تھے، میز پر بانات جڑا رہتا تھا، ایک دفعہ یہ بانات میلا ہو گیا تھا، یا کوئی داغ پڑ گیا تھا، تو طبیعت میں وہ انشراح نہیں رہا جو ایک مصنف کے لئے درکار ہے، بڑھئی نہ ملا، اتفاق سے ایک طالب علم (مولوی سید محمد صاحب ندوی رائے بریلوی اور اب ایم اے) اُس وقت موجود تھے، اُن کو اس قسم کے کاموں کا ذوق تھا، بازار سے کپڑا آیا، اور اسی وقت انھوں نے پیچ سے میز کی گوٹ کھولی، اور پرانا کپڑا نکال کر نیا کپڑا منڈھا، تو اُن کو خوشی ہوئی اور فرمایا کہ "اب لکھنے خوب بنے گا"۔

کپڑے اگرچہ بہت گراں نہیں پہنتے تھے لیکن نفاست کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا۔

کھانے کی خوبی کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ خوش ذائقہ ہو بلکہ یہ بھی لازمی تھا کہ خوشرنگ

ہو اور سلیقہ کے ساتھ دسترخوان پر چنا جائے،

اسی نفاست پسندی کی بنا پر لکھنؤ کے تمدن کو دلی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے،

چاے ہمیشہ سادی پیتے تھے اور اس میں بہتر سے بہتر دانہ دار انگریزی شکر بلکہ کبھی کبھی مصری ڈالتے تھے، فرماتے تھے کہ دودھ ڈالنے سے چاے کی لطافت چلی جاتی ہے،، وہ دیسی شکر اگرچہ میٹھی زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس میں ایک قسم کی ہیک ہوتی ہے، ہندوستانی عطر کی تیزی کو ناپسند فرماتے تھے، ہلکا انگریزی عطر البتہ انگیز کر لیتے تھے (اگرچہ استعمال نہیں کرتے تھے) فرماتے تھے کہ اسکی خوشبو میں لطافت ہوتی ہے، ایک دفعہ میں نے غسل کیا تھا، کپڑے بدلے تھے، اور کوئی تیز ہندوستانی عطر لگایا تھا، اور اس شان سے اُن سے ملنے گیا، بیٹھا ہی تھا کہ فرمایا "تم نے عطر لگایا ہے، کیسی سخت بو ہے"! میں نے چاہا ہٹ کر دور بیٹھوں، فرمایا "اس سے کیا ہوتا ہے"؛

خاکساری مولانا باوجود خودداری کے بیحد خاکسار تھے، ہر قسم کے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے تھے اور اُن سے گھنٹوں بات چیت کرتے تھے، اعظم گڈہ میں ایک جلد ساز تھے، جو مولانا کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے، اخیر عمر میں اعظم گڈہ میں قیام کیا تو اُن سے روزانہ صحبت رکھتے تھے جب کبھی وہ نہ آتے تو اُن کو خود بلواتے تھے،

لکھنؤ میں رہتے تھے تو منشی محمد علی صاحب محرر دار العلوم کے کمرے میں اکثر جا بیٹھتے اور چاے پیتے، تمام طلبہ سے بے تکلف ملتے، اور اُن کی عیادت کرتے، امین آباد اور چوک میں بے تکلف جاتے، کبھی کبھی بعض دوکانوں پر بھی بیٹھ جایا کرتے،

جس زمانہ میں علاقہ کا انتظام کرتے تھے، اُس وقت راجپوت وغیرہ جو اسامی تھے آتے تھے

تو زمین پر بیٹھتے تھے لیکن مولانا خود ہی اُن کو برابر بٹھاتے تھے،

کبھی مکان پر جاتے تو تمام اعزہ و احباب کے مکان پر جا کر اُن سے ملاقات کرتے،

ایک دفعہ لکھنؤ میں گولہ گنج کی ایک سڑک پر جہاں دار العلوم تھا مدرسہ سے نکل کر وہ اپنے قیامگاہ (مکان نواب مرشد آباد جو اِن دنوں اخبار حق کا دفتر ہے) پر جا رہے تھے، راقم الحروف ساتھ تھا، اتفاق سے کچھ دیہاتی مسلمان دھوتی باندھے پیچھے سے آ رہے تھے، جب وہ میرے برابر آئے تو چپکے سے مجھ سے پوچھا کہ "مولوی شبلی یہیں ہوں"؟ میں نے کہا ہاں، وہ آگے بڑھ گئے، مولانا نے فرمایا یہ کیا کہتے تھے، میں نے کہا پوچھتے تھے کہ مولوی شبلی صاحب یہی ہیں، یہ سنکر مولانا مسکرائے اور فرمایا خدا کی قسم مجھے ان کے اتنے سے فقرہ سے جو خوشی ہوئی وہ بڑوں بڑوں کی تعریف سے نہیں ہوئی

مسلم لیگ سے اختلاف کے زمانہ میں کسی نے راجہ صاحب محمود آباد کی نسبت ان سے یہ کہا کہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں شبلی کو تباہ کر دوں گا تو جواب میں کہلایا کہ راجہ صاحب مجھے آپ تباہ نہیں کر سکتے کیونکہ میں زمین کی گھاس ہوں آندھیاں اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں، زمین کی بے قدر گھاس کو نہیں[1]،

عموماً معمولی کپڑے پہنتے تھے، کھری چارپائی اور چٹائی پر بیٹھتے تھے، آرایش اور تکلف سے پاک رکھو

مخصوص اوقات میں خلوت پسندی

شہرت نے اگرچہ مولانا کو شمع محفل بنا دیا تھا، بہت سے لوگ اُن سے ملنے آتے تھے، وہ خود جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے، یار باش اور

---

[1] حدیث شریف میں مسلمان کی تمثیل میں بھی یہی آیا ہے، مثل المومن کمثل الزرع لا تزال الریاح تفیئہ ولا یزال المومن یصیبہ بلاء ومثل المنافق کمثل شجرۃ الارز لا تھتز حتی تستحصد (ترمذی ابواب الامثال)

احباب پسند تھے، مگر کام کے اوقات اور سونے کے وقت میں اُن کو خلوت ہی پسند تھی، کام کے اوقات، اور آرام کے گھنٹوں میں کسی شخص کا وجود بلکہ تخیل بھی اُن کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا تھا، رات کو جیسا کہ پہلے گذر چکا ہمیشہ کمرے میں تنہا سوتے تھے، اور کتنا ہی بڑا مکان ہو لیکن اس میں کسی دوسرے کو سونے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دوسرے شخص کے تخیل سے بھی مجھے نیند نہیں آسکتی۔

بعض اوقات بعض لوگ ان سے ملنے آتے، اور دیر تک بیٹھے رہتے، تو اُن کو سخت تکلیف ہوتی، خود فرماتے تھے کہ "میں نے عجیب متضاد طبیعت پائی ہے، احباب کی صحبت لازمی ہے، لیکن چند مخصوص گھنٹوں میں بالکل تنہائی ہونی چاہئے"۔ صحبت کے لئے چار بجے شام سے آٹھ بجے شب تک کا وقت مخصوص تھا، ان کے دروازے پر جلی قلم میں لکھا ہوا یہ اعلان چسپاں رہتا تھا کہ "چار بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں"۔

بمبئی کو انھوں نے جن اسباب کی بنا پر پسند کیا تھا، ان میں ایک خلوت گزینی بھی تھی، فرماتے تھے کہ "یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے، اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے"۔ ([illegible]) اسی خلوت گزینی کی بنا پر بعض اوقات بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:- "بمبئی میں سارا دن کام کے لئے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لئے برس دن تک یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں"۔

انظہار رائے میں بیباکی | مولانا اپنی جو رائے قائم کر لیتے تھے، اس کے اظہار میں بے باک تھے، جو لوگ اس رائے کے مخالف ہوتے تھے، اُن کے دلائل کا رد بھی اسی سختی سے کرتے تھے، مولانا شروانی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:- "دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں، لیکن دوستوں کی مروت

کبھی اُن کو رسمی تملق اور چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی، عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے، مخالفین کی مخالفت سے روبرو نہیں رُکتے تھے، مگران کے پس پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے، جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے، مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے، باوجود اسکے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل ورسوا کرتے "

جس زمانہ میں وہ علی گڈہ تشریف لے گئے، تمام کالج بلکہ تمام قوم پر سید صاحب کا اثر محیط تھا، اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ جب سید صاحب نے کانگریس کی مخالفت کی تو دفعتہً تمام قوم سیاسیات میں حصہ لینے سے الگ ہوگئی، اور ایک مدت تک الگ رہی، لیکن مولانا جیسا کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے، اسی وقت سے سید صاحب کی اس پالیسی کے شدت کے ساتھ مخالف تھے، اخیر میں انھوں نے پالٹکس پر جو آزادانہ نظمیں اور آزادانہ مضامین لکھے اُن کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمانہ اور قوم کی موجودہ روش کا نتیجہ تھے، اور مخالفین اس کو جاہ پرستی اور شہرت طلبی پر بھی محمول کرتے تھے، لیکن درحقیقت اُن کو ابتدا ہی سے اس پالیسی سے نفرت تھی، اور اس وقت سے اخیر دم تک وہ اپنی اس رائے پر قائم رہے،

اس وقت قدیم عربی نصاب کی مخالفت کرنا، اور ایک عربی مدرسہ میں انگریزی اور علومِ جدیدہ کا داخل کرنا ایک ایسا کام تھا، جو ایک شخص کو تمام علماء کی لعنت و ملامت کا آماجگاہ بنا سکتا تھا، لیکن مولانا نے لوگوں کی مخالفت مول لی، مگر جس راستہ کو انھوں نے صحیح سمجھا اس سے پیچھے نہ ہٹے، کمزور دل کے لوگ بدنامی کے خوف سے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار نہیں

کر سکتے لیکن مولانا اس قسم کی بدنامی سے بالکل نہیں گھبراتے تھے، ایک بار ندوہ میں انگریزی کے داخل
کرنے کی تحریک مولانا نے نہایت شدومد کے ساتھ کی لیکن مولانا حبیب الرحمٰن خاں نے
جو غالباً اس جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے بحث کا موقع نہیں دیا، مولانا نے جلسہ کے بعد اُن سے
پوچھا کہ "آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں"؟ تو انھوں نے کہا: "تمھاری بدنامی کے ڈرسے"
لیکن علما رکے لئے انگریزی تعلیم کی ضرورت کی جو رائے انھوں نے قائم کر لی تھی اس پر برابر
اڑے رہے، اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے، ندوہ میں انگریزی تعلیم داخل ہوئی، اور اب بہت
سے مدرسوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے، اور بے تکلف مولوی سیکھ رہے ہیں، مگر یہ سارا فیض
اُن ہی کے استقلال رائے کا ہے۔

سچائی کے مقابلہ میں وہ عوام کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،
"میرا اصول یہ ہے کہ انسان ہر کام کے نقص وہنر کا خود فیصلہ کر سکتا ہے، اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً
عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے"۔

اور اگر اُن کے سامنے کبھی یہ تذکرہ آتا، کہ فلاں کام سے فلاں شخص ناراض ہو جائے گا، تو
فرماتے تھے، کہ "میں یہ کب چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے" اور اس کے ساتھ یہ شعر
بھی پڑھتے تھے،

زندگانی بہ مراد ہمہ کس نتواں کرد　　خاطر یک دو کس ار شاد شود از تو بس است

علم کلام کے سلسلہ میں بعض مذہبی مسائل کی تشریح میں اپنا راستہ عام شاہراہ سے الگ اختیار
کیا، اور جن باتوں کو امام غزالی اور امام رازی نے صرف خلوت میں کہا تھا، اُن کو علانیہ برسرِ عام

ظاہر کیا، جس کی بدولت اُن پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، مگر اس کی کچھ پروا نہ کی، البتہ جب آخر میں سیرت نبوی کی تاثیر سے ان میں انقلابِ حال پیدا ہوا تو صورت اور ہو گئی،

وہ فقہی مسلک میں حنفی تھے، اور نہایت سخت حنفی تھے، اس کے بعد کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر سے سب کچھ بن گئے، مگر بہر حال وہ حنفی ہی رہے، اور عمر بھر اپنی حنفیت کا اعلان کرتے رہے،

سادگی — مولانا کا خاندان ایک آسودہ خاندان تھا، اُن کے والد بہت بڑے وکیل تھے، اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، اُن کے تین بھائی کامیاب وکیل اور بیرسٹر، اور انگریزی طرزِ معاشرت کے دلدادہ تھے، مولانا نے کامل سولہ سال علی گڈھ کالج میں بسر کئے، جو دنیوی جاہ و جلال کی تماشگاہ تھا، مدتوں حیدرآباد میں ایک معقول مشاہرہ پر ملازم رہے، جہاں کے تمدّن کا اندازہ داغ کے اس شعر سے ہو سکتا ہے،

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم — یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

اس بنا پر خیال ہو سکتا ہے کہ اُن پر بھی اس طرزِ معاشرت کا اثر پڑا ہوگا، اور انھوں نے اس قدیم سادگی کو کھو دیا ہوگا، جو گروہِ علماء کا تمغۂ امتیاز ہے،

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا فطرۃً نہایت سادگی پسند تھے، اور ہمیشہ اپنے معتقدین و تلامذہ کو سادگی کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ خود داری اور بلند ہمتی کی وجہ سے وہ کسی سوسائٹی میں پست ہو کر رہنا نہیں چاہتے تھے، اس بنا پر وہ حیدرآباد میں کسی قدر تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں: - "مجھ کو سرِ دست صمار اور ہوا دار سوزیادہ نہیں مل سکتے، اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی جاتی ہے، خرچ بڑھتا جاتا ہے، البتہ اگر یہاں

کی سوسائٹی میں تبذل، بدحیثیت بے وقعت ہوکر رہوں، تو پس انداز ہوسکتا ہے"۔ (محسن الملک - ا)

تاہم وہ طبعاً سادگی کی طرف مائل تھے، اور ابتدا سے انتہا تک انھوں نے اس شان کو قائم رکھا، اُن کو نہایت کثرت سے سفر کرنے پڑتے تھے، لیکن اُن کا خود بیان ہے کہ میں نے سفر میں ملازم ساتھ نہیں لیا، تنہا گھوما کرتا تھا، قسطنطنیہ کے طویل سفر کے لئے اگرچہ اعزہ واحباب نے باصرار کہا،

"لاجرم خادمکے نیز بہ ہمراہ بہ بر"

لیکن مولانا یکہ وتنہا روانہ ہوگئے،

مولانا صحرائیت وفضائیت کے بہت دلدادہ تھے، اس لئے اگرچہ مکان وسیع، پُرفضا اور خوش منظر پسند کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ ان کو دوسرے قسم کے زیب وزینت اور سامانِ آرایش کی کچھ پروا نہ تھی، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ان کو کانپور میں مسجد کے ایک حجرے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھا تھا، ندوہ میں مدتوں وہ اوپر کے ایک کمرے میں مقیم رہے، فرنیچر کی کل کائنات ایک چٹائی، ایک فرش، اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی، البتہ صحن کسی قدر وسیع تھا، اور اِدھر اُدھر فضائیت تھی، اس کے بعد انھوں نے کرایہ کا ایک بڑا مکان لیا، جس میں متعدد کمرے تھے لیکن اُن کی ضروریات کے لئے صرف ایک کمرہ تھا، بقیہ میں طلبہ اور بعض مدرسین رہتے تھے، اخیر میں امین آباد پارک کے ایک بالائی کمرے میں اٹھ آئے تھے، جس کا کرایہ عہ رہا ہوا تھا، لیکن پارک کی فضائیت کے اس قدر شیفتہ تھے کہ فرماتے تھے کہ ایسی کوئی جگہ بمبئی میں بھی نہیں، ایک بار یہ دیکھ کر کہ بڑے بڑے لوگ اُن کے پاس آتے ہیں، اس کمرے کو فرنش بھی کیا، ایک دری

اور ایک قالین، متعدد کرسیاں منگوائیں، لیکن جب "خدام الدین" کی جماعت قائم کی، اور ان کو زہد وتقشف، اور سادہ زندگی اختیار کرنے کی طرف مائل کیا تو کرسیاں دفتر سیرت نبوی کو دیدیں، اور دری اپنے فرزند محمد حامد صاحب کو عنایت کی، اور خود ایک چٹائی پر بیٹھنا پسند کیا، فرماتے تھے کہ ایک میز اور ایک کرسی تو البتہ میرے لئے لازمی ہے کہ بغیر اس کے لکھ نہیں سکتا، اور تمام چیزیں غیر ضروری ہیں،

کپڑے بھی نہایت سادہ پہنتے تھے، کپڑوں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی، سات آٹھ سپید پائجامے، اسی قدر سپید کرتے اور تین چار سرد اور گرم شروانیاں، اور یہ کپڑے کوئی بہت زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتے تھے، عمامہ اور عبا کا استعمال صرف مخصوص جلسوں میں کرتے تھے، اور غالباً یہ چیزیں کسی قدر گراں قیمت ہوتی تھیں، اخیر اخیر میں تو طبیعت سادگی کی طرف بے انتہا مائل ہوگئی تھی، ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب سے فرمایا کہ دگلے کے لئے مجھے کوئی چھینٹ لادو، وہ ہم گز کی ایک نقلی جامہ وار لے گئے، وہ دل میں ڈر رہے تھے کہ اگر یہ ناپسند ہوئی تو مجھ پر جھلائیں گے، لیکن اس کو بار بار ادھر ادھر سے دیکھ کر فرمایا کہ "ہاں نہایت عمدہ ہے، اب اس سے بہتر کپڑا دگلے کے لئے کیا ہوسکتا ہے" چنانچہ اسی کا دگلا بنوایا، اور دو سال اسی کو پہنتے رہے، ایک بار تو شیروانی وغیرہ سب بالائے طاق رکھدی تھی اور صرف ایک کرتہ، ایک صدری، اور میرٹھ کی ٹوپی استعمال کرنی شروع کی تھی، ندوہ کے جس جلسۂ انتظامیہ میں مولانا پر کمیشن بیٹھا تھا، اس میں مولانا اسی وضع میں گئے تھے، فرماتے تھے کہ "اس لباس نے مجھ میں کچھ ایسا انکسار پیدا کردیا تھا کہ میں خاموش تمام لوگوں کا منھ دیکھتا رہا، شروانی پہننے سے بدن میں جو چستی پیدا ہوتی تھی اس کا

مطلق اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، ورنہ ایک منٹ میں تمام کمیشن ہوا ہو جاتا"

اپنے زیر تربیت طلبہ کو ہمیشہ سادہ لباس اور عالمانہ وضع اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے، اور ان کے سامنے خود اپنا نمونہ پیش کرتے تھے، وفات سے صرف ایک ماہ پیشتر اپنے ایک حوصلہ مند عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں :" افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے، میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گران زندگی ہے، جو سید صاحب سکھا گئے، ہندو اسی سے بازی لے گئے، اور قیامت تک لیجائیں گے، میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو بھی ختم کرے گی، اور انشاءاللہ اخیر زندگی تک جاؤں گا، بھائی! ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے، یہ سچ ہے کہ لوگ بدحیثیت کی وقعت نہیں کرتے، لیکن یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کو دو چار دن کا تجربہ ہو، جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا، اور رہیگا، وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے" (مسعود ۳۳)

دار المصنفین میں تعلیم و تربیت کے لئے جن طلبہ کو انتخاب کرنا چاہا، ان کے لئے یہ شرط بھی لگا دی :" وضع و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں، گو یہ جزئی بات ہے، لیکن میں شیروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قص لحیہ[1] تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں، بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو" (مسعود ۲۱)

ندوہ میں خدام دین کی جماعت اسی اصول کے مطابق قائم کی تھی، اور وہاں سے الگ ہو کر مدرسۃ سرائے میر کو تو بالکل گروکل کے اصول پر چلانے کا ارادہ کر لیا تھا،

یو پی کے گورنر لاٹوش صاحب ولایت واپس جا رہے تھے، چونکہ وہ ہر دلعزیز رہے تھے

[1] داڑھی ترشوانا

اس لئے ان کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر بڑا مجمع تھا، مولانا بھی تشریف لے جارہے تھے، لیکن
اُن کے پاس کوئی اچھی عبا نہ تھی، مجھے لکھا کہ "تمہارے پاس کوئی اچھی عبا ہو تو بھیجدو" میں نے اپنی
دو تین عبائیں بھیجدیں، مولانا نے ان میں سے ایک سبز رنگ کی عبا جس میں ریشم کی دھاریاں
تھیں، اور مدنی وضع کی تھی پسند کی، اور اس کو پہنکر تشریف لے گئے، جب میں حسب معمول
شام کو مولانا سے ملنے گیا تو فرمایا کہ آج تمہاری عبا نے مجھ کو بہت ذلیل کیا، وہاں مولوی مشتاق
حسین (نواب وقار الملک) بھی تھے، وہ چار آنے گز کی شروانی پہنے تھے، مجھے بڑی شرم آئی"

رحمدلی | وہ فطرۃً نہایت رقیق القلب تھے، اس لئے معمولی سے معمولی دردانگیز واقعہ سے اُن کا دل
بھر آتا تھا،

ایک بار اعظم گڈھ سے پالکی پر سوار ہوکر مکان جارہے تھے، راستے میں دیکھا کہ چند آدمی شدت
کے ساتھ گریہ وزاری کررہے ہیں، واقعہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ غریب کاشتکار ہیں، ان کا بیل مرگیا
ہے، فوراً ان لوگوں کو دس روپئے دیئے،

مولانا کے خاندان کے لوگ اسامیوں پر سختی کرتے، یا اُن کو مارتے پیٹتے، تو مولانا اس کو
بہت ناپسند فرماتے، کسی کی فاقہ زدگی سے سخت متاثر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر مجھے
یہ معلوم ہوجائے کہ ایک شخص فاقہ سے ہے تو میں کھانا نہیں کھا سکتا،

فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی بادشاہ کی رعایا میں ایک شخص بھی فاقہ سے رہ جائے، تو اس کو
کھانا حرام ہے،

یہ رحمدلی ہی کا اثر تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، ادھر دل پر ذرا چوٹ لگی اور ادھر

آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے،

ایک دفعہ شام کے وقت امین آباد پارک کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، مکان کے پہلو میں ایک لڑکی کا کان چھیدا جا رہا تھا، وہ بار بار چیختی تھی، تو مولانا کے چہرہ و پیشانی پر شکن پڑ پڑ جاتی تھی، جب ضبط نہ ہو سکا تو ملازم کو بلا کر کہا کہ "اس لڑکی کی ماں سے جا کر کہدو کہ اپنی لڑکی کو کیوں ذبح کر رہی ہے" مولانا سمجھتے تھے کہ ماں لڑکی کو مار رہی ہے، لیکن ملازم نے آکر کہا کہ لڑکی کا کان چھیدا جا رہا ہے،

ذکاوتِ حِس | دنیا میں جو بڑے بڑے اشخاص گذرے ہیں، وہ بیشتر نہایت شدیدالاحساس تھے اور اسی قوتِ انفعالی نے اُن کو قوم کی اصلاح، مذہب کی تجدید اور علم کی خدمت پر آمادہ کیا تھا، مولانا میں بھی یہ قوت شدت کے ساتھ موجود تھی، اور اسی قوت نے اُن کو ایک فطری شاعر، ایک پُرجوش مقرر اور ایک قومی مصلح بنایا تھا،

اس قوت کا اثر مولانا کے اخلاق و عادات کے ایک ایک جزئیات سے نمایاں ہوتا تھا، معمولی سے معمولی ناگوار واقعہ پیش آجاتا تو ان کی پیشانی پر گرہ پڑجاتی تھی، کوئی بات خلاف مزاج ہوجاتی تو سخت برہم ہوجاتے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد غصہ کافور ہوجاتا، سکون و اطمینان میں ذرہ برابر خلل پڑتا تو بدحواس ہوجاتے، رات کو سوتے تو گھڑی کے کھٹکھٹانے کی آواز ناگوار ہوتی، امین آباد میں یکہ والے چلاتے تو ناگواری ظاہر کرتے، بمبئی میں مکان لیتے تو خاص طور پر اس کا لحاظ رکھتے کہ ٹریم کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز وہاں تک نہ پہنچے، بدن پر مکھی بیٹھ جاتی تو سخت ناگواری محسوس کرتے، فرماتے تھے کہ "بمبئی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں مکھیاں نہیں ہوتیں" شوروغل

سخت ناپسند تھا، ہجوم وکشمکش سے سخت گھبراتے تھے، اور سکنڈ کلاس میں صرف اسی لئے سفر کرتے تھے اور اسی لئے دوستوں کے مکانوں کے بجاے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے، ورنہ ان باتوں سے ان کو جاہ واعزاز مقصود نہ تھا، اسی ذکاوتِ حس نے ان کو کسی قدر عجلت پسند بھی بنا دیا تھا، کسی کام کا خیال آتا تو اس کے کرنے میں نہایت عجلت سے کام لیتے، ہم لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتے تو چاہتے کہ یہ کام فوراً ہو جائے، اگر ذرا دیر ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ یاد فرماتے تو ہم سوچ کر سہم جاتے کہ کوئی کام ایسا تو نہیں کہ انھوں نے کرنے کو کہا اور ہم نے اب تک نہیں کیا، اور وہ اسی کی بازپرس کے لئے یاد فرما رہے ہوں،

جب بیگم صاحبہ بھاولپور نے ندوہ کی عمارت کے لئے پچاس ہزار روپیے عنایت فرمائے، تو ایک رات مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ندوہ کا بورڈنگ بھی تمامتر مستورات کے چندہ سے تیار ہو، یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگے، بالآخر ضبط نہ ہو سکا، اور ۳ بجے شب کو شمع جلائی، اور مستورات کے نام ایک اپیل لکھا، جس کو صبح کے وقت چھپنے کے لئے بھیجا، ایک بار اعظم گڈہ میں برسات کا زمانہ تھا، اور نیشنل اسکول کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی، ایک رات کو شدت سے پانی برسنے لگا، اور مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ پانی برس رہا ہے، عمارت کی دیواریں گر رہی ہوں گی، اس تخیل سے اس قدر پریشان ہوے کہ لحاف پھاڑ کر روئی نکالی اور کان میں ڈالی، تاکہ پانی کی آواز سننے میں نہ آئے اور پریشانی دور ہو،

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے اُن کی ذکاوتِ حس کے مظاہر کو ان کی وفات کے مضمون میں نہایت استقصاء کے ساتھ جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:- "احساس بہت شدید تھا،

اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذر نے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔

عصبیت دینی | مولانا کے مزاج میں سخت عصبیت پائی جاتی تھی، اور اس کا اثر مختلف مظاہر سے نمایاں ہوتا تھا، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی تھے، اور حنفیوں کی تائید اور غیر مقلدین کی تردید میں رسالے لکھتے تھے، اور اُن سے مناظرے کرتے تھے، مولانا کے گاؤں کے متصل ایک موضع کا نام جیراجپور ہے، یہاں مولوی سلامت اللہ صاحب ایک غیر مقلد عالم تھے، اُن کا اور مولانا کا حریفانہ مقابلہ رہتا تھا،

عام قومی حیثیت سے وہ عربوں اور ترکوں کے سخت حامی تھے، عربوں کے اس لئے کہ وہ اسلام کے منبع و ماویٰ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہیں، اور قرآن اُن کی زبان میں ہے اور ترکوں کے اس لئے کہ اُن کے زمانہ میں مسلمانوں کی عزت اور اسلام کی سلطنت اُن ہی کے دم قدم سے قائم تھی، قسطنطنیہ کے سفر میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مسٹر آرنلڈ مولانا کے ساتھ تھے، اور مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے، جہاز پر اسپین کا ایک عیسائی بھی ساتھ تھا، جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے نہایت جلتا تھا، اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت برے لہجہ میں ادا کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ یہ اونٹوں کی زبان ہے، مولانا سفرنامہ میں اس واقعہ کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں، "اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا، لیکن جو قوم ایک مدت تک ذلت کے ساتھ

عربوں کی زیردست رہ چکی تھی، عرب اور عربی زبان کے ساتھ اس کا یہ سلوک بیجا نہ تھا"

اسی سفر میں مولانا کی رگ حمیت پر ایک اور نشتر لگا، جب جہاز عدن میں پہنچا تو سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار ہو کر جہاز کے قریب آئے، اور بہت سی مبتذل حرکتیں کرنا شروع کیں، ناچے، گائے، بغلیں بجائیں، اور ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا، کہ لوگ دونی چونی، پیسے جو کچھ انعام میں دینا چاہتے تھے اس کو سمندر میں پھینک دیتے تھے، اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے تھے، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے، اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزا آتا تھا، لیکن مولانا کی حالت کچھ اور تھی، چونکہ غلطی سے اُن کا خیال تھا کہ یہ عرب کے بچے ہیں، اس لئے یہ طبعی بات تھی، کہ وہ ان کو عزّت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے، لیکن وہ انعام لینے کے لئے ایسی مبتذل حرکتیں کرتے تھے کہ یہ مولانا کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا، اُن کو عبرت ہوئی کہ عرب کی اب یہ حالت ہو گئی، کہ غیروں کے سامنے اُن کو اس قسم کے حرکات سے مطلق شرم نہیں آتی، اس لئے ان کا دل بے اختیار بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور بے اختیار زبان سے نکلا" قم یا عمر!" مسٹر آرنلڈ پاس تھے، ان کو مولانا کی تغیرِ حالت کا خیال ہوا، مولانا نے اپنے دل کی کیفیت اور اس کا سبب بیان کیا، تو انھوں نے ایک بار آنکھ اٹھا کر مولانا کی طرف دیکھا، اور چپ ہو رہے، لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے، تو مولانا کو کسی قدر تسکین ہوئی، اسی غصہ و رنج کا نتیجہ تھا کہ قصیدۂ سفریہ میں مولانا کے قلم سے اس قوم کی ہجو میں یہ اشعار نکلے :-

"مردم شہر کہ خود را بہ سمالی نامند   حیوان اند نہ بل از حیواں ہم بدتر

خوار و بدبخت و سیہ کار و سیہ چردہ و زشت
سفلہ و ممتہن و کج روش و بدگوہر

خویشتن را بہ عرب بستہ و حاشا کہ عرب
ایں چنیں خوار و زبوں شان نہ پسندد اُو

چوں زبانِ ہمہ تازی بود و ہم چو عرب
نامِ شان بستہ بود با لقبِ جد و پدر

عامیاں در غلط افتند و گماں باز برند
کہ مگر در نسب و نسل ز معد اند و مضر

تخم و ہم ریشۂ ایں نخل ز خاکِ حبش است
کہ دریں جاے بہ بار آمد و افشاند ثمر"

جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ تمدنِ اسلامی" کی تردید جن اسباب کی بنا پر کی اُن میں ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس نے عرب کی تحقیر کی تھی، ان کی طرف بہت سے معائب منسوب کئے تھے چنانچہ الانتقاد میں مؤلف سے جو معذرت کی ہے، اس کی تمہید ان الفاظ میں شروع کی ہے:-

"اے فاضل مؤلف! میں آپ کے احسان کا انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ آپ نے اس کتاب میں میرا نام شاندار طریقہ سے لیا ہے، مجھ کو مستند قرار دیا ہے، میرے اقوال سے استشہاد کیا ہے، اور مجھ کو مشاہیر علمائے ہند میں شمار کیا ہے، لیکن با ایں ہمہ کیا میں یہ پسند کرسکتا ہوں کہ آپ میری تعریف اور عربوں کی ہجو کریں، اُن کو اپنے تیر وسناں کا آماجگاہ بنائیں، ان کی طرف ہر قسم کے عیوب و شنائع منسوب کریں، یہاں تک کہ ان کے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں، اور ان کے پرخچے اڑا دیں۔"

اسی عصبیت کی بنا پر ترکوں کے تمام معاملات سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے، جب ترکی پر کسی یورپین سلطنت کی طرف سے حملہ ہوتا تھا تو ہر ممکن طریقہ سے ترکوں کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ان کی کامیابی سے خوش اور ناکامیابی سے رنجیدہ ہوتے تھے، ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ ہوئی تھی، اس میں مولانا نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لئے ایک انجمن قائم کی

خود اس کے سکریٹری بنے، اور اپنے ضلع سے تین ہزار کی رقم چندہ کرکے بھیجی، جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، تو ندوہ میں مولانا نے ایک پرجوش تقریر کی، تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اُن پر رقت طاری ہوگئی، اور گلو گرفتہ ہوگئے، چندہ ہوا تو خود سو روپیہ کی رقم دی،

سلطان المعظم کو نہایت وقعت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، قسطنطنیہ میں عید کے دن سلطان کا جو جلوس دیکھا اس سے سخت متاثر ہوئے، اسی تاثر و انفعال کی حالت میں مثنوی عید لکھی ہے، جس میں سلطان المعظم کا نام نہایت عقیدتمندانہ طریقہ سے لیا ہے، اور طرح طرح سے ان کے وجود کو اپنے قومی و اسلامی جذبات کی تسکین کا سرمایہ بنانا چاہا ہے،

ترکوں کے اخلاق اور حسنِ معاشرت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ سفرنامہ میں ترکوں کے اخلاق و طرز معاشرت کے عنوان سے ایک عنوان قائم کیا ہے، اور اس میں اُن کے تمام اخلاقی محاسن گنائے ہیں، سفرنامہ کا اختتام بھی ترکوں ہی کی مدح سرائی پر کیا ہے،

عربوں اور ترکوں کے علاوہ تمام سلاطینِ اسلام کے سخت حامی تھے، حضرت عمر فاروقؓ سے لے کر مامون، جہانگیر اور عالمگیر پر جو الزامات لگائے جاتے تھے شدت کے ساتھ اُن کی تردید کرتے تھے، جہانگیر کو تمام دنیا صرف ایک عیش پسند بادشاہ خیال کرتی تھی، لیکن مولانا نے اس پر الندوہ میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس قسم کے مذہبی، سیاسی، اور علمی واقعات اس کثرت سے جمع کئے ہیں جن سے اس خیال کی بہت کچھ تردید ہوجاتی ہے، عالمگیر پر تعصب و تنگدلی کا جو الزام قائم کیا جاتا تھا، ایک سلسلۂ مضمون میں اس کی تردید نہایت پُرزور طریقہ سے کی ہے،

اُن کی یہ عصبیت اُنکے اس خیال کا نتیجہ تھی کہ یہ بادشاہ بہرحال مسلمانوں کے نمایندے اور

اسلام کے فرمانروا تھے، مخالفین اُن کی برائیاں اس لئے دکھاتے تھے کہ اس سے اسلام اور مسلمان بدنام ہوں، مولانا کو یہ بدنامی کسی حال میں گوارا نہ تھی،

پابندیِ اوقات | وہ اپنے معمولات اور فرائض کے سخت پابند تھے. فرماتے تھے کہ جب میں علیگڈہ میں تھا تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب کالج کی گھنٹی ہوتی تھی تو ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لئے میں اس تیزی سے دوڑتا تھا کہ پاؤں میں درد ہوجاتا تھا، علی گڈہ سے علیحدہ ہوکر اگرچہ انھوں نے تمام عمر آزادانہ بسر کی لیکن اس حالت میں بھی جو معمول تھا، اُس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا تھا، عموماً صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے، اور دن نکلنے تک تمام ضروریات سے فارغ ہوکر تصنیف وتالیف کے لئے بیٹھ جاتے تھے، اور آٹھ بجے تک اس سے بھی فارغ ہوجاتے تھے، اس کے بعد اخبار بینی، کتب بینی، اور دوسرے متفرق کام کرتے تھے، خطوط کا جواب روزانہ دیتے تھے، قاضی تلمذ حسین صاحب جو ایک زمانہ میں مولانا کے سخت مخالف ہوگئے تھے. فرماتے تھے کہ "تمام عیوب کے ساتھ مولانا شبلی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خط کا جواب ٹھیک وقت پر دیتے ہیں" وہ خطوں کا جواب اس پابندی سے دیتے تھے، کہ ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتے تھے، ہم لوگ ڈاک آنے جانے کے دن گن کر جواب کی اُمید باندھتے تھے، اور ٹھیک وقت پر جواب آجاتا تھا الندوہ کی اشاعت میں اکثر دیر ہوجایا کرتی تھی، اس سے سخت پریشان ہوتے تھے اور اس کے لئے صاحب مطبع اور مضمون نگاروں پر سخت پابندیاں عائد کرتے تھے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا تھا، تو فرماتے تھے کہ اب تو یورپ میں رہنے کو جی چاہتا ہے، جہاں کام ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے،

اعزہ و اقارب سے محبت | مولانا اگرچہ بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے، تاہم اعزہ و اقارب سے نہایت محبت رکھتے تھے، والدہ کے انتقال کو اگرچہ ایک مدت ہو چکی تھی، لیکن مولانا کے دل میں اب تک اُن کی محبت کی یاد تازہ تھی، فرماتے تھے کہ جب کبھی والدہ یاد آجاتی ہیں تو تڑپ تڑپ جاتا ہوں۔

مولانا کے والد نے مولانا کی والدہ کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کر لی تھی، اور مولانا کو اس سے اس قدر اختلاف تھا کہ جب تک مولانا کے والد زندہ رہے، انھوں نے اس مکان میں قدم تک نہیں رکھا جس میں یہ دوسری بی بی رہتی تھیں، لیکن والد کے مرنے کے ساتھ ہی محبت اور انسانیت کے اقتضا سے مولانا نے خود اسی مکان میں قیام کیا، اور باوجودیکہ مولنا کے دوسرے بھائی وکیل تھے، اور مولانا سے زیادہ آمدنی رکھتے تھے، لیکن مولانا نے خود اپنے وظیفہ سے ۱۰؎ ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر کر دی، اور اس کو برابر دیتے رہے، چنانچہ اپنے بھائی مولوی اسحاقؔ مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں ۱۰۰ روپیے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا، اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔" (اسحٰق۔ ۱۹)

بھائیوں سے اس قدر اُلفت رکھتے تھے کہ مہدیؔ مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں کسی سے بات چیت تک نہیں کی، فرماتے تھے کہ "والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہنستے بولتے تھے، تو مجھے تعجب ہوتا تھا" ایک بار مولوی عبدالسّلام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے اُن کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا تو بولے کہ حواس کب بجا تھے،

مہدیؔ مرحوم کی بیوہ سے اگرچہ مولانا بذاتِ خود ناراض رہتے تھے، لیکن اپنے وظیفہ میں

ان کو بھی شریک کر لیا تھا، اور ایک ماہوار رقم اُن کو ہمیشہ دیا کرتے تھے،

اخیر میں مولوی اسحاق صاحب کی موت نے تو اُن کی زندگی کا خاتمہ ہی کر دیا، مولانا کو اس حادثہ کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اس زمانہ میں لکھے ہیں، ان کے انتقال کے بعد جتنے دنوں زندہ رہے، اُن ہی کے ماتم میں رہے، اور آخر کار اسی غم میں جان دی،

پہلے محل سے اولاد نرینہ میں صرف ایک حامد صاحب ہیں، وہ ایک دفعہ والد سے ناراض ہو کر کہیں چل دیئے تھے، تو اس قدر بدحواس ہوئے کہ کئی دن تک کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، وہ ایک دفعہ اعظم گڈھ میں طاعون میں مبتلا ہوئے، مولانا لکھنؤ میں تھے، خبر ملی تو فوراً لکھنؤ سے اعظم گڈھ روانہ ہو گئے، اور اُن کی تیمارداری کی،

مولانا کی دوسری شادی سے جو لڑکا پیدا ہوا، اس سے بھی وہ بڑی محبت رکھتے تھے، اُن کی محبوب ترین چیز صرف کتاب تھی، لیکن صرف یہی لڑکا تھا جو اس معاملہ میں کتاب کی قائم مقامی کر سکتا تھا، چنانچہ حیدر آباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں:- "اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں" (مہدی - ۱۴)

افسوس ہے کہ اس لڑکے نے وطن میں انتقال کیا، اس وقت مولانا حیدر آباد میں تھے، یہ افسوسناک خبر پہنچی تو ان پر بدحواسی کا عالم طاری ہو گیا، فرماتے تھے کہ تین دن تک پڑا پڑا ہائے ہائے!! کر کے رویا کرتا تھا،

لڑکیوں سے نہایت محبت رکھتے تھے، چھوٹی لڑکی فاطمہ بیمار ہوئی، اور بیماری نے طول

کھینچا، تو لکھنؤ بلا کر نہایت اہتمام کے ساتھ علاج کیا، لیکن افاقہ نہ ہوا، اور وطن میں جا کر اُس نے انتقال کیا، مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو ہٹا دیا اور کمرے میں جا کر خوب روئے اوس کی علالت کی حالت میں اس کے نام جو خطوط لکھے ہیں، اُن سے محبت کا اظہار ہوتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں :۔ "قرۃ العین من! سخت افسوس سے سنا کہ تم کو ابھی تک افاقہ نہیں ہوا، عزیزی! میری اولاد میں جس کو مجھ سے پدری محبت ہے، صرف تمہیں ہو، اس لئے تم سمجھتی ہو کہ مجھ کو کس قدر تمھاری بیماری کا رنج ہے، میں اس وقت لکھنؤ سے بہت دور ہوں، ورنہ فوراً پہنچتا، خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچکر سب سے پہلے بندول آؤں گا" (فاطمہ خانم۔۳)

نواسوں سے بھی محبت رکھتے تھے، ایک بار بڑی لڑکی کے لڑکے کو اپنے ساتھ لکھنؤ لائے اور اس کو چند دنوں ساتھ رکھا،

پوتے سے نہایت الفت تھی، ایک مرتبہ غازی پور میں حامد صاحب کا بچہ بیمار ہوا تو مولانا بنارس میں تھے، خبر ہوئی تو سخت پریشانی کی حالت میں غازی پور گئے، اور کئی دن مقیم رہ کر اس کا علاج کیا، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں :۔ "میاں حامد کا بچہ سخت علیل ہو گیا، اور میں نہایت پریشانی میں غازی پور گیا، اور آج آکر پھر واپس جاتا ہوں" (مہدی ۲۲)

بدقسمتی سے اسی علالت میں اس بچے نے انتقال کیا، اس کے بعد تا مرگ دوسرے پوتے کے پیدا ہونے کی حسرت دل میں رہی،

دوسری بی بی سے بھی بہت محبت رکھتے تھے، چنانچہ اُن کا انتقال ہوا تو فرماتے تھے کہ "میں اس زور سے چیخ کر رو یا، کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا"

اپنے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولوی حمید الدین صاحب مرحوم سے نہایت خلوص تھا، اور ان کو ہر بات میں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، کابل سے ترجمۂ ابن خلدون کی تحریک ہوئی، تو انھی کا نام پیش کیا، علی گڈھ کی عربی پروفیسری کے لئے نواب محسن الملک نے لکھا تو انھی کے لئے کوشش کی، اور وہ اسی کوشش سے وہاں کے پروفیسر مقرر ہوسے، دار العلوم حیدر آباد کی پرنسپلی کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا تو انھوں نے یہ جگہ بھی مولوی حمید الدین صاحب کو دلائی، اُن کی فارسی سخن سنجی، نکتہ آفرینی، اور آخر میں اُن کی قرآن فہمی کے بیحد معترف تھے، مسائل کی تحقیق میں اُن سے مشورے کرتے تھے، اُن کے فارسی کلام کی نسبت کہتے تھے کہ یہ زبان ہے، اُن کی مذہبی علمی و عملی شیفتگی اور پابندی کی بنا پر ان کو درویش کہتے تھے، اور تھے بھی وہ ایسے ہی عقیدۃً اور عملاً نمونۂ سلف، رحمۃ اللہ تعالیٰ، دیندار، عبادتگذار، تہجد گذار، متقی، متوکل، صابر و قانع، متواضع و خاکسار، غرض مجموعۂ اوصاف، اعزہ میں مولوی محمد سمیع صاحب سے بھی بہت انس تھا، چنانچہ سفر قسطنطنیہ میں ان کو ساتھ لیجانا چاہا تھا، اسی تعلق کی بنا پر ان کے بھائی علی ضامن کا بہت خیال رکھتے تھے، اور تعلیمی معاملات میں اُن کو مالی اعانت دیتے تھے،

وہ اپنے تلامذہ سے بھی مثل عزیزوں ہی کے محبت رکھتے تھے، راقم الحروف فراغت کے بعد ۱۹۰۶ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ایک ملازمت کے خیال سے لکھنؤ سے چلنے لگا تو مولانا سے رخصت ہونے گیا، انھوں نے پہلے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیا، کہ وہ سرڈینی سن راس[۱] صاحب سے جو ان دنوں مدرسۂ عالیہ کے

---

[۱] افسوس ہے کہ راس صاحب نے ان دنوں ستمبر ۱۹۴۰ء میں قسطنطنیہ میں وفات پائی، جہاں وہ انگریزی و ترکی مصالحت کی بنا پر مقیم تھے،

صدرستے مجھے ملادیں، خط لکھ کر میرے ہاتھوں میں دیا تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اور پھر فرمایا،
سلیمان اگر ندوہ میں گنجایش ہوتی تو میں تم کو کہیں جانے نہ دیتا"

دوسرے تلامذہ سے بھی اُن کا برتاؤ یہی تھا، اور ہرایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھی سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، حالانکہ مولانا کا مزاج بہت جھلاتھا، یعنی اُن کو غصہ جلد آتا تھا، پھر بھی ہر شاگرد اُن پر سے نچھاور ہونے کو تیار رہتا تھا، اور اس غصہ کو بھی ان کی محبت ہی کا مظہر سمجھتا تھا،

کتب بینی مولانا کو بچپن ہی سے کتب بینی کا نہایت شوق تھا، جب اعظم گڈھ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، تو روزانہ ایک کتب فروش کی دوکان پر جاکر فارسی کی کتابیں دیکھا کرتے تھے، ایک روز مولانا کے والد نے ان کو کتب فروش کی دوکان پر دیکھا تو منع فرمایا، اب مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی دکان سے کتابیں لے آتے تھے اور مکان پر دیکھتے تھے، بڑے مزے کی بات تو یہ تھی کہ باوجود اس شوق کے کتاب کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جاتا تھا لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی، اور اسی کو غنیمت سمجھتا تھا،

تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر کسبِ معاش کے کاموں میں مصروف ہوئے، تب بھی یہ شوق قائم رہا، امانت کا کام کرتے تھے اور ادھر اُدھر گھوڑے پر سوار ہو کر دورہ کرتے پھرتے تھے، لیکن اس حالت میں بھی دیوان حماسہ ساتھ رہتا تھا، جہاں ذرا سا آرام لینے کا موقع ملا اُس کا مطالعہ شروع کر دیا،

حج و زیارت کے سلسلہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو وہاں کے کتب خانوں کی بھی سیر کی، فرماتے تھے کہ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کتبخانوں میں نظر آیا، تمہید ابن عبد البر

یہیں دیکھی تھی،

علی گڈھ تشریف لے گئے تو اس شوق کے پورا کرنے کا کافی سامان ہاتھ آیا، سید صاحب کا کتب خانہ بہترین کتابوں کا مجموعہ تھا، اور انھوں نے مولانا کے ذوقِ علم کو دیکھ کر مطالعہ کی عام اجازت دیدی، اور مولانا نے دل کھول کے اس گنجینۂ علم سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ایک خط میں نہایت مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں:۔" سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں، گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرفہ سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے"۔ (ضمیمہ۔ ۳)

علی گڈھ میں مولانا کے ایک اور دوست تھے، جن کو کتابوں کا بڑا شوق تھا، وہ مولانا کے پاس نخریہ کتابیں بھیجدیتے تھے، اور مولانا نہایت شوق سے اُن کا مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ ایک عزیز کو نہایت مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع دیتے ہیں:۔" یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں، اور کتابوں کے بڑے شائق، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں، اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے نخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں، . . . . . ممکن ہے سلیمان ساوجی وطالب آملی دیکھنے کو مل جائے"۔ (ضمیمہ۔ ۲)

اور کم از کم یہ خیال تو ہر شخص کے دل میں گذرتا ہوتا ہوگا، کہ اُن کے مطالعہ میں تاریخ وسیر کے سوا اور کسی فن کی کتابیں نہیں رہتی ہوں گی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث غرض تمام علوم کو بالاستیعاب پڑھا تھا، اور ہمیشہ ان علوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے تاریخ وادب کی نسبت جس کو اُن کی تمام تر کائنات سمجھا جاتا ہے، مولانا خود فرماتے تھے کہ "یہ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے"

صحت وعلالت، سفر وحضر، جلوت وخلوت، غرض ہر حالت میں کتابیں اُن کی رفیق رہتیں، سفر کشمیر سے واپس آکر جب سخت بیمار پڑے تو اس حالت میں بھی مطالعہ برابر جاری تھا، فرماتے تھے کہ "میں اس زمانہ میں اکثر صدرا دیکھا کرتا تھا"

ایک بار جب اعظم گڈھ میں سخت طاعون آیا، اور خود مولانا کے فرزند محمد حامد صاحب مبتلائے طاعون ہوے، تو لوگ شہر سے باہر چھپروں میں نکل گئے، مولانا بھی مع حامد کے چھپر میں مقیم تھے، اور شبلی منزل کو چھوڑ دیا تھا، ایک روز اسی حالت میں محقق طوسی کی شرح اشارات دیکھ رہے تھے، محقق طوسی نے امام رازی پر ایک اعتراض کیا تھا، جو مولانا کو غلط معلوم ہوا، باوجودیکہ شہر میں طاعون تھا، اور بنگلہ بند تھا، لیکن فوراً اُٹھے اور بنگلہ کھول کر محاکمات نکالی، اور اس میں دیکھا، تو واقعی محقق طوسی کا اعتراض غلط تھا،

وہ بذاتِ خود اگرچہ ہر چیز میں ترتیب ونظام چاہتے تھے لیکن مطالعہ کے معاملے میں اُن کو مجبوراً یہ اُصول توڑ دینا پڑتا تھا، کمرے میں کتابیں ادھر اُدھر پڑی رہتی تھیں، مولانا کو اگرچہ یہ بے ترتیبی ناگوار تھی، لیکن فرماتے تھے کہ کیا کیا جائے؟ اگر کتابوں کو مرتب رکھوں، تو مطالعہ

میں خلل واقع ہو،

مولانا کی کثرتِ تصنیفات کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ اُن کے اوقات کا بیشتر حصہ تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح کو صرف ایک دو گھنٹے تصنیف وتالیف میں صرف کرتے تھے، اور صرف صفحہ دو صفحہ لکھتے تھے، بقیہ اوقات کتب بینی کے نذر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ میں تنہائی میں کبھی بغیر کتابوں کے نہیں بیٹھ سکتا: مولوی وحید الدین سلیم جب بمبئی میں مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے اور امین آباد پارک میں مولانا کے پہلو میں رہتے تھے وہ کہتے تھے کہ "مولانا شبلی کیوں قاق ہوگئے ہیں، میں جب جاتا ہوں کبھی اُن کو بیکار نہیں پاتا، ہر وقت کتابیں الٹا پلٹا کرتے ہیں، یہ صحت کے لئے سخت مضر ہے، مولانا عبد الحئی مرحوم فرنگی محلی کو اسی کی بدولت صرع کا عارضہ ہوا، اور وہی اُن کی موت کا سبب ہوگیا"

اس طرح مولانا کی نظر سے تمام موجودہ کتابیں گذر چکی تھیں، فرماتے تھے کہ اب تو کتابیں دیکھنے کو نہیں ملتیں جب کسی نئی اور نادر کتاب کا پتہ چلتا تو اس کے دیکھنے کے شوق میں بیتاب ہو جاتے، بمبئی کی جامع مسجد میں ایک مختصر سا کتب خانہ ہے، مولوی عبد السلام صاحب جب بمبئی میں اُن کے ساتھ تھے تو ان سے فرمایا کہ جاکر اس کتب خانہ کو دیکھ آؤ، اور اگر کوئی نادر اور قلمی کتاب ہو تو اس کا نام لکھ لاؤ، وہ چند کتابوں کے نام لکھ لائے، ان ہی کتابوں میں قفال کی کتاب محاسن الشریعہ کا نام بھی تھا، قفال بہت بڑے متکلم ہیں، اور عقلی طرز پر قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، تفسیر کبیر میں جا بجا اُن کے اقوال مذکور ہیں، اور مولانا نے اُن کو علم کلام کے بانیوں میں قرار دیا ہے اور علم کلام اور الکلام میں ان کے جستہ جستہ اقوال سے جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں فائدہ اٹھایا ہے، مولنا

نے اُن کی کتاب کا نام پڑھا تو شوق کے لہجہ میں فرمایا کہ یہی ایک کتاب دیکھنے کے قابل ہے،
اور دوسرے روز خود گئے اور اس کو دیکھا،

مولانا کتب بینی کے لئے نہایت نادر اور بلند کتابیں انتخاب کرتے تھے، اور جو لوگ معمولی
کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، اُن کی حالت پر سخت افسوس کرتے تھے، اور اس کو نظامِ تعلیم کی
ابتری کا نتیجہ بتاتے تھے، قسطنطنیہ میں جو مسلمانوں کے تمام قدیم علمی جواہرات کی کان ہے جب
اُن کو نظر آیا کہ یہاں لوگ معمولی درجہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں تو سخت متاسفانہ
انداز میں یہ ریمارک کیا: "کتب خانوں میں جب لوگوں کو کتابوں کے مطالعہ میں مشغول دیکھتا تھا،
تو ہمیشہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی کتابیں اُن کے پیش نظر ہیں، لیکن میں نے کسی کے سامنے مختصر
معانی، ایساغوجی، شرح وقایہ، جلالین وغیرہ کے سوا کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی،

حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی
کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ
جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے، اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے آئندہ اس
کی بھی اُمید نہیں۔" (سفرنامہ ص ۹۷ ؛ ۹۸)

کتابوں کا نہایت شوق تھا، مصر، بیروت، شام اور یورپ میں جو بہترین کتابیں شائع
ہوتیں اُن کو بہت شوق سے منگواتے، اور عمدہ جلد بندھوا کر ان کو میز یا الماری میں رکھتے،
قدیم قلمی کتابوں کی جستجو میں ہمیشہ مصروف رہتے، اور جب کوئی عمدہ کتاب مل جاتی تو نہایت فیاضی
کے ساتھ خریدتے، مونس الارواح کا ایک مطلا و مذہب نسخہ ہاتھ آیا، تو اس کو سو روپیہ پر خریدا،

ایک قرآن دوسو روپیہ پر ہدیہ لیا، بہت سی قلمی کتابیں نقل کرواتے تھے، اور ان پر بیدریغ روپیہ صرف کرتے تھے، خصائص ابن جنی، اخبار الحکما شہرزوری، کشف الادلہ، رباعیات سحابی، ردّ المنطق لابن تیمیہ کے نسخے ان کے کتب خانے میں اسی طرح دور دور سے نقل ہو کر آئے تھے لیکن اس شوق کے پورا کرنے کے لئے اُن کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، اس لئے اگر کہیں بہترین کتابیں اُن کی نظر سے گذر جاتی تھیں، تو ان کو اپنی مفلسی پر سخت افسوس ہوتا تھا، ایک بار مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ میں مطبوعات یورپ نظر سے گذریں، تو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھا۔" مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوگیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے" (شروانی - ۳۲)

جن نادر چیزوں کو خود نہ خرید سکتے، اپنے علم دوست دولتمند دوستوں کو اُن کے خریدنے کی ترغیب دیتے، چنانچہ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط ہیں، ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر، اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے"

لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں، وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدابخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا" (شیروانی - ۱۷)

مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ "میں نے وہ مرقع مولانا کی تحریر پڑھ کر خرید، کتاب خانے میں ہے۔ منصور کے قلم کا سرخ سوسن کا بوٹا اس میں ہے، امریکہ کے ایک مؤلف نے حال میں لکھا ہے کہ ساری دنیا میں عجیب ہیچ ہیں منصور کے ہاتھ کی گلکاری (FLORAL) تصویر ہے۔"

درس وتدریس | علماء کے فرائض و اعمال میں تصنیف و تالیف، وعظ و پند اور ہدایت و ارشاد کے علاوہ درس و تدریس بھی ہے، مولانا نے اگرچہ اور مشاہیر علماء کی طرح اپنا کوئی مستقل حلقۂ درس قائم نہیں کیا، تاہم بہت سے خوش قسمت لوگوں کو اُن کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوا، تحصیلِ علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اعظم گڑھ میں خود بھی ادب کی تکمیل کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "دریں فرصت بادب کار دارم خود چیزے از ادب می خوانم و دیوان حماسہ بہ دیگرے می آموزم"۔ (مکاتیب ۲)

وکالت کی غرض سے بستی میں چند روز کے لئے طرحِ اقامت ڈالی، تو وہاں بھی یہ مشغلہ جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "دریں روزہا دو کان کشادہ ام و تن بآموختن کسب در دادہ"

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اسی زمانہ کے تربیت یافتہ ہیں،

وکالت چھوڑ کر علی گڈھ میں آئے، تو اگرچہ کالج کے تعلق سے یہ مستقل مشغلہ ہو گیا، لیکن ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کے سر میں صدرا شمس بازغہ او حمد اللہ کی وقت آفرینیوں کا نشہ ہو، جس کی زبان پر عرب جاہلیت کے اشعار چڑھے ہوئے ہوں، جو حدیث و فقہ کے بہترین علماء سے درس حاصل کر چکا ہو، فارسی کے چند انتخابات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، اس لئے یہاں بھی خارجی طور سے بعض لوگ مولانا سے ادب کا درس حاصل کرتے رہے،

ندوۃ العلما میں تشریف لائے تو بہ کثرت طلبہ کو مولانا سے مستفید ہونے کا موقع ملا، لیکن ندوہ میں انھوں نے باضابطہ طور پر کبھی درس نہیں دیا، بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ کبھی قرآن مجید کے حقائق و معارف پر درس دیتے، کبھی ہدایہ شروع ہوتی، اور اوپر کے درجہ کے طلبہ شریک ہوتے، مولانا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے اور مولانا اس پر نکتہ چینی کرتے، یا خود کسی مسئلہ پر تقریر کرتے، کبھی ادب کی کوئی کتاب شروع کراتے کبھی صحیح بخاری پڑھاتے، بعض اوقات قدیم طریقۂ املا کے موافق کسی علمی مسئلہ پر خطبہ دیتے، اور اس میں تمام طلبہ شریک ہوتے، اسی طرح ہمیشہ طلبہ کو مولانا سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کا موقع ملتا رہا، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر کی تعلیم اس سے الگ تھی، اور ندوہ کے طلبہ میں مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا جو مذاق پیدا ہو گیا ہے، وہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے،

علی گڈھ کالج کے زمانہ میں مولانا فارسی، عربی اور قرآن مجید کا درس کالج کے طلبہ کو دیتے ہی تھے، یہ طلبہ ان علوم کے علاوہ ادب و شاعری کا ذوق بھی مولانا سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ چودھری خوشی محمد ناظر، سید سجاد حیدر یلدرم، مولوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی وغیرہ ان کے اس فیضِ صحبت سے مستفید تھے،

لطفِ صحبت | مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اپنے مضمون مندرجہ انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڈھ (مورخہ ۷، ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء) میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں، عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی، ان کے بیان کے رفیق و

لے، خیبر کر
اپریل ۱۹۳۹ء کی
کو لکھنؤ میں
قلب و فات
" س"

ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی، بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتیں اُن کی زبان سے میں نے کبھی نہیں سُنیں۔"

عام طور پر مولانا کی صحبت سے مستفید ہونے کا وقت ۴ بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور آٹھ بجے شب تک ختم ہوجاتا تھا، چار بجے شام کے بعد اُن سے ملنے کی عام اجازت تھی، اور ہر کہ ومہ بلا تکلف اُن سے مل سکتا تھا، مولانا اس مخصوص وقت کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، نہ اُن کے یہاں ترتیب سے کرسیاں بچھائی جاتی تھیں، نہ لوگوں کی خدمت میں پان اور سگرٹ پیش کیا جاتا تھا، اور نہ چاے وحقہ کا دور چلتا تھا، چند کرسیاں اور چند مونڈھے ادھر اودھر پڑے رہتے تھے، اور مولانا کبھی آرام کرسی پر، اور کبھی کھرّے پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے، جو آتا کرسی یا مونڈھا گھسیٹ لیتا، اور بیٹھ جاتا، ظاہرداری اور تصنع سے کسی کی تعظیم وتکریم بالکل نہیں کرتے تھے، اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو پلنگ سے اُٹھ بیٹھتے یا کرسی پر ذرا سنبھل کے بیٹھ جاتے، معمولی طور پر صرف یہ پوچھ لیتے "کہاں سے آنا ہوا؟" اور کیا مقصد ہے؟"

محاضرات کی کتابوں میں بعض کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن کو کشکول کہتے ہیں، ان کتابوں کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تمام علوم وفنون کے متعلق نادر اور لطیف نکتے جمع کردیے جاتے ہیں، اس لئے انسان اُن سے دل بھی بہلا سکتا ہے، اور علمی فوائد بھی حاصل کرسکتا ہے، بعینہ یہی حال مولانا کی صحبت کا بھی تھا، وہ ایک مختلف الحیثیات صاحبِ کمال تھے، یعنی بہت بڑے شاعر تھے، بہت بڑے فلاسفر تھے، بہت بڑے مورخ تھے، بہت بڑے انشا پرداز تھے، بہت

بڑے سیّاح تھے، بہت بڑے وسیع المعلومات تھے، بہت بڑے سیاسیات کے نکتہ شناس تھے
بہت بڑے جامع الفنون تھے، اس بنا پر اُن کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور وہ
ہر فن کے متعلق نہایت بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، شعر و شاعری کا ذکر آجاتا تو عربی، فارسی اور
اُردو کے سینکڑوں منتخب اشعار سنا دیتے، اور اس کے ساتھ اُن پر تنقید بھی کرتے جاتے کسی فن کے
متعلق کتابوں کا ذکر آجاتا تو بیسیوں مطبوع اور قلمی کتابوں کا نام بتا دیتے، فلسفہ اور منطق کے کسی مسئلہ
کا ذکر آجاتا تو مع مالہ و ما علیہ اس پر تقریر کر دیتے، وسعتِ نظر کی بنا پر سیکڑوں تاریخی واقعات اور
سیکڑوں مہذب لطیفے یاد تھے، سیر و سیاحت میں ہر قسم کی چیزیں نظر سے گذر چکی تھیں، بڑے بڑے
علماء و فضلاء، اور رہبرانِ قوم سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو چکا تھا، اور اُن کے خیالات سے واقف
تھے، اس بنا پر ان چیزوں کی آمیزش سے یہ علمی صحبت نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہو جاتی تھی، انکی
صحبت میں فضول، لغو یا عام باتیں کبھی نہیں ہوتی تھیں، کبھی کوئی علمی مسئلہ چھڑ جاتا، کبھی کسی زیر
تالیف کتاب کے متعلق کوئی گفتگو شروع ہو جاتی، کبھی قومیات و سیاسیات کا تذکرہ ہو جاتا، کبھی
کسی مضمون کا ذکر ہوتا،

بڑے بڑے اربابِ کمال کی صحبتوں میں عموماً یہ عالم نظر آتا ہے کہ حاضرین مؤدبانہ خاموشی
کے ساتھ بیٹھے ہیں، اور ایک باوقار اور پر عظمت ہستی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کو کانوں
سے سُن لیتے ہیں، لیکن بے تکلفی، سادگی اور خاکساری کی بنا پر مولانا کی صحبت اس سے بالکل
مختلف تھی، ان کے یہاں ہر شخص نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی گفتگو میں حصہ لے
سکتا تھا، اُن کے خیالات کی مخالفت، اور اُن پر نہایت بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کر سکتا تھا

اُن کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم صفائی وغیرہ سے سخت تنفر تھا، اس لئے علی الاعلان اس کی بھی برائی کرتے تھے لیکن اگر کسی شخص میں کوئی خوبی نظر آتی تو اسی طرح اس کا تذکرہ بھی کرتے، اور نہ صرف تذکرہ کرتے بلکہ لوگوں کو خطوط میں بھی لکھتے مولوی حمید الدین صاحب کی فارسی زباندانی کے قائل تھے، اور تعریف کرتے تھے۔ آخر میں اُن کی تفسیر نظام القرآن کے متعلق دوسرے رسائل کی بھی مدح فرماتے تھے۔ ندوہ میں جو طلبہ کسی قابل نکلے مولانا نے ان کو اسی طرح ہر جگہ روشناس کیا، مولانا حفیظ اللہ صاحب فرماتے تھے کہ "طلبہ کی تعریفیں کر کر کے مولوی شبلی اُن کو خراب کردیتے ہیں" اپنے اساتذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے حسنِ اخلاق و تورع، مولانا ارشاد حسین صاحب کے تفقہ، مولانا فیض الحسن صاحب کی عربیت اور مولانا فاروق صاحب کی ادبیت و معقول دانی کا تذکرہ ہمیشہ نہایت مدح و ستایش کے ساتھ کرتے تھے، معاصرین میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولانا شیر علی صاحب (حیدرآباد) کی نکتہ رسی کی داد دیتے تھے، مولانا شاہ سلیمان صاحب کے حسنِ تقریر اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی کی خوبی بیان کی مدح فرماتے تھے، اور علماے دیوبند میں سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی روشن خیالی اور سیاسی گہرائی اور مولانا محمود حسن صاحب کے علم و فضل اور تقوی کے معترف تھے، کبھی کبھی اُن سے خط و کتابت بھی رہتی تھی، اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی دینی برکت و صحبت اور بے نیازی کی بھی قدر کرتے تھے، (شروانی ۵۷)

اسی طرح سرسید کی انشا پردازی، مولانا حالی کی سخن فہمی اور نواب وقار الملک کی اخلاقی قوت کے بیحد مداح تھے، اور ہر موقع پر اس کا ذکر فرماتے تھے،

احباب مولانا کے تعلقات نہایت وسیع تھے، اس لئے اُن کے احباب کے ناموں کا استقصا نہایت مشکل ہے، تاہم جن لوگوں سے اخیر تک تعلقات قائم رہے، اُن میں نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، مولوی سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں، نواب سید علی حسن خاں، ایم مہدی حسن، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی کے نام خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں،

نواب محسن الملک کے ساتھ مولانا کے تعلقات علی گڑھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں ان تعلقات نے استحکام کیا، نواب صاحب مولانا کے فضل و کمال کے معترف تھے، اور مولانا اُن کے فضل و احسان اور لطفِ عمیم کے ہمیشہ مداح رہے، ساتھ ہی اُنکی کج و پیچ پالیسی سے ہمیشہ گھبراتے بھی تھے، تاہم گورنمنٹ سے اُن کی صفائی کرانے میں نواب صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا، حیدر آباد کی ملازمت اور اجراء وظیفہ میں بھی نواب صاحب کی کوششیں شامل تھیں، نواب صاحب نے مولانا کو بار بار علی گڈھ بلانا چاہا، لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا، سفر کشمیر سے واپس آکر مولانا علیل ہوئے تو نواب صاحب عیادت کے لئے خود اعظم گڈھ تشریف لائے، واقعۂ شکستِ پا کے بعد مولانا لکھنؤ آئے تو نواب صاحب نے لکھنؤ آکر مولانا کی عیادت کی، نواب صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کے ماتم میں مولانا نے الندوہ میں ایک پُر درد مضمون لکھا، جس میں اُن کی تمام خوبیاں گنائیں،

اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ایک ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا، غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا، جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا،

رسی آنکہ بدرد ما کہ چو ما   خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلاف باعثِ ملاقات ہوا، ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی، نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا، اور الحمد للہ کہ وہ اخلاص علامۂ ممدوح کی رحلت تک قائم رہا[1] اور یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے محو نہ ہوگا، موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی، بلکہ حسرت کا اضافہ کردیا، قریباً بیس سالہ مودت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں، بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا، حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا، ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے، اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔"

تعلقات کی شگفتگی کا اندازہ ان مراسلتوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ ہو سکتا ہے، جو دونوں دوستوں میں باہم ہوئی ہیں، مولانا حبیب الرحمان خاں فارسی میں غزلیں کہتے ہیں، اور مولانا کی خدمت میں بھیجتے ہیں، اور وہ اُن کے ٹوکنے پر تغیر و تبدل کرتے ہیں، مولانا کی تصنیفات پر ریویو لکھتے ہیں، اور مولانا داد دیتے ہیں، اُن کے زورِ تحریر کو دیکھ کر

---

[1] اس مسودہ کو دیکھتے وقت مولانا شروانی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے،

"یہ شیفتہ تعلق اخلاص آج بھی اسی درجہ پر ہے جو زمانۂ حیاتِ علامہ میں تھا، حالانکہ نصف صدی سے زیادہ عمر تعلق محبت کی ہے"

مولانا کو مضمون نگاری کا میدان تنگ نظر آتا ہے، اور ایک مستقل تصنیف کا مشورہ دیتے ہیں، ایک مشترک کتاب کی تصنیف کی تجویز ہوتی ہے جس کا نام حبیب شبلی تجویز کیا جاتا ہے، تصنیفی مشورے ہوتے ہیں، اور مولانا اُس کا خاکہ پیش کرتے ہیں، مولانا علیل ہوتے ہیں، تو اُن سے حکیم عبد المجید خاں کے نام خط لکھواتے ہیں غسلِ صحت کے بعد ایک جلسۂ دعوت ترتیب دیتے ہیں، تو اُن کو خصوصیت کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں، ندوہ میں جو اہم معاملات پیش آتے ہیں ان میں اُن کی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں، نادر اور بیش قیمت کتابیں نظر سے گذرتی ہیں تو اُن کو خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں، تصنیف و تالیف کے لئے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلا تکلف ان کے کتب خانہ سے منگواتے ہیں، اپنا کتبخانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں، تو اس راز کی صرف اُن ہی کو خبر دینا چاہتے ہیں، غرض ان گوناگوں تعلقات کی بنا پر وہ مولانا کے دوست بھی تھے، ممنون مشورہ بھی تھے، محسن بھی تھے اور ایک عزیز بھائی بھی تھے،

حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے تعلقات کی ابتدا معلوم نہیں، غالباً حکیم صاحب کے قیامِ رامپور کے زمانہ سے ہوئے، جب رامپور کا کتبخانہ حکیم صاحب کے زیر انتظام تھا، آخر زمانہ میں جب حکیم صاحب رامپور سے چلے آئے تھے اور قومی کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے تو ان تعلقات میں مزید وسعت ہوئی، اصلاحِ ندوہ کے سلسلہ میں اور بھی تعلقات بڑھ گئے تھے، اور حکیم صاحب ہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، دہلی میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ حکیم ہی صاحب کی کوششوں سے ہوا، اور مولانا کے مخالفین کی قوت کو ان ہی

اثر نے نمایاں نہیں ہونے دیا، اصلاحِ ندوہ کے لئے دلی میں جو جلسہ ہوا، اس میں اگر حکیم صاحب کا ہاتھ کام نہ کرتا تو اس کا انعقاد ناممکن ہو جاتا،

نواب سیّد علی حسن خاں صاحب مولانا کے بیحد معتقد و معترف تھے، تعلقات کی ابتدا گذشتہ تعلیم اور المامون سے ہوئی، ۱۸۹۱ئ؁ میں جب حیدرآباد کا سفر کیا تو نواب صاحب نے راستہ میں مولانا کو اپنے ہاں بھوپال میں روک لیا، یہ پہلی ملاقات تھی، نواب صاحب کو نواب شاہجہاں بیگم نے جب اپنی ریاست کا ڈائرکٹر تعلیم مقرر کیا، تو نواب صاحب نے مولانا سے مشورے طلب کئے، اور اس سلسلہ میں وہ کئی دفعہ بھوپال جا کر اُن کے ہاں ٹھہرے،

نواب صاحب نے متعدد بار مولانا کو مالی نذرانے بھی پیش کرنا چاہے، لیکن مولانا کی خودداری اور بے نیازی نے اُن کو قبول نہیں کیا، اتفاق سے ۱۹۰۳ئ؁ میں نواب صاحب بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے اور مولانا بھی معتمد دارالعلوم کی حیثیت سے ۱۹۰۴ئ؁ میں لکھنؤ رہنے لگے، تو تعلقات میں اور زیادہ استواری پیدا ہوگئی، اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، نواب صاحب مولانا کو گاڑی بھیج کر بلواتے تھے، اور اپنی کوٹھی کے قیام پر اصرار کرتے تھے، کبھی کبھی مولانا وہاں چند روز کے لئے قیام بھی کرتے تھے،

ندوہ پر انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ مولانا ہی کے اثر سے وقف کیا، ندوہ کی رکنیت اور دلچسپی بھی مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب مولانا نے استعفا دیا تو وہ بھی مستعفی ہو کر اصلاحِ ندوہ کی کوششوں میں مصروف ہوگئے، اور آخر میں ندوہ کی نظامت کا کام انھوں نے اسی دوستی و محبت کی یادگار میں قبول کیا، جس کو وہ سالہاسال

انجام دیتے رہے،

ایم مہدی حسن سے لطفِ ادب اور حسنِ معاشرت کے تعلقات تھے، ان میں اور مولانا میں نہایت پُر لطف اور بے تکلفانہ خط وکتابت ہوتی تھی، وہ نہایت عمدہ قسم کے لفافے اور خط کے کاغذ بھیجدیتے تھے، کہ اُن کے نام جو خطوط بھیجے جائیں، اُن کے لئے یہ کاغذ مخصوص کرلئے جائیں، مولانا کی ذات سے انھوں نے اُن کے مرنے کے بعد بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی، اور "شبلی سوسائٹی" اور "معاصرانہ چشمک" کے عنوان سے معارف میں جو مضامین لکھے وہ اسی دلچسپی کا نتیجہ تھے،

ان کے علاوہ مختلف شہروں مثلاً بمبئی، علی گڈھ، پٹنہ، کلکتہ اور الہ آباد میں مولنا کے بہت سے احباب تھے، اور جب مولانا ان شہروں میں جاتے تھے تو ان سے صحبتیں رہتی تھیں

احباب علماء، مولانا کے احباب کی اس فہرست پر نظر ڈالنے سے مولانا کے مذاقِ طبیعت کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، مولانا کے ان تمام احباب کی حیثیتیں اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ذوقِ علم ایک ایسی چیز ہے جو سب میں مشترک ہے، علماء میں سے ان کے تعلقات ندوہ کے سبب سے سب سے قائم تھے، ان میں قابلِ ذکر اشخاص یہ بزرگوار ہیں، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا سید محمد علی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، مولانا شیر علی صاحب حیدرآبادی، مولانا فضلِ حق صاحب رامپوری، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مگر چونکہ وہ قدیم وجدید کے درمیان

واسطہ تھے، اس لئے کبھی کبھی قدیم کی خاطر جدید اصحاب سے اور کبھی جدید کے سبب سے قدیم علماء سے اُن کا تصادم ہوتا رہتا تھا، اور یہی سبب ہے کہ بے غرض اصحاب علم کے سوا ان سے سب ہی سے اَن بَن ہوتی ہی رہتی تھی، چنانچہ مولانا شروانی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

"علامہ شبلی چونکہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے، ایک حد تک اُن کے خیالات آزاد تھے، علماء کے موجودہ رسمی طریقوں کو وہ لوازمِ دین نہیں خیال کرتے تھے، اعتراض کرنے میں بے باک تھے، ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور، اور اس کے آثار تھے، لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے یہ اسباب تھے، جن کی وجہ سے قدیم علماء کو اُن کی جانب سے شبہات تھے، بعض کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے، تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں، خلاصہ یہ کہ اخیر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقہ کے علماء میں شیر وشکر نہ ہو سکے، تاہم اس قدر کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم وجدید سوسائٹی کی صلح وآشتی کا، لیکن افسوس کہ مذکورۂ بالا اختلافات نے ان کوششوں کو بار آور نہ ہونے دیا"

باہم معاصرین کے اعترافات مولانا نے اپنے معاصرین کے ساتھ اور اُن کے معاصرین نے اُن کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار تعلقات قائم رکھے، دونوں نے ایک دوسرے کے فضل وکمال کا اعتراف کیا، اور علانیہ ایک نے دوسرے کی مدح وستایش کی،

مولانا کو نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا آزاد اور خواجہ عزیز الدین کے ساتھ شرفِ معاصرت حاصل تھا، اور ان میں ہر ایک دوسرے کے فضل وکمال کا معترف تھا، نواب محسن الملک کو مولانا کے ساتھ جو حسن ظن تھا، اس کا اعتراف

انھوں نے ایک تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے، چنانچہ شمس العلمار کے خطاب پر مولانا کو مبارکباد دینے کے لئے علی گڈہ کالج میں جو جلسہ ہوا، اُس میں بحیثیت پریسیڈنٹ کے انھوں نے یہ الفاظ فرمائے، "وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحتِ بیان اور سلاستِ عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا، اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ اور استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانحعمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا"

نواب محسن الملک اور مولانا کے اخلاق و فطرت میں بہت بُعد تھا، اس بنا پر گو متعدد بار اختلاف کے اسباب بھی پیدا ہوگئے اور "علی گڈہ پارٹی" کے بہت سے لوگوں نے اُن کی مخالفت بھی کی، لیکن بایں ہمہ مولانا اور نواب صاحب کے تعلقات میں اخیر دم تک عملاً فرق نہیں آیا،

مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی، اور اُن کی دقتِ نظر اور اُن کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے، فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے، اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی، رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ "یہ نثر کا حماسہ ہے" مولانا کہتے تھے کہ اُن کے اس ایک فقرہ نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کردیا، اور اُس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آگیا، جو پہلے سامنے نہ تھا،

فرماتے تھے "میں دریا ہوں، اور حالی کنواں ہیں" میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے، اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں، لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں اُن کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے، مولانا حالی کی تصنیفات میں حیاتِ سعدی کو نہایت پسند فرماتے تھے، شعرالعجم حصۂ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لئے پس وپیش کرتے تھے کہ حالی کے بعد اُس میں کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن مجبوراً سعدی کے حالات لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا:- "مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں، سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا، اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا"

حیاتِ سعدی شائع ہوئی تو اُس پر ریویو لکھا، مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ جس چیز کو خود پسند کرتے تھے، اپنے اعزہ، تلامذہ اور احباب کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، حیاتِ سعدی بھی اسی قسم کی پسندیدہ چیزوں میں تھی، چنانچہ ایک عزیز کو لکھتے ہیں:- "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے، اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا، اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیجدیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ ہے، واقعی بے مثل ہے، اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں"

پاؤں کے حادثہ کے بعد مولانا حالی نے ایک رُباعی لکھ کر الندوہ میں چھپنے کے لئے بھیجی، تو اس کے شکریہ میں مولانا نے شذرات میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا :۔" مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض اُن کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا کرتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے، کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

مولانا حالی کو بھی مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی، سیرۃ النعمان شائع ہوئی تو مولانا حالی نے اس پر ریویو لکھا، جس میں فرماتے ہیں :۔" انھوں نے (شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں اُن کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے، اور جہانتک میری نگاہ پہنچتی ہے، سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں، جس طرح حسن تناسبِ اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے وقیاس سے کام لیا گیا ہے اس طریقۂ استدلال سے فلسفہ و مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔"

مولانا حالی مولانا کی تصنیفات کو شوقیہ منگاتے تھے، اور لائبریری میں رکھتے تھے ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لئے منگائیں، اور لکھا کہ خود تو آنکھوں سے معذور ہوں، لیکن یہ کتابیں دوسروں کے لئے منگوائی ہیں کہ

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

بعض اوقات مولانا خود اپنی تصنیفات اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیجتے تھے، اور وہ اس کی نہایت قدر کرتے تھے، دستۂ گل شائع ہوا، اور اس کو مولانا نے اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا تو مولانا حالی نے اُس کے جواب میں لکھا کہ :- "کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اُس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اُس سے بہت زیادہ گرم ہیں"

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیب است سالک را   خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کونسی بات ہے، مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا، الا الذی ابتلی بمثل ما ابتلی بہ القائل،

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے اُس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں، ولیس فی ذلک شائبۃ من التصنع"

مولانا نے سوانح مولانا روم ہدیۃً بھیجی تو مولانا حالی نے رسید میں لکھا :- "سوانح کو میں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں، اول مولوی وحید الدین دیکھنے کو لے گئے اس کے بعد غلام حنین نے مانگ لی، آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، کہ من عرف منزلتکم فی التصنیف کلّ لسانہ، آپ کا وجود قوم کے لئے

باعثِ فخر ہی، خدا ے تعالیٰ آپ کو بہت مدّت تک زندہ و سلامت رکھے۔"

باہم اخلاقی تعلقات بھی نہایت شگفتگی کے ساتھ قائم تھے، سفرِ کشمیر کے بعد مولانا کو ایک طویل علالت سے صحتیاب ہونے کی توقع ہوئی، اور اس مسرّت میں ایک جلسۂ دعوت کرنا اور اُس جلسہ میں جن احباب کو مدعو کرنا چاہا، اُن میں ایک مولانا حالی بھی تھے، چنانچہ مولنا حبیب الرحمان خاں شیروانی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:- "آپ اس بات کے لئے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحتِ کامل دی، تو میں اپنے تمام خاص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑیگی" (شیروانی)

صحتیاب ہونے کے بعد مولانا نے قصیدۂ کشمیریہ لکھا، اور مولانا حالی کی خدمت میں بھیجا، تو مولانا حالی نے ایک طویل خط لکھا جس کی ابتدا اس قطعہ[1] سے کی جس کا پہلا شعر یہ ہے

شبلیِ ما بمراد از سرِ بالیں برخاست   للہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:- "مولانا! قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں، پہلے اس سے کہ آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے، جس نے مدت دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا، فی الواقع آپ کی حالت نازک ہوگئی تھی، اور مرض کو حد سے زیادہ امتداد ہوگیا تھا، باوجودیکہ تبدیلِ آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا، اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بعد ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار تھا، اذا اراد اللہ شیئاً ھیّأ اسبابہ ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب

[1] اشعار پہلے گذر چکے ہیں (دیکھیے ص ۳۴۶)

کا آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا، فالحمد للہ ثم الحمد للہ علی ما انعم علینا بابقائکم فینا وبنعمۃ وجودکم لنا

مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو مولانا حالیؔ کو اس سے سخت تشویش لاحق ہوئی، اخبارات میں جو حالات شائع ہوئے، اس کے سننے سے تسکین نہیں ہوئی، تو مولانا کے فرزند محمد حامد نعمانی کو بغرض استفسار حال ایک خط لکھا، اور باوجود اس ضعف کے مولانا کی عیادت کے لئے اعظم گڈہ آنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔"آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالہ سے جناب مولانا کے حالات سُنے گئے ہیں، اُن سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لئے ناچار آپ کو تکلیف دیتا ہوں، کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر، اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں اس کو قلمبند کرکے ازرہِ لطف میرے پاس بھیجدیں، نیز یہ بھی لکھیں کہ مبئی کے ڈاکٹر رجب علی جو مولانا کو وہاں بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں،

بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنؤ میں ہے اس سے ملنے کے لئے لکھنؤ آؤں، اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے اعظم گڈہ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا، اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڈہ آنے سے پہلے آپ کو وہاں سے اطلاع دوں گا، مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاقِ زیارت سلام و نیاز کہدیجئے گا"

لیکن باوجود ان مخلصانہ تعلقات کے مولانا کی بعض عبارتوں اور بعض خطوط سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ دونوں معاصرین میں باہم چشمک بھی تھی، مثلاً ایک موقع پر سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔" تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی،

اور مولانا روم ہیں، اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے، اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں، اور چونکہ مولانا ہمارے پیرو ہیں، اس لئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی اُن کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے[1]۔"

موازنۂ انیس و دبیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔" ہمارے زمانہ میں جو سوانحعمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں باوجود دعوائے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے، کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اسکو دکھائے جائیں[2]۔"

موجودہ سوانح نگاری کے متعلق اسی قسم کی تنقید مولانا نے اپنے بعض مضامین میں بھی کی ہے، اور لکھا ہو کہ" یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔"

ان عبارتوں سے یہ ظاہر ہے کہ یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے، اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانحعمریوں سے" حیاتِ جاوید" مراد ہے، کنایہ سے گذر کر مولانا نے خطوط میں حیاتِ جاوید کے متعلق تصریحاً بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ" حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں، اور وہ بھی غیر مکمل خیر و للناس فیما یعشقون مذاھب۔" (شیروانی۔ ۲۵)

لیکن یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں، جن کی وہ بیحد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے تمام بائیگرفی (سوانح عمری) پر اظہار خیال ہے، اگر حیاتِ جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا

---

[1] سوانح مولانا روم ذکر" دیوان" صفحہ ۵ طبع اوّل [2] موازنہ زیر عنوان" اعتراضات" صفحہ ۲۳۵ طبع اوّل

تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے۔

مولوی نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط و اخلاص نہ تھا جو مولنا کو مولنا حالی کیساتھ اور مولنا حالی کو مولنا کیساتھ تھا تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی، کانفرنسوں کے اجلاس میں اکثر دونوں بزرگ ایک ساتھ پبلک اسٹیج پر نظر آتے تھے، اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ کہتا تھا، اُس سے بے تکلفانہ تعلقات کی جھلک نمودار ہوتی تھی، ایک بار اسٹریچی ہال میں کانفرنس کا اجلاس ہوا، تو مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں ظریفانہ لہجہ میں کہا :۔ "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہوگیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں"۔

دہلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو مولانا، مولوی نذیر احمد سے ملے، اور چونکہ چند لڑکوں کو عربی میں تقریر کرنے کے لئے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے مولانا نے خصوصیت کے ساتھ اُن کو جلسہ میں شریک ہونے کے لئے دعوت دی۔ الندوہ جاری ہوا، تو مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کی تعریف میں ایک خط لکھا اور چند عربی شعر لکھ کر بھیجے۔ جن کو مولانا نے الندوہ کے شذرات میں شائع کیا، شعر یہ تھے :۔

یقولون ان العلم والفضل والنھیٰ	حبیس علی المتقدم المتبصر
فلما تصفحنا صحائف ندوۃ	وجدنا بان الفضل للمتاخر

ترجمہ :۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضل و کمال اگلوں کا حصہ تھا، مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل و کمال تو پچھلوں ہی کا حصہ ہے۔

مولانا نے ۱۹۰۰ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا، اُس میں ان دونوں بزرگوں کے

نام بڑی عزت سے لئے ہیں،

نگہ از ہر سوے حالیِ آزادہ فگن وان نذیر احمد طوطیِ شکر خا بنگر

مولانا محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے، اُن سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، جبکہ اُن کا دماغ خراب ہو چکا تھا، بایں ہمہ مولانا اُن کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز مانتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "آزاد اردوے معلّٰی کا ہیرو ہے، اُس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے"

الندوہ میں جہانگیر پر جو مضمون لکھا ہے، اس کی تمہید میں نیرنگِ خیال کی عبارت کا اقتباس ان الفاظ میں کیا ہے:۔ "ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگِ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے"

جس زمانہ میں شعر العجم لکھ رہے تھے، آزاد کی کتاب "سخندانِ پارس" نکلی، اُس کی نسبت ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں:۔ "آزاد کی کتاب آج ویلو آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم وہ اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیا گذرا، ٹیکر تک اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا، بارہویں میں میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، اس لئے یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا" (مہدی ۔ ۳۶)

مولانا محمد حسین آزاد کی وفات کی خبر جب مولانا کو پہنچی، تو اُن پر بے حد اثر ہوا، اسی وقت مدرسہ بند کرا دیا، اور تعزیت کا ایک جلسہ کرایا، جس کے پہلے مقرر وہ خود تھے، اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرہ سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدتِ غم کا اثر محسوس ہوتا تھا

تقریر میں سب سے پہلا فقرہ جو اُن کے منھ سے نکلا وہ یہ تھا:۔

"آج خدائے سخن مرگیا"

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی سے نہایت وسیع تعلقات تھے، قیصر نامہ ان کی مشہور فارسی مثنوی ہے، مولانا اُن کی فارسی دانی اور قادر الکلامی کے قائل تھے، تعلقات کا آغاز غالباً اُس وقت سے ہوا جب علی گڈھ جاکر مولانا نے اپنی اور حزیں کی فارسی غزلیں خواجہ صاحب کے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجی تھیں، اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے، ندوہ کے قیام سے پہلے مولانا جب لکھنؤ جاتے تھے تو اکثر اُن ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بھی بعض اوقات اُن کے یہاں جاکر دن دن بھر رہتے تھے، مولانا خواجہ صاحب کی بلند ہمتی اور خودداری کے دل سے معترف تھے، البتہ شاعری میں اُن کے مراعاتِ لفظی کو پسند نہیں فرماتے تھے، مولانا کے پاؤں میں گولی لگی، تو خواجہ صاحب نے ایک رُباعی لکھی، مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے، ایک بار "الناظر" نے مولانا کو خواجہ صاحب کا شاگرد لکھدیا تھا، اس کی تردید میں مولانا نے لکھا کہ

"خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں" (مکاتیب ۱۰)

خواجہ صاحب کو الناظر کے اس بیان کا حال معلوم ہوا تو سخت افسوس کا اظہار کیا،

۱۹۰۸ء تھا کہ مولانا نے حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں بہادر کی خدمت میں ندوہ کی طرف سے ایک خریطہ پیش کرنے کے لئے یہ شعر کہا تھا،

تا جہاں باشد و ایں گنبدِ گرداں باشد دہر فرماں بر محبوب علی خاں باشد

پھر یہ شعر بغرض مشورہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجا، جو صاحب گئے تھے، انھوں نے آکر کہا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گنبدِ گرداں کی ترکیب اچھی نہیں معلوم ہوتی، مولانا نے یہ سُن کر فرمایا کہ اب ہمارے خواجہ صاحب سٹھیا گئے،

آخر میں مولانا کے معاصر دوستوں میں سے ایک بزرگ کا نام لینا چاہتے ہیں، جو بفضلہ تعالیٰ اس وقت تک ہم میں ہیں، اور کہنہ سالی کے باوجود قلم و کاغذ کی تفریحات اور علمی مشاغل میں مصروف ہیں، میری مراد مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری سے ہے جو مصنفِ البرامکہ کی حیثیت سے مشہور ہیں، اور اس وقت تک جبکہ اُن کی عمر اسّی کے قریب ہوگی، بھوپال کے "محکمہ تاریخ" کے مہتمم ہیں اور ابھی اپنی کتاب البرامکہ کا دوسرا اڈیشن جو پہلے سے دونا ہے مرتب کرکے چھپوایا ہے، مولوی صاحب ممدوح کو مولانا سے اُن کے علی گڈھ کے زمانۂ قیام سے بے تکلفانہ دوستی، آمد و رفت اور مشاغلِ علمی میں استشارہ کا تعلّق تھا، وہ گویا علمی میدان میں مولانا مرحوم کے ہمرکاب تھے، مولانا نے جو سلسلہ فرماں روایانِ اسلام کا شروع کیا تھا، اس کی مناسبت سے انھوں نے سلسلۂ وزرائے اسلام شروع کیا تھا، اور اس سلسلہ میں البرامکہ اور نظام الملک طوسی دو کتابیں لکھیں اور دونوں کے مسوّدے چھپنے سے پہلے مولانا کی نظر سے گذر چکے تھے، مولوی صاحب نے آجکل اپنی زندگی کے دلچسپ مشاہدات یادِ ایّام کے نام سے لکھے ہیں، اس میں مولانا کے اور اپنے بے تکلفی کے واقعات اور آمد و رفت کے حالات بھی درج کئے ہیں، مگر

عہدِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اُمراء اور والیانِ ملک سے تعلقات | مولانا کے علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں بڑے بڑے امراء اور والیانِ

ملک کالج کو دیکھنے آتے تھے، اور وہاں اُن کے خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے، اُن جلسوں کے پروگرام کا ضروری جزء مولانا کی نظم ہوتی تھی، اس تعلق سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے، بلکہ اُن کے فضل و کمال کا سکہ ان مہمانوں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا، خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ، سر آسمان جاہ صدر اعظم حیدر آباد، جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام رام پور وغیرہ سے وہ اسی طور سے روشناس ہوئے تھے اور سب نے اُن کی قابلیت کا اعتراف کیا،

پہلے پہل جب سر سید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے تو اکثر امرائے کبار نے اُن کی قدر و منزلت کی، اور خود اعلیحضرت میر محبوب علی خاں تک ان کی شہرت پہنچی، دوبارہ ۱۸۹۶ء میں جب وہ حیدر آباد گئے تو امراء اور اکابر دکن کی قدردانی اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے جلسہ کرکے اُن کو ایڈریس پیش کیا، اور اعلیحضرت میر محبوب علی خاں نے ازراہ قدردانی سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا اور ۱۹۰۱ء میں ان کو اپنے ہاں ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز فرمایا، جس سے ۱۹۰۵ء میں وہ مستعفی ہوئے تو پھر بدستور پہلا وظیفہ جاری فرما دیا، ۱۹۱۶ء میں جب اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خاں تک دار المصنفین کی امداد کے تعلق سے مولنا کا اسم گرامی پہنچا تو تعریف فرمائی، اور اُن سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر فرمایا، منصبداران و امرائے دکن میں سے مولنا کے تعلقات زیادہ تر نواب فخر الملک بہادر وزیر تعلیم نواب سر افسر الملک بہادر سپہ سالار آصفیہ اور نواب عماد الملک بہادر معتمد تعلیمات سے تھے،

دوسرے والیان ریاست میں سے بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال سے متعدد بار اُن کی ملاقاتیں ہوئیں، ایک دفعہ تو ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کی امداد کے تعلق سے اور دوسری دفعہ ۱۹۱۲ء میں سیرۃ نبوی کے لئے ان ملاقاتوں میں اُن سے مولانا بہت متاثر ہوئے پہلی ملاقات

کے تاثرات اُسی زمانہ میں الندوہ میں لکھے ہیں، دوسری دفعہ کی ملاقات کا ذکر مکاتیب میں ہے (مکاتیب شروانی (۱۰۱) اس سفر میں ہر ہائینس مرحومہ نے مولانا سے دریافت فرمایا تھا آپ کی صحت کی یہ حالت ہے، آپ اپنا جانشین تو تیار کریں، مولانا نے سیرت کے متعلق دو شعر کہے تھے، جن میں ایک یہ ہے،

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل　　کہ جن میں اک فقیرِ بے نوا ہے، ایک "سلطان" ہے

سلطان کا اشارہ سلطان جہاں بیگم کی طرف تھا،

جب مولانا کا انتقال ہوا، تو بیگم صاحبہ نے بہ حسرت فرمایا، کہ "فقیرِ بے نوا تو چل بسا، سلطان باقی ہے"، بیگم صاحبہ نے اپنی بعض تصانیف میں بھی مولانا سے مشورہ لیا ہے،

نواب حامد علی خاں بہادر والی رام پور سے اُن کے تعلقات اُن کی ولیعہدی کے زمانہ سے تھے، جب زمامِ انتظام جنرل عظیم الدین خاں کے ہاتھ میں تھی، اور مولانا مدرسۂ عالیہ اور کتب خانہ کے تعلق سے رامپور آیا جایا کرتے تھے، مولانا جب سفرِ ٹرکی سے واپس آئے تو ریاست رامپور نے اُن کے اس سفر کے مصارف ادا کرکے اُن کی اس علمی زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہا، مگر مولانا نے قبول نہیں کیا، سرسید کی وفات کے بعد رام پور میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اُس میں پھر ملاقات ہوئی، ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے تعلق سے پھر جاکر ملے اور نواب صاحب نے پانچسو روپیے سالانہ ندوہ کے لئے مقرر فرمائے، جو چند سال جاری رہے،

نواب صاحب جزیرہ (جنجیرا) اور اُن کا پورا خاندان مولانا کا شیدائی تھا، چنانچہ جب

بمبئی جاتے تھے، تو اکثر اُن لوگوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر ۱۹۱۲ء
میں خود جزیرہ (جنجیرہ) تشریف لے گئے تھے،

مولانا کو صرف ہندوستان ہی میں یہ عزت حاصل نہ تھی، بلکہ اُن کی شہرت کا غلغلہ
بیرونی ممالک میں بھی پہنچ گیا تھا، اور وہاں سے عملاً اس کا اعتراف ہوتا تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء
میں قسطنطنیہ گئے تو وہاں کے تمام اکابر سے ملاقاتیں رہیں، اور گورنمنٹ ٹرکی کی طرف سے
تمغۂ مجیدی عطا ہوا، امیر عبدالرحمان خاں والیِ کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تو اس کی
سکریٹری شپ کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، لیکن مولانا نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا،
انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا، اور اپنی مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں اُن
کو ممبر بنایا دربار میں بھی بحیثیت شمس العلما، اُن کی کرسی تھی، دربار تاجپوشی کے موقع پر بھی وہ
شریکِ دربار ہوئے تھے، اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو بار بخشا تھا،

مذہب | مولانا کی مذہبی زندگی میں مختلف تغیرات پیدا ہوتے رہے، ابتدا میں وہ ایک
متعصب حنفی اور متشدد مولوی تھے، غیر مقلدوں سے مناظرے کرتے تھے، اُن کی تردید
میں رسالے لکھتے تھے، خود فرائض وسنن کے سخت پابند تھے، اور دوسروں سے نہایت
سختی کے ساتھ اُن کی پابندی کراتے تھے، فریضۂ حج سے تو زمانۂ طالب علمی ہی میں مشرف
ہو چکے تھے، اور دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے،

اُن کے خالو نے اعظم گڈہ میں ایک برف خانہ بنوایا تھا، فرماتے تھے کہ "جب ہم لوگ
گرمی کے زمانہ میں افطار کے وقت برف پیتے تھے تو اپنے خالو کے حق میں دعائیں کرتے

تھے، امانت کا کام کرتے تھے تو اُسی گرمی کے زمانہ میں متصل کئی کئی کوسوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا، لیکن بایں ہمہ وہ روزہ قضا نہیں کرتے تھے، علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں سخت گرمیوں میں سرسید کے ساتھ نینی تال گئے تھے، اس سفر میں بھی روزہ کا اہتمام تھا، اثنائے قیام ندوہ میں ۱۳۲۹ھ کے رمضان میں جو اگست ۱۹۱۱ء میں پڑا تھا، دن میں کثرتِ مطالعہ کے سبب سے ایک آنکھ میں پانی آنے لگا، اور اُس کی بینائی جاتی رہی، تاہم روزے رکھے،

ندوہ میں آنے کے بعد بعض اوقات جماعت میں شریک ہوتے تھے، البتہ پاؤں کے حادثہ کے بعد معذوری ہوگئی تھی، پھر بھی ایک دفعہ یہ اہتمام کیا کہ کہار مقرر کئے، اور ڈولی پر بیٹھ کر مسجد جانے لگے، مگر چونکہ مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم جو امامت فرماتے تھے نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے اور رکوع وسجود میں دیر تک رہتے تھے، اور مولانا اپنے پاؤں کی معذوری کے سبب سے اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے چند روز کے بعد جماعت کی شرکت چھوڑ دی،

اسی طرح اخیر زمانۂ قیامِ اعظم گڈھ میں ایک دفعہ ایک حافظ صاحب نے جو بہت کھینچ کھینچکر قرأت کرتے تھے، مغرب کی نماز میں امامت کی، مولانا مقتدی تھے، نصف ساق تک ایک پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے دیر تک ایک پہلو پر بیٹھنے میں اُن کو تکلیف ہوتی تھی، اس لئے نماز کے بعد بہت جھلائے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا کہ "آپ لوگوں کو معذوروں کا ذرا خیال نہیں ہوتا" وہ صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور سویرے ہی وضو کر کے نماز پڑھتے تھے،

صبح کو کبھی زبانی اور کبھی قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کا معمول تھا، اور اس میں بھی ان کے مزاج میں یہ نفاست پسندی تھی کہ وہ تلاوت کے لئے مطبوعہ قرآن کے نسخوں کو بہت کم پسند کرتے تھے، وہ ہمیشہ اس کے لئے قرآن پاک کا کوئی نہ کوئی قلمی نسخہ رکھتے تھے، اور اخیر عمر میں بھی بمبئی میں اس کے لئے جو نسخہ خریدا تھا وہ بڑا قیمتی تھا،

علی گڈہ جا کر اُن کی مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا، اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں، اور عوام بلکہ علما تک کا خیال ہے کہ وہ علی گڈہ میں جا کر وضع، قطع، عقائد و اعمال کے لحاظ سے معاذ اللہ بالکل آزاد خیال نیچری ہو گئے تھے، لیکن یہ تمامتر خلافِ واقعہ ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ علی گڈہ جا کر اُن کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ وسعت اور آزادی پیدا ہو گئی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ جس شدت کے ساتھ وہ پہلے پابند تھے، علی گڈہ میں وہ اہتمام و تشدد باقی نہیں رہا، بلکہ حیدرآباد تک یہی حال رہا، اور یہ متکلمین کی ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، اور کچھ ماحول کا اثر بھی، لیکن اس پر بھی ان کی حنفیت کا غلو اپنی جگہ پر قائم رہا،

لطیفہ:- دار العلوم کی پرانی عمارت کے صحن میں ایک مسقف حوض تھا، خاکسار نے ایک دفعہ حوض کے پائپ سے وضو کیا، اور اُس کی چھت پر نماز پڑھنے لگا، ساتھ ہی میلانِ خاطر کی بنا پر اتفاقاً اُس وقت رفع یدین بھی کیا، میں نے مولانا کو نہیں دیکھا، وہ مولٰنا حفیظ اللہ صاحب کے چھپّر کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے، نماز پڑھ چکا تو پاس بلایا، پھر فرمایا، میری عجیب قسمت ہے، میں تو پکا حنفی ہوں، اور جو مجھ سے پڑھتا ہے وہ اہلِ حدیث

ہو جاتا ہے، حمید الدینؒ کا یہی حال ہوا، اور تمہارا بھی یہی حال ہے،

جب وہ کالج میں گئے ہیں تو طلبہ کی مذہبی زندگی اُن کو پسند نہ آئی، گو یہ اُن کے فرائضِ منصبی میں نہ تھا، تاہم انھوں نے طلبہ میں نماز کی پابندی کا شوق پیدا کر دیا، "نجنۃ الصّلوٰۃ" کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن قائم ہوئی جس میں وہ شریک تھے، کالج کے طلبہ میں مذہبی معلومات پیدا کرنے کی خاطر وہ سال میں ایک دفعہ مجلسِ میلاد کیا کرتے تھے، اور خود اس میں بیان فرمایا کرتے تھے، اور دینیات کے درس میں وہ دلچسپی پیدا کر دی تھی کہ طلبہ اُن کے کلاس میں شوق سے شریک ہونے لگے، خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبہ نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے یہ صاف کہدیا کہ "چونکہ آپ شریک نہیں ہوتے"۔ (سرسید سلسل البول کی شکایت کے سبب سے گھر جا کر نماز پڑھتے تھے، اور جمع بین الصّلوٰتین بھی کرتے تھے)

وضع و قطع کے لحاظ سے مولانا اگرچہ کوئی متقشف مولوی نہیں معلوم ہوتے تھے، تاہم انگریزی لباس انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، لطیفہ سیرۃ النعمان کے جواب میں مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی نے "حسن البیان" نام کتاب لکھی تھی، اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ "اتفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنتا، مولانا رحیم آبادی نے پشیمانی ظاہر کی، اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا"

لہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اپنے چچا مولوی سلیم صاحب کے اثر سے جو عامل بالحدیث تھے، ایک زمانہ میں اہل حدیث ہو گئے تھے، پھر رجوع کر لیا،

داڑھی کی غیر شرعی ہیئت سے بھی اُن کو سخت بیزاری تھی،

ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں لوگوں نے رقص و سرود کا سامان کیا، اُن کو معلوم ہوا تو سخت خفگی ظاہر فرمائی، اور شرکت سے انکار کر دیا، آخر وہ حرکت ملتوی کی گئی، تب انھوں نے شرکت کی،

اپنے صاحبزادہ کی پہلی شادی میں ہر قسم کے رسوم و بدعات سے احتراز کیا، اور اس موقع پر ایک مؤثر تقریر کی، جس میں اُن تمام رسوم کی جڑ کاٹ دی، اور اہلِ برادری کے لئے شادیوں میں جہیز وغیرہ کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا، جس کی تعمیل بہت دنوں تک ہوتی رہی، اور اب بھی کسی قدر ہے،

قسطنطنیہ کے سفر میں جہاز پر پرندوں کے گوشت کھانے سے کئی روز تک اس بنا پر اجتناب کیا کہ اُن کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ جہاز پر پرند ذبح نہیں کئے جاتے، مگر انھوں نے خود جا کر دیکھا کہ اس جہاز پر پرند ذبح کئے جاتے ہیں گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے تب گوشت کھانا شروع کیا،

عقائد و خیالات | تاہم عقائد و خیالات کے لحاظ سے وہ عقلیت پسند تھے لیکن اُن کی عقلیت پسندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ احکامِ مذہبی کو مصالح و حِکَم پر مبنی سمجھتے تھے، اسی لئے وہ احکامِ الٰہی کی مصلحتوں اور حکمتوں کی تلاش میں رہتے تھے، اور اشاعرہ کے اس خیال کے کہ احکامِ الٰہی کا منشا محض مشیئتِ الٰہی[1] ہے اور وہ کسی مصلحت و حکمت پر مبنی نہیں، سخت مخالف تھے

[1] حالانکہ ان دونوں باتوں میں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ثابت کیا ہے اور ماتریدیہ کا مسلک بھی یہی

اسی بنا پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ معجزات کے بھی قائل نہ ہوں گے، کیونکہ وہ خرقِ عادت پر مبنی اور خلافِ عقل ہوتے ہیں، لیکن یہ سوءِ ظن قطعاً غلط ہے، وہ معجزات کے قائل تھے اور سرسید وغیرہ کی تاویلات کو دور از کار اور ملمع سمجھتے تھے، چنانچہ الکلام میں لکھتے ہیں: "لیکن خرقِ عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے، اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک موجود ہے، اس لئے اس عقدہ کا حل کرنا ضرور ہے، قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا، بے شبہہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکارِ محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کافی ہیں، جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرزِ اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع کیا کام دے سکتی ہے"۔ (ص ۶ - ۱۱۵)

لیکن با ایں ہمہ وہ بات بات کو معجزہ نہیں مانتے تھے، اُن کے نزدیک معجزات کے ثبوت کے لئے قطعی شہادت کی ضرورت تھی، اور قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے، اس لئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۱۸) ہے کوئی تضاد نہیں، بے شبہہ یہ احکام مصالح و حکم پر مبنی ہیں، لیکن یہ بھی مشیئتِ الٰہی کا کرشمہ ہے، خاکسار کا ایک شعر ہے،

تری قدرت وہ کرسکتی ہے جو تیری مشیئت ہے   مگر تیری مشیئت آپ ہی پابندِ حکمت ہے

لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ مصالح و حکم پوری طرح بندوں کی سمجھ میں بھی آجائیں، اور جو بندے سمجھیں وہ تمام تر صحیح بھی ہو،

اس میں جہاں خرقِ عادت کا ذکر ہوگا، واجب التسلیم ہوگا،

لیکن مولانا کے نزدیک یہ امر نہایت غور اور دقتِ نظر سے طے کرنا پڑے گا، کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں، مفسرین میں بقول مولانا جو محقق گذرے ہیں، مثلاً قفال، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ، ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرقِ عادات مذکور ہیں، اور جو واقعی مذکور ہیں اُن کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے[1]،

ان کا یہ خیال الکلام کے لکھتے وقت یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۳ء تک تھا، لیکن سیرت کی تصنیف کے وقت وہ اپنے پچھلے خیال سے پھر چکے تھے، چنانچہ احادیثِ صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو معجزات مذکور ہیں، اُن کا ذکر خود سیرۃ النبیؐ کی دو جلدوں میں کیا ہے، اور مقدمہ میں لکھ بھی دیا ہے "البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہی، مثلاً معراج اور تکثیرِ طعام وغیرہ اُن کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے"، (خاتمۂ دیباچۂ سیرت جلد اوّل)

وہ جن اور شیطان کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے، لیکن اُن کے متعلق عوام جو واقعات بیان کیا کرتے ہیں اُن کو وہم پرستی سمجھتے تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کے حال میں اُن کا جو مضمون ہے اس میں لکھتے ہیں:- "جن کے وجود سے انکار نہیں، لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے"۔ (مقالاتِ شبلی ج ۵ ص ۳۷)

اس سے شاید مولانا کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ دوسروں کی صورت بن کر نمایاں نہیں

---

[1] الکلام بحث معجزات،

ہوا کرتے، ورنہ شخصیتوں سے امان اُٹھ جائے، ہاں احادیث میں شیاطین کا بہ تبدیلِ صورت نظر آنا صاف وصریح مذکور ہے،

وہ گو فرشتوں کے وجود کے پہلے بھی قائل تھے، لیکن اس کے ساتھ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ ملائکہ کا اطلاق حسبِ تصریح مولانا رومؔ ومولانا بحر العلوم شارحِ مثنوی بعض ملکاتِ نبوی اور ملکاتِ بشری پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ سوانح مولانا رومؔ میں انھوں نے لکھا ہے، لیکن سیرت کی تالیف کے زمانہ میں اس حقیقت کے چہرہ سے بھی پردہ اُٹھ چکا تھا، اور جبریلِ امین اور دوسرے فرشتوں کے مستقل شخصی وجود کے نام اُن کی اس کتاب میں اسی طرح آئے ہیں جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں،

حشر و نشر، جنت اور دوزخ اور واقعاتِ مابعد الموت کے متعلق جہاں تک اُن کی قدیم کلامی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی کلامی مشغولیتوں کے زمانہ میں ان چیزوں کو فقط روحانی سمجھتے تھے، مگر جب سے انھوں نے ادھر چند اخیر برسوں میں سیرۃ النبیؐ کے تعلق سے احادیث کا مطالعہ شروع کیا تھا، اُن کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا تھا، اُن کے ذہن و عقل کی دنیا ہی بدل گئی تھی، اُن کے اس انقلاب میں علامہ ابن تیمیہ کی تصنیفات کو بھی بڑا دخل تھا،

بدعات سے اُن کو ہمیشہ سے سخت نفرت تھی، بدعاتِ شعبان ومحرم کا اُن کے ہاں پتہ بھی نہ تھا، اسی طرح بزرگوں کے مزارات پر جاکر عوام جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اُن کو شرک سمجھتے تھے، بلکہ بعض دفعہ وہ غصہ میں احتیاط سے آگے بڑھ جاتے تھے،

ایک بار ایک صوفی اُن سے ملنے آئے، سلسلہ کلام میں مولانا نے فرمایا کہ اجمیر وغیرہ کے تبکدوں کو جلا دینا چاہئے۔ اُس وقت تو وہ صاحب خاموش رہے لیکن وہاں سے اٹھ کر آئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی سے کہا کہ ان حضرت کو مراق تو نہیں ہو گیا ہے، اگر ان کا یہ خیال تھا تو کم از کم میرے سامنے اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہئے تھا۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ مولانا بمبئی سے اجمیر کے راستہ سے لوٹے، اجمیر کے اسٹیشن پر پہنچے تو مجاور جو اسٹیشن پر زائروں کو لینے کے لئے آتے ہیں، مولانا کی طرف بڑھے، مولانا نے اُن سے بے رُخی برتی تو انھوں نے کہا، کہ "یہ حضرت فرعون بے سامان معلوم ہوتے ہیں" مولانا نے فرمایا "ہاں میں تو فرعون بے سامان ہوں، مگر آپ فرعون باسامان ہیں"۔

الفاروق میں ایک ضمنی موقع پر لکھتے ہیں:۔ "اسلام نے شرک کو کس زور شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے، اس میں آج بھی کس قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استفادہ عن القبور اور حصولِ برکت کے خوشنما الفاظ نے اُن پر پردہ ڈال رکھا ہے"۔

الکلام میں مولانا نے ملحدین کے بہت سے اعتراضات نقل کرکے اُن کے جوابات دیئے ہیں بعض لوگوں نے دیدہ و دانستہ یا نادانستہ ان اعتراضات کو مولانا کے عقائد میں داخل کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں معاملاتِ ندوہ کی تحقیقات کے لئے دلّی میں جلسہ ہوا، اُس میں بعض مخالف علماء نے ان ہی عقائد کی بنا پر اُن پر کفر کا فتویٰ لگایا، اور ظاہر کیا کہ وہ مادہ کو قدیم اور غیر مخلوق اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، اس پر سید عبدالسلام صاحب مرحوم مالک مطبع فاروقی

عکس تحریر مولانا شبلی مرحوم

(متعلقہ صفحہ ۲۰۲)

باقی یہ ہے کہ عقاید میں وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقاید ہیں، میں عقاید اسلام

اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں

شبلی

۹ مئی ۱۹۱۳

مولانا شبلی کی غزل خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی

غزل

ہر جا کہ روی روشن تو جلوہ ساز بود
ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو باز بود

آن شوخ را بہ صومعہ‌ها چون گذر فتاد
یکبارہ عشق‌ہای حقیقی مجاز بود

ہر جا حدیث فتنۂ ایام کردہ‌ایم
روی سخن بر آن نگہ فتنہ ساز بود

با چرخ سفلہ صحبت آن شوخ درگرفت
کو فتنہ دوست بودہ و این فتنہ ساز بود

جانا زبان و لب نشود ترجمان دل
ما را امیدہا بہ نگہ‌ہای راز بود

ما خود سری بہ رندی و مستی نداشتیم
این‌ہا گناہ دیدۂ معشوقہ باز بود

مستور و رند ہیچ یکی سر برون نبرد
زان حلقہ‌ہا کہ در خم زلف دراز بود

لذت شناس رندی و مستی نبودہ است
آن بوالہوس کہ در گرو عز و ناز بود

غمگین مباش گر سخن از مدعا نرفت
شبلی ہنوز اول راز و نیاز بود

دہلی نے مولانا سے اس کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے اس کا یہ جواب لکھا:۔" جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے، اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں،

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں، تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں، اور اس غرض سے نقل کئے ہیں، کہ اُن کا رد کیا جائے،

نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے، اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا یقین کرتا ہوں، اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا، باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہلِ سنت وجماعت سے ہوں"

اس اعلان میں آخری سطریں یونہی چھپی ہوئی ہیں، مگر چونکہ میں اس واقعہ کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اس لئے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا اس کی اخیر سطریں انھوں نے یہ لکھی تھیں، جو اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب تک میرے پاس ہیں۔۔" باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائلِ فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں"   شبلی ۹۔ مئی ۱۹۱۴ء

فوٹو

وھذا مما یستظرف ان یکون حنفیؐ اشعریا۔ یعنی یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص حنفی ہوکر اشعری ہو" (علم الکلام ص ۹۰)

اس کے بعد مصنف نے ماتریدیہ کے ان عقائد کی فہرست دی ہے، جن میں وہ اشاعرہ سے الگ ہیں،

مولانا مرحوم اپنی کتابوں میں سے علم الکلام کو بہت ناقص سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ مجھے افسوس رہ گیا کہ جس تفصیل سے اشاعرہ کے علم کلام کا ذکر میں نے کیا، ماتریدیہ کا کیوں نہیں کیا" اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ انھوں نے اس کتاب کو علالت کے زمانہ میں لکھا، جس کے سبب سے پوری تفصیل نہ کی جاسکی، اور شاید یہ بھی وجہ ہو کہ علماے احناف نے علم کلام پر بہت کم کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:۔" ماتریدیہ کی گمنامی کی وجہ یہ ہوئی کہ علماے حنفیہ نے علم کلام میں بہت کم تصنیفات کیں، اس فن میں جس قدر مشہور اور معرکۃ الآرا کتابیں ہیں وہ شافعیہ کی تصنیفات ہیں، جو عموماً اشعریہ تھے، (علم الکلام ص ۹۰)

فروری ۱۹۰۹ء میں شیخ عبدالقادر صاحب (پونہ) مولانا سے ایک کلامی مسئلہ کی تشریح چاہتے ہیں، وہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔" جملۂ مستفسرہ اشاعرہ کا عقیدہ ہے، اشاعرہ سنّی فرقہ کی ایک شاخ ہے لیکن اب تو تمام سنّی اسی حماقت میں گرفتار ہیں، خیر اس فقرہ کو رہنے دیجئے گو میرے ذاتی عقیدہ کے خلاف ہے" (۸)

اس خط پر میرا حاشیہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا ہے،

"عقائد میں (مولانا) ماتریدیت کو ترجیح دیتے تھے"

(حیات شبلی)

بہر حال اہلسنت کے یہ دو مقابل کے فرقے تھے، علامہ سبکی جو مشہور اشعری ہیں، شرح عقیدۂ ابن حاجب، میں لکھتے ہیں:۔

وبالجملة فهم (اى اهل السنة) بالاستقرأ ثلاث طوائف الاول اهل الحديث و معتمد مباديهم الادلة السمعية والثانى اهل النظر العقلى والصناعة الفكرية وهم الاشعرية والحنفية وشيخ الاشعرية ابو الحسن الاشعرى وشيخ الحنفية ابو منصور الماتريدى (اتحاف السادة ج ۲ ص۶)

حاصل یہ کہ اہلِ سنت کے تین گروہ ہیں، پہلا گروہ اہل حدیث ہے، اور اُن کے اصول کی بنیاد نقلی دلیلوں پر ہے، اور دوسرا گروہ عقلی اور فکری علم و استدلال والے، اور وہ اشعریہ اور حنفیہ ہیں، اشعریہ کے امام ابو الحسن اشعری، اور حنفیہ کے امام ابو منصور ماتریدی ہیں،

یہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اُسی طرح باہم مختلف اور دست و گریباں ہیں، جس طرح اسلام کے اور دوسرے فرقے، گو ان میں صلح پسندوں کے بیچ بچاؤ سے کبھی کبھی روک تھام بھی ہوتی رہی، ان اختلافات کی شدت کی صحیح حیثیت اگر کسی کو دیکھنی ہو تو امام ماتریدی کی شرح فقہ اکبر (منسوب الیہ) امام فخر الاسلام بزدوی کی کتاب العقیدہ، ابوشکور سالمی کی کتاب التمہید، ابن ہمام کی مسایرہ، اور متاخرین میں ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر دیکھئے،

جن مسائل میں حنفیہ اور اشعریہ کا اختلاف ہے، اُن میں چند مسائل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتِ فعلیہ جیسے خلق و رزق و رحمت وغیرہ اشعریہ کے نزدیک حادث ہیں، اور ماتریدیہ کے نزدیک تمام صفاتِ الٰہی قدیم ہیں،

۲- اشیاء میں حسن و قبح اشعریہ کے نزدیک فقط شرعی ہے، اور ماتریدیہ کے نزدیک شرعی کے ساتھ عقلی بھی ہے،

۳- اشعریہ کے نزدیک بندوں میں اپنے افعال پر جو قدرت ہے وہ وہمی ہے اس کو افعال کے صدور میں کوئی دخل و تاثیر نہیں، ماتریدیہ کے نزدیک بندوں کی قدرت کو اُن کے افعال کے صدور میں دخل و تاثیر ہے، اور اسی لئے اُن سے مواخذہ ہے،

۴- ماتریدیہ کے نزدیک خدا جس طرح جور و ظلم سے اور جو صفات اُس کے شایانِ شان نہیں اُن سے شرعاً پاک ہے، اسی طرح عقلاً بھی پاک ہے، اشاعرہ کے نزدیک شرعاً پاک ہے، عقلاً نہیں،

۵- ماتریدیہ کے نزدیک خدا نے اپنے احکام اپنے بندوں پر اپنی رحمت سے مصالح اور حکمت پر مبنی کئے ہیں، اشعریہ کے نزدیک مصالح و حکمت پر مبنی نہیں،

۶- ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں خواص اور تاثیرات ودیعت کی ہیں، اشاعرہ کے نزدیک اشیاء میں کوئی خاصہ اور تاثیر نہیں، اللہ تعالیٰ ضرورت کے وقت اُن میں تاثیر پیدا کرتا ہے،

۷- ماتریدیہ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو تکلیف مالایطاق نہیں دیتا، اشعریہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ وہ دے سکتا ہے بلکہ اُس نے دی ہے،

۸- ماتریدیہ کے نزدیک ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، اشاعرہ کے نزدیک ہوتا ہے،

مولانا شبلی نے علم الکلام اور الکلام دونوں کتابوں میں طرح طرح سے اشاعرہ پر حملے

کئے ہیں، اور بڑے زور شور سے اُن کے دلائل کا رد کیا ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایشاعرہ کا رد انھوں نے معتزلہ کی محبت میں کیا ہے، حالانکہ یہ معتزلہ کی محبت میں نہیں، بلکہ ماتریدیہ کی محبت میں ہے، البتہ اُن کا قصور یہ ہے کہ وہ اس مخالفت پر بھی اپنی کلامی تصنیفات میں اشاعرہ کے چکر سے نہیں نکل سکے، اور امام غزالی اور امام رازی کی گرفت میں، جو راس الاشاعرہ ہیں، عرصہ تک رہے،

امام غزالی اور امام رازی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عام رسائل میں اشعریت کا حد درجہ التزام کرتے ہیں، حتیٰ کہ امام رازی تفسیر میں کسب کیا جبر تک کے ثابت کرنے کے لئے قدم قدم پر رُکتے ہیں، مگر وہ مطالب عالیہ وغیرہ مخصوص کتابوں میں بلکہ تفسیر میں بھی بعض حقائق کی حکیمانہ تشریح میں اشعریت کی کوئی پروا نہیں کرتے، امام غزالی کبھی معتزلہ کے ہم زبان ہوتے ہیں، کبھی صوفیہ کے، کبھی حکما کے، یہی سبب ہے کہ قاضی ابن رشد نے اپنی کتاب کشف الادلہ میں امام غزالی کی نسبت جل کر یہ لکھدیا کہ" ابو حامد غزالی کا کیا کہنا وہ اشعریوں کے ساتھ اشعری، معتزلیوں کے ساتھ معتزلی اور صوفیوں کے ساتھ صوفی ہیں"

امام غزالی کی کتابوں میں سے جواہر القرآن، المنقذ من الضلال، التفرقہ بین الاسلام والزندقہ، المضنون بہ علی غیر اہلہ وغیرہ ابتدائی کلامی رسائل مولانا کے زیر نظر رہے، اور ان دونوں اماموں کی ان ہی تصانیف سے مولانا نے اُن کے ان خیالات کو چن لیا ہے جو آجکل کے خیال اور مذاق کے مطابق ہو سکتے تھے، اور یہی اُن کا علم کلام ہے،

غرض الکلام لکھتے وقت اُن پر سب سے زیادہ غزالی کا اور پھر رازی کا اثر تھا، لیکن

اس کے بعد جب علامہ ابن تیمیہ کی کتابیں چھپ چھپ کر آنے لگیں تو علامۂ ممدوح کا اثر اُن پر غالب آنے لگا، اس اثر کا آغاز علامۂ ابن تیمیہ کی کتاب "الرد علی المنطقیین" سے شروع ہوا، اور آخر یہاں تک بڑھا کہ وہ جولائی ۱۹۱۴ء میں یعنی وفات سے چار ماہ پہلے مجھے لکھتے ہیں کہ "تم نے شروع کر دیا تو خیر، ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرضِ اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی وغزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، اُن کی تصنیفات میں ہر روز نئی باتیں ملتی ہیں۔" (ص-۸۶)

آخر میں مجھ سے فرماتے تھے کہ "میں اب ہر چیز میں ابن تیمیہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار رہوں"

آخر زمانہ میں اُن میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہو گئی تھی، اسی زمانہ میں بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں، ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن[ل] صاحب نے جن سے مولانا کے بھائی مولانا حمید الدین صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی عربی پروفیسری کے زمانہ میں جو شاید ۱۹۱۰ء ہو، بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی، مگر ان کو مانتے تھے،

مولانا کے اخیر زمانہ کی فارسی غزلوں میں خواجۂ شیراز کی شراب کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اس کو دیکھ کر بعض صاحبوں کو خیال ہوا تھا کہ مولانا پر تصوّف کا رنگ آرہا ہے، اور

[ل] کوڑا جہان آباد وطن تھا، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے فیض حاصل کیا تھا، لکھنؤ میں شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد میں قیام فرمالیا تھا، وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں، لکھنؤ کے بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب نے ان سے تربیت پائی، اور بہت سے شہروں میں ان کے فیض روحانی نے وسعت حاصل کی، خاکسار بھی ان کی زیارت سے بارہا سعادتمند ہوا،

اس کی تلاش تھی کہ اُن کی اس شرابِ حقیقت کا پیرِ مغان کون ہے، اگر یہ واقعہ نہ تھا، تاہم اتنا درست ہے کہ فلسفہ و حکمت کا نشہ اُن کے سر سے اُتر چکا تھا، اور یہ کہنے لگے تھے۔

وودل بودن دریں رہ سخت ترعیبست سالک را   خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوے ایمان ہم

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود   گشت رازِ دگرآں راز کہ افشا می کرد

لطیفہ:۔ ۱۹۱۴ء کے شروع میں جب اصلاحِ ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا، تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے حلقۂ مشائخ میں انھوں نے تصوف پر تقریر فرمائی، جو بڑی جامع و مانع و مؤثر تھی، تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف نقالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا[1]

اسی زمانہ میں دلی میں اہلِ حدیث کے زیرِ اہتمام ایک مجلس میں توحید پر ایسا عمدہ، مدلل اور مؤثر بیان فرمایا کہ خود اہلِ حدیث اس غالی حنفی کی پاکیزہ توحید سے متاثر نظر آتے تھے، اگر کچھ روز اور انکی زندگی وفا کرتی تو عجب نہیں کہ یہ قال حال بنجاتا، اور جو انقلابِ روحانی گذشتہ متکلموں کے حالات و خیالات میں پیش آیا وہ چودھویں صدی کے اس متکلم میں بھی نظر آتا جس کے آثار اُن میں روز بروز نمایاں سے نمایاں تر ہوتے چلے جاتے تھے، شاید اسی عالم میں یہ فرمایا ہو،

ساغرِ زندگیم حیف کہ جز درد نداشت   جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ "جس زمانہ میں مولانا الکلام لکھ رہے تھے

---

[1] بروایت مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڈھ، یہ مولٰنا کے اخیر زمانہ میں ندوہ میں زیرِ تعلیم تھے

متکلمین نے وجود باری پر عقلی دلیلیں قائم کی ہیں اُن میں سے ہر ایک کے ضعف و قوت پر نقد کر رہے تھے، ایک دن ایک صحبت میں انھوں نے اقبال صاحب سے فرمایا کہ تم وجودِ باری پر کوئی مضبوط عقلی دلیل دے سکتے ہو؟ اُنھوں نے متداول عقلی دلیلیں پیش کیں، مولنا نے ایک ایک کی کمزوری ظاہر کردی، اسی طرح وہ دیر تک ایک کے بعد دوسری دلیل پیش کرتے رہے، اور مولانا اُن کو توڑتے رہے، آخر میں انھوں نے تھک کر کہا کہ "اچھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعویٰ کیا وہ معاذ اللہ غلط اور جھوٹ ہے؟" ان الفاظ کا سننا تھا کہ مولانا پر تاثیر کا ایک عالم پیدا ہوا، اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور دیر تک روتے رہے، اور جب ذرا سکون ہوا تو اُن سے کہا، "عزیز من

ع با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار صلی اللہ علیہ وسلم

اصل یہ ہے کہ مولانا وجود باری کی ان فلسفیانہ دلیلوں کو جن کو متکلمین نے پیش کیا ہے اعتراضات اور شبہات سے بری نہیں سمجھتے تھے، وہ وجود باری کے اقرار کو فطری کہتے تھے، اور اس کو دلیلِ منطقی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے، اور اس کے لئے قرآن پاک نے جو تنبیہی شہادتیں پیش کی ہیں اُن ہی کو مفید یقین یقین کرتے تھے، چنانچہ الکلام میں بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:- "آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہو گئی ہے، جبکہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہو گئے ہیں، جب کہ حقائقِ اشیاء نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے، جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا"[1]

[1] الکلام صفحہ ۴۰ طبع اول

اور یہی صحت ایمان کا وہ اخیر نقطہ ہے جس پر امام جوینی، امام غزالی اور امام رازی، بلکہ قاضی ابن رشد بھی جو عمر بھر عقلی دلیلوں کی جمع و ترتیب میں سرگرداں رہے، بالآخر رُکے تھے، اور اُسی پر اُن کا خاتمہ ہوا،

یہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہے، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ یہ کہ

حضرت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ اُن کو جو غیر معمولی شیفتگی ہمیشہ سے تھی، جیساکہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں علانیہ فرمایا: "شفیفتگانیم و پیمبر پرست" وہ سیرت نبوی کی تالیف و تصنیف کے زمانہ میں جوں جوں آگے بڑھتے جاتے، ترقی کرتی جاتی تھی، احادیث کے مطالعہ نے اُن میں روحانیت کی ایک سرخوشی پیدا کردی تھی، اور آخر میں ہمیشہ اسی پاک شراب کے نشہ میں مخمور رہتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں اخلاقی نظموں کا جو سلسلہ اُنھوں نے شروع کیا تھا وہ اسی ذاتی اور وجدانی حالت کا نتیجہ تھا،

یہ بھی سلسلۂ وفات میں اوپر آپ پڑھ چکے کہ مرتے وقت بھی جو چیز اُن کے لبِ ناتوان پر بار بار آتی تھی وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی،

تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

آخر اُن کی یہ پیشین گوئی بھی جو اسی سال کی تھی پوری ہوئی،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ‏ ‏ مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم ‏ ‏ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دو سال پہلے ۱۹۱۲ء میں ایک ادب نواز دوست کو کس حسرت سے لکھا تھا:-

،شعر العجم اب کہاں ، ایک آنکھ میں پانی اتر آیا ، دوسری بھی ضعیف ہوگئی ، سیرت پر خاتمہ ہوجائے تو یہ حسن خاتمہ ہے[1]"

بحمداللہ کہ یہ دعا ، قبول ہوئی اور محبوب کی سیرت ہی پر خاتمہ ہوا جو حسنِ خاتمہ کی نشانی ہے

خاتمہ | ناظرین ! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت ، کی ، اس اثنا میں آپ کے اس شریکِ سفر اور رفیقِ نظر نے ایک مجسمۂ علم و فن اور پیکرِ خدمتِ دین و ملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اُس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا ، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوریوں کی جھائیاں بھی ہوں گی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا ، آئیے ہم اور آپ اُسکی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائیں اور زبان سے کہیں ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ ،

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۳۰ ر اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

شبلی منزل ، اعظم گڈھ

---

[1] مکاتیب ۲ - مہدی ۷۶ ،
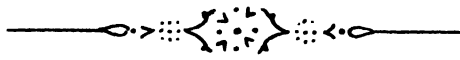
مراثی وقطعات

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اخبارات و رسائل مین اس کثرت سے مرثیے اور تاریخی قطعے شائع ہوتے رہے کہ اُن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بنجائے لیکن اس موقع پر اُن چند خاص مرثیون اور تاریخی قطعون کا ضمیمہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُن کے خاص عقیدت مندون نے لکھے ہین، اور جو اُن کی زندگی کے سوانح کے بیان مین تکملہ کی حیثیت رکھتے ہین،

مرثیۂ فارسی

از

مولوی اقبال احمد خان صاحب سُہیل ایم اے ال ال بی ایڈوکیٹ اعظمگڈہ

جاے نشاط در چمنِ روزگار نیست ۔ آہ است سرو جنبشِ بادِ بہار نیست

کو لالۂ کہ داغِ جگر در نہان نداشت ۔ کو نو گلے کہ چاکِ دلش آشکار نیست

خونے است تو بتو کہ گلش نام کردہ اند ۔ زہریست سر بر زدہ این سبزہ زار نیست

سنگست دیدۂ کہ زِ نم اشکش نمی چکد ۔ کو راست دل گرش نگہِ اعتبار نیست

زنہار چشم دل بہ فریبِ رخش مدوز ۔ دنیا عجوزہ ایست عروسِ نگار نیست

بنیادِ کاخِ عمر به بادے نهاده اند
آرے نهادِ باد تو دانی قرار نیست

در کاروان سرا نتوان خانه ساختن
خود این زمانه چیست اگر رهگذار نیست

پایه گزین خرابه رود در غمش منال
کاین کاخ را اساسِ بقا استوار نیست

ابرو کشاده دار به شیرین و تلخِ دهر
دانی که نوش و نیشِ جهان پایدار نیست

نتوان چو جامِ عیش درین خاکدان زدن
بر تلخیِ زمانه نیز زود فغان زدن

لیکن کنون که سیلِ حوادث ز سر گذشت
باید ز شیونِ منِ بیچاره در گذشت

بگذار تا به ناله دل از غم تهی کنم
کارم کنون ز سعیِ تو اے چاره گر گذشت

بپذیر عذرِ تلخ نوائی ز من که باز
زهرابهٔ غمم ز گلو تا جگر گذشت

چون کعبه گر سیاه به پوشیم می سزد
کان نقشبندِ سیرتِ خیر البشر گذشت

آواره گشته گله و چوپان بخواب رفت
در ره بماند قافله و راهبر گذشت

آرے اگر دلت نه گدازد بحالِ قوم
بارے ببین چه بر سرِ علم و هنر گذشت

زیبد اگر فتد علمِ علم سرنگون
کز کشورِ کمال شهِ دادگر گذشت

نزهت گهِ هنر که بدان برگ و ساز بود
بازش نگه کنید و بپرسید سرگذشت

ناصح به دجله بارئ مژگانِ ما مگیر
کاین گریه نیست بهرِ عزیزی که بر گذشت

ما این فغان به بیکسیِ علم و فن کنیم
یا شیونے به زندگیِ خویشتن کنیم

دانشورِ یگانہ بہ دارالقرار شد | زیبد اگر جہان ہمہ اش سوگوار شد
بادِ سحر بہ ماتمِ اُو آہ بر کشید | چشمِ ستارہ در غمِ او اشکبار شد
دانشورانِ دہر بہ ماتم نشستہ اند | کز روزگار نادرۂ روزگار شد
تا رُخ نہفت ساقیِ خمخانۂ علوم | آبِ بقا بہ کامِ خضر ناگوار شد
دردا کہ گنجدارِ معارف ز دہر رفت | واحسرتا کہ شبلیِ معجز نگار شد
اے جہل شاد باش کہ گیتی بہ کامِ تست | وائے علم خون بشو کہ درونت فگار شد
آوخ کہ ہمچو گنج بہ خاکش نہاں کنند | کز وے ہزار گنجِ نہاں آشکار شد
گلزارِ دین کہ از نمِ کلکش بہار داشت | بے برگ ماندہ است کہ آن آبیار شد
عیسیٰ دمے کہ جان بہ تنِ مردگان دمید | آخر چہ شد کہ خود ز جہان بر کنار شد

خلقے ز خوابِ واہمہ ہشیار کرد و خفت
بختِ ہنر بہ زمزمہ بیدار کرد و خفت

دردا کہ وجہ نازشِ اہلِ جہاں نماند | فخرِ زمیں ز عربدۂ آسمان نماند
اکنوں کہ چامہ گوئے نظیری نظیر مرد | در شیوۂ سخن شرفِ ہندیاں نماند
یکتا گلے کہ بادِ بہارِ گذشتہ داد | آن ہم کنون ز غارتِ بادِ خزاں نماند
از سر بپاست ماتمِ رازی و ابن رُشد | کان یادگارِ دانشِ پیشینیاں نماند
دردا کہ بازدامنِ اُردو زبان تہی است | گلگلے کہ بود شاخچۂ گلفشاں نماند
دریوزۂ شرار غمے از کجا کنیم | کان دل کہ بود در غمِ ملت تپاں نماند

آوخ کجا روند و چہ سازند و چون زیند
اکنون کہ خضرِ جادۂ اسلامیان نماند

چرخِ خمیدہ پشت چہ جوئی نظیرِ او
کاینک گلے چو او سرِ این گلستان نماند

سیرت نہ شد تمام و دریغا کہ کس ز ما
شایستۂ نگارشِ آن داستان نماند

تخمے فشاندہ بود و برش برنچیدہ رفت
شاخے نشاندہ بود و بہارش ندیدہ رفت

اے شمعِ جمعِ فضل کہ از ما جدا شدی
ما را بہ غم گذاشتہ آخر کجا شدی؟

بیگانگان کمالِ تو نشناختند حیف
زین رو مگر بہ بزمگہِ آشنا شدی؟

شاید کہ نشرِ علم بہ گردون ہم آرزوست
کاین خاکدان گذاشتہ سوئے سما شدی

دادِ کسے نہ داد مگر از جہانیان
کاے دادخواہِ قوم بہ پیشِ خدا شدی

در بارگاہِ قدس مگر شاعرے نہ بود
تا بہرِ نغمہ سنجیِ حمد و ثنا شدی

در سیرتست حاجتِ تحقیقِ نکتۂ
تا خود کنون بہ بارگہِ مصطفیٰ شدی

یا جلوۂ بے حجابِ تمناست کز جہان
مستانہ وار در حرمِ کبریا شدی

ما را فغان ز ہیچ نہ پرسی ز حالِ ما
آخر کنون چہ شد کہ تو ناآشنا شدی

این خستہ را بہ منزلِ مقصود ہم رسان
آخر نہ خود ز لطف و کرم رہنما شدی

اے راہبر بمان کہ شتابت نمی سزد
تو بختِ قومِ ہستی و خوابت نمی سزد

غافل ز حالِ ملتِ بیضا چگونۂ
خامش درین قیامتِ صغریٰ چگونۂ

ما خاکیان بہ ماتم تو خاک بر سریم — تو بر فراز چنبر مینا چگونہ

اینجا دلت طپید بہ ہجران مصطفیٰ — در خلوت وصال بفرما چگونہ

در فکر قوم سیر چمن خوش نداشتی — در حیرتم بخلد شکیبا چگونہ

اہل جنان بحسن کلام تو کے رسند — در بزم خلد انجمن آرا چگونہ

در چار دانگ دہر نظیرت نہ داشتی — اینجا یگانہ بودہ آنجا چگونہ

ما بے تو ہم چو عسکر بے شاہ ماندہ ایم — اے تاجدار فضل تو بے ما چگونہ

با خاکیان تیرہ درون سخت زیستی — با قدسیان عالم بالا چگونہ

دیر است تا ز حال تو آگاہ نیستیم — بارے بگو بہ چاکر خود تا چگونہ

وقت است سرور اکہ سر از خواب برکنی
بر حال خستگان بہ عنایت نظر کنی

بنگر کہ حال ما بفراق تو چون شدہ است — از دیدہ خواب رفتہ و از دل سکون شدہ است

ہر نقش آرزو کہ بر انگیختم ز دل — چون رشتہ نگاہ کنون غرق خون شدہ است

آن ندوہ کز فیوض تو عہد کمال بود — ہر خام راستیزہ گہ آزمون شدہ است

وآن نخل کہ ہمت تو دادہ اش وجود — یکسر خراب و خستہ و خوار و زبون شدہ است

باغے کز آبیاری تو خرمی گرفت — تاراج فتنہ سازی چرخ حرون شدہ است

جامے کہ پر ز بادۂ نابش گذاشتی — چون کاسۂ سپہر دگر واژگون شدہ است

دار المصنفین کہ بہشت فیوض تست — می سود سر بہ چرخ مگر بے ستون شدہ است

بدخواہِ دین کہ چید اساسِ حصارِ کذب | بازاز گلولہ باریٔ کلکت مصون شدست
توچون کلیم طور نشینِ وصال و قوم | از سادگی فریفتۂ ہر فسون شدست

برخیز و باز لطف بہ اہلِ نیاز کن
بر ما درِ خزینۂ تحقیق باز کن

نوحۂ استاذ

از

خاکسار سلیمانؔ ندوی

اے متاعِ عزتِ پیشین کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبالِ گذشتہ! مقطعِ عہدِ سلف!
شمعِ بزمِ صحبتِ آخر! نشانِ رفتگاں

غنچۂ فصلِ پسیں! موجِ نسیمِ صبحدم!
نغمۂ آخر سحر! مرغِ گلستانِ خزاں

علم و فن کا عشق تھا جسکی طبیعت کا خمیر
صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جسکی ہر فریاد تھی صوتِ درائے کارواں

جس کی ہر رائے رزیں آزارِ ملت کا علاج
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں

جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جسکی رگ رگ میں تھیں سوزِ درد کی چنگاریاں

جس کے ہر مصرع میں سوزِ آتشِ زخمِ دروں
جس کے ہر فقرہ میں مخفی، مرہمِ دردِ نہاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریائے عماں

پیکر آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ ور
مرکزِ رازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لئے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لُٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دلفگار
جس کی دولت لُٹ گئی کب اُسکو دل پر اختیار

جانتا ہوں ہر بشر کو رہروِ عاجل سفر
جانتا ہوں زندگی کو اک لباسِ مستعار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دلِ اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اُس کا فقرۂ نا مختتم
"آہ سیرت! آہ سیرت چھوڑ کر سب کاروبار"

اس طرف لب توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل
اُس طرف جاں مبتلائے نزع و رنجِ احتضار

پھر رُکے کس طرح پُر شورئ قلبِ مضطرب
کس طرح رک جائے خوں نابئ چشمِ اشکبار

اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں
پوچھ لوں "اے احمدِ مختار کے سیرت نگار"

تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں
کچھ طریقِ نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار

جب سوادِ خط ترا آئیگا آنکھوں کو نظر
کس طرح پائیگا قلبِ مضطرب صبر و قرار

اہلِ میت اک توقف! پوچھ لوں آقا سے میں
میرے آقا میں فدا! اور جان میری تجھ پہ نثار

تو نے فرمایا کہ تاریخِ عرب تحریر ہو
ہو چکی تعمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار

ارض القرآن

پھر تسکینِ دلِ بے صبر کچھ فرمائیے
میرے آقا پھر ذرا سحرِ بیاں دکھلائیے

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں
کون پھونکے اب مرے بے جان فقروں میں جاں

رکزِ اُمید جو تھا آہ وہ جاتا رہا
جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں

ب پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے
پست مضمون کون پہنچائیگا اب تا آسماں

ون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن
کون سمجھائیگا رمزِ حسنِ اسلوبِ بیاں

ون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوے قلم
کون دیکھیگا مری جولانیِ طبعِ رواں

ون نامہ میں کرے گا اب عزیزی ہی خطاب
کس کا "تم" کہنا بڑھائیگا مری توقیر و شاں

س کے نامہ کا بناؤں اب مین عنوانِ خطاب
"سیدی" "مولائی" "استاذی" "غزالیِ الزماں"

س کی مجلس تھی تماشاگاہِ اربابِ نظر
آہ اے دستِ اجل تو نے مٹایا وہ سماں

یں نے جب پوچھا بتائے اُس نے ہر فن کے رموز
اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستاں

جب اُسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی
اُس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب و تواں

اس دلِ پُرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا

یرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر
کمسنی ہے سہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر

چھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں
رو کے مچلے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر

یا ابھی جانیں یہ خوننابہ فشانی چشم کی
کس طرح سمجھائیں اُن کو صدمۂ داغِ جگر

نوجوان جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو
ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزمِ سفر

کس ہوس سے تو نے اُنکی تربیت فرمائی تھی
آہ کس اُمید سے تو نے لگائے تھے شجر

باغباں کیا رک نہیں سکتے ہوا اگلی فصل تک
لوگ کہتے ہیں کہ ابکی لائیں گے یہ برگ و بر

طاقتِ پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور — اب نکل آنے لگے تھے بازوؤن پر بال و پر
جب کبھی باہر ہوا جا ناتوان سے بِل گئے — وعدۂ دیدار کیوں اٹھا ہے ابکی حشر پر
اُن کی خاطر سے ہوے اکثر ارادے ملتوی — ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لئے عزمِ سفر
اور اگر کارِ ضروری ہی کہ ٹل سکتا نہین — عرض اتنی ہے کہ ہو اُن کی یتیمی پر نظر

اپنے بچّون کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہی دُور

۱۹۰۶ء

تو نے جب چھیڑا ہی کوئی سخت یا آسان کام — نا پسند آیا ہی اس کو چھوڑ دینا ناتمام
مقصدِ اعظم ترا یعنی بناے درس گاہ — جس مین طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام
شائقِ فن کے لئے سامانِ تکمیلِ علوم — اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام
تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے — نشرِ دین، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقفِ عام
ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور — تیرے ہاتھون سے ابھی پانا تھا جنکو انصرام
کام ادھورے ہین بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر — اس قدر تو ہو توقف انکا بن جائے نظام

لوگ ٹھہرائین جنازہ پوچھ لوں بھولا نہ ہو
یا ہوا اس وقت اور عالم مین کہیں ایسا نہ ہو

کوچ ہوتا ہی جہاں سی قوم کے غمخوار کا — کون ہو اب چارہ ساز اس ناتوان بیمار کا
شغل دائم جس کا تھا غمخواریِ دینِ مبین — اب وداعِ دائمی ہوتا ہی اس غمخوار کا
وقفِ ماتم جو رہا جبتک کہ اُسمین جاں رہی — کون اب ماتم کرے اس جانِ ماتم کار کا

قطعاتِ مرثیہ و تاریخ

از

ہیچمدان سلیمان

کون کہتا ہے کہ زیرِ خاک ناپیدا ہوا   شبلیِ سیرت نگارِ مرسلِ قدسی سرشت

عشقِ پیغمبر میں فرقت سی بہت بیچین تھا   لے گیا ہی شوقِ دیدارِ نبیؐ سوی بہشت

فلک پہ دھوم ہوئی عاشقِ رسولِ اممؐ   سوانحِ نبویؐ کر رہا ہی خوب رقم

ہوا یہ حکمِ الٰہی مجھے پسند آیا   حضور میں اُسی لاؤ بصد وقار و حشم

براے لوحِ مزار

سعدیِ عصر و غزالیِ زماں، خلدونِ وقت   شبلیِ نعمانیِ والا گہر عالی سرشت

سیزدہ صد بود و سی و دو و روزِ پنجمین   بست و ہشتِ ماہِ ذیحجہ کہ ایں منزل ہشت

چہار شنبہ ۱۳۳۲ھ   ۲۸ ذیحجہ

قطعہ تاریخ

از مولوی سید احمد مرتضیٰ نظر صاحب وکیل سرد نج (مالوہ) مؤلف آثار مالوہ و صولت شیر شاہی

چو علامہ شبلیِ پاک باطن   بحکمِ الٰہی ز دارِ فنا رفت

نظرؔ ہاتفِ غیب سالِ وفاتش   بگفتا کہ "شبلی بہ دارِ بقا رفت"

۱۳۳۲ھ

ضمیمہ (صفحہ ۵۳۵ کے بعد)

ناگپور یونیورسٹی میں مشورہ ۱۹۱۴ء

ناگپور یونیورسٹی یعنی صوبہ متوسط و برار کی یونیورسٹی جس کا صدر مقام ناگپور ہے، اس وقت تجویز و خیال کی منزل میں تھی، مسٹر جونس اس زمانہ میں وہاں کے ڈائرکٹر اور اس تجویزی کمیٹی کے سکرٹری تھے، موصوف نے مولانا کو ۲۵۔ اگست ۱۹۱۴ء کو حسب ذیل سرکاری چٹھی لکھی:

"آپ شاید واقف ہوں گے کہ صوبہ متوسط اور برار کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے اور اس کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، مقامی حکومت کی طرف سے اس اُمید کا اظہار کیا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کمیٹی کی امداد کریں گے،

مجھ کو آپ تک یہ اطلاع پہنچانے کی ہدایت دی گئی ہے کہ عربی اور فارسی کی تجاویز کے لئے ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے اور غالباً اس کام کی تکمیل کے لئے آپ کی امداد و مشورے کی ضرورت ہو، آپ سے امداد اس سے زیادہ نہیں لی جائے گی کہ آپ بعض مسائل سے متعلق خطوط کا جواب دیں، ان مسائل کے متعلق آپ کی معلومات اور تجربے قیمتی ہوں گے، اس لئے میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ اس قسم کی ضرورت پیش آئی تو کیا آپ خطوط پاکر جواب دینے پر رضامند ہوں گے،

اُمید ہے کہ اس کا جواب ۵ ستمبر تک مرحمت فرمائیں گے۔"

مولانا نے اس کا جواب ۳۱ اگست ۱۹۱۴ء کو دیا، مگر یہ وقت مولانا کے لئے بڑی مصیبت

کا تھا، اور چند ہی مہینوں کے بعد وفات پائی، اس لئے مجھے امید نہیں کہ اُنھوں نے اس یونیورسٹی کے مشرقی صیغہ کی تشکیل میں کچھ زیادہ مشورے دیئے ہوں گے، یونیورسٹی کا یہ خاکہ چھ برس میں تکمیل کو پہنچا، اور ۱۹۲۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، نیز اس کا مشرقی صیغہ جو عربی و فارسی و اردو پر مشتمل ہے خاصہ ہے، اور اس کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ علامہ شبلیؒ کی تجاویز کا بھی کسی حد تک ممنون ہے،